ہو جائینگی۔ ہر "بامنشا" کل بجائے خود ایک بالاتر کل کے "بامنشا" یا بے منشا جز کی حیثیت سے دیکھا جاسکتا ہے۔ منفرد احساسات اعمال اور اجزائے زندگی اُسوقت بامنشا کہلاتے ہین جب وہ ہماری مجموعی زندگی کے لئے اہمیت رکھتے ہون۔ اس سوال کا جواب کہ خود زندگی مثلاً ایک منفرد انسانی زندگی بہ حیثیت مجموعی کوئی منشا رکھتی ہے یا نہین۔ اس پر منحصر ہے کہ یہ انسانی زندگی کسی بڑے نظام قدور کا جزو ہے یا نہین۔ یہ سلسلہ جسمین ہم ہمیشہ بلند تر کل کی طرف بڑھتے جاتے ہین۔ آخر مین اُس انتہائی اور غیر متعین کل تک پہونچتا ہے جسے ہم دنیا کہتے ہین۔ اب ہی یہ بات کہ یہ دنیا بھی کوئی منشا رکھتی ہے یا نہین ہمارے حد فہم سے باہر ہے۔ یہان تک ہمارے ادراک کی انتہائی پرواز بھی نہین پہونچ سکتی ہم اس سے زیادہ کچھ نہین کرسکتے کہ انسانی حالات پر قیاس کرکے کوئی رائے قائم کرلین۔

منشا کی اصطلاح کو جسے ہم استعمال کرتے آئے ہین اسقدر وسیع معنی مین استعمال کرنا ہمارے لئے اہمیت سے خالی نہین ہے۔ بظاہر "سمجھنے" کے عمل کے لئے جس سے ہمین یہان سروکار ہے۔ سب سے بڑا کل جس سے سب چیزون کو نسبت دیجاتی ہے انسانی زندگی ہے۔ بالفاظ دیگر بادی النظر مین یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم انسان کو محض اُسکی ذات کی نسبت سے سمجھ سکتے ہین۔ گویا اگر ہم اُسکی ذات کے ہر پہلو اُسکے ہر احساس اور ہر عمل کا منشا اُس کی مجموعی زندگی کے نظام قدور کی نسبت سے جان لین تو ہمنے اُسے سمجھ لیا ہے۔ لیکن دراصل یہ بات نہین ہے اسکا ایک کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ اگر انسان کے نفس کی ترکیب بجائے خود مکمل ہوتی تو وہ اپنی زندگی کے کل مظاہر مین اپنے آپکو پوری طرح سمجھ سکتا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کئی باتون کے لحاظ سے انسان خود اپنے کو اس سے کم سمجھ سکتا ہے جتنا وہ دوسرون کو سمجھتا ہے۔ پوری طرح سمجھنے کے لئے اپنے نفس کے حدود مین مقید رہنا کافی نہین بلکہ ایک وسیع تر اور بلند تر نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔ چنانچہ زمانۂ ماضی کے لوگ جس حد تک اپنے آپکو سمجھتے تھے اُس سے کہین زیادہ ہم انھین سمجھ سکتے ہین اور اگر کہین ہم کو دوسرون کی داخلی زندگی اور اُن کے نفس کی تغیر پذیر کیفیتون کا اُتنا ہی مکمل اور گہرا احساس ہوتا جتنا خود اُن کو ہوتا ہے پھر تو دوسرون کو سمجھنا بہ نسبت آپکو سمجھنے کے ہر اعتبار اور ہر پہلو سے بدرجہا زیادہ آسان ہوتا۔ اُس صورت مین ہم دوسرون کو اندر سے اُسی طرح دیکھتے جیسے وہ

اپنے آپ کو دیکھتے ہین اور باہر سے اُنسے کہین بہتر دیکھتے۔ لیکن ہمین دوسرونکے نفس مین اتنا گہرا ورک ہونا چاہئے کہ ہم دُنیا کو انکی آنکھون سے دیکھ سکین۔ دوسری طرف اکثر ہم کسی دوسرے کی حیاتِ داخلی کے اُن حدود اور تعلقات کو دیکھ لیتے ہین جنھین وہ اپنے نقطۂ نظر سے ہرگز نہین دیکھ سکتا۔ اُسے اپنی نفسی زندگی کا احساس ہم سے کہین زیادہ ہوتا ہو لیکن اُس کا علم بعض صورتون مین ہم کو زیادہ ہوتا ہو۔ اور اسی لئے ہم اُسکے احساس کا منشا اُس سے بہتر معلوم کر سکتے ہین۔

مندرجہ بالا بحث سے ہماری نفسیات کے لئے دو اہم اصول اخذ کئے جا سکتے ہین۔

ا۔ صحیح معنی مین سمجھنے کے لئے ضروری ہو کہ انسان محض نفسی زندگی کے اُس شعور اور احساس پر اکتفا نہ کرے جو براہِ راست ہوتا ہو بلکہ اس سے آگے بڑھکر مختلف قسم کے "خارجی معنی" رابطون کا علم رکھتا ہو۔ مثلاً عہدِ شباب کو انسان اُسی وقت سمجھ سکتا ہو جب وہ خود اس منزل سے گذر چکا ہو اور زندگی سے ہاسکی مختلف صورتون سے اُسکی تاریخی اور اجتماعی قیود سے اُس سے کہین زیادہ گہری واقفیت رکھتا ہو جتنی نوجوان رکھتے ہین۔ یا کسی تاریخی اہمیت رکھنے والی شخصیت کو انسان تب جاکر سمجھتا ہو جب وہ اُسے پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ کر کے اُس طرح نہین دیکھتا جس طرح وہ اپنے آپ کو دیکھتی تھی بلکہ جب وہ اُسکی حدود زندگی سے اسقدر دور ہوچکا ہو کہ اُسکا بحیثیت مجموعی مع اُسکے تاریخی اور اجتماعی ماحول کے مشاہدہ کر سکتا ہو۔ مختصر یہ کہ وہ کل جسکی نسبت سے انسان سمجھا جا سکتا ہو اُس کی مجموعی دُنیائے نفس سے بہت بڑا ہے۔ دوسرا اصول اسی بات کے ایک مختلف پہلو کو ظاہر کرتا ہو۔

"کسی نفس کو سمجھنا اُسکی داخلی زندگی، احساسات اور افعال کا ہو بہو عکس خود اپنے احساس مین اُتارنے کا نام نہین۔ اور اسکی کوشش یون بھی مہمل ہے کہ اسمین ہرگز کامیابی نہین ہو سکتی۔ کیونکہ اسکے یہ معنی ہین کہ انسان اپنے قالب مین کسی دوسرے کی روح داخل کرلے۔ یقیناً ہمین کوشش کرنا چاہئے کہ اُسکے احساس اور عمل کے عام رنگ کی ایک خفیف سی جھلک اپنے نفس مین پیدا کرین۔ لیکن اگر اسمین کامیابی بھی ہو تو مشاہدہ کا

یہ طریقہ بہت محدود ہی اور بجائے خود کافی نہین۔ اسمین بہت سے غیر مربوط مظاہر باقی رہجاتے ہین جنمین ربط اور معنی پیدا کرنا اسپر موقوف ہی کہ انسان داخلی احساس کی تنگ نظری اور بے نظامی کے دائرہ سے باہر نکلکر دیکھے۔

ایسی نفسیات جسکی بنا دوسرون کے احساس کا عکس اپنے نفس مین اُتارنے پر ہو محض بیانی نفسیات ہوگی۔ یہ اِس لحاظ سے پہلے ہی قدم پر اپنے موضوع سے دور ہٹنے پر مجبور ہوگی کہ اسے دوسرے شخص کی نفسی کیفیات اور اعمال کے لئے نام اور اصطلاحات مقرر کرنا پڑینگے حالانکہ وہ شخص خود ان کیفیات کو محسوس کرنے یا ان اعمال کو پورا کرنے کے لئے نفسیاتی اصطلاحات اور معانی کا محتاج نہین۔ دوسری قید اس نفسیات کے لئے یہ ہوگی کہ سمجھنے والا دوسرے کی نفسی زندگی کے صرف اُن مظاہر کو سمجھ سکیگا جو اسکے مشاہدہ یا تخیل کی حد کے اندر ہونگے۔ لیکن بہت سی چیزین اس حد کے باہر ہین۔ غرض یہ کہ اس نفسیات سے دوسرون کے نفس کے سمجھنے مین کام نہین چلتا ہمارے لئے یہ قیود بالکل فضول ہین کہ ہم "سمجھنے" کے لئے ہر وقت اندرونی مشاہدہ کا سہارا ڈھونڈھین یا دوسرے کے نفس کی ترجمانی کے لئے ہمیشہ اپنے داخلی احساس سے مدد لین۔ نظریۂ علم کے نقطۂ نظر سے یون کہنا چاہئے کہ "وہ عمل ادراک جسکا نام سمجھنا ہی کلیتہً دوسرون کے احساس کا عکس اپنے احساس مین اُتارنے پر موقوف نہین بلکہ اسکے لئے ضرورت ہی صوریٔ[1] ابواب کی جو ہماری قوتِ خیال اندرونی احساس کے تجربی مادہ کو قابو مین لانیکے لئے مقرر کرلی ہی اور جنکی مدد سے وہ دوسرے کے نفس کے گوناگون کیفیات اور اعمال مین ربط اور ترتیب ڈھونڈھتی اور پاتی ہی۔

کسی دوسرے کی نفسی تغیر حالات کا محض مشاہدہ مین عکس اُتار لینا ہرگز سمجھنا نہین کہلا سکتا جسطرح آنکھ کے پردہ پر بیرونی اشیاء کے اثر سے حس کا پیدا ہونا بجائے خود دیکھنا (بمعنی ادراک) نہین ہے بلکہ دونون صورتون مین موقوف با علم اُسی وقت حاصل ہوتا ہی جب حسیات ابواب (Categories.)

[1] Formal Categories. وہ عام معانی Conceptions ہین جو مختلف مظاہر کی مشترک خصوصیات کے

اور ربط کی صورتوں کے سانچہ مین ڈھل جائین۔ ابواب جن سے سمجھنے مین کام لیا جاتا ہو مثلاً کے تعینات اور علاقے ہین۔ خود نام نہاد انتقال احساس جسے ڈنٹ "داخلی احساس کی زبان مین خارجی حسیات کا ترجمہ" کہتا ہو محض اشیاء اور واقعات کا عکس اُتارنا نہین ہو بلکہ حسیات اور احساسات کا منشا کے ابواب کے ماتحت ترتیب دینا ہو اسلئے سمجھنا اگر عکس اُتارنا ہو بھی تو اس قید کے ساتھ کہ اس عکس مین ابواب کی صورتو نکے ماتحت تصرف ہو چکا ہو۔

اسکی تردید مین کہا جا سکتا ہو کہ جن دو شخصون کا نظام نفسی مشابہ ہو وہ ایک دوسرے کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہین۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہین کہ واقعی ہمعصر ہم رتبہ ہم عمر اور ہم جنس اشخاص ایک دوسرے کی نفسی کیفیات کا احساس اپنے نفس کے قیاس پر آسانی سے کر لیتے ہین لیکن اس سے ہمین دھوکا نہین کھانا چاہئے۔ یہ سمجھنا جسکی بنیاد نفس کی ہم آہنگی پر ہو بہت سطحی ہوتا ہو۔ ایسے لوگ جو کچھ سمجھتے ہین وہ محض اپنے داخلی طرز خیال اور ایک خاص حلقہ کے نقطۂ نظر کے ماتحت اسطرح سمجھنے سے یہ اندازہ ہرگز نہین ہو سکتا کہ داخلی وجود اور احساس ایک فوق الافراد معنوی نظام کا پابند ہو۔ اگر ایسا ہوتا کہ سمجھنے والا صرف اُن باتون کو سمجھ سکتا جو خود اُسکی نفسی کیفیات سے مشابہ ہون تو وہ کیفیات جو اسکی نفس پر کبھی نہین گذرین اسکی سمجھ ہی مین نہ آتین۔ اگر اس کے جواب مین کہا جائے کہ ایک طرح کے تخیل کی ترجمانی سے وہ اس خلیج کو عبور کرتا ہو تو ہم کہینگے کہ بیشک یہ صحیح ہے لیکن تخیل کا یہ عمل ایک معمہ ہو جسکے حل کے لئے یہ ماننا ضروری ہو کہ خود تخیل ایک فوق الافراد معنوی نظام کا پابند ہو جسکے ماتحت ہماری اجتماعی ذہنی زندگی ہو اور ہر فرد کی نفسی زندگی اسی کا ایک نمونہ ہے۔ اسلئے اُسکا وجود اور اسکا سمجھنے والا تخیل بھی اسی معنوی نظام کا پابند ہو۔ مجھے چاہئے کہ اپنی نفسی کیفیات اور حالات کو ان معنوی قوانین کے مُطابق اسطرح تبدیل کرون کہ دوسرے کے کیفیات اور حالات مین بھی مجھے ان قوانین سے مُطابقت نظر آنے لگے۔

اس عمل کے ذریعہ سے جو ایک فوق الافراد ذہنی نظام کی روشنی مین واقع ہوتا ہے

سمجھنے والا اس سے محفوظ رہتا ہے کہ دوسرون کے نفس کے محض داخلی پہلو مین الجھ کر رہجائے یقیناً
یہ بھی عمل و قوت کا ایک اہم جزو ہے کہ اس داخلی پہلو کا عکس اپنے احساس مین اتارا جائے تاکہ
چشم مشاہدہ اُسے دیکھ سکے (نفسیات بیانی) لیکن سمجھنے والا اس سے آگے بڑھ کر اس نظم و ترتیب
بھی نظر ڈالتا ہے جسکا اس دوسرے شخص کو جسکی نفسی کیفیات کا سمجھنا مقصود ہے شعور نہین ہوتا (نفسیات
افہامی) کیونکہ وہ مافوق الافراد نظام معنوی جسکے ماتحت ہر فرد کی داخلی زندگی ہے۔ اسس
فرد کے احساس مین نہین آسکتا ہم اس مشکل مطلب کی توضیح کے لئے دو مثالین پیش کرتے ہین۔ پہلی مثال
بچون کی زندگی سے اور دوسری تاریخ تمدن سے۔ اگر نفسیات کا محض یہ کام ہوتا کہ جو کچھ افراد
محسوس کرتے ہین اُسے بیان کر دے تو اس سوال کے جواب مین کہ بچہ کیون کھیلتا ہے بس اتنا کہنا
کافی تھا کہ اُسے کھیلنے سے خوشی ہوتی ہے کیونکہ کھیل کا داخلی منشا (جو محسوس ہوتا ہے) اس سے
زیادہ کچھ نہین۔ اس صورت مین بچپن کے اس جبلی رجحان کے متعلق کوئی مزید "نظریہ" قائم کرنیکی
گنجائش نہوتی لیکن اگر ہم کارل گروس کے ہمزبان ہو کر کہین کہ بچہ اس لئے کھیلتا ہے تاکہ اُسے
اُن کامون کی مشق ہو جائے جو آگے چل کر اسکی زندگی کے لئے اہم ثابت ہون گے تو ہم اس
احساس سے کہین آگے بڑھ جاتے ہین جو بچہ کو کھیلتے وقت ہوتا ہے۔ خود بچہ کے شعور مین "اسلئے
------ تاکہ" ---- کا شائبہ بھی نہین ہوتا۔ یہ مثال ہے ایک مافوق الافراد منشا کی کھیل کو
یہ معنی وہی شخص پہنا سکتا تھا جو مافوق الافراد معنوی نظام کا علم رکھتا ہو۔

اسی طرح اگر آپ کسی قوم کی تمدنی تاریخ پر غور کرین تو نظر آئے گا کہ ایک خاص عہد مین
وہ ایک مخصوص تصور عالم انداز خیال، نظام اقتصاد اور طرز معاشرت رکھتی ہے۔ یہ سب مافوق الافراد
ذہنی مظاہر کی مثالین ہین۔ فرد اور اُسکا "ذہن داخلی" اس "ذہن خارجی" کا محض ایک
جزو ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ فلان شخص کے خیالات اور اُسکے اخلاق و اعمال کیون ایسے
ہین تو اسکا جواب محض اُس شخص کی انفرادی سیرت پر غور کرنے سے قیامت تک
نہین ملسکتا بلکہ اُسکے اور دوسرے افراد کی انفرادی سیرت بہت بڑی حد تک مافوق الافراد

ذہنی مظاہر اُس مخصوص تمدن کے اعتقاد، علوم وفنون، حکومت، اخلاق، اور مذہب کی
عام حالت سے متاثر ہوتی ہے۔ ان مافوق الافراد قوتوں کے منشا کا ہمارے نفس کو بجائے خود شعور
نہین ہوتا۔ یہ شعور محض فلسفیانہ اور مؤرخانہ غور وفکر سے حاصل ہوتا ہے اور وہ بھی محض ایک حد تک
مختلف افراد مین اس شعور کے مدارج مختلف ہوتے ہین۔ ہم کسی عہد کے کسی فرد کو اسوقت تک
پوری طرح نہین سمجھ سکتے جبتک ہم اُس سے اتنے بلند نہون کہ داخلی احساس کو خارجی منشا کے
معیار پر جانچ سکین۔

نفسیات شباب پر اسکا انطباق بالکل صاف ہے۔ یہ نفسیات اگر محض اتنا کرے کہ جو کچھ
ایک نوجوان کے نفس مین واقع ہوتا ہے اُسے کیفیات وحالات کے ایک سلسلہ کے طور پر بیان کر دے
تو اُسنے اپنا کام ادھورا چھوڑ دیا بلکہ اُسے اُس داخلی منشا پر بھی انکشاف کرنا چاہئے جو خود
اُس نوجوان کے شعور مین ہے اُسکے کام کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اس نوجوان کے نفس
اور اُسکے احساسات کو مافوق الافراد نظام ذہنی کی روشنی مین دیکھے اور اس نظام ایک
جزو جان کر سمجھنے کی کوشش کرے۔

اس بحث نے ہمین ایک نئے اہم ترین معنی سے آشنا کر دیا ہے۔ ہم کہہ چکے ہین کہ
منشا صرف وہ چیز رکھتی ہے جو کسی قدر کے کل مین بحیثیت ایک تعمیری عنصر کے جگہ پائے۔ نفسی زندگی
کوئی خالص ذہنی چیز نہین بلکہ عالم واقعی کا ایک جز ہے جو زمان ومکان کا پابند ہے اس لئے اگر اس واقعی مظہر کو نظام منشا کے ماتحت
قرار دینا ہے تو نفس کو ایک ایسی چیز سمجھنا چاہئے جسمین قدر کو واقعیت کا جامہ پہنانے کی صلاحیت موجود
ہے۔ اس قسم کی چیز کو ہم وسیع معنی مین ترکیب کہتے ہین۔ ترکیب کسی واقعی مظہر مین اُسوقت
ہوتی ہے جب وہ ایک ایسا کل ہو جسکا ہر جزو اور جزوی عمل کل کے لئے اہمیت رکھتا ہو ہر حصہ
اپنی ساخت اور اپنے کام کے اعتبار سے کل کا پابند ہو اور اُسکا سمجھنا محض کل کی نسبت سے
ممکن ہو۔ "نفسیات اتمامی" کی بنیاد ہی اس حقیقت پر ہے کہ اُسکے موضوع ترکیب رکھتے
ہین۔ جس طرح کسی نامی جسم مین ہر عضو یا ہر حصہ کل کی صورت کا پابند ہوتا ہے اور کل کی

زندگی کا انحصار تمام اعضا یا حصّون کے اتحادِ عمل پر ہوتا ہے اسی طرح نفس بھی ایک با مقصد ترکیب ہے جسکا ہر منفرد پہلو صرف کُل کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے اور کُل کی وحدت جزوی اعمال کی ترتیب اور ربط پر موقوف ہے۔ ان بنیادی اصولون کو بیان کرنیکے بعد ہم اپنی نفسیات کا نام نفسیات ترکیبی بھی رکھ سکتے ہین۔ یہ نام اکثر اس نفسیاتی تحقیقات کے لئے استعمال ہوتا ہے جسمین نفس کی جزوی ترکیبون سے بحث کیجاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ منفرد نفسی مظاہر مین ترکیب ہونا اسی صورت مین ممکن ہے کہ کل مین بھی ترکیب پائی جاتی ہے لہذا نفسیات ترکیبی ہر اُس نفسیات کو کہتے ہین جو منفرد نفسی مظاہر کو اِسقدر اونچل کے اعتبار سے سمجھتی ہے جو وہ کل نفس مین رکھتے ہین اور اُس اہمیت کے اعتبار سے جو انھین پورے نظام عمل مین حاصل ہے۔

نفسیات ترکیبی کی ایک یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ سارے احساسات اور اعمال کو جو کسی فرد کے نفس مین واقع ہون تمام و کمال اُسی فرد کے نظام نفسی کی نسبت سے سمجھنے کی کوشش کیجائے یعنی یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر منفرد نفس کی سرشت مین محض ایک قدر ہے اور وہ خود اپنی بقا اور توسیع کی خواہش ہے۔ اسمین شک نہین کہ اُصولاً نفسیات کو مدرک کا بھی تصور قائم کرنا پڑتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ منفرد نفس اسقدر منظم اور کافی بالذات ترکیب نہین ہے۔ ہم اس سے قطع نظر کئے لیتے ہین کہ نفس مین بہت سے ایسے مظاہر ہوتے ہین جنھین داخلی نظام نفسی سے کوئی ربط نہین ہوتا مثلاً اتفاقی تصورات و احساسات جو خارج سے آتے ہین یا وہ جو نفس ہی مین پیدا ہوتے ہین لیکن بالکل بے ربط ہوتے ہین جیسے ہمارے اکثر خواب، کیونکہ یہ چیزین تحت شعور کی سرحد مین ہین۔ اس سے کہین زیادہ اہم یہ پہلو ہے کہ خود انفرادی نفس کی ترکیب ایک جزو ہے وسیع تر اور بلند تر معنوی ترکیبون کا جنکا سلسلہ نظام فطرت سے لیکر تاریخی اور معاشرتی زندگی کے خارجی ذہنی نظام تک چلا جاتا ہے۔ اس فوق الافراد نظام مقاصد کی نسبت سے منفرد نفس کے بہت سے مظاہر کا حقیقی منشا سمجھ مین آتا ہے جسکا احساس داخلی حیثیت سے یا تو بالکل نہین ہوتا یا بہت ناکافی ہوتا ہے۔

اگر نفس ایک کافی بالذات ترکیب ہوتا تو ہر فرد ہمیشہ اپنے آپکو پوری طرح سمجھ سکتا، لیکن ہم کہہ چکے ہین کہ یہ ناممکن ہو۔ مدرک خود اپنے آپکو اُن عظیم الشان نظامون کی نسبت سے سمجھتا ہے جو اسکی ذات سے بالاتر ہین جسقدر اُسکا ذہن ترقی کرتا ہو اور وہ ان مافوق الافراد نظامونکا محرم ہوتا جاتا ہو اُسی قدر وہ خود اپنی ذات کو بہتر سمجھتا ہو اسی طرح دوسرے لوگ بھی اُسکے سمجھنے سے قاصر رہین گے اگر وہ اُسکی نفسی کیفیات کا عکس اپنے احساس مین اُتارنے پر اکتفا کرین یا اُسکے نفس کو ایک ایسی ترکیب سمجھ لین جو ساری کائنات سے بے تعلق اور بے نیاز ہو ضرورت اس امر کی ہو کہ وہ بامنشا نظام اور بامقصد ترکیبین جنکی نسبت سے منفرد نفس کو سمجھنے کی کوشش کیجائے مافوق الافراد اور عالمگیر ہون تاکہ فرد کے نفس کا تعلق ہمارے نظام کائنات سے معلوم ہو کیونکہ سمجھنا اصل مین اسی کا نام ہے[1]۔

ہماری بحث کا مذکورہ بالا پہلو اُسوقت اور بھی اہم ہو جاتا ہو جب ہمارے موضوع کلام مطلق افہامی نفسیات ترکیبی نہین بلکہ اُسکی ایک مخصوص صنف یعنی افہامی نفسیات ارتقائی ہو اب ظاہر ہے کہ ہمین یہان نفسیات کے جس شعبہ سے کام ہو وہ ترکیب نفسی کے ارتقا سے تعلق رکھتا ہو خود ہمارے نوجوان کو اپنی ارتقا کے منشا کا احساس نہین ہوتا۔ خصوصًا اس بات کا احساس اُسے بالکل نہین ہوتا کہ اُسکے بہت سے نفسی مظاہر محض ارتقائی مقصد رکھتے ہین اور اگر انکے ارتقائی پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان کا کوئی منشا سمجھ ہی مین نہین آسکتا۔ علاوہ اسکے جو تھوڑا بہت احساس نوجوان کو اپنی نفسی زندگی کے مقصد کا ہوتا بھی ہے ضروری نہین کہ وہ اُس مکمل صورت مین ہو جیسا ذہن خارجی کے حکم مطلق[2] کے مطابق ہونا چاہئے بلکہ ایسی مطابقت

[1] یہان ہم ایک طویل عبارت جسمین فرد کے نظام نفسی کا تعلق مافوق الافراد نظام سے بیان کیا گیا ہو حذف کئے دیتے ہین کیونکہ اسے نفسیات سے براہ راست کوئی تعلق نہین ہے۔

[2] حکم مطلق لفظ Norm کا ترجمہ ہے یہ اُس قانون عمل کے ادراک کا نام ہے جو کسی قدر مطلق کے احساس کے ساتھ پیدا ہو مثلاً جو شخص الخ

شاذ و نادر ہی ہوتی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کمل صورتین نفسیات ارتقائی کی بحث مین نمایان حیثیت نہین رکھ سکتین لیکن ہمین اپنی رائے قائم کرنیکے لئے انھین بطور مسلّمہ اصول کے پیش نظر رکھنا پڑتا ہے اسلئے ضروری ہو کہ ہم اپنی نفسیات کا منہاج بیان کرنے وقت ان کی طرف اشارہ کرین۔

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ نفسی ارتقا کے کیا معنی ہین؟ ہر عمل ارتقا مین اندرونی اور بیرونی عناصر کے مشترکہ اثر سے مدرک مین ایک سلسلۂ تغیرات واقع ہوتا ہو لیکن ان تغیرات کی نوعیت کا تعین زیادہ تر مدرک کے اندرونی سرشت یا رجحانات پر موقوف ہو۔ دوسرے ارتقا کے ساتھ انشعاب یعنی وظائف اور اعمال نفس کا مختلف شعبون مین تقسیم ہونا ضروری ہو مگر اسطرح کہ بہ ہیئت مجموعی مدرک کی اصل ذات اور وحدت بدستور قائم رہے۔ تیسرے ارتقا کے معنی مین کسی قدر کا تصور مضمر ہے جس کے حصول کی خواہش ان سارے تغیرات کے لئے قوت محرکہ کا کام دیتی ہو۔ یعنی نفسی ارتقا اسکا نام ہو کہ کسی فرد کی نفسی زندگی داخلی محرکات کی بدولت نشو و نما پاکر مختلف شعبون مین تقسیم ہو اور اُسکی مجموعی قدر مین اضافہ ہو۔ ظاہر ہے کہ قدر کا جو معیار قرار دیا جائے گا اُسی کے لحاظ سے ارتقائے نفسی کے مفہوم کا تعین ہوگا۔ مثلاً اگر انتہائی قدر کسی کے نزدیک فرد کی بقائے نفس ہے تو ارتقا مین صرف وہ عناصر داخل ہون گے جن سے یہ مقصد حاصل ہو۔ اُس صورت مین ارتقائے نفسی محض قوت حیات کی ترقی یا طبعی ماحول سے مطابقت کا نام ہوگا جسمین نفسی ذرائع اور وظائف سے کام لیا جائے۔ لیکن اگر کوئی انتہائی قدر ذہن خارجی مین حصہ پانے اور مطلق ذہنی ترقی کو قرار دے تو نفسی ارتقا کے معنی بہت وسیع اور پیچیدہ ہو جاتے ہین تب "مطابقت" اور "اعمال" کا تعلق محض طبعی ماحول سے نہین ہوتا بلکہ ذہنی ماحول سے بھی۔ لیکن ہم نے ارتقائے نفسی کی جو تعریف کی ہے اُسکی رو سے محض مختلف شعبون مین تقسیم ہو جانا کافی نہین بلکہ استقلال اور وحدت حیات قائم رہنا بھی ضروری شرط ہے۔ یہی ذہن انسانی کا انشعاب جو استقلال کو قائم رکھتے ہوئے پایا جائے "ذہنی صورت" "اخلاقی سرمایہ" اور اختصار کے ساتھ "شخصیت" کہلاتا ہو۔ گوئٹے نے

Functions. ؎ مختلف اعضاء کے مخصوص اعمال۔

ان الفاظ سے "مقررہ صورت جو زندگی کے ساتھ ساتھ ارتقا پاتی ہے" محض جسمانی نظام نہیں بلکہ ذہنی Entelecisie جوہر قابل مراد لیا ہے۔

ہم کو بھی یہ حق نہیں کہ نفسیات شباب کا مفہوم تنگ قرار دین۔ بالفاظ دیگر ہمارے نزدیک عنفوان شباب یا نوجوانی کا عہد محض وہ زمانہ نہیں ہے جو بچپن اور بلوغ (عضویاتی معنی مین) کے درمیان ہو بلکہ وہ عمر جو بچہ کی مخصوص ناشگفتہ ترکیب ذہنی اور مرد یا عورت کی مستحکم ترکیب ذہنی کے درمیان گذرتی ہے۔

نفسیات بیانی اور نفسیات افہامی کا فرق اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نوجوان کو اپنی ترکیب نفسی اور اپنی کیفیات کا ارتقائی مظاہر ہونا بالکل محسوس نہیں ہوتا۔ اکثر صورتون مین وہ ان چیزون کو اسی طرح دائمی سمجھتا ہے جس طرح ہم اپنے سارے احساسات کو ابتدا مین سمجھا کرتے ہین۔ اس بات کا کہ وہ اپنے آپکو اچھی طرح نہین سمجھتا یہی کافی ثبوت ہے کہ اُسے اپنی طوفان خیزیون اور جنون انگیزیونکی ارتقائی اہمیت کا اندازہ نہین۔ لیکن نفسیات شباب کا کام محض عام طور سے سمجھنے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ بعض مظاہر کو خاص ارتقائی مظاہر کی حیثیت سے سمجھے اور انھین ایک نظام مقاصد کی تحت مین لائے۔ اس نظام مقاصد کا شعور نوجوان کے داخلی احساس مین نہین پایا جاتا بلکہ اس نظام کو اس لحاظ سے اُسکی داخلی زندگی کے ماورا سمجھنا چاہیے کہ اُسکا نفس ارتقا پانے وقت اپنے آپکو ایک خارجی طبعی اور ذہنی ماحول مین پاتا ہے جس سے اُسے اپنے تعلقات معین کرنا پڑتے ہین۔ انسان کی اس طبعی خواہش کا کہ وہ پیچیدہ مسائل کو اساطیر کے پیرایہ مین بیان کرے تقاضا ہے کہ وہ ارتقائے نفسی کے ان قوانین کو (ذہنی) فطرت کے پراسرار مقاصد کا نتیجہ قرار دے۔ اسمین شک نہین کہ یہ محض استعارہ ہے لیکن اس سے زیادہ آسان اور مختصر طریقہ اس حقیقت کو ظاہر کرنے کا نہین ہوسکتا کہ نفسی زندگی کے بعض مظاہر کو سمجھنے کے لئے انھین کسی "ارتقائی منشا" کی طرف منسوب کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس کتاب مین اس طرح کی بحث آئیگی کہ تخیل کی کیا ارتقائی اہمیت ہے،

عشق اور شہوت کی علیحدگی کا گیا "منشا" ہے۔ نوجوانوں میں احساس نصب العین اور ادراک حقیقت کی دوئی کا گیا "مقصد" ہے۔ خواہ یہ اغراض درحقیقت موجود ہوں یا نہ ہوں اور خواہ اُن کا یقین ہو سکے یا نہ ہو سکے مگر ہم نفسی زندگی کی مستقل تفسیر کرنیکے لئے اسطرح کا نقطۂ نظر اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی ہم محض اُن کیفیات کے بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرینگے جو محسوس ہوتی ہیں بلکہ اُن کے منشا سے بھی بحث کرینگے۔ بغیر اسطرح کے مفروضات کی مدد کے نفسیات شباب کی تدوین ناممکن ہے۔ اگر ان سے کام نہ لیا جاتا تو ہم اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے کہ غیر مربوط جزوی واقعات کو محض بیان کر دیں اور چونکہ ساری کتاب اسی نقطۂ نظر کے ماتحت لکھی گئی ہے اسلیے بجائے مظاہر کی تمام اصناف کو فرداً فرداً نظام منشا کی طرف منسوب کرنیکے ہم ابتدا ہی میں اس عام اور بنیادی حقیقت کو بیان کر دینے پر اکتفا کریں گے۔ ہمارے نزدیک نفسی ارتقا اسکا نام ہے کہ منفرد نفس کسی مخصوص عہد کے ذہن خارجی اور اخلاقی میں اس طرح جڑ پکڑتا جائے کہ مدرک کا مافوق الافراد نظام ہائے ذہنی کا علم اور احساس بتدریج زیادہ اور بلند ہوتا جائے لیکن اسی کے ساتھ وہ استقلال اور وحدت باقی رہے جس کی بدولت انفرادی نفس کا ایک ذہنی صورت آفرین جوہر اور نصب العین کا حامل ہونا روز بروز زداس واضح ہوتا جاتا ہے۔

اب اس بحث کا آخری پہلو رہ گیا ہے۔ ارتقا پذیر مدرک اس اعتبار سے کہ وہ طبعی اور ذہنی ماحول کے اثرات میں قوتِ انتخاب سے کام لیتا ہے اور اس اعتبار سے کہ وہ تخلیق منشا اور احساس منشا کا ایک مخصوص انداز رکھتا ہے۔ ایک صورت پذیر اور صورت آفرین فرد ہے اس نقطۂ نظر سے ہر شخص ایک نرالی ہستی ہے۔ ہر شخص بجائے خود ایک دُنیا ہے۔ ایک جوہر واحد[1] ہے

[1] جوہر واحد جرمن لفظ Monade. کا ترجمہ ہے جسے انگریزی میں Monad. کہتے ہیں جرمن فلسفی Leibniz لائبنٹز کے نزدیک Monaden. وہ بسیط اجزائے لاتیجزے ہیں جنسے کل موجودات مرکب ہیں۔ لیکن دیمقراطیس و ابیقورس وغیرہ کے خلاف لائبنٹز اسکا قائل ہے کہ ان اجزائے لاتیجزے کی ماہیت مادی نہیں بلکہ روحانی ہے اسی لیے ہمنے لفظ Monade. کے لئے بجائے جوہر فرد کے جوہر واحد استعمال کیا ہے۔

جسمین کائنات کا عکس اس مخصوص رنگ مین نظر آتا ہی جس طرح کسی دوسرے مین نہین نظر آتا لیکن اس وجود اوّل کا ادراک علم کی طاقت سے باہر ہے۔

ہم عام ذہن انسانی کی ان مخصوص صورتون پر قابو پانے کے لئے ایسے معانی کے محتاج ہین جو مجرد اور مشہود کے بین بین ہون۔ عام معانی کو اس طرح مشہود صورت مین لانیکا نام "مثال" ہے۔ (جس طرح عین کو مشہود صورت مین لانا نصب العین کہلاتا ہی) عام انسانونکی ترکیب نفسی کو مخصوص قوانین کے ماتحت قابلِ مشاہدہ صورت مین لانے کے لئے ہم انسان کی یا ارتقا پذیر نوجوان کی "مثال" قائم کرتے ہین۔

یہان سے بجائے نفسیات عمومی کے نفسیات خصوصی اور بجائے نفسیات عمومی ارتقا کے نفسیات خصوصی مثالی کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ اگر مثال کے قائم کرنے مین استقرا سے کام لیا جائے یعنی ایک طرح کے واقعات کو بار بار دیکھکر نتیجہ نکالا جائے تو اُسے مثال اوسط کہتے ہین بخلاف اسکے اگر مثال بداہتہ اسطرح مستنبط کی جائے کہ انسان اپنے تصور مین قانون کو حقیقت کا جامہ پہنے ہوئے دیکھے تو وہ مثالِ عینی کہلاتی ہے۔ علمی تحقیقات مین یہ دونون منہاج بلکہ یون کہنا چاہئے کہ قیاس اور استقرا ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہین۔

ہم جب عہدِ شباب کی نفسیات سے بحث کرتے ہوئے افراد کی نفسی ترکیب اور ارتقا کے باہمی اختلافات پر زور دین تو ہمارا موضوع کلام نفسیات مثالی کے نام سے موسوم ہوگا۔ یہ اختلافات یا تو گوناگون خلقی رجحانات پر مبنی ہوتے ہین جنمین سے ایک اسقدر قوی ہوتا ہی کہ ساری ترکیب نفسی پر چھا جاتا ہی یا ان کا منبع اختلافات احوال ہے جو ذہن خارجی کی بدولت پیدا ہوتا ہی۔ اسطرح سے جو مثالین حاصل کیجاتی ہین اُنمین قومون کی مثالین مختلف طبقونکی مثالین تاریخی مثالین وغیرہ شامل ہین۔ افراد مین باہم جو فرق ہوتا ہی اُسکا اظہار اُنکی جسمانی ساخت تک سے ہوتا ہی۔ اور بظاہر جتنا زیادہ خالص جسمانی اختلاف ہو اُسی نسبت سے نفسی اختلاف بھی ہوتا ہی اسکی سب سے اہم مثال وہ فرق ہے جو مرد اور عورت کی جسمانی اور نفسی ساخت مین ہوتا ہے

نفسیات مثالی کی یہی وہ شاخ ہے جو نہایت وضاحت کیساتھ یہ ثابت کرتی ہے کہ باوجود اسکے کہ دونون جنسون مین تمام نفسی عناصر اور ذہنی شعبے مشترک ہین محض ان اندرونی اختلافات کی بنا پر جو مجموعی ترکیب نفسی مین ان عناصر اور شعبونکی ترتیب مین پائے جاتے ہین ہمین وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف مثالین نظر آتی ہین۔

یہان اتنا اور کہدینا چاہئے کہ ہماری نفسیات مثالی ابھی تک ابتدائی حالت مین ہے اور اس میدان مین مزید کام کرنیکے لیئے ضرورت ہے کہ آہستہ آہستہ نہایت احتیاط سے تحقیقات کی جائے۔ مثلاً سب جانتے ہین کہ نوجوان لڑکیونکی نفسی ارتقا نوجوان لڑکون سے مختلف ہوتی ہے لیکن ان گہرے ترکیبی اختلافات کو معانی کی تحت مین لانا بہت مشکل ہے۔ اگرچہ ہم نے عورتونکے متعلق بھی مشاہدہ اور تحقیقات مین کمی نہین کی ہے لیکن ہم اس بات کو صاف کردینا چاہتے ہین کہ ہمارے پیش نظر زیادہ تر صنف ذکور ہے۔ اور ہمارے خیال مین شارلوٹے بوہلر کی کتاب بہت سی باتون مین محض لڑکیونکی نفسی زندگی کے باب مین مستند ہے کیونکہ ایسی کتابین لکھنے مین اپنے ذاتی تجربہ کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے جسکی بدولت انسان کسی ترکیب نفسی کے خاکے مین تصویر کی طرح کما حقہ رنگ بھر کر مکمل نقش بنا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب طبعی اور ذہنی دنیا کی اتنی موٹی مثال کا سمجھنا دقت سے خالی نہین تو افراد مین جو باریک فرق ہوتے ہین اُن کے سمجھنے مین کسقدر دشواری ہوتی ہوگی۔ پہلی کوشش مین ہم اس سے زیادہ کچھ نہین کرسکتے ہین کہ اُن مثالی بنیادی خصوصیات کو بیان کردین جنپر آسانی سے نظر پڑتی ہے۔

اپنی نفسیات کے مقصد اور منہاج کو چار پہلوؤن یعنی نفسیات افہامی ۲۔ نفسیات ترکیبی۔ ۳۔ نفسیات ارتقائی اور ۴۔ نفسیات مثالی کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بعد نفسیاتی تحقیقات کی ایک اور شاخ یعنی نفسیات عضویاتی سے بحث کرنا آسان ہے ہمین اسکی صحت اور اہمیت مین کلام نہین لیکن اسکا مقصد بالکل مختلف ہے اسلیئے ہمارا کام اس سے کسی طرح نہین چلسکتا۔ بلاشبہ جسم کی ساخت اور اُسکے وظائف کو نفسی زندگی سے گہرا تعلق ہوتا ہے اسکا سب کو روزمرہ تجربہ ہوتا ہے۔ تجربی تحقیقات نے ان مشاہدات کی تدوین کردی ہے اور امید ہے کہ اس سے مزید نتائج نکلین گے۔ ابتک یہ دقت رہی ہے کہ علوم فطرت تشریح عضویات کیمیا اور طبیعیات کی تحقیقات خاصی ترقی کرگئی تھی لیکن خود نفسیات بالکل ابتدائی حالت مین تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ طبعی علوم کو زیادہ مستند سمجھکر ان سے نفسی زندگی کی تفسیر کرنیلگے۔ برخلاف اسکے نفسیاتی نتائج کا اثر عضویاتی تحقیقات پر

ابتک بہت کم پڑا ہو لیکن آگے چل کر زیادہ پڑیگا۔ یہ کہنا کہ جسم اور نفس کے باہمی تعلق کی نوعیت کا مسئلہ ابتک حل نہین ہوا۔ نبولی تحقیقات کے خلاف کوئی معقول اعتراض نہین ہو خواہ جسم اور نفس مین اتحاد ہو یا توازی یا بدل یا نظریہ علم کے نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ لاینحل قرار پائے ہر صورت مین یہ نظریہ کہ جسمانی اور نفسی زندگی ایکدوسرے کی پابند ہین، خالص علمی حیثیت سے قابلِ قبول ہو اور عملی پہلو سے بھی مثلاً طب مین اسے بہت اہمیت حاصل ہے۔ مظاہر کے اُن دو سلسلون مین کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہو لیکن یہ تعلق اسطرح کا ہرگز نہین ہے کہ ہم ایک کو دوسرے کی مدد سے سمجھ سکین[1]۔ ہم نہ نفس اور اُسکے وظائف کو جسم کے واسطہ سے سمجھ سکتے ہین اور نہ جسم کو ترکیب نفسی کے ذریعہ سے یقیناً ان دونون مین نظامِ منشا کے ماتحت ضرور معنوی تعلق ہوگا۔ لیکن یہ تعلق ہمارے ادراک سے ابھی تک باہر ہے۔

اب بھی علومِ فطرت کے محقق بے سمجھے معنوی اصطلاحات سے کام لیتے ہین۔ مثلاً وہ جانور کے جسم کی ساخت کی توجیہ اسطرح کرتے ہین کہ وہ اپنے ماحول سے "مطابقت" رکھتا ہو اور اُسکا "مقصد" بقائے نفس ہے۔ غالباً وہ آنکھ کی ساخت کو اُس وقت تک نہین سمجھ سکتے جبتک وہ خود اپنے مجموعی شعورِ زندگی کی مدد سے یہ پہلے سے نہ فرض کرلین کہ وہ دیکھنے کے لئے بنی ہو۔ اسی طرح وہ تمام اعضا کی "تفسیر" کرتے ہین جو جسم کی کوئی خدمت کرتے ہون۔ جو محقق منہاج کے بارہ مین بہت سخت ہین۔ انھون نے کوشش کی ہو کہ منشا اور مقصد کے ابواب سے کام نہ لین اور اُن کا نصب العین یہ ہو کہ تمام مظاہر کی توجیہ خالص طبعی نقطۂ نظر سے یعنی علت و معلول یا وظایف اعضا کے اصول کے ماتحت کرین۔ انہین علم الحیات والون کو جس حد تک کامیابی ہوئی اسکا فیصلہ وہ خود کرسکتے ہین۔ بظاہر تو یہ کامیابی کچھ زیادہ نہین معلوم ہوتی۔

نفسیات کو نظامِ منشا کا حوالہ دینے مین کوئی باک نہین۔ بلکہ وہ ذہنی نقطۂ نظر سے کوشش کرتی ہے کہ "قابل فہم" اور "بامنشا" مظاہر کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جائے۔ البتہ اُسے یہ کوشش کرنا چاہئے کہ ایسی درمیانی کڑیون کو ترک کرے جنمین عضویاتی رنگ ہو اور ایک بالکل مختلف نوع سے تعلق رکھتی ہین۔ مثلاً اگر یہ ثابت ہوجائے کہ دماغ مین جو ائتلافات کی رگین کہلاتی ہین وہ واقعی خیالات مین ائتلاف کی ناگزیر

[1] سمجھنا یہان مخصوص معنی مین استعمال ہوا ہو جسکی تفصیل پہلے کی جاچکی ہو۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱

بنیاد مین تو نفسیات کے نقطۂ نظر سے یہ محض ایک جسمانی نفسی واقعہ ہو کوئی "قابل فہم" بات نہین ہے۔ جس علم سے اس موضوع کو تعلق ہے وہ طبعیات نفسانی ہو۔ بخلاف اسکے خالص نفسیات یہ سمجھاتی ہو کہ ہزارہا ممکن ائتلافات مین سے کیون یہ ایک مخصوص ائتلافات میرے نفس مین واقع ہوا ہو۔ اب یہ ائتلافات محض ایک اتفاقی واقعہ نہین ہے، بلکہ ایک نتیجہ ہو جسکا معنوی سبب موجود ہو اور جو بجائے خود یا میرے نفس کے لئے کوئی اہمیت رکھتا ہو۔

ہمارے موضوع کلام کے لئے یہ مسئلہ بہت اہم ہے۔ نفسیات عنفوانِ شباب مین ابھی تک ترقی نہوئیکی یہی وجہ ہو کہ عموماً چند جدید تصانیف کو چھوڑ کر ہر کتاب مین یہ کوشش کیجاتی تھی کہ زمانۂ بلوغ کے نفسی تغیرات کی "تفسیر" جسمانی تغیرات کی نسبت سے کیجائی۔ قطع نظر اسکے کہ اسطرح سے جذبۂ شہوت پر اُس سے زیادہ زور دیا گیا جتنا خالص نفسی مشاہدات کی بنا پر دیا جانا چاہئے تھا۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ آخر یہان "تفسیر" سے مراد کیا ہو؟ کیا یہ کہدینے سے کہ فلان فلان غدود کا فعل قوی ہو جاتا ہو یا نہین ہوتا نفسیاتی حیثیت سے اُس عظیم الشان انقلاب کے سمجھنے مین جو بچہ کے جوان ہوتے وقت رونما ہوتا ہو۔ کسی طرح کی آسانی پیدا ہوتی ہو؟ یہ تفسیر اسی طرح کی ہو جیسے کوئی کہے کہ سقراط کے قید ہونیکا سبب یہ تھا کہ اُسکے پیرون کے اعصاب مین حرکت پیدا ہوئی جو اُسے قیدخانہ مین لے آئی۔

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ ہم اس قسم کی عضویاتی تحقیقات کو فضول یا بیکار نہین سمجھتے۔ یہ علم الاعضا کے لئے نہایت اہم چیز ہے اور نفسیات عضویاتی کے لئے بھی فائدہ سے خالی نہین۔ لیکن خالص نفسیات مین ہمین اس سے ذرا بھی مدد نہین ملتی۔ اکثر ماہرین نفسیات اسطرح کے سلسلۂ "علت و معلول" سے اپنے دلکو تسکین دے لیتے ہین۔ تھیوڈور ہین جنکی نفسیات شباب کے اصول اُس کوشش کے جو ہم کر رہے ہین بالکل برعکس ہین کہتا ہو: "سب سے پہلے ہمین یہ جان لینا چاہئے کہ وہ نفسی انقلاب جو ہمارا موضوع بحث ہو ہرگز محض شہوانی بلوغ کے عمل پر مبنی نہین ہو۔ بلکہ گہرے مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہو کہ عموماً نوجوان کی مخصوص نفسی زندگی مین بلوغ کی بیداری پیدا کرنیکے لئے تین اسباب کا جمع ہونا ضروری ہو۔ اوّل علم تشریح کے نقطۂ نظر سے مرکزی نظام اعصابی خصوصاً دماغ کی مزید نشو و نما دوسرے شہوانی غدودون کا پختہ ہو جانا تیسرے ماحول اور حالات زندگی کا انقلاب جو عموماً اسی عمر مین واقع ہوتا ہو اور جیسا ہر شخص

سمجھ سکتا ہی۔ اِن تینون عناصر مین باہم گوناگون تعلق اور تفاعل پایا جاتا ہی"۔

تیسری بات سے یہ ظاہر ہی کہ محض بیرونی عناصر کو ارتقا کا سبب قرار نہین دیا جا سکتا۔ کیونکہ یون بھی ہم دیکھتے ہین کہ کبھی کبھی یہ عناصر موجود نہین ہوتے لیکن نفسی ارتقا مین کوئی خلل واقع نہین ہوتا۔ ہماری سمجھ مین بالکل نہین آتا کہ شہوانی غدودون کی حرکت سے ہم نوجوان کے گہری احساس تنہائی یا اُسکی انتہا پسندی یا اُسکی کمال منی کی توجیہ اصول علت و معلول کے ماتحت کیسے کر سکتے ہین۔ ہمین ایمانداری سے صاف صاف کہدینا چاہیے کہ ہمارے پیش نظر دو واقعات ہین جو زمانہ کے اعتبار سے ایک حد تک (نہ کہ بالکل) ساتھ ساتھ رونما ہوتے ہین ایک جسمانی عضویاتی تغیر ترکیب اور ایک نفسی ذہنی تغیر ترکیب۔ دونون مین غالبًا کوئی نہ کوئی تعلق ہی مگر کیا تعلق ہی؟ یہ آجتک علم کے دائرہ سے باہر ہے۔

لیکن اگر ہم یہ کہین کہ اِس عمر مین اور تقریبًا ان جسمانی تغیرات کے ساتھ ہی ساتھ نوجوان کے شعور مین شہوانی ہیجان احساسات کی شکل مین پیدا ہوتا ہی (خواہ اسکا ظہور تخیل مین ہو یا ارادہ مین یا محض تفتیش وجستجو کی حیثیت سے)، تو صورتِ حال بالکل بدل جاتی ہی۔ یہ اِن احساسات سے جو یا تو بالکل نئے ہوتے ہین یا اگر پہلے سے موجود بھی ہون تو اب بہت قوی ہو جاتے ہین مجموعی نفسی کیفیت مین ایک انقلاب عظیم رونما ہونا بعید از قیاس نہین۔ ہم آگے چل کر ثابت کرینگے کہ یہ بات کلیۃً صحیح نہین ہی۔ یہ ضروری نہین کہ ارتقائے نفس کا عمل ہمیشہ شہوانی احساسات سے شروع ہو اور ان احساسات کو نئی ترکیب نفسی کا مرکز سمجھنا سخت غلطی ہی۔ پھر بھی اس قول کو تسلیم کر لینے سے کم سے کم نفسیات افہامی کا منہاج برقرار رہتا ہی اور اِس قانون کی خلاف ورزی نہین ہوتی کہ نفسیات کی بحث نفسیات ہی کے اُصول کے مطابق ہونا چاہیے۔ جو لوگ اسکے قائل ہین کہ شہوانی جذبات کو نفسی زندگی کا مرکز قرار دینے سے کسی طرح مفر نہین اُن کے لئے یہ راستہ کھلا ہی کہ وہ ماہرین تحلیل نفس[1] کی طرح جنکا منہاج خالص نفسیاتی ہی ان جذبات کا کھوج تحت شعوری نفسی زندگی مین لگائین لیکن اِس لاشعوری عمل کو جسے غدود کا فعل کہتے ہین خالص نفسیات کی بحث مین ٹھونسنا تو کسی طرح جائز نہین۔ کوئی شخص یہانتک کہ

[1] Psycho-anylists.

اڈورڈ سپہن بھی ان چیزون کو اُسوقت تک زبردستی کھینچکر نفسیات کی بحث مین نہین لاسکتا جبتک
اُسکے پیش نظر کوئی مافوق الطبعیاتی نظریہ ہو جسکا دار و مدار بھی نظام منشا پر ہی - اس نظریہ کے مُطابق
عہدِ شباب کا منشا اور مقصد محض قوتِ تناسل کی نشو و نما ہی نہ صرف آلات تناسل کے غدودون کا بلکہ
تمام غدودون کا کام یہ سمجھا جاتا ہی کہ وہ فطرت کے اس مقصد کو پورا کرین - بیشک ہم اپنے دلمین اسطرح کی
توجیہین کیا کرتے ہین جنسے جسم اور نفس کا اتحاد عمل فطرت کے واحد معنوی مقصد کے حاصل کرنے مین
ثابت ہو چنانچہ موجودہ بحث مین بھی ایک مافوق الافراد نقطۂ نظر سے "بلوغ کے منشا" کی طرف اشارہ
کیا گیا ہی لیکن نفسیات کو بجائے خود اس سے کوئی تعلق نہین - اُسکا کام یہ بتانا ہی کہ اس نفسی جسمانی
دائرہ مین جسے ہم عہد شباب کہتے ہین خود ہمارے نوجوان کو کیا محسوس ہوتا ہی اور کیونکر ہوتا ہی
اور اُسکے احساس مین کون کون سے مافوق الافراد نظام منشا موجود ہین - اسمین غدودون کی
کسی طرح گنجائش نہین - لوگ علم تشریح کے واقعات کو نفسی کیفیت کی تفسیر کے لئے پیش کرنے پر بہت
مصر ہین - یہ چیزین بجائے خود اہم بھی ہین اور دلچسپ بھی لیکن "سمجھنے" مین ان سے کسی طرح کی مدد نہین ملتی

اس موقعہ پر ہم پھر ایکبار یہ کہدینا چاہتے ہین کہ نفسیات انہامی بھی اسپر قادر نہین ہی کہ نفس
کی کل کیفیتون کو نظام منشا کی نسبت سے سمجھا سکے - اُسے بھی کبھی کبھی ایسے واقعات سے سابقہ پڑتا ہی جنکی
مزید تشریح نہین ہو سکتی لیکن یہ واقعات بھی جب احساس کے دائرہ مین آجائین تو انکا شمار نفسی زندگی کے بامنشا
اثر آفرین عناصر مین ہو سکتا ہی - ایک محض خارجی حادثہ مثلاً بجلی گرنا اصل مین ایک ایسا واقعہ ہی جسکی
توجیہ نظام منشا سے نہین بلکہ صرف علت و معلول کے ذریعہ سے ممکن ہی لیکن جب یہ واقعہ اور اُس کے
جسمانی نتائج ایکبار احساس بنجائین تو ان مین اور مجموعی نفسی زندگی مین باہم ایک بامنشا ربط کا علاقہ
قائم ہو جاتا ہی - اس صورت مین مثلاً ہم یہ سمجھ سکتے ہین کہ جو شخص لنجا ہو گیا اُسکی زندگی اور اُسکا طرز عمل
بالکل بدل جاتا ہی اُسکے ارادون اور اُسکے خیالات مین بہت بڑا تغیر ہو جاتا ہی - ان سب چیزون کو ہم اپنی
احساسات کے ذریعہ سے سمجھتے ہین نہ کہ اس بات سے کہ اُسکے دماغ سے خون بہگیا ہی - اسی طرح نوجوان
کے نفس کو ہم تولید منی کے واسطہ سے کسی طرح نہین سمجھ سکتے -

بعض صورتون مین خصوصاً تاریخی پہلو مین "واقعات" کا عنصر اس حد تک غالب ہوتا ہی کہ نفسیات شباب کے
کلی اصولون کا امکان معرض شبہ مین آجاتا ہی۔

اگر ہم نوجوان کو محض ایک طبیعی مخلوق بھی سمجھین تب بھی ہمین مختلف افراد کی فطری خصوصیتونکو
مدنظر رکھنا پڑیگا مثلاً نسل اور خاندان کی اصلی اور فطری سیرت یا وہ محسوس ماحول جسکا اثر نفسی زندگی پر بھی
پڑتا ہی منطقہ معتدلہ کے نوجوان کا فطری ماحول جسمین وہ رہتا ہی اور نشو ونما پاتا ہی منطقہ حارہ مین رہنے والے
نوجوان کے ماحول سے بالکل مختلف ہوتا ہی اور اسی طرح زمین اور آب ہوا کے خفیف تغیر سے بھی کسی نہ کسی
حد تک فرق پڑتا ہی۔ لیکن اس ماحول مین جسکا اثر نوجوان پر پڑتا ہی محض فطرت ہی نہین بلکہ ذہن رکھنے
والے مخلوق کے لئے ذہن خارجی بھی شامل ہی۔ یہ ذہن خارجی ایک تاریخی اجتماعی چیز ہے جو واقعی وجود
رکھتی ہی اور فطرت کی زمین مین پھلتی پھولتی ہی۔ اسمین بھی عام قوانین نیز کسب عام قوانین نشا اور عمل انسانی کو آگے
دکھانیوالے احکام واوامر موجود ہین۔ اس عام دائرہ کے اندر ہر تاریخی تہذیب اپنی خصوصیات رکھتی ہی
اسمین ایک "واقعاتی" عنصر ہی جسے ہم محض عام قوانین کی مدد سے نہین سمجھ سکتے بلکہ اسکا سمجھنا صرف
تاریخ اور اخبار تمدن کے ذریعہ سے ممکن ہی زیادہ وضاحت کیساتھ ہم یون کہ سکتے ہین کہ نوجوان کی
ارتقا کا ماحول مطلق ذہن خارجی نہین ہوتا بلکہ کوئی خاص ذہن کوئی خاص تہذیب کوئی خاص سماج
غالباً یہ خصوصیات جو اس تہذیب کو جسمین ہمارا نوجوان رہتا ہی دوسری تہذیبون سے الگ کرتی ہین
خود اسکے نفس مین پہلے سے شخصی رجحانات کی شکل مین مضمر ہوتی ہین۔ بہر صورت سبب کچھ بھی ہو مگر
اس واقعہ سے انکار نہین ہو سکتا کہ پہلے ہی دن سے یہ ذہن خارجی نوجوان کے لئے فضائے حیات
بنجاتا ہی جسمین وہ سانس لیتا ہی اگرچہ اصل مین وہ اسمین احساساً اور عملاً شریک اسی وقت ہوتا ہی جب بالغ
ہوجائے بلکہ خود وہ فلسفی اور ماہر نفسیات جسکا مقصد نوجوان کی نفسی کیفیات کا علم حاصل کرنا ہی
اپنی قوم اور اپنے زمانہ کی فضا سے ایسا گھرا ہوا ہی کہ اسکا تاریخی اور تمدنی احساس کتنا ہی وسیع
کیون نہو جائے وہ ان قیود سے آزاد نہین ہو سکتا۔ جس ماحول مین ہم سب رہتے ہین وہ مطلق ذہن
خارجی نہین ہی بلکہ اسکا ایک خاص ارتقائی درجہ اور ایک خاص قومی صورت اسی عام ذہنی فضا کے

آغوش مین جسمین سچی قدرین بھی ہین اور نقائص بھی ہم زندگی بسر کرتے ہین۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے لئے عام اور عالمگیر نفسیاتِ شباب لکھنے کی کوشش بالکل بیکار ہے۔ اگر اس کوشش مین کامیابی ممکن بھی ہو تو اُسکے لئے یہ شرط ہے کہ مختلف ملکون اور مختلف زمانون کے نوجوانونکو مشاہدہ اور اُنمین آپسمین مقابلہ کیا جائے تاکہ ایک مثال اوسط یا مثالِ عینی قائم ہوسکے۔ ہمارے پیش نظر صرف یہ مقصد ہے کہ اُن جرمن نوجوانون کی نفسی زندگی کا مشاہدہ کرین جنکا عہد زندگی موجودہ زمانہ یعنی وہ ذہنی دور ہے جو نئی روشنی کی بنیاد پر قائم ہے اور ایک طرف جرمنی کے فلسفہ عینیت اور دوسری طرف انگلستان اور فرانس کی ثبوتیت سے متاثر ہوچکا ہے۔ یعنی ہم اُنیسوین اور بیسوین صدی کے لوگون کی نفسی کیفیت کو ایک مثال کی حیثیت سے سمجھنا چاہتے ہین کیونکہ تخصیص مین اسقدر مبالغہ کرنا جائز نہین کہ ہم عین اپنے زمانہ یعنی جنگ عظیم اور انقلاب جرمنی کے عہد کے نوجوانونکی تصویر کھینچنے پر اکتفا کرتے۔ اگر ہمارا مقصد یہ ہوتا تو ہم جدید تحریک شباب کی ایک تصویر پیش کرتے اور اسمین ایک مثالی نوجوان کی شلًا "آزاد جرمن جماعت" کے ایک رکن کی سیرت کے خط و خال کو نمایان کرتے۔ یہ ایک نہایت محدود کام ہوتا اور صورت حالات کے بدلنے سے بہت جلد بیکار ہو جاتا اسلئے ہم اُس حد تک ایک عام مثال قائم کرنے کی کوشش کرتے ہین جتنا پچھلے ڈیڑھ سو سال کی تاریخ کے مطالعہ کی بنا پر ممکن ہے۔ ان مین سے اکثر باتین انگلستان فرانس اور امریکہ کے نوجوان پر بھی راست آتی ہین مگر سب نہین (خود ہمارے ہی ملک مین) یہودی نوجوان عام نوجوانون سے بہت مختلف نفسی خصوصیات رکھتے ہین اور روسیون کے نفس کے مشاہدہ مین باوجود ظاہری مشابہت کے ہم سب کو بیحد اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

اس دائرہ کے اندر معاشرتی حیثیت اور تعلیم کے فرق کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس معاملہ مین بھی ہم یہ ظاہر کردینا مناسب سمجھتے ہین کہ ہمارے پیش نظر اصل مین تعلیم یافتہ جرمن نوجوان ہین جنکے لئے ہم شہری شرفا کا لفظ استعمال کرتے، اگر اُسنے موجودہ زمانہ مین فرقہ وارانہ سیاسی رنگ اختیار کرلیا ہوتا۔ آجکل جرمنی مین مزدور پیشہ جماعت کے نوجوانون اور "شریف" طبقہ کے نوجوانون کی نفسی ترکیب مین کچھ زیادہ فرق نہین بلکہ شہر اور دیہات کے نوجوانون مین اس سے کہین زیادہ فرق ہے۔ باوجود اسکے ہم اپنے مطالعہ کا

موضوع تعلیمیافتہ نوجوانون کو اسلئے قرار دیتے ہین کہ شہر کے نوجوانون کی مشترک نفسی صفات انہین زیادہ نمایان ہوتی ہین خصوصاً اسلئے کہ تعلیم یافتہ خاندانون مین نوجوانون کے اندرونی عمل بلوغ کے راستہ مین ماحول کے اثرات بہت کم حائل ہوتے ہین معاشرتی حیثیت کی وجہ سے جو فرق پیدا ہوتا ہی اُسکا ذکر ہم تفصیل سے کرینگے۔

آخر مین یہ بحث رہجاتی ہی کہ "عنفوانِ شباب" کس عمر تک کے زمانہ کو کہتے ہین۔ اس معاملہ مین بھی ہمین عضویاتی علامات نہین بلکہ نفسیاتی علامات کی تلاش کرنا چاہیے۔ اصل چیز یہ علامات ہین نہ کہ سالہائے عمر کی تعداد جو محض ناکمل قیاس پر مبنی اوسط کی شکل مین بتائی جا سکتی ہے نفسی بلوغ کا آغاز کبھی کبھی دفعتہً ہوتا ہی لیکن عموماً بتدریج زمانۂ قبل بلوغ کا اختتام اور شباب کا آغاز اتنی خاموشی سے ہوتا ہی کہ باہر سے دیکھنے والے کو اسکی خبر اسوقت ہوتی ہی جب اس کے ساتھ خارجی حیثیت او اعمالِ زندگی مین بھی تغیر ہو جائے اگر سطحی طور سے اور عوام کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو بلوغ کی علامت یہ ہی کہ طبیعت مین سکون پیدا ہو جائے اور اسکے بعد نہ نفسی شدید انقلابات کی صلاحیت باقی رہے نہ مزید نفسی ترقی کے امکانات لطیف تر اور باریک تر علامات کے بتانیکے لیے بہت زیادہ تفصیل کی ضرورت ہی۔

شارلوٹے بوہلر نے ای۔ شپرین۔ کی تقلید مین زمانۂ قبل بلوغ یا عنفوانِ شباب کو دو حصون مین تقسیم کیا ہی۔ پہلے زمانہ کو زمانۂ بلوغ اور دوسرے کو سن رشد کہتی ہی اور ان دونون کی درمیانی حد فاصل سترہ برس کی عمر کو قرار دیتی ہی۔ ہم اس سے ناواقف نہین ہین کہ عنفوانِ شباب کے ابتدائی اور انتہائی زمانہ مین باہم نمایان فرق ہی۔ لیکن ہمین اسمین شبہ ہی کہ ہماری نفسیاتی معلومات اس حد تک پہونچگئی ہی کہ ہم تغیر ترکیب کے ان باریک فرقون کا عام قانون دریافت کرنا تو در کنار ان کی "مثالی" سمت قائم کر سکین۔ یہ قول کہ پہلا حصہ "نفی" کا زمانہ ہی اور دوسرے حصہ مین "اثبات" کا آغاز ہو جاتا ہے عام طور پر صحیح نہین ہی۔ مجھے ایسی صورتین معلوم ہین جنمین ارتقائے نفسی کی ترتیب اس کے بالکل برعکس تھی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ان صورتون کو "غیر معمولی" سمجھا جائے۔ مذہبی احساس کی ارتقا کے مدارج جنکا ہم آگے ذکر کرینگے، آبائی روایات کو اختیار کرنے کی کوشش انکا ترک اور از سر نو ایک مذہبی عقیدہ کی

تقسیم بھی محض اس بنا پر قائم کئے گئے ہین کہ اکثر یہی ترتیب دیکھنے مین آتی ہی۔ عہد نوجوانی کے ان دونون حصّون کے اور بھی عنوان قرار دیے جاسکتے ہین مثلاً انتشار اور اجتماع یا داخلیت کا غلبہ اور عالم خارجی کی طرف رجوع یا بچپن سے نکلنا اور بلوغ مین داخل ہونا لیکن اسکا بھی وہی حال ہی جو تاریخی عہدون کے عنوانات کا یہ عنوان کبھی نفس امر پر پوری طرح حاوی نہین ہوتے بلکہ محض کسی خاص شخص کے نقطۂ نظر کو ظاہر کرتے ہین۔ کم سے کم ہمارے لئے ابھی یہ کوشش کرنا قبل از وقت ہی۔ ابھی ہمین محض اسپر قناعت کرنا پڑیگی کہ نفس کی جزوی ترکیبون کے خط ارتقا کے دو حصّے قرار دین جنمین سے ایک پہلے ہوتا ہی اور ایک اسکے بعد۔

اصل مین یہ ساری کتاب ایک کوشش ایک آغاز سے زیادہ وقعت نہین رکھتی۔ جہان تک ہمین معلوم ہوتا ہی ابتک کسی نے انسانی عمر کے کسی دور کی مجموعی نفسی کیفیت کے بیان کرنیکی کوشش نہین کی ہی۔ بسمر نے عہدِ کہولت کے متعلق جو کچھ لکھا ہی وہ زیادہ تر فلسفیانہ تسکین طبع کی خواہش پر مبنی ہی۔ لیکن ہم حتی الامکان اپنے بیان مین اخلاقی اور تعلیمی پہلو سے قطع نظر کرینگے تاکہ خالص نفسیاتی نظر کر ہم ذہن فطرت کے اُس مخصوص مظہر یعنی نوجوان کے نفس کا اس حالت مین مشاہدہ کرسکین جب اسکی فطری صورت جو وہ آگے چلکر حاصل کریگا نشو ونما پا رہی ہو۔

باب دوم

عنفوانِ شباب کی مجموعی نفسی سیرت

اگر ہم لفظ "سیرت" سے سانچے مین ڈھلی ہوئی نفسی زندگی" مراد لین تو ہم یہ کہہ سکتے ہین کہ عنفوانِ شباب کی مجموعی سیرت یہ ہو کہ انسان کوئی سیرت نہ رکھتا ہو۔ واقعی عمر کے اس حصہ مین اور تمام حصون سے زیادہ ایک عمل تغیر ایک مانہ انقلاب کی شان پائی جاتی ہو جسمین کسی "مستقل" حالت" کا تعین نہین ہو سکتا۔ اگر نفسی پہلو سے دیکھا جائے تو یہ عمل کم سے کم موجودہ زمانہ مین جتنا ہم سمجھتے ہین اُس سے کہین زیادہ طویل ہو۔ سال و ماہ کی کوئی تعداد جسکا عام اطلاق ہو سکے نہین بتائی جا سکتی۔ البتہ ایک مثال[a] قائم کرنیکے لئے ہم شمالی جرمنی کے بڑے شہرون کی تعلیمیافتہ آبادی مین ارتقائے نفسی کا زمانہ لڑکیون کے لئے ۱۳ سے لیکر ۱۹ برس کی عمر تک اور لڑکون کے لئے ۱۴ سے لیکر ۲۲ برس کی عمر تک مقرر کرتے ہین۔

چونکہ ہم نفسی زندگی کے جزویات کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ اس بات پر مجبور ہین کہ انھین "کل" کی نسبت سے دیکھین اسلیے ضروری ہو کہ ہم ابتدا ہی مین عہدِ شباب کی مجموعی سیرت کو بیان کر دین اس بیان کا مقصد یہ ہو کہ ہم نظامِ نفسی مین اُس نقطہ کو تلاش کرین جہان سے عہدِ شباب کے واردات اور اعمال کی خصوصیات دیکھی اور سمجھی جا سکین۔ اس غرض کے لئے یہ مفید ہوگا کہ ہم ابتدا مین عہدِ طفلی کے مجموعی طرزِ زندگی اور عنفوانِ شباب کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کر دین۔

البتہ جہان ہم چاہتے ہین کہ بچہ کی مجموعی طرزِ زندگی کو معروف سمجھ کر نظرانداز کر جائین وہان موجودہ علم النفس ہماری بالکل مدد نہین کرتا۔ واقعہ یہ ہو کہ یہ موضوع اس سے بھی زیادہ غیرمعروف ہے جس سے ہم اس کتاب مین بحث کرنا چاہتے ہین اسلیئے ہمین چاہئے کہ چند سرسری طور پر کھینچے ہوئے

Type [a]

[b] ہندوستان مین یہ زمانہ ایک دو برس پہلے شروع ہوتا ہے۔

خطوط مین نفسیات طفلی کا ایک خاکہ پیش کر دین۔

ہمین رفتہ رفتہ بچہ کے تصور، خیال، احساس، اور ارادہ کے متعلق جزوی معلومات بڑھانے سے اُسوقت تک بہت کم فائدہ ہوتا ہی جبتک ان مظاہر پر زندہ اور نامی کل یعنی بچہ کی مجموعی زندگی کی نسبت سے غور نہ کر لیا گیا ہو لیکن معدودے چند مضامین سے قطع نظر کر کے آجکل کی نفسیات طفلی مین یہ انداز خیال مفقود ہی چونکہ بچّہ کی اندرونی ترکیب نفسی پر نظر ڈالنا ہمارے لئے بہت دشوار ہی اسلئے ہم محض اُسی پہلو کا ذکر کرینگے جو سب سے زیادہ نمایان ہی یعنی بچہ کا تعلق اُس چیز سے جسے "وہ واقعہ" سمجھتا ہی۔ بہ خلاف نظریہ علم کے نفسیات کے ہر شعبے مین یہ اصول موضوعہ ہونا چاہیے کہ نفس مدرک کے لئے "واقعیت" ہمیشہ ایک نہین ہوتی بلکہ اسمین ہر شخص کے نظام نفسی کے لحاظ سے اور اسکے ارتقائے ذہنی کے مدارج کے لحاظ سے اختلاف ہوتا ہی۔ سب سے پہلے ہمین اس اصول کو تسلیم کرنا چاہئیے کہ بچہ ہماری دُنیا مین نہین بلکہ دوسری دنیا مین رہتا ہی۔

ہمپر یہ امر اُسوقت بہت واضح ہو جاتا ہی جب عہد طفلی کے وسطی حصّہ یعنی اندازاً تین برس سے سات برس تک کی عمر کو پیش نظر رکھین۔ ہم کہا کرتے ہین انسانی نشو و نما کے اس درجہ (بچپن) کی خصوصیت ایک خاص طور پر پرجوش تخیل ہی جو اپنے ماحول مین ہر ایک چیز مین ڈوب جاتا ہی اور اُسی انسانون کی طرح ذی روح سمجھتا ہی۔ یہ نفسی تصویر اسلیے غلط ہی کہ لفظ تخیل ہمارے لیے ایک خاص معنی رکھتا ہے جو بچہ کے نفسی تجربہ مین موجود نہین ہوتے یعنی تخیل کا "واقعہ" سے مختلف ہونا اُسکا خواب سا ہونا اور قابل اعتماد نہونا۔ لیکن بچہ کی زندگی مین جسے ہم غلطی سے تخیل کی زندگی کہتے ہین سب سے بڑی بات یہی ہی کہ اُسمین یہ تفریق نہین ہوتی جو ہمین تخیل معلوم ہوتا ہی وہ بچہ کے لیے "واقعہ" کی قدر رکھتا ہے اور اسکے لیے اُسی قدر اہم ہی جتنی ہمارے لئے ہماری واقعیت ہی (جسکے جانچنے کے متعدد اور مختلف معیار ہین اور جسکے ادراک مین ہم ایک حد تک من مانے اُصولون سے کام لیتے ہین)۔ جہان بچہ کے لئے تخیل اور واقعہ کا وہ فرق مفقود ہی جسے ہم اپنی دُنیا سے بچہ کے نفسی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے ناگزیر طور پر محسوس کرتے ہین وہان بچہ کے تخیل کو ہم بڑون کے "دوئی آسا" تخیل کے مقابلہ مین "وحدت آسا"

تخیل یا خدا پرست تخیل کے مقابلہ مین بھولا تخیل کہہ سکتے ہین۔ اُس زمانہ مین جسکا ہم یہاں ذکر کررہے ہین۔ بچہ کی ساری باطنی زندگی ہنوز اپنے ماحول کے اشخاص و اشیا مین جو اسکے پیش نظر ہوتے ہین محو ہوتی ہے وہ ابتک اپنے آپکو شعوری حیثیت سے اُن کے مقابلہ مین لطور ایک مستقل ہستی کے نہین دیکھتا خواہ اسمین اُسے ساعت بساعت ذلت نفس کا غم برداشت کرنا پڑے لیکن یہ غم ہنوز غم روزگار نہین ہے۔ اپنی نفسی دُنیا دوسرونکی نفسی دنیا اور غیر ذی روح دنیا ابھی ایک دوسرے سے جُدا نہین۔

لیکن یہ الفاظ بچہ کی خصوصیت کو پوری صحت کیساتھ ادا نہین کرتے۔ ان مین مبالغہ سے کام لیا گیا ہے تاکہ جو سب سے اہم پہلو ہے وہ اچھی طرح نمایاں ہو جائے ورنہ حقیقت مین بچہ کی زندگی ایسی وحدت آسا نہین کہ وہ اپنے ماحول کے اُس حصّہ مین جو اُسکے لئے اہم ہے بالکل ہی گم ہو جائے۔ بچہ کو بھی ابتدا سے ایک تضاد کا احساس ہوتا ہے یعنی اُس تضاد کا جو اُسکے بھولے، ہر شے کو جاندار سمجھنے والے جبلی تخیل مین اور عالم کے نام نہاد "واقعی" حالات مین یا اُسکی دُنیا مین اور بڑونکی دنیا کی قواعد و قوانین مین ہوتا ہے جو طرح طرح سے اُسکی زندگی مین دخل دیا کرتے ہین۔ اور یہ بھی صحیح نہین کہ بچہ کو اس دوسری دُنیا کے احساس سے محض تکلیف یا نفرت ہوتی ہے بلکہ وہ ہمیشہ اس دنیا کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور روز بروز اُس سے قریب ہوتا جاتا ہے مختصر یہ کہ اس احساس تضاد سے جسے ہم دلمین رکھتے ہوئے بچونکی دُنیا کی سیر کرتے ہین اور جو جذبات پرست ہونیکے سبب سے ہمین اُنکی نفسی کیفیات کا صحیح اندازہ نہین ہونے دیتا، ملتی جلتی ایک چیز خود بچہ کے دلمین بھی ہوتی ہے البتہ اتنا فرق ہے کہ بچہ کو تضاد کا احساس دوسرے پہلو سے ہوتا ہے اور وہ رومانی جذبات کے ماتحت ماضی کی یاد مین سر نہین دھنتا بلکہ نئی چیزون کے دریافت کرنیکے شوق مین مستقبل کیطرف قدم بڑھاتا ہے اور سچ پوچھئے تو یہ ہے بھی فطری بات۔ اگر مین اپنے مکان مین کھڑا ہو کر جنگلہ کے اُسطرف ہمسایہ کے وسیع باغ کو دیکھون تو ظاہر ہے کہ مین اُسکی ملک کو کسی اور نظر سے دیکھون گا، اور اگر وہ میرے غریب خانہ کی طرف جھانکے تو اُسکی کچھ اور نظر ہوگی۔

ہم جب بچون کی دنیا کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہین تو جلد وہ حد آجاتی ہے جسکے آگے انکی ساخت ہم سے بالکل مختلف ہی ہوتی ہو انکی ذہنی کیفیت ہم "سمجھ" تو سکتے ہین لیکن خود ہمارے قلب مین وہ کیفیت موجود نہین ہوتی۔ اس رنگ مین بالکل ڈوب جانا ہمارے لئے ناممکن ہو کیونکہ بقول ہولڈرلین کے ہمارے نفس مین ضرورت سے زیادہ پختگی آگئی ہو۔

اگر ہم اس مسئلہ پر مزید بحث کرتے تو مندرجۂ بالا حدود کے اندر اس بات کی تحقیق ضروری تھی کہ بچہ موجودات کا ادراک کرتے وقت اپنے آس پاس کی چیزون مین سے (جسے سائنس ہر مدرک کے لئے یکسان بنانیکی کوشش کرتی ہو) کن چیزون کو چنتا ہو۔ ہر ماحول اسطرح کے انتخاب سے بنتا ہو جو قدری نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ بچہ کی دنیا مین بہت سی ایسی چیزین وجود اور اہمیت رکھتی ہین جو ہمارے نزدیک معدوم یا فضول ہین اسی طرح بچہ کی نظر مین بہت سی ایسی چیزین معدوم ہین جنکا ہمارے خیال مین اُسے صریحاً ادراک ہوتا ہو۔ مگر ہمین نفسیات طفلی کی تفصیلی بحث کرنے کا حق نہین۔ ہم صرف چند باتون کا ذکر کرین گے جو خاص طور پر اہم ہین۔

موجودات کی اُن "عام صورتون"[1] سے جو کانٹ کے خیال مین ہر مدرک کے لئے "مظاہر" کے ادراک کی بنیاد ہین یعنی زمان و مکان سے بچہ کے تعلقات ویسے نہین ہوتے جیسے ہمارے بلکہ بالکل مختلف قسم کے ہوتے ہین۔ ہمین نہین معلوم کہ اُسکے تصور مین مکان نامحدود ہوتا ہو یا نہین لیکن اسمین کوئی شبہ نہین کہ بچہ بھولے بھالے جنگلی لوگون سے بھی بڑھکر اسکا قائل ہے کہ مکان کی دو فضائین ہوتی ہین ایک تو وہ جانی بوجھی مرکزی فضا جو خود اُس کے گرد ہوتی ہو اور جسکی اشیاء مین شبہہ کی گنجائش نہین اور دوسری وہ عظیم الشان فضا جسمین تخیل حسب دلخواہ اشیاء کا وجود فرض کرلیتا ہے بچہ اُس مرکزی فضا کی بڑی گہری چھان بین کرتا ہو۔ اس فضا کا چپہ چپہ دیکھا بھالا ہوتا ہو اور بچہ کے نفس سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہو۔ عمر بھر ہمین کسی مکان سے اتنی گہری واقفیت

[1] صورت علمیاتی اصطلاح ہو۔ جو چیزین خارج مین موجود ہین انکا حس علم یا ادراک کا مادہ کہلاتا ہو اور جو تصرف مدرک کا ذہن اس حس مین کرتا ہو اُسے صورت کہتے ہین۔

نہین ہوتی جتنی بچپن مین اپنے گھر کے ایک ایک کونے سے ہوتی ہی جسمین ہم "تحقیق واکتشاف" کی غرض سے "سیاحت" کیا کرتے تھے۔ اسکی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہی کہ بچپن مین باربار تبدیل مکان کرنیسے نفسی نشوونما قبل ازوقت ہوجاتی ہی لیکن گہری نہین بلکہ سطحی ہوتی ہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہی بچہ کو جلد جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے مین زندگی کے ضروری اور مضبوط رشتے وقت سے پہلے ٹوٹ جاتے ہین۔

اسی سے کچھ مختلف اور کچھ مشابہ بچہ مین زمانہ کا احساس ہوتا ہی اُسکے ذہن مین زمانہ کا تصوّر ابتک یہ نہین ہوتا کہ وہ خود اُسکے نفس اور کل موجودات کی مربوط اور ناگزیر حرکت کا نام ہی جو ایک خطِ مستقیم مین واقع ہوتی ہی جسمین سے ایک نقطہ بھی گذرنیکے بعد لوٹ کر نہین آتا اور جو (کم سے کم ذی روح مدرک کیلئے) ایک دن دفعتاً ٹوٹ کر عرصۂ ظلمات مین غائب ہوجائے گا۔ بلکہ وہ زمانہ کو لمحات کی ایک غیر مربوط اور نامحدود توالی[1] سمجھتا ہی جنمین سے ہر ایک کا وہ اس قدر گہرا مزا لیتا ہی کہ اُسکے گذرنے اور پھر لوٹ کر نہ آنیکا احساس تقریبًا بالکل جاتا رہتا ہی۔ اگر دفعتاً زمانہ کا احساس بچہ کے دلمین بدل جائے تو یہی ایک فوق الطبعی واردات[2] اس بات کی علامت ہوسکتی ہی کہ بچپن کا زمانہ ختم ہوچکا اور نفس بیدار ہوگیا۔ کیونکہ جیسا ہم آگے چل کر دیکھین گے لڑکپن سے جوانی مین قدم رکھنا اکثر اس طرح واقع ہوتا ہی جیسے دفعتاً زمین پھٹ جائے اور اوپر کی تہ ٹھکر نیچے سے زیادہ گہری تہ نمودار ہوجائے اسکی سب سے مؤثر مثال ہمین اڈولف اشٹار کی "نوجوانی کی یاد" مین ملتی ہی۔ اُسکی ماں کی موت اُسکے غنچۂ نفس کی گریبان چاکی کی محرک ہوئی۔ "وہ چیزین جنھین وہ پہلے صدہا مرتبہ دیکھ چکا تھا اب اُسے اور ہی رنگ مین نظر آئین اگرچہ خود اُن مین کوئی تغیر نہین ہوا تھا۔" لوگون کو سُن کر تعجب ہوگا کہ میرے دلمین کبھی یہ خیال نہین گذرا تھا کہ ہمارے ماں باپ بھی مرجایا کرتے ہین۔ اب دفعتاً میرے دلمین یہ خیال اور اسی کے ساتھ دُنیا کی سب چیزون کے فانی ہونیکا

[1] یکے بعد دیگرے ہونا۔

[2] یہان بطور فلسفیانہ اصطلاح کے وارداتِ قلب کے معنی مین استعمال ہوا ہی۔ جرمن لفظ Erlebnis کا ترجمہ ہی۔

احساس پیدا ہوگیا۔ اسوقت سے میرے قلب پر جس چیز کا ہجوم تھا اُسے خوف اور وحشت نہین کہہ سکتے بلکہ وہ کوئی اور ہی روح فرسا کیفیت تھی جسے مین آجتک پوری طرح دلسے دور نہین کرسکا ہون یہ کیفیت پہلی بار اُس موقع پر ظاہر ہوئی جب ہم لوگ والدہ کے انتقال کے کئی مہینے بعد دوبارہ سیر کرنے --------- جارہے تھے جسکی مجھے بہت آرزو تھی۔ جب ہم ایک ناشپاتی کے بڑے درخت کے قریب سے گذر رہے تھے جہان سے ہماری منزلِ مقصود آدھی دور رہگئی تھی دفعتاً میرے دلسے یہ صدا آئی "آج شام کو تو واپسی مین اسی درخت کے پاس سے گذریگا اور اُسوقت ساری خوشی ختم ہوچکی ہوگی"۔

"میرے دلسے زمانیکے نامحدود ہونیکا احساس جاتا رہا تھا جسپر بچپن اور نوجوانی کی خوشی کا انحصار ہے۔ میری نوجوانی ختم ہوچکی تھی"۔ صحیح الفاظ مین یون کہنا چاہیے کہ اُسکا بچپن ختم ہوچکا تھا اور نفسی نقطۂ نظر سے اب اُسنے نوجوانی کی حدود مین قدم رکھا تھا۔ اُسکے احساس مین اب بھولاپن نہین رہا تھا اُسکی نفس مین وہ جذبات پرستی بیدار ہوگئی تھی جس کی ماہیت پر ہم اس کتاب مین غور کرنا چاہتے ہین۔

جس طرح زمان و مکان کے طول سے کہین زیادہ بچہ کو اُنکی گہرائی اور نامحدود ہونیکا احساس ہوتا ہے اُسی طرح اُسکی نظر مین جو تصویر دُنیا و مافیہا کی ہوتی ہے وہ نوجوانون کی دُنیا سے بالکل مختلف ہے۔ قوانین فطرت سے اُسے ابھی اتنی بھی واقفیت نہین جتنی عوام کو تجربہ کے ذریعہ ہوجاتی ہے خود اپنی امیدوسرون کی طاقت کا بالکل اندازہ نہین ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ مین نے ایکبار ۷ سال کی عمر مین سنجیدگی سے یہ قصد کیا تھا کہ جب ہم لوگ حسب معمول آیندہ گرمیون مین بحیرۂ بالٹک کے ساحل پر جائینگے تو مین ریت کا ایک جہاز قدآدم بناؤن گا جسمین سچ مچ کے کمرے اور زینے ہونگے لیکن جہان تک یاد ہے مجھے اس ارادہ کے پورا نہ ہوسکنے کا کچھ زیادہ افسوس نہین ہوا۔ علاوہ اسکے بچون کو اپنے آس پاس کے لوگون کی نفسی زندگی کے اُس پہلو کے سوا جو خصوصیت کیساتھ اُنکی ننھی سی جان کی طرف (جو گویا دُنیا کا مرکز ہے) مائل ہو کسی اور پہلو سے مطلق سروکار نہین

ہوتا۔ وہ سیدھا سادھا فلسفۂ جذبات اور وہ محرکات جن سے بچہ اپنا کام چلا لیتا ہے۔ شارلوٹے بوہلر کی کتاب "کہانیاں اور بچہ کا تخیل" مین بیان کئے گئے ہین۔ خود اپنے نفس کے متعلق بچہ اس سے بھی کم غور کرتا ہے بجز اس صورت کے کہ تصوف کے ماحول نے اُسپر خاص کرکے یہ اثر ڈالا ہو یا تربیت کے ذریعہ قبل از وقت مصنوعی طریقہ سے وہ غور و فکر پر مجبور کیا گیا ہو۔

ہمنے ابتک بالقصد صرف بچپن کے وسطی حصہ کی نفسی زندگی کا ذکر کیا ہے تاکہ نوجوانی کی زیادہ گہرا تقابل ہو سکے لیکن عمر کے ان دونون حصون کے درمیان تخمیناً ۸ سے ۱۲ برس کی عمر تک ایک ایسا زمانہ ہوتا ہے جسکی بنیادی خصوصیات بالکل مختلف ہوتی ہین اور جسکے متعلق نفسیات کی تحقیق ابتک تقریباً صفر ہے۔

ذرا ایک لڑکے کی زندگی پر غور کیجئے۔ اس عمر کی خصوصیت عموماً ایک طرح کی طفلانہ واقعیت پسندی ہوتی ہے جسکا رجحان خارجی دنیا کی طرف ہوتا ہے۔ اسکی بنیاد جسمانی زندگی کا ایک قوی احساس ہے۔ طفلانہ زندگی کی جو ضروریات ہین اُن سے اس عمر مین نظام نفسی بڑی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ اس سے اعتماد اور یقین پیدا ہوتا ہے جو برابر آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے۔ علاوہ اسکے لڑکو نمین اتنی فاضل قوت بچ رہتی ہے کہ اسکا طرح طرح کی شرارتونکی صورت مین ظاہر ہونا ضروری ہے بخلاف نوجوان کے جو ہمیشہ حیص بیص مین رہتا ہے لڑکا اپنے آپ پر اعتماد رکھتا ہے۔ اور غیرون سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اسکے ادراک عالم مین اشیا کو ذہنی رنج سمجھنے کا عنصر بہت کم ہوتا ہے۔ یا کسی حد تک اُس چیز مین تبدیل ہوجاتا ہے جو اصلی معنی مین تخیل ہے۔ یعنی واقعی اشیا کو حسب بخواہ کسی رنگ مین رنگ دینا یہ تخیل اب بیجان چیزون (کھلونون) مین مشغول رہنے کے مقابلہ مین ہمسن لڑکون کے ساتھ کھیلنے مین زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان نئے کھیلون مین جو واقعیت پسندی لڑکے دکھاتے ہین اُسکا اظہار اس طرح کے فقرون سے ہوتا ہے: "واہ۔ یہ کھیل کہین ایسے کھیلا جاتا ہے"۔ یعنی اب تخیل خود ساختہ قاعدون کا زیادہ پابند ہوجاتا ہے۔ قطع نظر اسکے توجہ زیادہ تر خارجی چیزون کی طرف ہوتی ہے۔ خارجی عالم کے متعلق اب لڑکا جان بوجھکر سوال کرتا ہے اور ہر بات کا کھوج لگاتا ہے اس عمر کی ایک اور خصوصیت منطقی دلچسپی کا بیدار ہونا ہے۔ وہ بچے بھی جنمین اسکی صلاحیت نہین ہوتی اس عمر مین کاغذ کی ناؤ اور ریت سے

مکان بنا کرتے ہیں۔ انسان اپنی نشو ونما کی اس منزل میں واقفیت پسند ہو جاتا ہے۔ لیکن اسکے نزدیک واقفیت صرف اُن چیزوں تک محدود ہے جو اسکی طفلانہ دنیا میں موجود ہیں یا اُس سے واسطہ رکھتی ہیں۔ اب گویا بچپن اپنی "پختگی" کو پہونچگیا ہے جہاں تک موجودہ زندگی کا تعلق ہے تمام قوتوں میں صحیح توازن قائم ہو گیا ہے۔

اس امن و سکون کی زندگی میں نوجوانی کا عہد اسقدر شدید انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ لوگوں نے اسے دوبارہ پیدا ہونا کہا ہے اور بجا کہا ہے۔ اس کا یا پلٹ کا دفعتاً واقع ہونا یا آہستہ آہستہ رونما ہونا ہر فرد کی مخصوص نفسی کیفیت پر موقوف ہے۔ پہلی صورت میں بھی ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اس انقلاب سے پہلے ایک زمانہ ایسا گذرتا ہے جسمیں بغیر ہمارے محسوس کئے طبیعت اسکے لئے تیار ہی ہوتی ہے اور اسمیں تو ذرا بھی شبہ نہیں کہ خواہ دل کی گہرائی میں اتر جانیوالی واردات قلب اس انقلاب میں محرک یا ممد قوت کا کام دے خواہ تربیت کے اثر سے یہ عرصے تک روکا جا سکے۔ ہر صورت میں خود عمل اندر سے یعنی خود نفس کی نشو و نما سے ظہور میں آتا ہے۔ اسے ہم کسی بیرونی چیز کا اثر نہیں سمجھ سکتے اسکی شدت میں مختلف صورتوں میں فرق ہوتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ کسی صحیح دل و دماغ کے انسان میں یہ چیز بالکل ہی واقع نہ ہو۔ ہم یہاں اُن مصلحتوں کی بنا پر جنکا ذکر باب اول میں ہو چکا ہے اسکے عضویاتی[1] پہلو کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں ہماری غرض صرف یہ ہے کہ اُس نفسی تغیر ترکیب[2] کو سمجھنے کی کوشش کریں جو یہاں رونما ہوتا ہے۔

تجربہ کار نفسی (ماہران نفسیات) اس تغیر کو ایسی خفیف سی علامتوں سے پہچان لیتے ہیں۔ جو بظاہر دور از کار معلوم ہوتی ہیں بلا اسکے کہ وہ لڑکے کی نفسی کیفیت اور اسکے مرکز انقلاب علمی نظام کے ماتحت غور کریں۔ مجھ سے ایک لڑکی بارہ برس کی عمر سے خط و کتابت کرتی تھی۔ سترہ برس کی عمر تک اُسکے خطوط میں نفسی بیداری کا شائبہ بھی نہیں تھا جسمانی اعتبار سے وہ

---

[1] Physiological

[2] ترکیب یہاں جرمن لفظ (Struktur) کا ترجمہ ہے اسکے معنی ہیں نفسی زندگی کا وہ شعبہ یا پہلو جو نشا "رکھتا ہے

چودھویں ہی سال میں نوجوانی کی حدمیں قدم رکھ چکی تھی نفسی تغیر کی پہلی علامت سترہ برس کی عمر میں اُسکے دو جملوں میں نظر آئی جو اُسنے طالبعلموں کی ایک دعوت کا محض سرسری ذکر کرتے ہوئے لکھے تھے۔

"دعوت کے بعد رات بھر ناچ ہوتا رہا اور صبح تڑکے دو دو آدمی ایک ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کو چلے" چاروں طرف بالکل سناٹا تھا" ہم سب پر سکوت طاری تھا۔"

بچہ کے کانوں تک سناٹے کی آواز نہیں پہونچا کرتی۔

اب ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ نئے نظام نفسی کی اہم ترین علامات کو معلوم کریں۔ ایسی علامتیں تین ۳ ہیں۔

(۱) نفس کا اکتشاف اور احساس۔

(۲) آہستہ آہستہ زندگی کا دستور العمل مرتب ہونا۔

(۳) زندگی کے مختلف شعبوں سے گہرا تعلق پیدا ہونا۔

ان میں سے پہلی بات وہ بنیادی مافوق الطبعی احساس ہے جو انسان کو اُسوقت ہوتا ہے جب وہ ایک جداگانہ فرد بنتا ہے۔ دوسری اس احساس کو عملی زندگی سے وابستہ کرنکی مرادف ہے اور تیسری کے ماتحت وہ تمام کوششیں آتی ہیں جو انسان زندگی کے مختلف پہلوؤں سے مفاہمت کی کرتا ہے اور جو ابتدا میں ایکدوسرے سے بالکل بے ربط ہوتی ہیں لیکن بہتریں صورتوں میں شخصی قوت تشکیل انمیں ربط اور ہم آہنگی پیدا کردیتی ہے۔ ان تینوں باتوں کی میں مزید توضیح کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ ہم نے نوجوانی کے آغاز کی پہلی علامت جداگانہ فرد ہونیکے احساس کو قرار دیا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پہلے نفس کا احساس کبھی ہوتا ہی نہ تھا۔ بچہ بھی خودی رکھتا ہے لیکن اُسکے نزدیک یہ ایسی بدیہی چیز ہے کہ اُسکا موجود ہونا یا تسلیم

نہ کیا جانا اس کے قیاس مین نہین آسکتا اور اسی لئے اُسے اس کا گہرا شعور بھی نہین ہوتا۔[1]

ہم سب بچے کی دل خوش کن لاشعوری انانیت سے واقف ہیں لیکن نوجوانی کی علامت کا جو پہلا عنوان ہم نے قرار دیا ہی اُسکے معنی یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس تغیر کے ساتھ ہی بچہ کو اپنی ذات کا علم اُس طرح ہوتا ہی جیسے ولہیلم مائسٹر کو اپنے زمانۂ تربیت کے ختم ہونیکے بعد یا اس سے بھی بڑھکر اپنے زمانۂ سیاحت کے اختتام پر حاصل ہوا تھا بلکہ ہمارا مطلب یہ ہی کہ نوجوانی کی حد میں داخل ہونے پر نئی بات یہ ہوتی ہے کہ بچہ کی نظر اندر کی طرف پھر جاتی ہے یعنی تفکر کا آغاز ہوتا ہی۔ مدرک اپنے آپ کو بجائے خود ایک دنیا سمجھنے لگتا ہی جو ہمیشہ کے لئے ایک جزیرے کی طرح عالم خارجی کی تمام موجودات سے خواہ وہ انسان ہوں یا اشیا جدا ہو جاتی ہے اور اسی لئے اُسے بیحد تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔

زیادہ صحیح الفاظ میں ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ یہ نفس یا خودی جسکی طرف بچہ کی نظر پھرتی ہے ابھی تک موجود نہیں ہوتی یا کم سے کم نظر نہیں آتی۔ بجائے اسکے ابتدا میں ایک طرح کا داخلی تلوّن ظاہر ہوتا ہی جسکے سبب سے انسان اپنی نفسی کیفیت پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس غور و فکر سے چند مخصوص مظاہر پیدا ہوتے ہیں جو غالباً سب نوجوانوں میں نظر آتے ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز کو مینڈوس نے اپنی کتاب "نوجوان کا نفس" میں بجا طور پر

---

[1] طالبعلم کو چاہئے کہ شعور کے مختلف مدارج کے بارہ میں زیادہ چھان بین کرے۔ ایک تو سادہ شعور ہوتا ہی جو احساس اور فعل کا جولانگاہ ہونے پر اکتفا کرتا ہی۔ اسکے بعد اُس شعور کا درجہ ہے جو ان چیزوں پر دھیان بھی دیتا ہی (تفکر کا پہلا درجہ) سب سے بلند وہ شعور ہی جو نفسی کیفیات کو معانی کے تحت میں لاتا ہی اور شعور کا علم بنجاتا ہے (تفکر کا دوسرا درجہ) مثلاً فرض کیجئے ایک شخص جو پہاڑ پر چڑھتا ہی تو کوہستانی دنیا کو محض محسوس کرتا ہو اب ممکن ہے کہ اُسے احساس کا بھی احساس ہو اور اس سے اُسکا لطف دوبالا ہو جائے یا اُس پر حسرت و ملال طاری ہو جائے پھر یہ بھی ہو سکتا ہی کہ وہ اس احساس پر تبصرہ کرے۔ ہمارا یہی مراد یہ ہی کہ بچہ شعور کی پہلی منزل طے کر چکا ہوتا ہی اور جب وہ نوجوانی کی حد میں قدم رکھتا ہے تو دوسری منزل یعنی تفکر کا پہلا درجہ شروع ہوتا ہی۔

طبیعت کا مزاج کہا ہے۔ اسٹینلے ہال[1] نے بھی نوجوانوں کے نفس کے تلون کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ایک ہی شخص اپنے نفس میں متضاد کیفیات پاتا ہے جنہیں سمندر کی موجوں کی سی پستی اور بلندی ہوتی رہتی ہے کبھی وہ انتہائی چستی دکھاتا ہے اور ورزش یا کھیل میں دنیا بھر کے استادوں کو مات کرتا ہے اور کبھی اسقدر کاہل ہوجاتا ہے کہ ہاتھ پیر ہلانا بھی اسپر بار ہوتا ہے کبھی وہ جوشِ مسرّت سے کھلا ہوا پھول ہے اور کبھی ملال و افسردگی سے مرجھائی ہوئی کلی۔ اسکی دلفریب شوخی اور حد سے بڑھا ہوا شرمیلا پن ایک ہی بات کے دو پہلو ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ اپنے نفس کے اہم ترین اعمال کو وہ دوسروں کی نظر سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے اسی طرح اُس میں کبھی ایثار کی شان نظر آتی ہے کبھی خود غرضی کی کبھی شرافت کی کبھی کمینہ پن کی، کبھی جذبۂ انس کی کبھی تنہائی پسندی کی، کبھی تقلید کی، اور کبھی حریت پرستی کی، کبھی قوتِ عمل کی اور کبھی خاموشِ تفکر کی۔

مختصر یہ ہے کہ جسقدر شدت سے عنفوانِ شباب کا طوفان برپا ہو اسی قدر اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس عمر میں نفس میں ہر چیز کا مادہ موجود ہوتا ہے۔ خیر یہ صحیح ہو یا نہ ہو، یہ بہت گہرا ما فوق الطبعی مسئلہ ہے۔ مگر اسمیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس طرح ڈانواں ڈول رہنے سے خود ہمارے نوجوان کی جان عذاب میں ہوتی ہے۔ شاذونادر ہی یہ سننے میں آتا ہے کہ کسی کو شباب کے آغاز میں مسرت نصیب ہوئی ہو باوجودیکہ اس زمانہ میں کبھی ایسے لمحات بھی گذرتے ہیں جب نفس انتہائی بلندی پر پرواز کرتا ہے لیکن جب ہم اُن ارادات کو جو قلب پر گذرتی ہے نفسیات کی خردبین سے دیکھتے ہیں اور اُنکے "منشا" کی جستجو کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ چیزیں نفس کے ارتقا میں کیا اہمیت رکھتی ہیں۔ فطرت یہاں ہونے والے انسان کو انتخاب کا موقع دیتی ہے۔ وہ خود اپنے اوپر ہر طرح کا تجربہ کرتی ہے تاکہ آخر میں صرف ایک طرزِ زندگی کو جو سب سے زیادہ موزوں ہو اختیار کرلے۔ نفسیاتِ ارتقا کے دوسرے شعبوں میں بھی اس سے ملتے جلتے مظاہر نظر آتے ہیں

---

[1] اسٹینلے ہال Adolescence دو جلد مطبوعہ نیویارک و لندن ۱۹۱۱ء جلد دوم صفحہ ۷۵ تا ۸۸۔

چنانچہ بچہ موضوع الفاظ ادا کرنے سے پہلے جو غوں غاں کرتا ہے اُسکا مقصد یہ ہو کہ ہر طرح کی آوازوں کا جنمیں سے بعض کا ادا کرنا بہت مشکل ہوتا ہو ایک ذخیرہ جمع ہو جائے تاکہ اُسمیں سے حسب ضرورت انتخاب کیا جا سکے اسی طرح قوت ارادی کے ارتقا کی سب سے پہلی منزل وہ ہوتی ہے جسمیں ارادہ کسی خاص مقصد سے نہیں کیا جاتا بلکہ محض اپنی نئی قوت یعنی اثبات خودی کی مشق کیلئے۔ اسی طرح کھیل میں مختلف حالتوں اور طرز ہائے عمل کا تجربہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ عنفوان شباب کا طوفان محض کھیل نہیں ہو بلکہ بڑی سنجیدہ چیز ہے۔ یہاں فطرت انسان کی عین ذات کو سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے۔ جو عمل وہ پہلے کھیل کے ساتھ کرتی تھی وہ اب واقعی زندگی کے ساتھ کرتی ہے۔

مناسب ہوگا کہ یہاں ہم بطور جملہ معترضہ کے ایک تعلیمی نکتہ بیان کردیں۔ ہمارا نوجوان ان اندرونی انقلابات میں اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکتا۔ اسی لئے اُسے اس زمانہ میں سمجھے جانے کی خواہش انتہا سے زیادہ ہوتی ہے اگر کوئی اُسے سمجھ لے تو محض یہ سمجھ لینا بہترین ذریعۂ تعلیم ہے کیونکہ اس سے نفسی رجحانات کی بیشمار متضاد صورتوں میں سے بعض کا انتخاب کیا جاتا ہے اُنکی تائید کیجاتی ہے اور اُن کے نشو و نما کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر اس سمجھنے میں نفس کی پست تر صلاحیتوں پر زور دیا جائے تو نوجوان قعر مذلت میں گر جاتے ہیں لیکن اگر نفس کے فطرتی جذبہ ترقی کی پرداخت کی جائے تو وہ اوج شرف پر پہونچ جاتے ہیں اس زمانہ میں تعلیم و تربیت کا بہترین طریقہ سمجھنا اور اُبھارنا ہو۔ سقراط نے اپنے مخصوص انداز میں اسکی تدبیریں بتائی ہیں۔

نفس کی حالتوں اور کیفیتوں کے اس دائمی تغیر میں بعض رجحانات زیادہ نمایاں ہیں اور سب نوجوانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان سب کا تعلق اس چیز سے ہے جسے ہم نے نفس کا انکشاف کہا ہو۔ اِن سب احساسات میں خودی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ بچہ میں بھی موجود تھی۔ مگر لاشعوری حیثیت سے۔ اب ایک نئے جذبۂ خودی کا دور دورہ ہوتا ہے یعنی یہ شعور پیدا ہوجاتا ہے کہ

نفس اور غیر نفس کے درمیان ایک بہت بڑا خلیج حائل ہو گیا ہو نہ صرف اشیا بلکہ انسان سے بھی
بہت دور اور بالکل بیگانہ ہیں اور انسان تمام عالم میں بالکل یک و تنہا ہے اس طرح ذہنی "ہبوط"[۱]
واقع ہو جاتا ہو جو مدرِک اور مدرَک کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ مدرِک اب بجائے خود ایک
دنیا بن جاتا ہو "ہمارے اندر بھی ایک کائنات ہے" اب اپنے نفس کا احساس شروع ہو جاتا ہو
اسکا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ انسان بیشمار مختلف صورتوں میں اپنی ذات پر غور کرتا ہو ان میں سب سے
پست وہ سطحی ادھیڑبن ہو جسمیں انسان محض اپنے نفس کے بے مقصد جذبات کو گھنگھولتا ہے اور سب سے
بلند فلسفیانہ تفکر ہے۔ اس عمر میں ایک حالت ایسی بھی ہوتی ہے جب انسان سوچا کرتا ہو مگر
اُسکے ذہن میں خیالات نہیں ہوتے۔ گاٹ فریڈ کیلر نے اس قسم کی دوراز کار غور و فکر کا نقشہ
اپنے ناول (Der gruene Heinrich) میں کھینچا ہو۔ صناعوں کے جلسۂ دعوت کے بعد
وہ بہت دن تک سیڑھیوں کے پاس بیٹھا رہتا ہو اور بیفائدہ سیڑھیوں پر چاقو سے نشان کیا کرتا ہے
لیکن یہ حالت کبھی زیادہ گہرا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور انسان نشانۂ تخلیق کے اہم ترین مسئلہ پر
غور کرنے لگتا ہے۔ "میں دنیا میں کیوں ہوں؟" "سب چیزیں معدوم کیوں نہیں ہیں؟" بچہ پوچھتا
ہے "میں جبتک پیدا نہیں ہوا تھا تو کہاں تھا اور کیا تھا؟" مگر نوجوان یہ پوچھتا ہو "میرے
ہونے کا سبب کیا ہو؟ میری قدر کیا ہو؟" اس مافوق الطبعی جنگ سے انسان جس شش و پنج میں
پڑجاتا ہو اور اس سے جو خالص مافوق الطبعی (کچھ ضروری نہیں کہ وہ اخلاقی ہو) عالم بیزاری
پیدا ہوتی ہے اُسکا نتیجہ انتہائی صورتوں میں خودکشی ہونا بھی ممکن ہے۔ لوگ اکثر ان واقعات کا
سبب خارجی چیزوں کو قرار دیتے ہیں جو نوجوان کے نقطۂ نظر سے بالکل سطحی ہوتی ہیں اور جن کا
اُسپر کوئی گہرا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن عام طور پر اس تفکر سے جو ہمارے نوجوان اسرار نفس کے متعلق
کرتے ہیں اس سے کم مہلک نتائج پیدا ہوتے ہیں روزنامچے لکھے جاتے ہیں۔ خط و کتابت کیجاتی ہے
مگر اس کا مقصد تبادلۂ خیالات نہیں ہوتا بلکہ خط بھیجنے اور خط پانے دونوں میں ہمارا نوجوان اپنی

---

۱ جرمن لفظ Suendenfall کا ترجمہ ہے جس سے مراد ہی حضرت آدمؑ کا بہشت سے نکالا جانا یہاں مطلب ہے انسان کے نفس میں

ذات کا عکس ڈالنا اور دیکھنا چاہتا ہے۔ غزلیں اس لئے لکھی جاتی ہیں کہ دل کے جذبات کا بخار نکلے۔ دوستی سے اس عمر میں خود اپنے نفس کے مشاہدہ کا کام لیا جاتا ہے لیکن قدرتی طور پر انسان ان چیزوں کو تخیل کی عینک سے دیکھتا ہے جس سے اپنے نفس کی تمام کیفیتیں بہت دلفریب اور بہت اہم نظر آتی ہیں۔ اس بات کا ثبوت کہ اس عمر میں انسان اپنے آپ کو بالکل نیا پاتا ہے یہ ہے کہ لڑکیاں خود اپنے نام بدل دیا کرتی ہیں ہیلینیا، ہیلا بنجاتی ہے۔ اینا، انیٹا ہوجاتی ہے اور لیزے اپنے آپ کو کم سے کم لیزا کہنے لگتی ہے۔ بالوں کو روز نئے نئے طرز سے باندھنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ انسان اس زمانہ میں گویا ہر وقت آئینہ کے سامنے کھڑا رہتا ہے وہ ہر چیز کی طرف جو نفس کے لئے آئینہ کا کام دیسکے دوڑتا ہے۔ یہ سب چیزیں اس طرح بھی ظاہر ہوسکتی ہیں کہ شہوت جنسی کا خیال تک دلمیں نہو۔ ان کی صورت یہ ہوتی ہے جیسے کسی روشنی کے مرکز سے شعائیں نکل رہی ہیں لیکن مرکز ایک جگہ قائم نہیں ہے ابھی تک وہ جاگتی ہوئی خودی نمودار نہیں ہوتی جسکے ہمرکاب اثبات نفس، عشق، اور شہوت جنسی کا ہونا لازمی ہے۔ ہمارا نوجوان ایک طلسم تخیل میں ٹٹول ٹٹول کر چلتا ہے جسمیں ابتک کھیل کا رنگ باقی ہے لیکن اسمیں شبہ نہیں کہ دنیا اور زندگی کے دائمی قوانین کی ایک خفیف سی جھلک ضرور نظر آنے لگتی ہے۔

اب آپ داخلی زندگی کے اس عجیب و غریب تضاد پر غور کیجئے۔ ایک طرف تو انسان اپنے آپ سے بھاگنا چاہتا ہے اور دوسری طرف اپنے آپ کو ڈھونڈھتا ہے کبھی کبھی ایک ہی نفسی کیفیت میں دونوں باتیں موجود ہوتی ہیں مثلاً سیاحت کا شوق جو ہمیشہ سے نوجوانوں کے دلمیں ہے یہ اُس اندرونی بےچینی کا اظہار ہے جسمیں انسان گھر سے (جو گویا اُسکے پُرانے نفس کا ایک ٹکڑا ہے) بیزار ہوکر نکل کھڑا ہوتا ہے ایسی بےخودی ڈھونڈھتا ہے جو بےحسی کی حد تک پہونچ جائے نئے نئے خارجی حسیات کی تلاش میں رہتا ہے لیکن اُسی کے ساتھ خاموشی اور جمعیت خاطر بھی چاہتا ہے عنفوان شباب میں بہت سی باتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بےہوشی کی کیفیت پیدا

کریں یا کم سے کم جوشِ شباب کی گرمی کو کسی حد تک ٹھنڈا کریں۔ اس جوش میں نشہ کی دونوں کیفیتیں موجود ہوتی ہیں صوفیوں کے "حال" کی خود نمائی بھی اور خود فراموشی بھی۔ زندگی کے اس طوفان خیز زمانہ میں انسان مضطربانہ کوشش کرتا ہے کہ تھک کر شل ہوجائے اور پھر خود یہ تھکن وجہ سکون بنجاتی ہے۔ بخلاف اسکے بعض نوجوان تصنیف و تالیف کی خاموش زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ اپنے جوشِ اضطراب سے "نجات پانیکے لیے" اُسے روزنامچہ یا اشعار میں ظاہر کرتے ہیں۔ نفسی کیفیت کا اظہار جب کوئی معنوی "صورت" اختیار کرے تو اُس سے دونوں باتیں حاصل ہوتی ہیں اپنے آپ کو پا لینا بھی اور اپنے آپ سے نجات پانا بھی، نوجوان کو جو محبت اپنے روزنامچہ سے ہوتی ہے اُس کا سبب یہ ہو کہ وہ اسکے راحت و الم کا رازدار ہوتا ہے اُس کا درددل سنتا ہے اور اُسے کھُل کر بات کرنے کا ایسا موقع دیتا ہے کہ خاموشی کے لمحوں میں نوجوان کا رازدار دل جو کلی کی طرح سربستہ تھا پھول کی طرح شگفتہ ہوجاتا ہے یقیناً یہ روزنامچے نفسیات شباب کے ماخذ کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں لیکن اُتنے اہم ہرگز نہیں جتنا شارلوٹے بوہلر انھیں سمجھتی ہیں کیونکہ خارجی عالم ذہنی کو سمجھنا تو درکنار ہمارا نوجوان ابتک خود اپنی نفسی زندگی کا ترتیب اور ربط کے ساتھ مشاہدہ نہیں کرسکتا بلکہ عموماً حیرت کے ساتھ اور کبھی کبھی تو نفرت آمیز تحیر کے ساتھ اُسپر نظر ڈالتا ہے۔ یہ گویا تشکیل سیرت کی پہلی کوششیں ہیں۔ ابھی احساس نفس کی پراسرار کیفیتیں اور جذبات بہت دور ہیں اس عمر میں جو کوششیں اپنے نفس کا مشاہدہ کرنے کی ہوتی ہیں اُنھیں دوسروں سے مانگی ہوئی عینک سے کام لینا پڑتا ہے۔

نفس کی بیداری نہ صرف مشاہدۂ نفس کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ زود حسی کی شکل میں بھی جو اس بات کی علامت ہو کہ احساس خودی بہت بڑھا ہوا ہے اور ابھی اسے ٹھیس سے بچانے کی بہت ضرورت ہو دوسروں پر خصوصاً پختہ عمر کے لوگوں پر فرض ہے کہ نوجوان کے دل کی کھلتی ہوئی کلی کو نہ چھیڑیں کیونکہ وہ اتنی نازک ہوتی ہے کہ اُسے اپنے آپ سے صدمہ

پہونچ جانے کا خطرہ ہے اس عمر میں جس میں انسان طفلی و شباب کی سرحد پر ہوتا ہے لازمی طور پر نفس کی مجموعی حالت بہت تغیر پذیر ہوتی ہے۔

انسان محض ظاہری حیثیت سے یا محض نام کے لیے آدھا بچہ اور آدھا جوان نہیں ہوتا بلکہ اس عمر کے آغاز میں واقعی بعض اوقات وہ بالکل بچہ ہوتا ہے اور بعض اوقات اندرونی زندگی کے اعتبار سے اس میں پختگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ لیکن آس پاس کے لوگ اس کا بہت کم لحاظ کرتے ہیں۔ اس عمر میں نوجوان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اُسے لوگ پُورا انسان نہیں سمجھتے۔ اگر اُس کی زود حسی یوں مجروح نہ کی جائے تو اُس سے تعلقات قائم کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہوجائے محض اتنی بات سے اُسکی تربیت بہت اچھی طرح ہوسکتی ہے کہ اُس سے روزمرہ کی زندگی میں وہی برتاؤ کیا جائے اور وہی توقعات کی جائیں جو پختہ عمر لوگوں سے ہوتی ہیں۔

کم سے کم نوجوان لڑکیوں کے بارے میں تو یہ بات حرف بحرف صحیح ہے۔ بخلاف اس کے اگر نوجوانوں کی یہ فطری خواہش کہ اُنھیں لوگ مانیں اور اُن کی بات چلے، پوری نہ ہو تو وہ "ترک تعلق" کر دیتے ہیں یعنی وہ ایسی زندگی اختیار کرتے ہیں جو بڑی حد تک بڑوں کے معیار کی پابند نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو خود ساختہ پیمانوں سے ناپتی ہے۔ بڑے شہروں میں گنڈوں یا شہدوں کے جو جھتے نظر آتے ہیں ان کے قیام کی محرک محض بد معاشی نہیں ہے۔ اس میں یہ خواہش بھی شامل ہے کہ لوگ اُن کی عزت کریں بلکہ اکثر اوقات لوگ اپنی اس آرزو کے خاک میں ملجانے سے کہ اُن کے ساتھ محبت اور اُن کی ہدایت کی جائے، حالت یاس میں ان جھتوں میں

شامل ہو جاتے ہیں۔

مشاہدۂ نفس اور زود حسی کے بعد خود مختاری کی اُٹھتی ہوئی اُمنگ اس بات کی علامت ہے کہ نفس کی گہرائی میں ایک نئی خودی نمودار ہو گئی ہے اسلئے اس عمر میں آزادی کی کوششیں سرکشی یا بیرونی پر نہیں بلکہ ایک فطری ضرورت پر مبنی ہیں۔ ہمارا نوجوان اب اپنے سے مقاصد قرار دینا شروع کرتا ہے جو ابتدا میں محض تجربہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نوجوان اکثر خواہ مخواہ انتہائی تیزی سے منزلوں پیدل چلتے ہیں جنکی غرض صرف اس بات کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کتنی دور چل سکتے ہیں۔ ابتدا میں اُنکی غرض مناظر قدرت کا لطف اُٹھانا بالکل نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو محض ضمنی طور پر۔ اُن کی یہ اُمنگ خواہ جسمانی ورزش کی شکل اختیار کرے خواہ نادر چیزوں کے جمع کرنے کی خواہ مضامین لکھنے کی، خواہ آرا چلانے یا لکڑی چیرنے کی، نفسیات کے نقطۂ نظر سے سب کا مقصد ایک ہی ہے۔ کیونکہ ان سب باتوں میں اہم ترین عنصر یہ ہے کہ آدمی کے پاس ایک چیز خود اپنی ہو جسمیں کوئی دوسرا دخل در معقولات نہ دے سکے۔ اسکا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس طرح کے شوق اکثر دورے کی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ دفعتاً شروع ہو جاتے ہیں (دیکھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انکی محرک کون چیز ہے) اور چند ہفتوں یا مہینوں کے بعد دفعتہً ختم ہو جاتے ہیں۔ بعض وقت یہ دورے باوجود بے معنی ہونیکے دائمی مرض کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ نفس کا ارتقا صحیح نہیں ہو رہا ہے۔ یہ خود مختاری کی اُمنگ بھی جس کا ہم آگے تفصیل سے ذکر کرینگے جرمنی کی تحریک شباب اور نوجوانوں کی آوارگی کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اس سے ہم پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ایک ہی نفسیاتی عنصر سے بہ اختلاف ماحول کتنے مختلف نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مندرجۂ بالا بحث خود بخود عنفوانِ شباب کی دوسری بنیادی خصوصیت کیطرف اشارہ کرتی ہے۔

۲۔ آہستہ آہستہ زندگی کا دستور العمل مرتب ہونا۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ یہ عمل پیشہ کے انتخاب

تک محدود ہی تو بڑی غلطی کے مرتکب ہوں گے۔ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ ہمارا نوجوان ایسا دستور العمل بنائے جسمیں سوچ سمجھ کر زندگی کا کوئی مقصد معین کیا گیا ہو۔ یہاں مراد صرف یہ ہے کہ اندرونی نفسی زندگی فطری رجحانات اور بیرونی دنیا کے اثرات کے تقابل سے ایک خاص سمت اختیار کر لیتی ہے اس طرح تہ کے نیچے نفس کی لاشعوری بھول بھلیاں میں انسان کی سیرت نشوونما پاتی ہے۔

ان سب تغیرات کی بنیاد اس پر ہے کہ نوجوان زندگی سے نئے قسم کا تعلق قائم کرتا ہے۔ بچہ کے نزدیک عموماً زندگی غیر مربوط لمحات کی توالی کا نام ہے وہ نت نئے لطف اُٹھاتا اور نئی دلچسپیاں پیدا کرتا رہتا ہے اور زندگی کو ایک کُل سمجھ کر عمل کرنے کا اُسے کبھی خیال تک نہیں آتا زمانہ اُس کی نظر میں نامحدود ہے۔ داخلی احساس میں عمر کا کوئی حصّہ اتنا طویل نہیں معلوم ہوتا جتنا بارہ برس سے تیرہ برس تک کا زمانہ۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ بچہ کو گذرے ہوئے جذبات و احساسات بہت کم یاد رہتے ہیں۔ وہ ابھی مرکز زندگی کے لئے اُتنے اہم نہیں ہوتے جتنے آگے چل کر ہوتے ہیں۔ جب بلوغ کا زمانہ قریب آتا ہے تو بہت ہی آہستہ آہستہ، سال، لبال، یہ نیا احساس پیدا ہوتا جاتا ہے "تیرے عمل کا موضوع ایک کُل ہے۔ تیرا عمل اس کُل کا جز ہو جاتا ہے اور کبھی اُس سے جدا نہیں ہوتا یہ خود تیری ذات کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے"۔ خود اپنی زندگی میں تسلسل کو ڈھونڈھنے اور گذرے ہوئے زمانہ کی یاد کو قائم رکھنے کی جو کوشش نوجوان کرتے ہیں اُس کی ایک اہم علامت روزنامچہ ہے۔ اس میں اکثر بچپن کی یاد نمایاں حصّہ رکھتی ہے۔ لیکن قدرتی طور پر اُن کے مدّ نظر زیادہ تر آنیوالا زمانہ ہوتا ہے۔ نہایت خاموشی کے ساتھ خود بخود ایک نصب العین زندگی بن جاتا ہے۔ مستقبل کی اس تصویر میں ابتدا میں وہ چیز جسے ہم واقعیت کہتے ہیں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ واقعات کے نقطوں کے درمیان جو وسیع خلو ہوتا ہے اُسے خلاق تخیل پر کر دیتا ہے۔ یہ تخیل کا عنصر آئندہ زندگی میں بار بار نمودار

ہوتا ہے۔ یہ رفتہ رفتہ واقعات کی صورت اختیار کرلیتا ہے جس طرح کھوپڑی میں کرّی رفتہ رفتہ سر کی ہڈی بنجاتی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہو کہ جیسے جیسے تمدّن میں پیچیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے اور اُسکے مختلف شعبے مستقل صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ بلوغ کے قبل کا زمانہ طویل ہوتا جاتا ہے۔ خارجی تمدن میں جو پہلے سے ایک صورت اختیار کرچکا ہو جڑ پکڑنا، اُس سے صحیح تعلقات قائم کرنا، اُسمیں اپنی مناسب جگہ ڈھونڈھنا روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اصل سوال اسکا ہے کہ بہت سی زندگیوں میں سے جنھیں انسان اختیار کرسکتا ہے وہ ایک زندگی اختیار کرے۔ لیکن اس مقصد کی خبر ہمارے نوجوان کو نہیں ہوتی فطرت ہر اُس کام کو جس کا تعلق توالد اور تخلیق سے ہے پردہ کے پیچھے کرتی ہے۔ الفرڈ آڈلر نے سچ کہا ہے "زندگی میں اور انسان کی نشوونما میں جسقدر پوشیدگی نصب العین حیات کی تعمیر میں برتی جاتی ہے کسی چیز میں نہیں برتی جاتی اسلئے بچوں کے نصب العین معلوم کرنے کے لئے جو اعداد و شمار مہیا کئے جاتے ہیں اُن سے محض غلط نتائج نکلتے ہیں جن لوگوں کی زندگی کو بچے" اپنے لئے مثال قرار دیتے ہیں وہ بڑے آدمی نہیں ہوتے بلکہ اکثر وہ معمولی آدمی ہوتے ہیں جن سے تعلق خاطر ہو جیسے اپنا چچا یا ہمسائے کا لڑکا جو سن میں تین برس بڑا ہے۔

ہم نوجوانوں کے تخلیق نصب العین کی حقیقت پر آئندہ باب میں تفصیل سے بحث کرینگے ریو کرٹ کا مشہور قول بالکل سچ ہے کہ" اس عمر میں ہر شخص کے پیش نظر اُس زندگی کی تصویر ہوتی ہے جسے وہ اختیار کرنا چاہتا ہے"۔ یہ تصویر کانٹ کے قطعی امر اخلاقی کی مجرد شکل میں نہیں ہوتی بلکہ خود اپنے نفس کی مکمل صورت جسم تصور میں نظر آتی ہے اور قانون صورت[۱] جسکی تعمیل میں سب اعلیٰ اندرونی قوتیں صرف ہوتی ہیں اندر اور باہر کی کاوشوں کے مقابلہ میں قانون عمل[۲]

۱؎ قانون صورت محض بیانی قانون ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ کسی شے کا نشوونما فطرتاً کیونکر ہوتا ہے۔

۲؎ قانون عمل حکمی قانون ہے جو یہ بتاتا ہو کہ کسی شے کے نشوونما میں کیونکر مدد کرنا چاہئے۔

بن جاتا ہے۔

لیکن یہ رکاوٹیں اکثر انحراف، خرابی بلکہ دماغی اور نفسی امراض کا باعث بن جاتی ہیں۔ پیستالوزی کا یہ قول بالکل صحیح ہے "انسان اچھا ہے اور اچھائی کرنا چاہتا ہے، البتہ اتنا ہے کہ وہ اچھائی کے ساتھ خوشی کا بھی طالب ہے۔ اگر کوئی انسان بُرا ہے تو یقیناً اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے اُسے اُس طرح اچھا نہیں بننے دیا جس طرح وہ چاہتا تھا۔"

طبّی تحلیل نفس کے اُس مذہب نے جس کا بانی الفریڈ آڈلر ہے نفس کی اِن گہرائیوں پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ اگر کسی کو اُس کے نظریے کے کل حصوں سے اتفاق نہ بھی ہو تو بھی اُس کے بہت سے اہم اور صحیح مشاہدات کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ آڈلر نے اِس بحث کا آغاز عضویاتی پہلو سے کیا ہے۔ اگر کسی عضو میں پیدائشی نقص ہو تو ساری قوتِ حیات اُسی عضو میں جمع ہو جاتی ہے اس طرح نہ صرف کافی بلکہ ضرورت سے زیادہ تلافی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آڈلر بہت تفصیل کے ساتھ نفسی زندگی کے مظاہر کا ذکر کرتا ہے۔ نقص کا احساس انسان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ (لوگوں کے طعن وتشنیع سے) بچاؤ کا راستہ ڈھونڈھے کیونکہ انسان کی یہ جبلّی خواہش، کہ وہ نیچا نہ رہے بلکہ اونچا رہے جسے ہم اثباتِ خودی کی اُمنگ یا حصولِ قوت کا ارادہ[1] کہتے ہیں، زندگی کی بنیادی جبلّت ہے۔ اگر یہ جبلّت سیدھے راستہ سے اپنی منزل پر پہونچ جائے تو شخصیت کی تعمیر صحیح بنیاد پر ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو بلکہ یہ جبلّت کسی وجہ سے دب جائے تو یہ لاشعوری حالت میں چپکے چپکے کام کرتی رہتی ہے اور اونچا رہنے کے لئے انسان من گڑھت تصورات سے کام لیتا ہے اور کسی دور دراز راستہ سے منزل پر پہونچنا چاہتا ہے۔ یہی من گڑھت تصورات عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ اس سے ہماری سمجھ میں آجائے گا کہ بعض لوگ کیوں زندگی کے

[1] جرمن ترکیب Wille zur Macht کا ترجمہ ہے جسے انگریزی میں Will to Power کہتے ہیں۔

بے سروپا دستور العمل بنایا کرتے ہیں یا اس خبط میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہر شخص ان کا دشمن ہے اور ان پر ظلم کرتا ہے یا اعصابی دوروں میں گرفتار ہوتے ہیں (یہاں تک کہ اپنی تذلیل کرنے میں بھی انھیں قوت کا مزا ملتا ہے) اس طرح کی صورتیں اپنی ابتدائی حالت میں روزمرہ زندگی میں بھی پیش آتی ہیں - عورتیں غش میں آکر وہ کیفیت حاصل کرنا چاہتی ہیں جو اُنھیں تصورات سے نہیں حاصل ہوتی - وہ جان بوجھ کر غش نہیں کھاتیں لیکن اُن کے نفس کے تحت شعوری حصّے میں کوئی ایسی چیز ہے جو اُنھیں اس پر مجبور کرتی ہے کیونکہ وہ سیدھے راستے سے بہ جبر ہٹا کر ٹیڑھے راستے پر لگادی گئی ہے - مکتبی کھانسی (بچوں کا جھوٹ موٹ کھانسنا تاکہ مکتب جانے سے بچ جائیں) کو نفس بالارادہ حفاظت درانداع کی غرض سے پیدا کرتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ آہستہ آہستہ یہ سچ مچ کی کھانسی بن جائے - مرض اختناق میں جو اندھاپن اور بہراپن ہوجاتا ہے اُس کی اصل تحت شعوری عالم میں یہ ہے کہ انسان خود سننا اور دیکھنا نہیں چاہتا -

لیکن اس کتاب میں ہمیں مریضوں کا ذکر کرنے کا حق نہیں ہے - اس قسم کی بالواسطہ محرکات اُس زندگی میں بھی پائی جاتی ہیں جسے ہم معمولی (یعنی صحت کی) زندگی کہتے ہیں اور دو خاص صورتوں میں ظاہر ہوتی ہیں - نقص کا احساس خود اپنی تلافی کی صورت پیدا کرلیتا ہے - یہ تلافی کبھی کبھی اُسی شعبۂ ذہنی میں ظاہر ہوتی ہے جسمیں نقص ہو لیکن زیادہ تر دوسرے شعبوں میں - روسو نے جسکے دل میں آرزوئے زندگی اور محبت کا طوفان موجزن تھا لیکن اس آرزو کے پورا کرنے کی قوت نہ تھی اُس کی شاعرانہ تلافی کے لئے لوح قلب پر New Heloise کا نقشہ کھینچا - جو شخص خود زور وشور سے زندگی کا لطف اُٹھاتا ہے وہ فسانے نہیں لکھا کرتا - تحقیر کا احساس یعنی اپنے نفس میں نقص کا وہ احساس جو لوگوں کی ناقدری اور بے اعتنائی سے پیدا ہوتا ہے قوائے نفسی کا رخ اس طرف پھیر دیتا ہے جدھر کوئی رکاوٹ نہیں ہے - دل میں جو اُمنگ اپنے آپ کو منوانے کی

ہوتی ہے وہ یا تو سماج (سوسائٹی) کے کسی دوسرے طبقے کی طرف رجوع کرتی ہے یا اغراض اور نفی کے جذبے میں تبدیل ہو جاتی ہے یا انسان کو تنہائی کی زندگی کا لطف اٹھانے پر مائل کردیتی ہے اسکی مثال نیٹشے کی زندگی میں ملتی ہے جبکہ یہ حال تھا کہ ایک طرف واقعی زندگی کا پیمانہ اُس کے ہاتھ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا اور دوسری طرف وہ اپنی داخلی زندگی کی شراب عالم آشوب میں سرشار ہوتا جاتا تھا[1]۔ نوجوانوں کے نصب العین زندگی کی حیرت انگیز بے اعتدالیوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اُس کے عمل کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہو جس سے نفس میں فعل کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اس عمر میں اخفا کا مادہ اس قدر ہوتا ہے کہ وہ ان تمام اعمال کو چھپا لیتا ہے جو قلب کی گہرائی میں واقع ہوتے ہیں۔

بظاہر جو چیز نوجوانوں میں نظر آتی ہے وہ محض خودسری، مخالفت، ضد اور مردم بیزاری ہے۔ ان خصلتوں کا اُن میں موجود ہونا اس قدر تعجب خیز ہے کہ اس کی توجیہ کے لئے ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ جبر اور سختی اُٹھانے سے (مثلاً دفعتہً اپنے پرانے عقائد یا اپنے محبوب دوستوں سے جدا کر لئے جانے سے یا مانوس مقامات سے چھڑا لئے جانے سے) اُن میں نفی (رہبات کی مخالفت کرنے کا) مرض پیدا ہو جاتا ہے جسے الفریڈ آڈلر نے ان الفاظ میں خوب ادا کیا ہے:-

"مجھے ایسا رویہ اختیار کرنا چاہئے کہ آخر میں میدان میرے ہی ہاتھ رہے۔"

کبھی کبھی داخلی کشمکش نوجوانی ہی میں ایسی خراب صورتیں اختیار کرلیتی ہے کہ انسان محض دوسروں کو اذیت پہونچانے کے خیال سے خودکشی تک کر گزرتا ہے۔ مجروح احساس خودی اپنی ذلت کی تلافی اور اپنی عزت کو کسی حد تک دوبارہ قائم کرنے کے لئے ہر تدبیر اختیار کرتا ہے خواہ کچھ ہی انجام کیوں نہ ہو۔

جرمنی کی تحریک شباب میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو کوئی مثبت نصب العین نہیں

[1] جس شخص کی سماج تحقیر کرتی ہے وہ ذہنی خلاقی کے اعلیٰ نمونے پیش کر کے عزت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ زیادہ غصہ در انسان کو ایسی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے جسکے لئے وہ بالکل مناسب نہیں۔ بہت سی ناکامیاب زندگیوں کا یہی راز ہے۔ -۱۲-

رکھتے۔ اُنھیں اس کا موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنے آپ کو بالغ سمجھیں۔ اس لیے انھوں نے وہ راہ اختیار کرلی ہے جو اُن کے لیے کھلی تھی "ہم اب بالغ بننے کی کوشش نہیں کرینگے ہم اپنے آپ کو نابالغ سمجھیں گے اور............ سمجھتے رہیں گے۔" دوسری صورت یہ ہے کہ موجودہ مغربی تمدن کے مطالبات اپنے نوجوانوں سے روز بروز سخت ہوتے جاتے ہیں۔ اسلیئے اُن کے نفس نے حفظ ماتقدم شروع کردیا ہے۔ وہ یہ اعتراف نہیں کرتے کہ وہ اس تمدن میں حصہ لینے کی قوت نہیں رکھتے بلکہ وہ اپنا بچاؤ یہ کہہ کر کرتے ہیں۔"ہم اس تمدن میں حصّہ نہیں لیتے یہ کسی کام کا نہیں ہے۔" تحریک شباب کا یہ پہلو یعنی زندگی کی کارزار سے منہ چھپانا ہمارے تمدن کی بیماری کی علامت ہے۔ لیکن جیسا ہم آگے چل کر بیان کرینگے اس تحریک میں دوسری قوتیں بھی پنہاں ہیں۔

مختصر یہ کہ عنفوان شباب کی آرزوئیں جو دل میں جڑ پکڑ لیتی ہیں انھیں اگر زمانہ پورا ہونے کا موقع نہ بھی دے تب بھی وہ بے اندازہ قوت کے ساتھ آیندہ زندگی میں باقی رہتی ہیں۔ یہ پوشیدہ محرکات کی شکل میں انسان کے اعمال پر اثر ڈالتی رہتی ہے۔ اور کبھی کبھی ساٹھ برس تک کی عمر میں (جسکی ایک مثال مجھے خود معلوم ہے) زندگی میں دفعتہً انقلاب پیدا کردیتی ہیں۔ اب خواہ یہ انقلاب نشاۃ ثانیہ (یعنی بلوغ میں جو کمی رہ گئی تھی اُس کا بہت دن کے بعد جاکر پورا ہونا جو ہمیشہ مفید ہوتا ہے) کی صورت میں ہو یا کسی افسوسناک حادثے کی صورت میں جس میں برسوں کے جبر کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور اُس کے ساتھ خود انسان کا طلسم حیات بھی۔

تشکیل ذات کے عمل میں جو عنفوان شباب میں شروع ہوتا ہے علاوہ نفس کے بیدار ہونے اور آہستہ آہستہ ایک مربوط تحریک زندگی پیدا ہونیکے ایک تیسرا عنصر بھی ہوتا ہے اور ان تینوں کے ملنے سے نئے سازِ حیات کا زیر و بم بنتا ہے۔ تیسرا عنصر یہ ہے کہ جہاں مدرک اپنے نفس کا مشاہدہ شروع کرتا ہے وہاں مدرکات میں بھی اُسے نئی نئی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔

خارجی حیثیت سے تو یہ چیزیں ہمیشہ اُس کے ماحول میں موجود تھیں لیکن اُن کی مخصوص ماہیت کے ادراک کے لئے اُس میں کوئی حس نہ تھی۔ اب یہ حس اس طرح پیدا ہوجاتی ہے گویا وہ پھول کا کٹورا جو اب تک غنچۂ نفس کو اپنے آغوش میں چھپائے تھا کھل گیا ہے اور اس کی ایک ایک پتی الگ ہوگئی ہے۔

۳۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے گہرا تعلق پیدا ہونے کی تیاری بچپن ہی سے شروع ہوجاتی ہے۔ چیزوں میں منشار پیدا کرنے یا اُن کا منشار سمجھنے کی جو مختلف صلاحیتیں نوجوانوں میں ہیں وہ بچے میں بھی ہوتی ہیں۔ وہ جمالی قدور، علمی قدور، اور مذہبی قدور کا احساس رکھتا ہے اور فائدہ، النس اور حکومت کا منشار سمجھتا ہے۔ لیکن ان قدور سے بچوں اور نوجوانوں کے تعلق میں کئی اعتبار سے فرق ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بچہ یہ شعور نہیں رکھتا کہ یہ زندگی کے شعبے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس نکتہ کو فروبل کی باریک بیں نظر نے خوب سمجھا تھا چنانچہ اُس نے فطرتی ذرائع تعلیم کا تعین اسی حقیقت کی بنیاد پر کیا تھا کہ بچے کے نفس کی خصوصیت زندگی کی وحدت ہے۔ اُس نے بچوں کو مشغول رکھنے کے لئے ایسے کھیل نکالے جنکی بنا ادراک کے نقطۂ وحدت پر ہے۔ جہاں علم کی صورتیں[۵]، جمال کی صورتیں، اور فائدہ کی صورتیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں کیونکہ خود بچہ ابتک اُس ازلی وحدت سے خارج نہیں ہوا ہے جو وہ ماں کے ساتھ، فطرت کے ساتھ، اور صانعِ فطرت کے ساتھ رکھتا ہے۔ علاوہ اسکے نوجوان کو زندگی کے مختلف شعبوں کا احساس کسی اور ہی رنگ میں ہوتا ہے۔ اس احساس میں مدرک کی نفسی کیفیت کا عنصر غالب ہوتا ہے اور مدرک کی واقعی حالت پر بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ بڑی خصوصیت نوجوان کے ادراک واحساس میں یہ ہے کہ یہ احساس اُسے "بذاتِ خود" اپنے مخصوص انداز میں ہوتا ہے۔ اب خارجی محسوس اشیاء کو وہ بلاچون وچرا جیسی وہ نظر آتی ہیں ویسی تسلیم نہیں کرلیتا بلکہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اب اُن میں وہ اپنے ذاتی احساس سے رنگ آمیزی کرتا ہے۔ اب جاکر

[۵] صورت سے مراد ہے وہ سانچہ جسمیں ذہن انسانی حواس خمسہ کے ذریعہ پہونچنے والے حسیات کو ڈھالکر علم بناتا ہے۔ ۱۲۔

اُن پر غور کیا جاتا ہے، اُن کی قدر کا تعین ہوتا ہے اور وہ واردات نفس کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ اب تک (یعنی بچپن میں) زیادہ سے زیادہ صنعتی کاموں میں ایک خاص طرح کا انہماک تھا یعنی تعین قدر کا وہم و گمان بھی نہ تھا کیونکہ صنعت و حرفت میں تو قدر کا تعین نہیں ہوا کرتا بلکہ انسان پہلے سے مقرر کی ہوئی قدور کو بلا تنقید مان کر اُن کے حاصل کرنے کے ذرائع تلاش کرتا ہے۔ لیکن اب انسان خود قدر کا تعین کرنے لگتا ہے کیونکہ اب وہ اپنا ذاتی ادراک اور اپنی ذاتی قوت حکم رکھتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عنفوان شباب سے پہلے انسان فاعلی حیثیت سے تمدن میں حصہ نہیں لے سکتا۔ بچہ کا تعلق تمدن سے محض انفعالی ہے یا اگر وہ خود کچھ کرتا ہے تو اُسکی وقعت دوسروں کی نقالی سے زیادہ نہیں۔ وہ خود کسی شعبہ میں کوئی تخلیقی کام نہیں کرتا بلکہ تمدن کو جس طرح وہ موجود ہے اُسی طرح قبول کرلیتا ہے اور اُس میں اپنی پابند فطرت لاشعوری وحدت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ جب اُس کے اور کائنات کے درمیان یہ رشتہ وحدت قطع ہو جاتا ہے تو ایک طرف اُسے شعبہ ہائے تمدن کی کثرت کا احساس ہونے لگتا ہے اور دوسری طرف وہ خود اس خزانہ میں اپنی حیثیت کے مطابق اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب آغاز ہوتا ہے اپنی صناعی کا، اپنے غور و فکر کا، اپنے انتخاب محبت کا، اور اپنے مذہبی احساس کا، علاوہ اس کے ہمارا نوجوان موجودہ تمدن کی دولت میں خود بھی کچھ اضافہ کرتا ہے خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ اس کا یہ بدلا ہوا رویّہ سب سے زیادہ اقتصادی شعبے میں نمایاں ہوتا ہے۔ بچے اگر کھاتے پیتے خاندان کے ہوں تو انھیں کبھی اس کی فکر نہیں ہوتی کہ ضروریات زندگی کس طرح فراہم ہوتی ہیں۔ فیلکس ڈان جس کے والدین تھیٹر میں تماشہ گر تھے اپنے بچپن کے زمانہ میں ایک بار اس سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن اُس نے جلد اپنے دل کو یہ کہکر تسکین دے لی کہ "روز شام کو تماشے کے بعد آسمان والے پردے سے ایک دوا آتی گرتی ہے"۔ خود کمانے کی خواہش دل میں پیدا ہونا اور اسکی باضابطہ کوشش بھی اس بات کی علامت ہے کہ نفسی شباب شروع ہو گیا۔

لیکن جب شعبہ ہائے تمدن سے یہ تعلقات پیدا ہونے لگتے ہیں تو ساتھ ہی زندگی کی

دشوار اور صعب کشاکش بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ابتدا ہی سے آدمی مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متعلق تفکر اور اس مسئلہ پر غور کرنے لگتا ہے کہ انہیں سے ہر ایک کو خود اُسکی زندگی کی تشکیل میں کہانتک دخل ہونا چاہئے۔ یہ بات اگر ہوتی بھی ہے تو بہت دن کے بعد اور شاید اُن لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو جان بوجھ کر اپنی تربیت آپ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی میں یہ عمل بلوغ کے بعد بھی سالہا سال تک جاری رہتا ہے۔ نوجوانی کے ابتدائی زمانہ میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں اُن کا محض ایک جزو کا شعور ہوتا ہے۔ لیکن ان دشواریوں کا ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ موجودہ حالت میں ہمارے تمدن کے مختلف شعبوں میں وحدت موجود نہیں ہے بلکہ طرح طرح کا تضاد اور کشاکش پائی جاتی ہے چونکہ ذہن خارجی (تمدن) بہت سی شاخوں میں تقسیم ہوگیا ہے اس لئے ہمارے نوجوان کی داخلی ذہنی زندگی کے مختلف شعبوں میں بھی ابتدا میں کوئی ربط نہیں ہوتا بلکہ اس سن میں ایسے ایسے تناقض ہوتے ہیں (اس سے مراد منطقی تناقض نہیں ہے بلکہ اخلاقی تعین قدر کا تناقض) جو ہمیشہ رہ نہیں سکتے اور جن کو پوشیدہ قوتِ تشکیل سیرت بھی کبھی نہ کبھی ضرور دور کردیتی ہے۔

آجکل مختلف ذہنی شعبوں کا غیر مربوط ہونا عنوانِ شباب کی ایک اہم نفسی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ ہم نظام نفسی کے اُن مختلف پہلوؤں پر جو کہیں ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں اور کہیں مل جاتے ہیں ایک ایک کر کے غور کریں اور اپنی نفسیات شباب کی تقسیم انھیں کی بنا پر کریں۔ اس سے خود بخود ظاہر ہو جائے گا کہ عموماً اس عمر میں کونسا شعبۂ ذہنی غلبہ رکھتا ہے۔ آخر میں یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ اس غالب شعبہ کی پرورش ایک ایسی چیز سے ہوتی ہے جو نفس کی گہرائیوں میں رہتی ہے اور غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ جوہر ہے جو سیرت کی تشکیل اور عہدِ شباب کی ذہنی زندگی کی تہذیب کرتا ہے۔

باب سوم

نوجوانوں کی تخیئلی زندگی

جو مجموعی نقشہ ایک نوجوان کی نفسی زندگی کا ہم نے کھینچا ہے اُس پر یہ اعتراض ہوگا کہ ہم نے اُن باتوں کو جو اعلیٰ ذہن والوں کے لئے مخصوص ہیں عام لوگوں کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ اس سرسری خاکہ میں یقیناً ہم اسپر مجبور تھے کہ نقوش کو زیادہ گہرا کر دیں تا کہ اُنکی خصوصیات اچھی طرح نمایاں ہو جائیں لیکن یہ کل باتیں نوجوانوں میں موجود ضرور ہوتی ہیں خواہ انکا اظہار مطلق نہ ہو سکے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ نوجوانوں کو اجڈپن کی حرکتیں کرنے سے بہت شوق ہے۔ وہ طاقت کا بیجا اظہار اس طرح کرتے ہیں گویا اُن کا نصب العین وحشیوں کی زندگی بسر کرنا ہے۔ یہ بات سب میں یکساں اور ہمیشہ نہیں ہوتی لیکن دیکھنے میں اکثر یہی حرکتیں آتی ہیں خصوصاً جب بہت سے نوجوان اکٹھا ہوں اور ساتھ ہی بالغوں پر رعب بھی ڈالنا چاہتے ہوں۔ لیکن جو لوگ نفسیات کے نقطۂ نظر سے اُن کی سیرت کو سمجھنا چاہتے ہیں اُنھیں ان نمایشی حرکتوں سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے کیونکہ یہ سب سطحی باتیں ہیں اور سطح پر یہ لوگ ویسے نظر آتے ہیں جیسا وہ اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں لیکن اُنکے نفس کے گہرے طبقوں میں بالکل دوسری کیفیت ہوتی ہے اور اسی کیفیت کو چھپانے کے لئے وہ سوائے اپنے محرمانِ راز کے اور سب کو محض اپنے نفس کا سطحی طبقہ دکھاتے ہیں لیکن جس قدر یہ اپنے دل کا حال چھپاتے ہیں اتنا ہی آرزوئے اظہار کا جوش و خروش بڑھتا ہے یہانتک کہ ایک دن مدت کے روکے ہوئے جذبات و خیالات منظر عام پر آجاتے ہیں۔ نوجوانوں کی اصلی حالت ہم پر اُسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ آرزوئے اظہار سے مجبور ہو کر خود اپنے نفس کے پردوں کو اُٹھا دیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ نظر آتا ہے وہ ایک زرہ ہے جو حفاظت کے لئے پہن لی گئی ہے۔ لیکن آخر اس زرہ کی ضرورت کیا ہے۔ اسکی جواب

پچھلے باب کے مضمون کی طرف عود کرنا پڑتا ہے۔ عنفوان شباب میں وہ رشتہ جو انسان کے نفس اور کائنات میں ربط پیدا کرتا ہے ٹوٹ جاتا ہے۔ اُس کے اور خارجی دنیا کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہو جاتی ہے کہ ہر چیز بیگانہ اور اپنی دسترس سے باہر نظر آتی ہے اسلئے نفس اپنی حفاظت کیلئے پیچ در پیچ بنجاتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات علاوہ جرمنی کے دوسری جگہ کے نوجوانوں میں بھی پائی جاتی ہے یا نہیں لیکن کسی میں بھی ہو یہ کسی طرح قابل اعتراض چیز نہیں کیونکہ اسکے پردے میں "آرزو" پوشیدہ ہے۔ دنیا میں کوئی قیدی اپنے قید خانہ کی سلاخوں سے اس تمنا کے ساتھ نہیں جھانکتا جیسے ہمارا نوجوان کسی کو عالم تنہائی میں دیکھے جانے اور سمجھے جانے کی اتنی تڑپ نہیں ہوتی جتنی اسے۔

اسی آرزو سے ایک نئی قوت پیدا ہوتی ہے جو اس فصل کو دور کرنا چاہتی ہے۔ یہاں سب انسانوں اور چیزوں کو جن سے ہمارا نوجوان جدا ہو گیا تھا کھینچکر اُس سے لا ملاتی ہے۔ یہ قوت تخیل ہے۔

یہاں یہ بات بہت ضروری ہے کہ ہم تخیل کے معنی صحیح سمجھیں ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ ہم نے اس لفظ کو بچہ کے تصور عالم کے ظاہر کرنیکے لئے پسند نہیں کیا تھا کیونکہ اس میں غیر واقعیت کا جو پہلو نکلتا ہے وہ بچہ کے ادراک میں نہیں پایا جاتا۔ نوجوان کی قوت مدرکہ سے مطلق بھی ہیں نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اُسے خود ہمیشہ یا اکثر اسکا احساس ہوتا ہے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اتنا بچپن اُس میں بھی پایا جاتا ہے کہ وہ واقعات پر خود جو رنگ چڑھاتا ہے یا شاعرانہ انداز میں جن غیر واقعی چیزوں کا تصور کرتا ہے اُنھیں بھی واقعیت کا جز و سمجھتا ہے۔ پھر بھی اس تخیل میں اور بچوں کے "تخیل" میں بہت فرق ہے کیونکہ یہ بالغوں کے شعبدۂ نظر سے جس میں جان بوجھ کر واقعات پر رنگ آمیزی کیجاتی ہے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اس مطلب کے ظاہر کرنے کے لئے علمی اصطلاحات موجود نہیں اسلئے ہم استعارہ سے کام لیتے ہیں۔

بچوں "کا تخیل" اشیار کے ساتھ ایک مکالمہ ہے جسمیں دونوں طرف سے باتیں ہوتی ہیں نوجوانوں کا تخیل یکطرفہ گفتگو ہے جس میں وہ خود بولتا ہے اور سارا عالم سنتا ہے یعنی بچہ اشیار کو ذی روح سمجھتا ہے اور اُسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ خود اُس نے اُنمیں جان ڈالی ہے نوجوان سب کچھ اپنے نفس سے پیدا کرتا ہے گویا

اُس داخلی قوت تخلیق کا عمل رُک جاتا ہے تو دفعتاً ساری اشیاء اُسکی نظر میں ننگی، بے روح اور بدصورت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اُسکے تخیل میں احساس وحدت کا بھولا پن نہیں ہوتا بلکہ اُسمیں بیقرار ہو کر ڈھونڈھنے اور پا کر خوش ہونے کی شان پائی جاتی ہے۔ میں نے کوئی بچہ نہیں دیکھا جسے آرزوے تلاش کا احساس ہو۔ اور نوجوان کے دل میں یہ آرزو نہ ہونا تصور سے باہر ہے۔

یہ پُر آرزو تخیل ہر چیز پر جو ہمارے نوجوان کی زندگی کے لئے اہمیت رکھتی ہے ایک نیا رنگ چڑھا دیتا ہے۔ فطرت پر اپنے ماحول پر اور سب سے بڑھکر خود اپنی ذات پر۔ اس تخیل کے ذریعہ سے نفس ٹٹول ٹٹول کر پھر اُس چیز کو پا لیتا ہے جس سے وہ جدا ہو گیا تھا یعنی غیر خود کو اور .... خود کو بطور ایک جداگانہ ہستی کے۔ اگر انسان اس نفسی "ترکیب"[1] پر جس کا ذہنی جال تمام اشیاء پر پھیلا ہوا ہے اس نقطۂ نظر سے غور کرے کہ اسکا منشا تمدن یا کائنات کی نسبت سے کیا ہے (جس سے ہمارا نوجوان خود یقیناً ناواقف ہوتا ہے) تو اسکی اہمیت نفس کی نشو و نما کے لئے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ پُر آرزو تخیل جو اشیاء میں احساس پیدا کر کے اُنکا ادراک حاصل کرنا چاہتا ہے توسیع نفس کا ایک ذریعہ ہے۔ اسکے ساتھ اُس صورت آرائی کی قوت کے بدولت جو اُسکے (تخیل کے) اندر پنہاں ہے یہ نفس کی تشکیل کا وسیلہ بھی ہے۔ اسلئے جوں جوں عمر میں پختگی پیدا ہوتی جاتی ہے اُس وقت[2] کا عمل کم ہوتا جاتا ہے۔ جب انسان کی نفسی نشو و نما مکمل ہو جاتی ہے تو تخیل قریب قریب فنا ہو جاتا ہے اور وہ شام کو تھیٹر دیکھنے یا گانا سننے اسلئے جاتا ہے کہ دوسرے کی واردات قلب یا شورش جذبات کے خزانہ سے کچھ قرض لے کیونکہ خود اُس کے اندر سے یہ چشمے اب نہیں اُبلتے صرف اُن لوگوں میں جنکا نفس نمو کی قوت بہت زیادہ رکھتا ہے تخیل بہت عرصہ تک باقی رہتا ہے اور اس صورت میں وہ بار بار از سر نو بالغ ہوا کرتے ہیں جسکی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر نوجوان کے تخیل میں وہ قوت تخلیق ہو جسپر صناعی مبنی ہے۔ نوجوان کے تخیل کا کام بقول شلائر ماخر کے خود اپنے نفس کی تشکیل ہے نہ کہ صناعانہ صورت گری اور جہاں یہ ہے کہ

---

[1] یعنی قوت تخیل پر۔ [2] صوفیوں اور رومانی (Romantic) شعرا کا یہ کہنا کہ خلاق تخیل کے پردے میں ناموس

زیادہ دن تک رہتی ہیں وہاں بہت سی صفات ایسی بھی ہیں جنکے اعتبار سے سچے صناع میں جو خارجی اشیا
کی تشکیل کی قدرت رکھتا ہے اور نابالغ نوجوانوں میں جنکی حد پرداز اپنی داخلی زندگی سے آگے نہیں
زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اب ہم نوجوان کے تخیل کی مختلف شکلوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ ایک وہ تخیل ہوتا ہے جو کسی موجود
موضوع ادراک کو لے کر اُس پر اپنا رنگ چڑھاتا ہے (پابند تخیل) اور ایک وہ ہوتا ہے جو دنیائے تخیل کے
خلا میں محض اپنے نفس کی روشنی سے نئی نئی چیزوں کا پرتو دکھاتا ہے (آزاد تخیل) پھر ایک صورت یہ ہے کہ
نوجوان آزاد تخیل مثلاً فنون لطیفہ سے زیادہ تر انفعالی تعلق رکھتا ہو اور ایک یہ کہ اُس میں قوت فاعلی زیادہ
ہو۔ ہم پابند انفعالی تخیل سے ابتدا کرتے ہیں اور سب سے پہلے اسکی مثال کے طور پر نوجوان کے مشاہدۂ
فطرت کا ذکر کریں گے۔

درمیانی منزل اُن بیداری کے خوابوں کی ہے جنھیں نوجوانوں کی امتیازی خصوصیت کہنا چاہئے۔
اس کے بعد صناعی (آرٹ) کی باری ہے جسمیں پہلے نوجوانوں کے ذوقِ فن کا ذکر آئے گا۔ پھر خود اُن کی
صناعانہ کوششوں کا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کا مرقع ہمارے نظام شمسی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ بچہ فطرت کی گود
میں پرورش پاتا ہے لیکن احساس فطرت نہیں رکھتا۔ وہ لاشعوری حالت میں فطرت کے ان حصوں کو
چن لیتا ہے جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے اُسکے لئے اہم ہیں اور اُنھیں سے سروکار رکھتا ہے۔ فطرت کے تبسم سے
اسکی روح کو بالیدگی ہوتی ہے اور فطرت کے قہر سے اسکا بند بند لرز جاتا ہے لیکن ان باتوں میں بچہ
ابھی نباتات کے مانند ہے۔ ابھی وہ فطرت کے ساتھ صرف ایسے تعلقات رکھتا ہے جن پر زندگی کا دارومدار ہے
دوسرے تعلقات بہت دن کے بعد آہستہ آہستہ قائم ہوتے ہیں۔ ان تعلقات کا جو جذبات پر مبنی ہیں یعنی
جمالیاتی رنگ رکھتے ہیں۔ نوجوان کو بھی پوری طرح شعور نہیں ہوتا لیکن وہ اُنھیں کسی نہ کسی حد تک محسوس
ضرور کرتا ہے اور اُن کی کچھ نہ کچھ کیفیت بھی بیان کر سکتا ہے۔

بالفاظ دیگر بچہ خود فطرت کا ایک جزو ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا ہولڈرلین نے اپنے بچپن کو یاد کرتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"وہ دن جب میں بھی تیری نقاب میں روپوش تھا اور اُس سے کھیلتا تھا"

"وہ دن جب میں تیرے گلبن میں ایک غنچۂ ناشگفتہ تھا"

نوجوان کی زندگی کا مرکزی نقطہ فطرت سے الگ ہو جاتا ہے اور ایک مستقل ہستی اختیار کر لیتا ہے۔ اُس کی زندگی اب فطرت کے آغوش میں نہیں بسر ہوتی لیکن وہ پھر اُس سے ہمکنار اور ہمکلام ہونا چاہتا ہے۔ اس طرح کہ جہانتک ممکن ہے وہ فطرت کو اپنے جذبات وکیفیات کے رنگ میں رنگ دیتا ہے یا شاعرانہ تخیل کے ذریعہ سے اُسکے "جذبات وکیفیات" کو اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے۔ یہ مشاہدۂ فطرت جذبات پرستانہ ہے یعنی بالکل داخلی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسمیں اندرونی عنصر اس قدر غالب ہے کہ وہ عظیم الشان آزاد فطرت جو خارج میں موجود ہے ہمارے نوجوان پر خود اپنی زندگی کا اثر نہیں ڈال سکتی۔ اس سے وہی لوگ متاثر ہو سکتے ہیں جنکا نفس بالکل پختہ ہو چکا ہے اور جذبات پرستی کی جگہ دوبارہ بھولے پن کا رنگ اختیار کر چکا ہے مثلاً گوئٹے۔

چنانچہ نوجوانوں میں جس حدتک نفسی بیداری پیدا ہو چکی ہے اُسی نسبت سے اُن کا احساس فطرت لطیف ہوتا ہے۔ جس قوم میں یا جس عہد میں زندگی کا مرکز خارجی عالم ہو مثلاً یونان کا کلاسیکی زمانہ اُس کے لوگوں میں داخلیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا احساس فطرت بہت کم نظر آتا ہے۔ برخلاف اس کے جس عہد میں لوگ بالکل داخلی زندگی بسر کرتے ہیں اور عالم محسوسات ومشاہدات کی نفی کرتے ہیں انہیں احساس فطرت سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ مکمل احساس فطرت صرف وہ لوگ رکھتے ہیں جنہیں دونوں باتیں موجود ہوں جو داخلی تفکر کا بھی ذوق رکھتے ہوں اور خارجی عالم کی حس اور مشاہدہ سے بھی لطف اُٹھاتے ہوں مثلاً اُس زمانے کے لوگ جب یورپ میں نشاۃ ثانیہ اپنے شباب پر تھی یا روسو کے عہد اور گوئٹے کے ابتدائی زمانیکے لوگ، اسکا بہترین مظہر ایک مشہور سین ہے۔ پطرارکا وینٹو کے پہاڑ پر کھڑا مناظر قدرت سے روحانی لطف اُٹھا رہا ہے کہ دفعتاً اگسطین مقدس کا ایک لفظ سنکر وہ پھر اپنے نفس کے مطالعہ میں ڈوب جاتا ہے۔

یہ سنکر تعجب نہ ہوگا کہ اس نئے "جمالی تعلق" میں جو عنفوان شباب میں فطرت سے پیدا ہو جاتا ہے

ایک مافوق الطبعی جھلک بھی ہوتی ہے فیلکس ڈان اپنے بچپن کے متعلق لکھتا ہے:-

"عجیب بات یہ تھی کہ ایک گہری، دائمی، ایک پر درد الم جسے کسی طرح کے خطرے یا خوف سے کوئی تعلق نہ تھا، بچپن ہی میں مجھ پر شام کے وقت چھا جاتا، جب میں اپنے باغ میں ہوتا تھا۔ اگر یہ کیفیت خزاں کے موسم میں ہوتی تو کہتے کہ یہ گرتی ہوئی پتیوں کہرے اور پالے کا اثر ہے لیکن غضب تو یہ ہے کہ یہ واقعہ عین موسم بہار اور موسم گرما میں ہوتا تھا۔"

گرمیوں کا جو سب سے دلفریب دن ہوتا تھا اسی دن شام کو یہ حالت مجھ پر طاری ہو جاتی تھی جب میں کھیلتے کھیلتے تھک چکتا تھا، بڈھا جیکب اپنا کام ختم کر کے باغ میں چلا جاتا تھا۔ میرے ماں باپ تھیٹر میں ہوتے تھے اسوقت مجھے کوئی چیز مجبور کر دیتی تھی کہ سانس روک کر اور کان لگا کر شام کی بڑھتی ہوئی بھیانک خاموشی کی آواز سنوں، پہلے کلیسائے سینٹ لوئی کا گھنٹہ بجتا تھا اور اب میری آنکھوں سے گرم اور دلخراش آنسوؤں کی نہر جاری ہو جاتی تھی۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا یہ ہے موت، یہ ہے زندگی کا انجام، یہ ہے ناگزیر خاتمہ ساری حسین چیزوں کا۔ موت، دائمی موت!"

تنہائی، دل گرفتگی، روحانی آرزو، اور روحانی احساس، یہ سب چیزیں انسان کو فطرت کے آغوش میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہیں جس سے "خستگی کی داد" پانے کی توقع ہوتی ہے لیکن دو باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فطرت محض کاغذ تصویر کا کام دیتی ہیں جس پر خود اپنے دل کی بیچینی کے نقوش بنتے رہتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کبھی کبھی دل میں اس خیال سے صدمہ گزرتا ہے کہ فطرت ہم سے مخاطب نہیں ہوتی دوسرے جب خود اپنی طبیعت میں اُمنگ، جولانی اور کس نہ ہو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت بھی دفعتاً ننگی، بے زبان، بے احساس، بے مروت ہو گئی اور ہم سے دور بے انتہا دور ہٹ گئی ہے۔ اب یہ ہماری نظر میں ایک عظیم الجثہ خوفناک ڈائن معلوم ہوتی ہے جو ہمیشہ بچے جنتی ہے اور انھیں پھر کھا جاتی ہے۔

اس احساس فطرت میں جو متضاد کیفیتیں ہوتی ہیں اُن کی بہترین تصویر بعض کتابوں میں ملتی ہے جنکے مصنفوں میں شباب کا پُر آشوب زمانہ گزر جانے کے بعد بھی عنفوان شباب کی بیچینی باقی تھی۔

جسمیں کبھی جذبات جوش و خروش سے اُبلتے ہیں کبھی دل رنج و ملال سے ڈوب جاتا ہے اور کبھی بے حسی اور ترک دنیا کی دردناک کیفیت دل پر چھا جاتی ہے۔ روسو کی "نئی ہلواس" میں گوئٹے کے "ویرٹر" میں اور جرمن عہد رومانی کے آغاز کی شاعری خصوصاً ہولڈرلین اور نووالس کے کلام میں بار بار احساس فطرت کے متعلق "اعترافات" ملتے ہیں۔

نوجوان فطرت کے اُن مناظر سے زیادہ اُنس رکھتا ہے جو رومانی کہلاتے ہیں مثلاً جادو جگانے والی چاندنی رات، تاروں بھرا آسمان، جنگلوں کی خاموشی، جھیل کا ٹھہرا ہوا پانی، آبشار، سمندر، درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑ، ہوا کا طوفان، پانی کا طوفان، شام کا سہانا سماں۔ کبھی کبھی تاریخی واقعات کے تعلق سے مقامات کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ جس دلفریب خطۂ زمین میں ویرانے، پُرانے شہر یا پُرانی یادگاریں ہوں وہ تو ہمارے نوجوان سے زبان حال سے باتیں بھی کرتا ہے۔ جرمنی کے سیلانی پرندے[1] اسی واردات قلبی کے سرچشمے سے سیراب ہوتے ہیں۔

احساس فطرت ہی میں مدرک چیزوں کو بڑی حد تک اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں تو بیچاری کشتۂ تغافل فطرت کا قدم بالکل درمیان میں نہیں رہتا۔ ہمارا نوجوان اکثر بیداری میں خواب دیکھتا ہے۔ فریڈرک گیزے نے جو نمونے نوجوانوں کی شاعری کے جمع کئے ہیں اُن میں اگر ہم سب الفاظ کو شمار کریں تو معلوم ہوگا کہ جس کثرت سے "خواب" اور "خواب دیکھنا" جابجا آیا ہے شاید ہی کوئی دوسرا لفظ آیا ہو۔ یہ خواب تقریباً ہمیشہ تمنا اور آرزو کے خواب ہوتے ہیں ان کی تہ میں کھوئی ہوئی دنیا کو دوبارہ حاصل کرنے کی خواہش پوشیدہ ہے۔ یہ خواہ کوئی صورت اختیار کریں ان کی اصل وہی احساس ہے جسے ہم عنوان شباب کا بنیادی احساس کہتے ہیں یعنی ایک آرزو کسی غیر متعین شے کی۔ کبھی یہ آرزو جوش بنجاتی ہے۔ وہ بے انتہا جوش کہ انسان انتہائی دلیری کے کام کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے اور کبھی ایسی دل گرفتگی جو بڑھتے بڑھتے خودکشی کا تصور اور موت کی آرزو ہو جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوانوں کو بعض اوقات دفعتاً چپ سی لگ جاتی ہے اور وہ کسی خیال میں محو ہو کر رہجاتے ہیں

---

[1] جرمن لفظ Wandervoegel کا ترجمہ ہے۔ جرمنی میں تحریک شباب کے سلسلے میں جو جماعتیں قائم ہوئیں اُن میں سے سب قدیم جماعت نے یہ لقب اختیار کیا تھا۔

ان لمحات میں وہ اپنی دوسری دنیا میں پہونچ جاتے ہیں جو اُن کے لئے اصلی دنیا ہے ۔ ان بیداری کے خوابوں میں اکثر انسان اُنھیں باتوں کی اُدھیڑبن میں رہتا ہے جو اُس پر گزر چکی ہیں ۔ یہ واردات قلبی کی صدائے بازگشت ہے، کیف نفس کا خمار ہے، باہر سے آنے والے نغمہ کی مشق ہے ۔ دوسری قسم ان خوابوں کی خواب آرزو یعنی شیخ چلی کے منصوبے ہیں جنکے پردے میں نخوت بھری اُمیدیں پوشیدہ ہیں ۔ ان میں ہمیشہ واقعیت کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے جس کی بنا پر آزاد خلاق تخیل عالیشان عمارتیں کھڑی کر دیتا ہے ۔ اس خواب وخیال کا مرکز زیادہ تر خود اپنا پُراسرار نفس ہوتا ہے ۔ ہمارا نوجوان اپنے آپ کو کبھی ذہانت وفراست کا پتلا کبھی شاہزادہ کبھی ولی تصور کرتا ہے ۔ زیادہ تر وہ شبدیز تخیل پر سوار ہو کر دور ودراز ملکوں اور گذرے ہوئے عہدوں میں پہونچتا ہے کیونکہ یہاں واقعیت بہت کم اسکی راہ میں حائل ہوتی ہے ۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی شخصیت کو بھی اُسکی شاعرانہ بلند پروازی کچھ سے کچھ کر دیتی ہے ۔ جرمنی کے رومانی شاعروں نے ان سب چیزوں کے لئے ایک علامت وضع کی ہے نیلا پھول ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان تصورات کے باہمی ربط سے پورے پورے رومان تیار ہو جاتے ہیں جنکا سلسلہ برسوں جاری رہتا ہے اور بلوغ کے بعد بھی بالکل منقطع نہیں ہو جاتا ۔ ان افسانوں کے "اشخاص" جو قرار دیے جاتے ہیں اُنکی سیرت پر ہمارا نوجوان کچھ اپنی سیرت کا رنگ بھی چڑھا دیتا ہے بعض اوقات یہ چیزیں جونک کی طرح چمٹ جاتی ہیں اور روزمرہ کی صحیح زندگی کا خون چوس لیتی ہیں نوجوانوں کے جرائم کی تحقیقات سے کبھی کبھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ واقعی زندگی کے ساتھ ساتھ ایک خیالی زندگی بھی بسر کرتے رہے ہیں ۔ باہر سے دیکھنے والے ایک سیدھے سادے نوجوان کو دفعتاً کسی جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھکر حیران رہجاتے ہیں مگر ممکن ہے کہ محرکات کے دوسرے سلسلہ میں جو مفروضہ صحیح اور واقعی زندگی کی سطح کے نیچے چل رہا ہے ۔ اُس کا فعل بالکل ترتیب کے مطابق ہو ۔ جو سمجھنا چاہتا ہے اُس پر لازم ہے کہ ان گہرائیوں سے واقف ہو ۔

۳ ۔ انھیں نئی قوتوں پر جنکا یہاں ذکر ہے نوجوانوں کا ذوق فنون لطیفہ بھی مبنی ہے ۔ جمالی احساس بچپن میں بھی کچھ نہ کچھ موجود تھا ۔ خاص کر لڑکیوں کو بہت کم سنی میں فنون لطیفہ کی ادا

سے مناسبت ہوتی ہے لیکن آرٹ کا اصل احساس جو لطف حیات، کیف صورت اور ذوق شے سب سے بالا ہے، عنفوانِ شباب میں شروع ہوتا ہے۔ اس کی نفسیاتی توجیہہ سہل ہے۔ آرٹ کو جو چیز آرٹ بناتی ہے وہ "صورت" ہے جو اشیا کو نفس کی "روانی" کی بدولت ملتی ہے۔ ہمارا تخیل اشیا میں جان ڈالتا ہے اُن میں احساس جذبات کا ہونا فرض کرتا ہے۔ اگر یہ سب تناسب اور روانی کے ساتھ ہو تو آرٹ ہے جس نے اپنے نفس میں اس روانی کو محسوس نہیں کیا ہے وہ اشیا میں جان نہیں ڈال سکتا یعنی آرٹ کا لطف نہیں اُٹھا سکتا۔

بچہ شاعرانہ فسانوں کو واقعات سمجھتا ہے۔ اُس پر جو کچھ اثر ہوتا ہے محض واقعات کا۔ خالص احساس مشاہدہ جو مدرک کے نفس میں پیدا ہوا کرتا ہے بچہ میں بہت کم ہوتا ہے۔ ابھی تک واقعیت کا پلہ بہت بھاری ہوتا ہے۔ مدرک کو ابھی اتنی آزادی نہیں ہے کہ اپنی طرف سے واقعات میں کچھ تصرف کرے یا دوسرے پہلو سے یوں کہنا چاہئے کہ ابھی تک نفس میں تخیل اور واقعیت کے دائرے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے ہیں اسلئے خیالی تصاویر سے بھی خالص جمالیاتی اثر نہیں پڑتا بلکہ وہ واقعی اشیا معلوم ہوتی ہیں۔ عنفوانِ شباب میں بھی جمالی احساس بہت ہی آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے۔ پہلے تو احساسی پہلو چپکے چپکے واقعاتی پہلو کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہے لیکن دفعتاً یہ غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ طبیعت کا یہ میلان بجائے قصصی (Epic) شاعری کے غنائی (Lyric) شاعری کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے بالکل آغاز میں بدلے ہوئے اندازِ طبیعت کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ہمارا نوجوان اُن چیزوں کو پسند کرنے لگتا ہے جو جذبات پر گہرا اثر ڈالتے ہیں لیکن اور کوئی بات اُن میں نہیں ہوتی۔ جو چیزیں جذبات سے لبریز ہوں، درد و الم سے بھری ہوں، اثر سے معمور ہوں اُنکی قدر کی جاتی ہے لیکن جنھیں اعتدال و تناسب کے سبب سے مکمل "صورت"

(بقیہ صفحہ ۵۹) یہاں جمالیات کی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ خوبصورت چیزوں کے دیکھنے سے جو کیفیت صناع میں پیدا

پیدا ہو گئی ہو جنمین خارجی اشیا اور نفس کا یعنی "اثر" اور "ادا" کا امتزاج ہو چکا ہو اُنکی طرف توجہ نہین ہوتی۔ اس عمر مین انسان سمجھتا ہی کہ آرٹ کا سب سے بڑا مقصد نہایت گہرے داخلی جذبات کا عکس اُتارنا ہی۔ خود اشیا کے قوانین صُورت کو (جنکے مشاہدہ محض مین تبدیل ہونیکے لئے ضروری ہے کہ انسان تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپکو بھول جائے) نوجوانون کا نو دریافت نفس تسلیم نہین کرتا اسلئے آرٹ کا جو طرز نوجوانون کی طبیعت کے موافق ہی وہ Expressionism ادا پرستی ہو یعنی یہ عقیدہ کہ آرٹ کی تخلیق مین داخلی عنصر بہت زیادہ اہم ہی اور عموماً وہ لوگ جنھون نے کچھ سیکھا نہین ہی اسی طرز کو اختیار کرتے ہین۔

یہی سبب ہے کہ اس عمر مین انسان آرٹ مین بھولے پن کو بہت ناپسند کرتا ہی جرمنی کے مدرسو نمین ہو اُس عمر مین پڑھایا جاتا ہی جب اُسکی شاعری کے اندازے بالکل مناسبت نہین ہوتی۔ بچہ خود بھولا ہوتا ہی اسلئے اُسے آرٹ کے بھولے پن کا احساس بحیثیت "ایک صورت" کے نہین ہو سکتا۔ بھولے پن کا لطف اصل مین وہ اُٹھاتا ہی جو خود بالکل پختہ ہو چکا ہی۔ گوئٹے کی "ہرمان" اور "ڈورتھیا" کا انٹرنس کلاس کے لڑکون پر کوئی اثر نہین ہوتا البتہ لڑکیون پر ممکن ہے کچھ تھوڑا بہت ہو کیونکہ وہ زندگی کے خارجی قانون کے آگے مقابلۃً کم عمر مین سر جھکا دیتی ہین اور اسلئے اُنمین احساس "صورت" موجود ہوتا ہی۔

ہمارا مطلب یہ کہنے سے کہ نوجوان کا میلان خاطر بجائے قصصی شاعری کے غنائی شاعری کی طرف ہو جاتا ہی یہ نہین کہ شاعری یا دوسرے فنون لطیفہ مین وان دونون طرزونمین سے کسی ایک کو سراسر مقبول اور دوسرے کو بالکل رد کرتا ہی بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے ہین کہ شاعری کے تینون طرزون مین جتنا غنائی عنصر ہوتا ہی اُسی کو وہ پسند کرتا ہی واقعات سے دلچسپی اور قصہ کا لطف ابتدا مین بدستور باقی رہتا ہی لیکن جمالیاتی احساس سب سے زیادہ اُن حصّون کا ہوتا ہی جنمین کسی خارجی واقعہ کا ذکر نہین ہے بلکہ جنمین انسانی احساس ارادہ جذبات کی کشمکش اور قلب کی بےچینی کی تصویر ہی۔ واقعات مین اب ایسی باتون کی ضرورت ہوتی ہی جو اپنے دلگو لگتی ہون۔ دنیا کے حوادث مین انسان اور اُسکے نفس کا جو حصّہ ہی اُس پر اب زیادہ نظر رہتی ہی۔ اسی کے ساتھ افسانہ کے اشخاص کی سیرت اور اُنکے اندرونی

مصائب سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے لیکن اسمین زیادہ باریکی سے کام نہین لیا جاتا۔ سیدھی سادھی تحریرین جو سمجھنے مین آسان ہون جیسی شلر کے ڈرامو نمین ہوتی ہین نوجوانون کے لئے بہت دلکشی رکھتی ہین ابتک انسانون کو سمجھنے مین چند بنیادی جذبات و خصائل سے کام لیا جاتا ہے اور نفس کی پیچیدہ ترکیبو نسے بالکل واقفیت نہین ہوتی وہی حالات اور موقعے سب سے زیادہ مرغوب ہوتے ہین جو اپنے جذبات کی آگ کو بھڑکاتے ہین۔

ڈراما "تمثیل" جو قدمائے یونان کے نزدیک قصصی اور غنائی شاعری کی ترکیب کا نام ہے اس عمر مین سب سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اسے ناول کے مقابلہ مین اسلئے ترجیح دی جاتی ہے کہ یہان واقعات بالکل نظر کے سامنے ہوتے ہین اور اشخاص گویا چلتے پھرتے نظر آتے ہین علاوہ اسکے قصہ مین المناک اور جذبات انگیز مواقع جمع کر دیے جاتے ہین جو دل پر بہت اثر کرتے ہین۔ آرٹ کی صنعت کا لطف اُٹھانا نہین نوجوان زیادہ اہم مضمون اور واقعات کو سمجھتے ہین۔ اسے خالص جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھنا وہ ابتک مطلق نہین جانتے اُنھین اس سے شوق اصل مین اسلئے ہوتا ہے کہ اسمین انسانی زندگی کی بوقلمون تصویرین نظر آتی ہین جن سے تخیل کو موقع ملتا ہے کہ اپنے آپ کو مختلف حالتون مین دیکھے تماشہ گرون کے ساتھ قسم قسم کے روپ بھرے اور طرح طرح کی زندگی کا لطف اُٹھائے تاکہ اُسکی نفسی زندگی کا دائرہ وسیع ہو جائے۔ تھیٹر کی اہمیت نوجوان کی ارتقائے سیرت کے لئے یہی ہے کہ اسکے ذریعہ سے اُسے زندگی کی گوناگون تشکیل مین حصہ لینے کے موقعے ملتے ہین جو واقعی زندگی مین کبھی نہ ملتے۔ تھیٹر مین سے رنگا رنگ اور واقعات سے مالا مال زندگی بسر کرنیکا وہ مزا ملتا ہے جو ناول کے مطالعہ مین بھی نہین ملتا وہ مختلف اشخاص کے نقطۂ نظر سے دنیا کو دیکھنا سیکھتا ہے۔ ان اشخاص سے اُسے جو دلی ربط ہوتا ہے وہ پختہ مغز تماشائی کو نہین ہوتا کیونکہ آرٹ کا بہترین لطف تو یہی ہے کہ قصہ کے کل اشخاص ایک خارجی سطح پر نظر آئین جہان ذاتی محبت اور نفرت کی صداہت مدھم ہو کر پہونچتی ہے۔ شلر نے بجائے خود اندرونی عمل تخلیق کے تقاضے سے والن اشٹائن کو اسی سطح پر رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس تمثیل کے ناظرین مین سے علاوہ نوجوانون کے اور بھی بہت سے لوگ شاعر کے کھلے ہوئے مقصد کی مخالفت

کرتے ہین اور ان انسانون کو زبردستی الیٹ کی مثل سدھا بنا دیتے ہین۔

چونکہ تماشاگر (Actor) اپنے پیشہ کی بدولت طرح طرح کی زندگی بسر کرتا ہوا نظر آتا ہی اسلیئے وہ ہمارے نوجوان کی محبت و احترام کا مرجع بنجاتا ہی۔ نوجوان خود یہ چاہتا ہی کہ ہمیشہ ایک سا نہ رہے بلکہ اُسکی طرح زندگی کے مختلف پہلوؤن پر قابو حاصل کرے۔ وہ چاہتا ہی کہ مختلف اشخاص کا روپ بھرے۔ مختلف مواقع کا تجربہ کرے اور اُن تمام احساسات کا لطف پہلے سے اُٹھالے جو اُسے یا تو بہت دن بعد نصیب ہون گے یا کبھی نہون گے۔ اُسکے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہی کہ تماشہ گر کی طرح اُسے بھی دیکھنے والے ملین جو جوش و خروش کیساتھ جو ہمدردی اور تعریف کا اظہار کرین۔ قدرتی بات ہے کہ اسطرح کے خیالات اُسے خود تماشہ گر بننے پر راغب کرتے ہین اور تماشہ گاہ اُسکی نظر مین روزمرہ کی بےہوش اور بےلطف زندگی سے بدرجہا بلند اور برتر چیز معلوم ہوتی ہی اسی لئے تھیٹر کا تماشہ دیکھنے اور خود کھیلنے کا شوق نوجوانون کے سلسلۂ ارتقا کی ایک ضروری کڑی ہی بلکہ ایک ذریعۂ تعلیم ہی جس سے معلمون کو جان بوجھ کر فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

"ولہیلم مائسٹر" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہی کہ یہی منزل تھی جسمین گوئٹے نے اپنی شاندار ارتقائے نفسی کے دوران مین بہت عرصہ تک قیام کیا تھا اور جس سے اُسکو دلی اُنس پیدا ہو گیا تھا اسکا آغاز اسطرح ہوا کہ وہ گھر پر خود کٹھ پتلی کا تماشہ کیا کرتا تھا۔ اس بات کو اُسکے شاعر ہونے یا ہونے سے کوئی تعلق نہین۔ اگر آگے چلکر اُسکی شاعری تمثیلی رنگ اختیار کرتی بلکہ اگر وہ سرے سے بالطبع شاعر ہی نہوتا تو بھی اُسکے دلمین نوجوانی مین تماشاگر بننے کا شوق ضرور پیدا ہوتا۔ اُسنے ولہیلم مائسٹر کے متعلق جو الفاظ اُسکے تھیٹر کے شوق کا ذکر کرتے ہوئے کہے ہین ان کا مصداق اصل مین وہ خود ہے۔ ولہیلم اپنے دلمین کہتا تھا۔ "کتنا خوش نصیب ہے، یہ کامیڈی کھیلنے والا! دیکھو اسکے اس کیسے زرق برق کپڑے ہین۔ اسکے حرکات و سکنات مین کسقدر متانت اور سنجیدگی ہی اور اسکا دل کن کن پاکیزہ اور شاندار خیالات و جذبات کا آئینہ ہے بلاشبہ اسکی گھریلو زندگی پسندیدہ افعال و اعمال کا ایک مرقع ہوگی جسکی محض خفیف سی جھلک ہم اسکے تماشے مین دیکھتے ہین جیسے کوئی چاندی کو دور سے چمکتا

دیکھے"

نوجوان لڑکیوں کا روز شام کو تماشہ گاہ کے باہر اسٹیج کے دروازے پر (نوجوان لڑکے بھی وہاں ہوتے ہیں مگر کچھ فاصلے پر) اس توقع میں کھڑا ہونا کہ اُن کے دیوتا یا دیوی کی ایک جھلک نظر آجائے بڑے سخت دھوکے پر مبنی ہے۔ وہ انکی زندگی کو اور ان کے پیشے کو خدا جانے کیا سمجھتی ہیں لیکن یہ اُن نتیجہ خیز دھوکوں میں سے ہے جو وہ اپنے اندرونی قانون ارتقا کی بدولت کھاتے ہیں کیونکہ اسکے پردے میں وہی مکمل زندگی کی آرزو کارفرما ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز کی آرزو، اُسکی بیچین کردینے والی حرکت کی آرزو اور اسکے مست کردینے والے جھکولوں کی آرزو۔

تمثیل سے نوجوانوں کے جمالیاتی اور غیر جمالیاتی تعلق کی بابت ہم نے جو کچھ کہا ہے اُس کا اطلاق بعض ضروری تبدیلیوں کے بعد ناول پر بھی ہو سکتا ہے۔ پڑھنے کی بھوک بھی اصل میں زندگی کی بھوک ہے۔ پہلے تو حیرت انگیز سرگذشتوں کا شوق ہوتا ہے۔ پھر مشاہیر کے حالات کا، پھر ہر طرح کے جذبات انگیز مضامین کا اور ایک طویل وقفے کے بعد عشق و محبت کی داستانوں کا۔ کیونکہ آرزو کی آگ کو یہی چیز سب سے زیادہ بھڑکاتی ہے۔ ان سب میں ابتک زیادہ دلچسپی مضمون سے ہوتی ہے۔ جمالیات کا مذاق رکھنے والے اکثر کتابوں کو جو نوجوانوں کے دل کو لگتی ہیں "بازاری" قرار دینگے۔

مخرب اخلاق کتابوں کی حمایت کوئی سمجھدار آدمی نہ کریگا لیکن کتابوں کا مخرب اخلاق ہونا بہت کچھ پڑھنے والے کی عمر پر موقوف ہے۔ ہمیں یہ بھولنا چاہئے کہ نوجوان پڑھنے والا کتاب کے قصہ پر بہت کچھ اپنا رنگ چڑھا دیتا ہے اور اکثر اُسکے معیار کو بلند کر دیتا ہے۔ اصل میں کتاب میں یہ چیزیں کسی آنکھ کو نظر نہیں آتیں۔ فرائی ٹاگ کی کتاب (Ahnen) پر کسی شخص کو رائے دینے کا حق نہیں جبتک اُسکے دل کے کسی گوشہ میں نوجوانی کی حرارت نہ موجود ہو۔

یہ سوال کہ "تمہاری ارتقائے نفسی پر کن کتابوں نے بہت گہرا اثر ڈالا ہے"۔ نفسیات ارتقا اور نفسیات تمیزی کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ بانڈی نے مزدور پیشہ لوگوں کے بچوں کی بابت جو تحقیقات کی ہے اسمیں یونہی چند کتابوں کا نام لے دیا ہے۔ اگر ہم اس بات کو مدنظر رکھیں کہ

نوجوان نادلون اور ننیلون کے اشخاص کے ساتھ اُسی طرح رہتے سہتے ہین جیسے سچ مچ کے آدمیون کے ساتھ تب کہین یہ اندازہ ہوگا کہ کتابون کا اثر نوجوان کی نفسی رفتار پر کتنا گہرا ہوتا ہی. اس معاملہ مین زیادہ گہری تحقیقات کی ضرورت ہی جسکی ضمن مین یہ بھی دریافت کرنا چاہئے کہ نوجوان کس قسم کی کتابون کو ترجیح دیتے ہین. محض اعداد و شمار جمع کرلینا کافی نہین ہو اتنا معلوم ہی کہ اس عمر مین سفرنامے اور تاریخی ناول زیادہ مرغوب ہوتے ہین.

دوسرے فنون لطیفہ سے نوجوانون کو جو تعلق ہی اُسکا ذکر ہم زیادہ اختصار سے کرینگے ظاہر ہی کہ ان چیزون تک اُسکی پہونچ شاعری کے مقابلہ مین بہت دشوار ہی اسکے بعد سب سے زیادہ اہمیت موسیقی کو حاصل ہی. اکثر لوگون نے کہا ہی کہ موسیقی کی صلاحیت اور نشو و نما عام نفسی ارتقا سے اتنی بے تعلق ہے جتنا ذہنی زندگی کا کوئی شعبہ نہین. یہی حال ریاضی کا ہی. اس سے جو مناسبت طبیعت کو ہوتی ہی اُسے عام ذہانت سے کوئی واسطہ نہین. جن لوگون مین موسیقی کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہو وہ بچپن ہی سے نغمون کے سمجھنے اور ادا کرنے مین احساس کی گہرائی اسقدر رکھتے ہین کہ اُسکا معیار اُنکی عام ارتقائے نفسی کے مقابلہ مین بہت بلند ہوتا ہی. لیکن اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے یہ جگہ نہین ہی جن نوجوانون کو موسیقی سے اوسط درجہ کی مناسبت ہوتی ہی وہ کہین بلوغ کے قریب پہونچکر موسیقی سے روحانی لطف اُٹھا سکتے ہین. اُسوقت تک وہ اُن کے لئے محض سُر تال کا کھیل ہے. خصوصًا موسیقی کی کسی "جز" مین وحدت کا احساس بہت دن کے بعد پیدا ہوتا ہی لیکن عام طور پر نوجوان کو کسی راگ کے خارجی موضوع سے بہت کم دلچسپی ہوتی ہی بلکہ ہم اپنے ذہن مین ایک مثال (Type) قائم کرکے کہہ سکتے ہین کہ نوجوان بیتھوون یا (Chopin) یا گریگ (Grieg) کے کسی نغمہ کو ساز پر بجاتے وقت اصل مین خود اپنے جذبات ہی کھیلتا ہی. ایک نوجوان کا قول ہی: "ممکن ہی کہ میرے ساز مین دوسرون کو فن کا لطف نہ آئے مگر مین تو ایک کیفیت مین ڈوب کر بجاتا ہون اور بجاتے بجاتے مجھپر ایک عالم طاری ہو جاتا ہی." جو واقعی تصرف نوجوان کسی پارۂ موسیقی پر کرتے ہین اُسمین تال، لے، تقسیم سب کچھ بدل جاتی ہی. مستند استادون کے نغمون کی مشق انتہائی غیر مستند انداز مین کیجاتی ہی.

Chopin کی آتش نفس تب و تاب خواب آسا لوچ، اور وئبر با روانی جو نوجوانون کو
اسقدر مرغوب ہے، اسکا سبب محض یہی نہین کہ یہ اس زمانہ کا مذاق ہے بلکہ قاعدہ کی بات ہے کہ جبتک مذاق
پختہ نہو انسان اُسی موسیقی کو پسند کرتا ہے جسمین ظاہری اثر زیادہ ہو۔

صورتگری کے فنون (سنگتراشی وغیرہ) مین ادنیٰ جذبات سے کھیلنے کا تو زیادہ موقع نہین
لیکن یہان بھی نوجوان موضوع کو نظرانداز کرتے ہین اور اُنپر جو اثر ہوتا ہے وہ محض ذوق نظر تک محدود ہے
یہ لوگ تصویرخانون مین اس غرض سے جاتے ہین کہ جی بھر کر رنگون کی دلفریبی کا لطف اُٹھائین۔
عجائبخانون کی سیر اسلئے کرتے ہین کہ کسی مجسمہ سے اُنھین ذاتی لگاؤ ہے۔ غرض اس سیدا ان مین بھی انھین
نفس شے سے کوئی دلچسپی نہین ہوتی لیکن ان چیزون سے بلاواسطہ اور جان بوجھکر شہوانی دلچسپی
جسکا ذکر "جدید" عہد کے ایک نوجوان کے روزنامچہ مین ہے شاذ و نادر ہی کسی کو ہوتی ہے۔ وئیڈہ کنڈ[1] کی
شان مین ایک قصیدہ لکھنے کے بعد یہ صاحبزادے فرماتے ہین "عام حسیات مثلاً دیکھنا سننا میرے لئے
خاص شہوانی حسیات کا کام دیتی ہین۔ موسیقی کے نغمے مجھے بیچین کر دیتے ہین۔ تصویر کے گرما گرم رنگ
دیکھکر میرے بدن مین سنسنی پڑ جاتی ہے اور سب سے بدتر وہ چیزین ہین جو چھونے مین نرم ہون۔ بال ----
ہائے نرم بال ---------- بس ---------- بس ---------"

نقاشون کے بچپن کے احساسات کا اطلاق عام نوجوانون پر کرنیکا ہمین کوئی حق نہین۔ البتہ
گوئٹے نے جہان صورت گرانہ فنون کے متعلق اپنے بچپن کے احساسات کا ذکر کیا ہے اُس سے رائے قائم
کرنیمین کسیقدر آسانی ہوسکتی ہے لیکن اسکے لکھنے مین نوجوانی کا رنگ باقی نہیں رہا۔

۴۔ نوجوانون کی تخیلی زندگی کی بلند ترین منزل اُن کے تخیل کی خلاقی ہے اور وہ بھی ایسی خلاقی
جو آرٹ کے نقطۂ نظر سے کیگئی ہو اصل مین تو نوجوان کو جو شوق تشکیل و صورتگری کا ہوتا ہے اُسمین اظہار
خودی کا عنصر اسقدر غالب ہوتا ہے کہ شاید ایک سخت گیر نقاد اس سارے کھیل کو جمالیات کے دائرہ ہی سے
خارج کر دیگا اشیاء مین جو قانون صورت کارفرما ہے اُس سے نوجوانون کو ابھی تک مس بھی نہین ہوتا

[1] جرمنی کا ایک مشہور فسانہ نگار جو جنسی اور شہوانی جذبات کی مصوری مین کمال رکھتا ہے۔

بلکہ خود نفس کا قانون صورت بھی ابھی مکمل نہین ہوتا اسی لئے انھین یہ آرزو ہوتی ہی کہ اپنے اندرونی جذبات کو خارجی شکل دیدین مختصر یہ کہ نوجوانونکی صنّاعانہ کوششون کا مقصد فطرت نے یہ رکھا ہی کہ ان کے ذریعہ سے اُنکے نفس کے تلاطم خیز کیفیات کا اظہار ہو سکے۔ نوجوانون کی ارتقائے نفسی مین ان کی بہلی اہمیت نوجوانون کا آرٹ اور پرستی ہی۔ اسمین مکمل آرٹ سے کہین زیادہ اس بات کا موقع ملتا ہی کہ انسان اپنے نفس کی حالت کا ہو بہو اظہار کر سکے اور خارجی تشکیل کی ان ناقص کوشش کے ذریعہ سے تھوڑی دیر کے لئے خودی سے نجات پائے۔

اسکی تصدیق اس بات سے ہوتی ہی کہ نوجوان عام اس سے کہ اُن مین صلاحیت ہو یا نہ ہو۔ محض ارتقائے نفسی کے تقاضے سے جب صناعی کی کوشش کرتے ہین تو سوائے اُس صورت کے کہ انہین کسی مخصوص شعبہ سے فطری مناسبت ہو بالعموم کسی ایسے آرٹ کو اختیار کرتے ہین جسکا مواد اور موضوع اندرونی جذبات کی مصوّری مین کم سے کم رکاوٹ پیدا کرتا ہو۔ پہلا نمبر ہمیشہ شاعری کا ہوتا ہی اسکے بعد تماشاگری (Acting) رقاصی اور موسیقی کا۔ برخلاف اسکے وہ فنون جنکا مواد اور موضوع واقعیت سے گہرا تعلق رکھتا ہی بہت کم اختیار کئے جاتے ہین۔ بچون کو مٹّی وغیرہ کی چیزین بنانے کا کتنا شوق ہوتا ہی وہ کسقدر انہماک کیساتھ لکڑی اور پتھر کے ٹکڑون سے مکان وغیرہ بناتے ہین لیکن کیا یہ شوق عنفوان شباب مین ترقی کر کے سنگتراشی یا فن تعمیر کا شوق بنجاتا ہی؟ نہین بلکہ اس عمر مین عموماً بالکل فنا ہو جاتا ہی۔ اس سے قوی دلیل یہ ہی کہ نوجوانی مین ڈرائنگ سے بھی شغف نہین رہتا اسکا سبب صرف یہ نہین کہ اب تنقید کا مادّہ پیدا ہو جانیسے نوجوانون کو اپنی ڈرائنگ پسند نہین آتی بلکہ اصل بات یہ ہی کہ وہ جو "کہنا" چاہتے ہین اُسکا اظہار کرنیمین کامیاب نہین ہوتے۔ ان فنون کو سیکھنا پڑتا ہی اور نوجوان کسی چیز کو سیکھے بس نہین تو پانی مرتا ہی۔ وہ اُنھین چیزون سے واسطہ رکھتا ہی جنہین فن کو سیکھنے کی بالکل ضرورت نہو یا بہت کم ہو۔

اسلئے نفسیات شباب کی تحقیقات مین زیادہ تر نوجوانون کی شاعری سے کام لینا پڑیگا مگر شاعری مین بھی وہی "اقل مزاحمت" کا اصول نظر آتا ہی۔ کوشش ہر صنف مین کیجاتی ہی مگر جو تھوڑی بہت

کامیابی ہوتی ہی وہ عموماً محض غنائی شاعری مین۔ ڈراما کے لئے بڑا دم چاہیے۔ ڈراما لکھنے مین نوجوانون کے
مد نظر عموماً یا تو آخری دردناک انجام یا دو چار پر اثر سین ہوتے ہین ورنہ بقیہ قصہ ناقص رہجاتا ہی۔ گوئٹے
نے اعتراف کیا ہی کہ اسنے اس عمر مین ڈراما لکھنے سے پہلے سوچنا شروع کردیا تھا کہ پانچوین ایکٹ مین کیا
ہونا چاہیے۔ ناول یا نظم مین کوئی بڑی داستان لکھنا نوجوانون کے لئے اور بھی دشوار ہی۔ کوئی چھوٹا
قصہ یا کوئی چھوٹی نظم وہ کسی نہ کسی طرح لکھ لیتے ہین لیکن یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم نے ناکامیابی کی علامت
اختصار کو قرار دیا ہی جس مین ڈراما یا ناول مین بھی اختصار کے ساتھ پورے مطلب کو ادا کرنا طول نویسی سے
کہین زیادہ دشوار ہی۔ ڈراما اور قصصی شاعری مین نوجوانون کے ناکامیاب ہونیکا سبب یہ نہین ہی کہ
ان مین بہت لکھنا پڑتا ہی (وہ تو ایک ایکٹ کا ڈراما بھی سلیقہ سے نہین لکھ سکتے) بلکہ یہ ہی کہ ان اصناف مین
خارجی چیزون کی تشکیل کی ضرورت پڑتی ہی۔ اور اس سے نوجوان معذور ہین۔ یہان ضروری ہی کہ انسان
قانون قدرت کا مشاہدہ اور انکی پابندی کرے اشخاص کی سیرت کی صحیح تصویر کھینچے اور مختلف اعمال
اور انجام مین نفسی محرکات سے ربط پیدا کرے۔ نوجوان داخلیت کے تنگ دائرہ مین ایسے گرفتار رہتے ہین
کہ ان شرطون کا پورا کرنا انکے امکان سے باہر ہی یہانتک کہ پیدائشی شاعر بھی یا تو بہت دن کے بعد کامیاب
ہوتے ہین مثلاً "فون ٹانے" یا کبھی نہیں ہوتے مثلاً "ہولڈرلین"۔ ذرا غور تو کیجئے کہ ان شرطون کے کیا معنی
ہین۔ جذبات مین ڈوبی ہوئی واردات قلبی کو قلم سے جو شاعری اور انشاپردازی کا سرچشمہ ہے
خارج مین مشاہدہ کی ہوئی تصویرونکا صحیح عکس اتارا جائے! انسان بالکل اجنبی لوگونکے سینہ مین جن کی زندگی کا
قانون مختلف ہی، اپنا دل ڈال دے قصہ کے واقعات و حوادث کو خود اپنی زندگی سے بے تعلق کرلیا جائے
تب کہین جاکر کام چلے۔ اپنے نفس سے تعلق رکھنے والے کیفیات کو بدل کر خارجی تصاویر بنا دینا ہی راز ہے
سچے کمال شاعری کا۔ اسکے لئے ایسی پختگی ایسا خارجی نقطۂ نظر درکار ہی جسکا پیدا ہونا اس عمر مین ناممکن ہے

مختصر یہ کہ نوجوان بالعموم قصصی شاعری کی بالکل صلاحیت نہین رکھتے اور تمثیل (ڈراما) مین
ناکامیاب رہتے ہین البتہ اکثر غنائی شاعری سے انھین مناسبت ہوتی ہی۔ یہ مناسبت زیادہ تر آگے
چل کر کم یا بالکل مفقود ہو جاتی ہی۔ غنائی شاعری کی کوشش مین مقابلۃً اچھی خاصی کامیابی ہوتی ہی
ایک تو اسلیے کہ اس عمر مین دل مین کچھ ہوتا ہی جو اظہار کا تقاضا کرتا ہی اور ظاہر کئے جانیکے قابل بھی ہے

دوسرے اسلئے کہ ہنگامی تخلیق جسکی غنائی شاعری مین ضرورت ہوتی ہو اس سے کہین زیادہ آسان ہے کہ خارجی زندگی کے ایک بڑے سے ٹکڑے کو لیکر انسان اپنے خون جگر سے اُسکی پرورش کرے اور جب وہ مکمل "صورت" اختیار کر چکے تو اُسے واپس کر دے۔ پھر بھی عموماً اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہو کہ نوجوانون کی بہت بڑی تعداد ایسی ہو جسمین شاعری کا مادہ بالکل نہین ہوتا اس عمر مین شاعری کی اُمنگ محض ارتقائے نفس کا ایک مظہر ہو مگر اسمین شک نہین کہ نہایت مفید مظہر ہو جو منشا اسمین پوشیدہ ہے وہ کلام نغز کی صورت مین نہین بلکہ تشکیل نفس کی صورت مین ظاہر ہوتا ہو، چنانچہ جب ارتقائے نفس کا عمل عارضی طور پر تکمیل کو پہونچ جاتا ہو تو انمین سے اکثر خود بخود شعر کہنا چھوڑ دیتے ہین، اُس وقت ولکے سرچشمہ سے آمد کم ہو جاتی ہو اور کیفیات نفس کو خارجی صورت دینے کی کشمکش سے جی اُکتا جاتا ہو۔

قبل اسکے کہ ہم نوجوان کی شاعری خصوصاً غنائی شاعری کے نمونے پیش کرین مناسب معلوم ہوتا ہو کہ ہم اختصار کے ساتھ یہ بتا دین کہ ہمارے پیش نظر کیا کیا مواد ہو۔ نوجوانون کی خود بینی اگرچہ وہ خدع نفس پر مبنی ہوتی ہو انھین نظمین سنانیکی اجازت دیتی ہے مگر رونا چون کو وہ ایسا چھپاتے ہین کہ کسی کو اُنکی ہوا بھی نہین لگنے پاتی۔ یہ مواد نفسیات کے محقق کو اُسوقت حوالہ کیا جاتا ہو جب لکھنے والا عنفوان شباب کی منزل سے بالکل گذر چکا ہو لیکن نفسیاتی تحقیقات کے لئے یہ کافی نہین کہ نظمونکو جمع کر کے محض اُن کے مصنفون کے نام جنس اور عمر کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔ خالص جمالیاتی نقطۂ نظر سے تو شاعر کا کلام اپنی تفسیر آپ ہوتا ہو لیکن نفسیات مین اس سے فائدہ اُٹھانیکے لئے ضروری ہو کہ شاعر کے حالات سے واقفیت ہو بلکہ یون کہنا چاہئے کہ اُسکی مجموعی سیرت کا گہرا علم ہو اس سے بہت فرق پڑ جاتا ہو کہ لکھنے والے نے ادبی ماحول مین پرورش پائی ہو (مثلاً آٹو پلاٹون) یا محض او بیون اور شاعرون کی مثال سے متاثر ہوا ہو (مثلاً ہولڈرلین) یا وہ خود اپنے فطری ذوق سے شعر کہتا ہو۔ کیرشن اشٹائنر نے جہان بچونکی ڈرائنگ کے متعلق اعداد و شمار جمع کئے ہین وہان اسکا خیال رکھا ہو کہ کن بچون کے پاس تصویرون کی کتابین تھین اور کن کے پاس نہ تھین۔ اسی طرح یہان یہ

معلوم کرنا چاہئے کہ نوجوانون کی کتابونکی الماری مین کون کون کتابین ہین۔ یہ بھی ہرگز جائز نہین کہ تحقیقات مین محض اُن نوجوانون کے کلام پر اکتفا کی جائے جو آگے چلکر مشہور شاعر ہوئے۔ بعض اوقات نفسیاتی نقطۂ نظر سے ناکامیاب کوششین سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہین علاوہ ازین اسکا سختی سے خیال رکھنا چاہئے کہ اسطرح کے مجموعون مین وہ نظمین داخل نہو جائین جو نوجوانون نے کہین سے نقل کرلی ہین اور یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہین کہ نوجوانون کے تخیل کی خلاقی پر رائے قائم کرتے ہین اُن مضامین یا نظمون سے جو مدرسہ مین لکھوائی جاتی ہین بہت کم اور نہایت احتیاط کے ساتھ کام لینا چاہئے۔ کیونکہ ان چیزون مین نوجوانون کے مدنظر دوسری مصلحتین ہوتی ہین نہ انکی محرک "اظہار" کی آزاد اُمنگ ہو اور نہ اُن کا مقصد اپنے آپ سے نجات پانا۔ زیادہ تر ان مضامین یا نظمون مین نوجوان اپنی شان جتانیکی کوشش کرتے ہین جو ایک دوسرے پہلو سے نفسیات کے محقق کے لئے دلچسپی سے خالی نہین۔ ابھی (مواد کی کمی کے لحاظ سے) اسکا موقعہ نہین کہ ہم کلی نتائج پر پہونچ سکین یا صحیح اعداد و شمار ترتیب دے سکین۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ نفسیات کے نقطۂ نظر سے اہمیت رکھنے والے چند بنیادی مظاہر کا ذکر کردیا جائے اور انکی توضیح کے لئے مناسب مثالین پیش کردیجائین۔ چنانچہ ہم یہی کرینگے۔

بچے بھی شعر کہنے کی کوشش کرتے ہین لیکن انمین اور نوجوانون کی شاعری مین صریحی فرق ہے۔ بچہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی شاعر کی نقل کرے۔ اسکا جی چاہتا ہے کہ وہ بھی ایسے اچھے اچھے شعر کہہ لے ان کے پر یہیں اپنی واردات قلبی نہین ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ محض تکبندی کرتا ہے جسمین سب سے زیادہ اہمیت قافیہ پیمائی کو ہوتی ہے۔ ابھی انمین ذاتی احساس اندرونی طپش کا سوز و گداز نہین ہوتا ہم یہ نہین کہہ سکتے کہ انسان چودہ[14] برس کی عمر سے پہلے محض تکبندی کرتا ہے اور جہان چودہ برس کا ہوا شعر کہنے لگتا ہے بلکہ جب کبھی قلبی واردات کی بنا پر شعر کہا جائے خواہ اُسوقت عمر نو یا دس ہی برس کی ہو تو سمجھنا چاہئے کہ لڑکے کے نفس مین کوئی چیز جاگ اٹھی ہے کم سے کم انکی شخصیت کی ایک تہ مین شباب کا آغاز ہوگیا ہے۔ ہم گیزیے کے مجموعہ سے ایک ایسی نظم کا نمونہ

۱ہ ہم نے ان نظمون کے ترجمون کے لئے بھی نظم کا لفظ استعمال کیا ہے تاکہ انکی اصلیت پیش نظر رہے۔

... کی واردات سے خالی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک سات برس کے بچے کا کلام ہے۔

"پیارا خدا جو لازال ہے
"ہمارا سچا خزانہ ہے
"پیارا خدا ہمیں کبھی نہیں چھوڑتا
"وہ ہمیشہ ہماری حفاظت کرتا ہے
"پیارے خدا نے جو لازال ہے
"نباتات حیوانات اور سمندر کو پیدا کیا
"محض ہمارے استعمال کیلئے
"اُسنے کائنات کو خلق کیا

مگر جب کوئی گیت فانکے پردے کو چاک کر کے نکلتا ہے تو اسکی شان ہی اور ہوتی ہے۔ فیلکس ڈان نے اپنی پہلی نظم چودہ برس کی عمر میں (۱۸۴۱ء) ایک ایسے دن کہی تھی جو جاڑے کے آخر میں بہار کا پیام لایا تھا۔ وہ اسکی شان نزول ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"میں ایک گیت الاپتا ہوا اپنی سڑک پر جا رہا تھا۔ ٹوپی میرے ہاتھ میں تھی اور"
"میری پیشانی کو سورج کی نرم اور خوشگوار کرنیں چوم رہی تھیں۔ یکایک"
"اُس گیت کی جگہ جو میں گا رہا تھا میری زبان پر اپنے الفاظ جاری ہو گئے"
"جو بلا کسی کوشش کے سینے سے اُبل رہے تھے ---------"
"کھول دو کھڑکیاں کھول دو دروازے، بہار کی سواری آتی ہے"
"آ گیا خوشی کا راجہ آ گیا۔ آؤ ہم خوش خوش اُسکی سیوا کریں"
"مہینہ کا نام مت پوچھو۔ توڑ ڈالو اور خون کی زنجیریں جب سورج"
"چمکے اور روح کو مسرت ہو۔ بس سمجھ لو بہار آ گئی ---------"

اس چھوٹے سے گیت میں نہ تو مضمون بالکل اچھوتا ہے اور نہ خیالات بہت گہرے ہیں۔

بلکہ یہ خاص [illegible] ہیں [illegible] ہیں ایک نئی بات
بے ضرورات سے محض دوسرون کے احساسات کی صدائے بازگشت تو نہیں کہہ سکتے۔

کہنے والے کہتے ہین کہ غنائی شاعری کا بجز اسکے کہ وہ اندرونی جذبات کی سچی تصویر ہو کوئی معیار نہین۔ جتنی صدائین دلکے اندر سے آتی ہین سب غنائی شاعری کے لئے قیمت رکھتی ہین۔ ممکن ہی کہ خاص ادا پرستی کے نقطۂ نظر سے یہ صحیح ہو لیکن دنیا مین اور دوسرے نقطۂ نظر بھی ہوتے ہین جنکے ماتحت کامیابی یا ناکامیابی پر حکم لگایا جاتا ہی۔ اصل مین غنائی شاعری مین ضرورت ہی کہ ان تین عناصر کی ترکیب ہو۔ نفسی کیفیت، ایک خارجی تصویر جسکا مشاہدہ ہو سکے اور کمال فن جسمین موسیقیت، روانی، اور زبان کی پاکیزگی شامل ہی۔ ان تینون مین کبھی صحیح امتزاج ہوتا ہی اور کبھی کوئی عنصر اچھی طرح گھلنے ملنے نہین پاتا جسکے سبب سے شعر مین نقص رہجاتا ہی۔" شلر نے ایک جگہ کہا ہی "کہ اس پر شعر کہنے سے پہلے ایک موسیقی کی کیفیت طاری ہوتی ہی۔ ہمین اسمین اتنا اضافہ کرنا چاہئے کہ یہ کیفیت موضوع کی تصویر اور الفاظ کی تصویر سے پیدا ہوتی ہی۔ موسیقی اور وزن براہ راست اس نفسی صورت سے ٹپکتے ہین جسے خارجی وجود بخشنا منظور ہو۔ اگر انسان کوئی ایسا طرز ادا بھی اختیار کرے جو فاعلاتن فاعلات کی قید سے آزاد ہو۔ پھر بھی وہ کسی پوشیدہ قانون کی پابندی کرتا ہی اور جہان اسنے اسکی خلاف ورزی کی سننے والا فوراً کھٹک جاتا ہی۔

نوجوانون کی شاعری کا اکثر یہی انجام ہوتا ہی کیونکہ انکے نفس مین بحیثیت مجموعی "موزونیت" یا "روانی" نہین ہوتی۔ اُنکے لئے یہی نہایت دشوار ہی کہ اپنے جسم کی رفتار مین تھوڑا بہت توازن پیدا کرین نفسی رفتار کا معاملہ تو اور بھی مشکل ہی۔ شاعرانہ تخلیق کیوقت اُن الفاظ مین جنکا کام نقاشی بھی ہی اور سامعہ نوازی بھی ایک ذرا سی روح پھونکنے کے لئے اسکی ضرورت ہی کہ خود اُنکا نفس ایک مکمل صورت اختیار کر چکا ہو اور یہ بات کبھی شاذ و نادر ہی ایک لمحہ کے لئے اُسمین پیدا ہوتی ہی اگر یہ حالت اسمین موجود ہی تو انکی چھوٹی سی تخلیق مین بھی جان ڈالدیتی ہی اگر نہین ہی تو اُنکا نقش بے رنگ ہو کر رہجاتا ہی۔ اب اس نقطۂ نظر سے ایک سترہ برس کے نوجوان کی آتش نوائی ملاحظہ کیجئے جسکے مضمون مین

عنفوانِ شباب کی مخصوص کیفیتین جھلکتی ہی ہین۔

"اُبل اُبل
"اے وحشی خون
"اُڑنے دے اپنے گرم نفس بادلون کو
"آسمان کی بلندیون پر
"لبون پر کف لاتے ہوئے
"اُٹھ! اُٹھ
"اے کڑی ہمت
"اور اپنی گود کے پالون کو
"چھلکا دے لذت کے سرچشمہ سے
"اُچھال اُنکو اے آتشِ سیّال
"اُبھار اُن کو اے گرمیٔ آرزو
"کہ وہ اُڑا کرین ہمیشہ آتشین پرون پر
"عقاب کی سی طاقت پرواز سے
"تیرے بچے کہلائین گے ہم لوگ
"جو ایک شعلہ کی طرح ہین
"زمانہ سے آزاد اور دور
"طوفان خیز عالمِ سرمدی مین

ہم ایک ورشال ایک سولہ سال کے لے پالک نوجوان کی پیش کرتے ہین جسکی بابتہ ہم سوائے اسکے کچھ نہین جانتے کہ غالبًا اُسنے برخلاف اُن لڑکون کے جنھون نے مندرجۂ بالا نظمین لکھی ہین، ادبی ماحول مین پرورش نہین پائی تھی۔ مضمون کے اعتبار سے یہ نظم عنفوانِ شباب کی

[illegible]

نظم میں جو شاعرانہ کیفیت ہو اُس سے بھی خالی ہیں۔

"میرے دلمین کس چیز کی آرزو ہی ؟

"آہ اِس کی کسی کو خبر نہین

"میرا جی چاہتا ہی

"کہ مین بیچ جنگل مین کھڑا ہوں

"اور سنوں چڑیوں کے چہچے

"اور کوئل کی کوک

"اور دلمیں کہوں

"کہ اب مین اکیلا ہوں

"میرا جی چاہتا ہی

"کہ مین سمندر کے ساحل پر کھڑا ہوں

"اور ڈھونڈھوں سفید ریت میں

"آرزو کے صدف

"اور محبت کے موتی

"اور طوفانی ہوا کے ساتھ ناچوں

"اور گاتا جاؤں

"کہ اب مین اکیلا ہوں

نوجوانون کی غنائی شاعری کی موضوع قدرتی طور پر وہی چیزیں ہیں جو ہمیشہ سے شاعر کی نغمہ سرائی کی موضوع رہا کی ہین۔ آرزو، الم، راحت، فطرت، موسم، مناظر قدرت کی کیفیتین، موت کا تصوّر

لہ اسکا اندازہ ترجمہ سے نہین ہو سکتا۔

حبِ وطن، مذہبی احساسات، فلسفیانہ خیالات، شراب کی تعریف سے بھی یہ نہیں جو کتنے اور عشق و محبت کے ذکر سے۔ لیکن جن لوگوں کا خیال ہو کہ آخر الذکر مضامین کا رنگ ان کی شاعری پر غالب ہے[1]۔ کیونکہ آخر عالم جوانی ہے اس وہ اعداد و شمار کو دیکھ کر جن کا آج کل بہت رواج ہو اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے۔ نفس کی زمین میں جو پھول کھلتے ہیں انہیں یقیناً عشق سب سے زیادہ حسین ہو لیکن یہ زمین اُس سے کہیں زیادہ گہری اور وسیع ہے جتنا لوگ اُسے عام طور پر سمجھتے ہیں۔

یہ جاننا بھی بہت اہم ہو کہ کن مضامین پر نوجوان شعر نہیں کہتے۔ وہ مدرسہ پر شعر نہیں کہتے اور نہ پیشہ پر کہتے ہیں کیونکہ معمولی زندگی کو سوائے بہت بڑے شاعروں کے کوئی شاعری کا موضوع کم سے کم سنجیدہ شاعری کا موضوع بنانے کے قابل نہیں سمجھتا۔ اور نوجوان اپنے نزدیک اپنے ہر شعر کو بہت سنجیدہ سمجھتے ہیں یہاں تک کہ اُن اشعار کو بھی جنہیں ہمیں ہنسی آتی ہو۔ البتہ جب وہ دوسروں کے شعر میں تصرف کرتے ہیں تو زیادہ تر مدرسہ اور اہلِ مدرسہ ہی کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس صنفِ شاعری میں نوجوان کمال رکھتے ہیں۔ بچپن کی نظر جو نمایاں خصوصیات کے دیکھنے میں بہت تیز ہوتی ہو اس عمر میں رفتہ رفتہ دوسرا انداز اختیار کرتی ہو اور لوگوں میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی عجیب و مضحک باتیں نکالتی ہو جو ساتھ ہی اُن کی سیرت کا مخصوص مظہر بھی ہوں۔

ان دونوں کے درمیان نوجوانوں کے شاعرانہ طرزِ ادا کی ایک تیسری قسم ہو۔ سنجیدہ شاعری کے ساتھ انہیں کبھی کبھی یہ رجحان بھی ہوتا ہو کہ جذبات و کیفیات کی گہرائی سے دفعتاً سطح پر آ جائیں اور خود اپنا مذاق اُڑانے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ جو نظم سنجیدہ نغموں سے شروع ہوئی تھی وہ عجب مضحک بے سرے پن کے ساتھ ختم ہوتی ہو۔ اس طرح کا اُتار چڑھاؤ عنفوانِ شباب کی نفسی کیفیت سے پوری مطابقت رکھتا ہے یہ اندرونی زندگی کے نشیب و فراز کا اثر ہے کہ ہمارا نوجوان گہرے بھید بیان کرتے کرتے ہنس پڑتا وہ

---

[1] ہندوستان کے نوجوانوں کی شاعری کا تو ظاہر ہو کہ ان ہی مضامین پر دارومدار ہو اور نوجوانوں پر کیا موقوف ہو سب شعرا سوائے معدودے چند لوگوں کے اسی تنگ وادی میں سرگشتہ رہتے ہیں پھر بھی نوجوان کی شاعری کی "روح" شرق و مغرب سب کہیں ایک ہو۔

بانو نبرا ہو آتا ہو اور "غم روزگار" کا پردرد گیت گانے گانے سخرا بن شروع کر دیتا ہو۔ اسی لئے نوجوان کو اپنی کی شاعری سے خاص رغبت ہو۔ انھین اسمین عجیب لطف آتا ہو کہ جو گہرائی انسان نے ڈھونڈھکر نکالی ہوا سے وفتا طنز کے پردے میں چھپا دے۔ بقول ایک سترہ سال کے نوجوان کے شاعر خود اپنے کلام کا ساتھ بیدردی سے چھوڑ دیتا ہو۔

نوجوانون کی شاعری پر ہمارے مخرب اخلاق تمدنی مظاہر کا جو اثر پڑتا ہو اسکا ذکر ہم ترک کرتے ہین کیونکہ اسکے لئے ایک مخصوص ماحول کا ذکر تفصیل سے کرنا پڑیگا اور ہم اپنے مقصد سے دور ہٹ جائین گے۔ بڑے شہرون کے نوجوانون کی جو تصویر ویڈے کنڈ نے اپنی "بیداری بہار" مین کھینچی ہے وہ ایک حد تک صحیح ہو۔ لیکن یہ تصویر بعض مخصوص طبقون کی ہو۔ پھر یہ بڑی مشکل ہو کہ ان طبقون کے لوگ اپنے آپ کو ویڈے کنڈ اور اسکے ہمخیال لوگون کے آئینہ مین دیکھتے ہین اسلئے یہان یہ تمیز کرنا بہت مشکل ہے کہ کہان تک ادب زندگی کی تصویر پیش کرتا ہو اور کس حد تک زندگی ادب کا اثر قبول کرتی ہو۔

غنائی شاعری کے سلسلہ مین ایک در قابل ذکر بات یہ ہو کہ لڑکیون کو مردون کے بھیس مین شعر کہنا بہت مرغوب ہے۔ عام نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ بڑی اہم بات ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہو کہ عورت اپنے آپکو دوسرون کی خصوصًا مردونکی نظر سے دیکھنے کی کسقدر شائق ہو اور اسمین کوئی خرابی نہین۔ بلکہ یہ ایک فطری اور ناگزیر خصوصیت ہو۔ آڈلر کی تحلیل نفسی مین اسکی توجیہ بالکل یکطرفہ اسطرح کیگئی ہو کہ عورت مرد بننا چاہتی ہو۔ اسمین شک نہین کہ عنفوان شباب مین کسی حد تک یہ خواہش بھی ہوتی ہو۔ لیکن اصل مین اس پردہ مین ایک گہرا مقصد پوشیدہ ہو۔ وہ یہ کہ عورت آرزو رکھتی ہو اجبکا خود بھی اسے پوری طرح احساس نہین ہوتا، کہ مرد کی منظور نظر بنے اور اسکے ساتھ نشو ونما پائے اسی لئے عورتین اور لڑکیان تعلیمی "مصلحون" کی اس تجویز کی بڑی زور وشور سے حمایت کرتی ہین کہ لڑکون اور لڑکیون کی تعلیم ساتھ ساتھ ہو۔ بخلاف اسکے نوجوان مرد کو بہت آگے چلکر یہ علم ہوتا ہو کہ عورت کا نفس مردونکی تربیت بھی قوت رکھتا ہو اور وہ اس سے فائدہ اُٹھانیکی ضرورت محسوس کرتا ہو۔

غنائی شاعری کے علاوہ اور اصناف شاعری مین نوجوان جو تھوڑی بہت کوشش

کرتے ہیں انکی طرف اس باب کی تمہید کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم محض اشارہ کرکے آگے بڑھ جائیں گے ۔ اپنے ذاتی تجربہ کے مواد کی بنا پر کوئی تمثیل لکھنا نوجوان کی طاقت سے باہر ہے کیونکہ نہ وہ عموماً خارجی واقعات کا کافی علم رکھتے ہیں اور نہ اتنا دم کہ اس کام کو انجام تک پہونچا سکیں ۔ اگر وہ احیاناً کبھی اس کی ہمت کریں تو اکثر (اسی طرح جیسے افسانوں میں) قدیم کہانیوں یا تاریخی واقعات کو تمثیل کا موضوع بناتے ہیں اور وہ بھی اس وجہ سے نہیں کہ ان چیزوں میں بہت سے نازک مسائل پیدا ہوتے ہیں بلکہ اسلئے کہ انہیں انھیں بعض ظاہری پُر اثر پہلو مل جاتے ہیں جنہیں تھیٹر کے عمل (Action) کا خوب موقع ملتا ہے ۔

اشخاص کے خاکے بہت بھدے اور اکثر مبالغہ آمیز ہوتے ہیں اور زبان میں جذبات پرستی کا تموج ہوتا ہے ۔ اگر سادی نثر سے کام نہ چلے تو قدیم (یونانی ورومی) طرز کی نثر مسجع اختیار کی جاتی ہے ۔ مجموعی طور پر ان تمثیلوں میں شاذونادر کوئی ایسی بات پیدا ہوتی ہے جس سے دوسرے لطف اُٹھا سکیں البتہ کہیں ایک آدھ اہم چیز ضرور نکل آتی ہے اور جب عمر میں ذرا پختگی پیدا ہوتی ہے (کم وبیش ایف ۔ اے کی تعلیم کے زمانہ میں) تو کبھی کبھی کوئی الم آفریں "مسئلہ" بھی ضمناً آجاتا ہے ۔ ان نوجوانوں میں جو لوگ شاعری کو اپنا پیشہ نہیں بناتے وہ چند سال کے بعد اپنے ان "نوجوانی کے گناہوں" کو بہت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک زمانہ میں کس گرمجوشی کے ساتھ وہ ان آتش فشانیوں میں منہمک تھے ۔

البتہ تماشاگری (Acting) میں نوجوانوں کو نمایاں کامیابی ہوتی ہے ۔ یہاں دشوار گزار خارجی منزل تک پہونچنے کی راہ اُس کے لئے پہلے سے بنی ہوئی ہے محض تقلیدی خلاقی کی ضرورت ہے اور اگر اُس میں منظر عام پر آنے اور خطابت کا تھوڑا بہت مادہ ہے تو وہ ایسے کارنامے دکھا سکتا ہے جن سے حیرت ہوتی ہے کیونکہ اُس میں ابتک "اندرونی" تبدیل ہیئت کی صلاحیت موجود ہے ۔ اگر اُسے کوئی "عینی" کیفیت ادا کرنا ہے تو وہ سارے تن بدن سے اُسکے اظہار میں ڈوب جاتا ہے ۔ تھیٹر کی محبت میں سرشار نوجوان جنھیں پابندی قواعد کی قید سے آزاد رکھا جائے ۔ البتہ تمثیل (Tragedy) کی دیوی کے بڑے سچے اور پاک پُجاری ہوتے ہیں اُن کے دل میں ابتک اُن قدیم دینی عقائد کی کچھ جھلک

ہوتی ہے جن سے المیہ پیدا ہوئی تھی۔ پُرمذاق تمثیل (اس سے اعلیٰ فرحیہ مراد نہیں) میں بھی وہ اچھے خاصے رہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اپنی تماشاگری کی کامیابی کا احساس، جو بجائے خود صحیح ہوتا ہے انھیں اس دھوکہ میں ڈال دیتا ہے کہ اُن میں یہ صلاحیت تمام عمر باقی رہے گی۔ ان شاندار لمحوں میں جو قلبی واردات گزرتی ہے اُس کی ہمیشہ رہنے والی یاد کی بنا پر وہ تماشاگری کو اپنا پیشہ بنانا چاہتے ہیں۔ انھیں اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے لئے کیا کچھ "سیکھنے" کی ضرورت ہے قطع نظر اس کے اس حقیقت سے وہ اور بھی کم واقف ہوتے ہیں کہ ایک طرح کے قانون "ارتقا" کی رو سے اندرونی شعلہ (جس کی گرمی پر تماشاگری کا دارومدار ہے) بجائے اور بھڑکنے کے بجھنا شروع ہو جاتا ہے اور اوسط درجے کے تماشہ گر کی حالت تمام اوسط درجے کے صناعوں میں تقریباً سب سے زیادہ افسوسناک ہوتی ہے۔ خاص طور پر اُن نوجوانوں کو جن کے بلوغ کا زمانہ اوروں سے زیادہ نفسی بیداری کی دولت سے مالامال ہے سمجھا بجھا کر اس دھوکہ سے نکالنا بہت دشوار ہے بلکہ اکثر برسوں تک اُن کے دل سے یہ خیال دور نہیں ہوتا کہ لوگوں نے انھیں فریب دیکر اُن کی زندگی کے اصل مقصد سے محروم کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کو ولیم مائسٹر پڑھنے کے لئے دیا جائے۔ کیونکہ وہ انھیں کے لئے لکھا گیا ہے۔

نوجوانوں کے تخلیقی آرٹ میں ہم ناچ کو بھی شمار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نام نہاد تفریح کی حیثیت سے عام نوجوانوں میں یہ بہت مقبول ہے کیونکہ اسمیں کئی ایسے عناصر شامل ہیں جن سے انھیں دلچسپی ہوتی ہے۔ لطفِ صحبت، چھیڑ چھاڑ، عشق، کسی قدر شہوانی لذت، ہم عمروں سے برابری کے میل جول، پہلا مزہ وغیرہ وغیرہ۔ ان سب چیزوں کا ذکر ہم آگے چل کر کرینگے۔ لیکن کبھی اس میں کوئی گہری بات بھی ہوتی ہے اگرچہ اس قدر طوفان بے تمیزی میں ناچ کے اصلی منشا کا کسی کو شاذ و نادر ہی دھیان رہتا ہے۔ وہ اصلی منشا یہ ہے کہ دلکی کیفیت جسم میں سرایت کر جائے اور یہ جسم نفس کی موزونیت کا ترجمان بنے۔ الغرض ناچ کی اس حقیقی مسرت کا سچا احساس لڑکیوں کو اکثر ہوتا ہے۔

ایک دوشیزہ اپنی اُٹھتی ہوئی جوانی کے عالم میں اپنے نفس کی ساری حسن و خوبی اور اپنے اندرونی جذبات کا پورا زور اس طرز ادا (ناچ) میں صرف کر دیتی ہے جسے لوگ اگلے زمانہ میں بجا طور

عبادت سمجھتے تھے۔ نوجوان مرد میں قدرتی طور پر یہ صلاحیت کم ہوتی ہے کہ اپنی نفسی کیفیات کو پوری طرح جسم کی "موزوں" حرکات میں ظاہر کرسکیں۔ لیکن یہ بات کہ مرد اور عورت دونوں میں ناچ کے اثر سے گہری سنجیدگی اور قابل احترام خود فراموشی پیدا ہو جانا ممکن ہے کبھی کبھی معمولی جوڑوں (ساتھ ناچنے والے عورتوں اور مردوں) کے چہروں سے صاف ظاہر ہوتی ہے[1]۔ بلاشبہ اس معصوم مجلس میں اللہ کی رحمت کا نغمہ سنائی دیتا ہے۔ مگر خدا کے لیئے نوجوانوں کے ناچ سے فان اور سائٹر کو نکال دو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اسے رواج دینے کا قصور نوجوانوں کے سر ہے۔

آخر میں ہمیں چند الفاظ نوجوانوں کی تخلیق موسیقی کے متعلق کہنا ہیں۔ اگر اس سے مراد وہ نغمہ نہ ہو جو خود بخود ہر نوجوان کے سازِ دل سے نکلتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس آرٹ کے لئے فن پر پورا عبور ہونا ضروری ہے جس کا حاصل کرنا برسوں کا کام ہے۔ علامات ہی کا سیکھنا سہل نہیں ہے چہ جائیکہ آہنگ اور طرزِ نغمہ سے کامل واقفیت ہونا۔ اس معاملہ میں نوجوان ان دو صورتوں میں سے ایک اختیار کرتے ہیں۔ یا تو وہ دوسروں کے نکالے ہوئے طرز اختیار کرتے ہیں یا سرے سے طرزِ نغمہ کی پروا ہی نہیں کرتے اور اُسے بڑھاپے کی علامت یا اہل فن کی مشکل آفرینی کہکر ٹال دیتے ہیں۔ ان کے یہاں ہر طرح کی بے آہنگی اور علامتوں کی بیقاعدگی جائز ہے۔ ان کی موسیقی سے خالی بلکہ موسیقی کے برعکس کوششوں میں (انھیں "آزادی" کہنا غلط ہے کیونکہ آزادی عام قانون سے ہو سکتی ہے مگر ہر شخص کے لئے ذوق سلیم مخصوص پوشیدہ قانون بناتا ہے جس کی پابندی ناگزیر ہے) کبھی کبھی کوئی اچھا موسیقی کا "خیال" بھی نکل آتا ہے لیکن ان نوجوانوں میں سے اکثر میں بلوغ کے بعد نہ تو تخلیق کا شوق رہتا ہے اور نہ اس کی صلاحیت۔ اگر یہ اپنے جذبات شباب کو ساز کے تاروں پر ظاہر کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھنا چاہئے کہ موسیقی کی تدوین نے بھی شاعری کی طرح اپنا ارتقائی مقصد پورا کر دیا۔ ان کی نغمہ آفرینی خاموشی کی تاریکی میں گم ہو جاتی ہے اور یہ

---

[1] ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے نزدیک ناچ معیوب ہے اور مذہب اور تمدنی روایات دونوں کی رو سے ہونا بھی چاہئے لیکن یورپ والوں کے ناچ کے متعلق رائے قائم کرنے میں ہمیں احتیاط کرنا چاہئے مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس میں بیجا طرفداری کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ ناچ کے جو برے پہلو ہیں اُنھیں بھی آگے چل کر بہت صاف گوئی کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے۔

موسیقی کی دیوی کی پرستش باکمال استادوں کے پاک مندر میں کیا کرتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلوغ کے بعد نوجوانوں کے ذوق جمال کا گلبن زندگی کی کیاری میں جڑ پکڑ لیتا ہے جسکی اہمیت "محض آرٹ" کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے اور اگر یہ لوگ خارجی تخلیق میں سچے آرٹ کی شرائط پوری کرنیسے قاصر رہتے ہیں تو اُس کے بدلے اُنکے خواب اور تخیلات اُنکے نفس پر اپنے آثار چھوڑ جاتے ہیں اور انھیں زندگی کے نصب العین سے زیادہ قریب پہونچا جاتے ہیں۔ افلاطون کا یہ قول کہ شاعر زندگی کے نقال کی حیثیت سے تیسرے درجہ کا خلاق ہے اس لحاظ سے صحیح ہے کہ خود آرٹ محض اُس اندرونی صورت اور اُن صورت آفریں قوتوں کا عکس ہے جنکے ماتحت نفس انسانی کی نشو و نما ہوتی ہے اسی نشو و نما کی خاطر صناع اپنے خواب دیکھتے ہیں اور اسی کی خاطر ساری قوت تشکیل آرٹ کی تخلیق میں صرف ہوتی ہے۔ عنفوان شباب میں ان ساری کوششوں کا مرکز نصب العین کی آفرینش ہے۔

باب چہارم

نوجوانوں کا عشق

نوجوان کی شاعری کا طرز ادا خواہ تقلید کی صورت میں یا مخالفت کی صورت میں، آرٹ کے اُس عام طرز سے متاثر ہوتا ہے جو فی زمانہ اس کے معاشرتی حلقہ میں مقبول ہو۔ پھر بھی ہم یہ کلیہ قرار دے سکتے ہیں کہ آرٹ کی کسی صنف میں مثلاً تمثیل میں واقعہ بینی[1] سے سچی شاعرانہ قوت تشکیل کا زیادہ اظہار ہوتا ہے بہ نسبت کمال بینی[2] کے۔ انسانوں اور چیزوں کو تخیل کی مدد سے اُن کی مکمل صورت میں دیکھنا عنفوان شباب کی خصوصیات میں سے ہے اور ہر نوجوان میں پایا جاتا ہے۔ اسلئے اگر کوئی آرٹ میں کمال بینی اختیار کرے تو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ اُس میں واقعی صناعانہ جدت طبع اور قوت احساس ہے یا نہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اور انسانوں کی طرح نوجوان بھی اپنی نفسی زندگی میں کبھی تہ میں ہوتا ہے اور کبھی سطح پر۔ اس لئے وہ ہر چیز میں اور ہر موقع پر کمال بینی سے کام نہیں لے سکتا بلکہ صرف اُس وقت جبکہ وہ دنیا کو اپنے نفس کی انتہائی گہرائی سے دیکھتا ہے۔

اب ہمارے پیش نظر دو صورتیں ہیں یا تو ہم یہ سمجھیں کہ یہ کمال بینی نوجوان کی طبیعت کا عام انداز ہے گویا وہ اپنی بہار شباب کی ترنگ میں اپنے آس پاس کی چیزوں اور انسانوں کو بلند، حسین، اور پُر اسرار بنا دیتا ہے یا یہ کہیں کہ اصل میں وہ جمالیاتی کیف کے عالم میں کسی محبوب روح کو کمال آفرینش سمجھ کر اُسکے رنگ میں ڈوب جاتا ہے اسلئے اُسے ساری دنیا حسین اور مکمل نظر آتی ہے۔ ہم دونوں باتوں میں سے کسی کے حق میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ جو لوگ دوسری صورت کو اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے، آیندہ زندگی میں جب انسان کسی پر عاشق ہوتا ہے تو یہ کمال بینی کی قوت پھر پیدا ہو جاتی ہے اُن کے جواب میں

---

[1] Naturalism or Realism آرٹ کی اصطلاح میں اُس طرز کو کہتے ہیں جس میں صناع اشیا کو اُسی طرح دیکھتا یا دکھاتا ہے جیسی وہ واقعی ہیں۔

[2] Idealism آرٹ میں وہ طرز ہے جس میں صناع اشیا کو اُنکی مکمل عینی صورت میں دیکھتا اور دکھاتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے نوجوانی میں محبت اور آرزو عالمگیر ہوتی ہو مگر بالغ ہونے کے بعد یہ گھٹ کر محض عشق یا روحانی اتحاد کی آرزو رہ جائے۔ لیکن عام خیال کی پیروی میں ہم یہ فرض کئے لیتے ہیں نوجوانوں کی کمال مینی کی اصل عشق ہی ہے۔

مناسب ہوگا کہ ہم سب سے پہلے بعض الفاظ کا استعمال معین کر لیں۔ ہم اپنی نفسیات میں عشق اور شہوت جنسی کو دو جداگانہ چیزیں سمجھتے ہیں اور ہمیں ان دونوں سے صرف اُس حد تک تعلق ہے جس حد تک یہ نفسی کیفیات کی صورت میں ظاہر ہوں۔ ان کی عضویاتی بنیاد سے بحث کرنا ماہرین عضویات اور اطبا کا کام ہے۔ ہمیں اس سے ہرگز انکار نہیں کہ عشق اور شہوت کے احساسات آپس میں بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ دونوں کے احساس کا رنگ ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہے بلکہ یہ کیفیات نفس کے دو مختلف طبقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

شہوت جنسی کے معنی سے آئندہ باب میں مفصل بحث کی جائیگی۔ یہاں ہم بلا ردّ و قدح اس لفظ کے وسیع ترین معنی جو اسے پہنائے گئے ہیں تسلیم کئے لیتے ہیں۔ ان کی رُو سے شہوانی جذبہ اور احساس محض اُسی کیفیت کا نام نہیں جو جنسی رغبت کے موضوع کے ساتھ واقعی یا تخیل میں اتصال یا جماع سے پیدا ہوتی ہے بلکہ ہر اُس کیفیت کو کہہ سکتے ہیں جسے جنسی لذت سے شعوری تعلق ہو بشرطیکہ اُس سے حسّی لذت پیدا ہوتی ہو۔ اس تعریف کے مطابق شہوت کا احساس ہمیشہ جسمانی یعنی حسّی ہیجان لذّت پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن یہ اگر کہا جائے کہ وہ سب احساسات جن میں جسم کا کوئی حصہ ذریعۂ لذت ہو شہوانی ہیں تو اس لفظ کے معنی حد سے زیادہ وسیع ہو جائیں گے کیونکہ جن اعضائے جسم کو غذا پہونچتی ہے یا جن کے توسط سے ہم حرکت کرتے ہیں اُنکی حسیات کے ہمراہ خاص قسم کا احساس لذت ہوتا ہے جو شہوانی لذت سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ نفسی احساس و جبلت کی وہ ترکیب جسے ہم (Libido) شہوانی لذت کہتے ہیں اس اعتبار سے بہت وسیع ہے کہ اُس کا اثر اپنے مخصوص عضویاتی نظام تک محدود نہیں رہتا بلکہ انسان کے دوسری نفسی جسمانی ترکیبوں سے نامکمل اجزا کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔

عشق کے احساس کا رنگ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہم فی الحال اختصار کے ساتھ یوں کہہ سکتے ہیں کہ

عشق محبت کی وہ صورت ہے جس میں نفسی رنگ غالب ہو اور جس کی اصل جمالیاتی احساس ہو۔ جمالیاتی احساس سے مراد وہ احساس ہے جو کسی واقعی یا خیالی مشہود کے ساتھ روحانی اتحاد پر مبنی ہو اور جس میں جسمانی لذت یا تصرف کی خواہش کا میل نہ ہو۔ ہر جمالیاتی لذت میں شاہد اور مشہود کی زندگی میں ایک طرح کا پُر اسرار اتحاد واقع ہوتا ہے۔ اگر مشہود ذی روح نہ بھی ہو تو ہمارا تخیل "انتقالِ احساس" کے عمل سے اس میں روحانیت کی جھلک پیدا کر دیتا ہے لیکن یہ روحانی اتحاد صرف ان چیزوں سے ہو سکتا ہے جو قابلِ مشاہدہ اور صورت پذیر ہوں۔ جمالیاتی احساس کے لئے (بخلاف مذہبی احساس کے) یہ ناگزیر شرط ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ اتحاد (واقعی اشیاء سے بھی) خالص تخیل کے عالم میں ہو اور تصرف، استعمال، یا جسمانی لمس کی خواہش اسمیں شامل نہ ہو۔

غرض جمالیاتی محبت یا عشق اصل میں کسی انسان سے روحانی اتحاد یا تبادلۂ احساس کا نام ہے جس میں خارجی جسمانی حسن کا مشاہدہ واسطہ کا کام دے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ عشق کبھی کبھی جسمانی علامت کے واسطہ سے بے نیاز بھی ہو جاتا ہے لیکن ارتقائے نفس کی یہ منزل بہت دُن کے بعد آتی ہے۔ عنفوانِ شباب میں عشق کی بنیاد اُس لطف و مسرت پر ہوتی ہے جو دوسروں کے جسم کی خوبصورتی خوش ادائی یا قوت کو دیکھ کر پیدا ہو محض چہرہ کے رنگ روپ یا جسم کے سڈول پن سے یہ بات نہیں پیدا ہوتی بلکہ حسین جسم کو حسین روح کا مظہر سمجھنے سے اصل چیز روحانی صورت ہے جسکی جھلک جسم میں نظر آتی ہے۔ بادی النظر میں یہ بات مافوق الطبیعات یا تصوف کی بلند پروازی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم عہد شباب میں اور اس کے بعد بھی جسم کے نظارہ میں روح کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ احساس کی بنیادی صورت ہے جس کی مزید تحلیل نہیں ہو سکتی۔ اسے دوسروں کے نفس کی سیرت یا اعمال کے "سمجھنے" سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ "سمجھنا" تو قوتِ وقوف کا ایک فعل ہے لیکن جمالیاتی مشاہدہ محض ایک احساس ہے روح سے معمور جسم کے حسن کا۔ اگر ہم فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یہ سوال کریں کہ جسم و روح کے اس طلسم میں جسے ہم انسان کہتے ہیں کیا چیز ہے جو اسے حسین بناتی ہے تو اس کا محض قیاسی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ روح کے قانونِ صورت اُس کی فطری ہم آہنگی اُسکے خوشنما تناسب اُس کی کثرت نما وحدت کا جو مشاہدہ ہم چشم دل سے بے حواس

اور اک کے واسطے سے کرتے ہیں وہی حسن ہے جو زندگی اپنے قانون ارتقاء کے مطابق بلا کسی رکاوٹ کے نشوونما پاتی ہے وہ اپنے جسم کے پردے میں حسین معلوم ہوتی ہے۔

اس طرح کی بصیرت اور واردات کے معاملہ میں نوجوان خاص طور پر ذکی الحس ہوتا ہے کیونکہ وہ خود ابھی اس سرچشمہ سے قریب ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس بصیرت کا خزانہ اُس کا اپنا تخیل ہے اسلئے "وہ انتقال احساس" کے ذریعہ سے اُن چیزوں میں بھی کمال بینی سے کام لیتا ہے جو دراصل اس کی مستحق نہیں پھر بھی اگر وہ اکیلا ہو تو اُس کی زندگی کا یہ پہلو نا تمام رہجائے۔ اسکے لئے کسی دوسرے سے روحانی اتحاد کی ضرورت ہے اور بظاہر نصب العین کا پیدا ہونا دو مشتاق روحوں کے معنوی وصل پر موقوف ہے۔

جسمانی توالد و تناسل کی طرح روحانی تخلیق بھی اس دوئی کے اصول پر مبنی ہے۔ یہ گویا جوہر انوثیت اور جوہر رجولیت کا آپس میں ملنا ہے جس سے ہم آگے چل کر مفصل بحث کرینگے۔ یہ حقیقت جسے ہم نے بے نقاب کر دیا ہے یعنی دو روحوں کے عالم مشاہدہ میں (جسم کو واسطہ بنا کر) ملنے اور تخیل کے عمل تولید سے خارجی صورت پذیر نصب العین کا پیدا ہونا ہمیں کائنات کے ایک بہت بڑے راز کا پتہ دیتی ہے۔ بغیر اس ذہنی پہلو کے جسمانی تناسل بھی ایک بے معنی چیز معلوم ہوتی ہے۔

یہی مختصر سی ضمنی مافوق الطبیعی بحث اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فطرت کا اصلی منشا اسوقت پورا ہوتا ہے جب روحانی اتحاد اور جسمانی وصل کے اجتماع سے ایک نئے انسان کی تولید کا پُر اسرار عمل واقع ہو لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ نصب العین کی روحانی تولید بجائے خود اگر اس کے ساتھ جسمانی تولید وابستہ نہ ہو بے معنی ہے البتہ جسمانی وصل یا جماع بغیر روحانی اتحاد کے ذلیل اور مہمل چیز ہے خصوصاً اُس صورت میں کہ اس کی غرض جسمانی تولید بھی نہ ہو۔

بہرحال نفسیات شباب کے لئے یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ ارتقائے نفس کے عہد یعنی نوجوانی میں فطرت ان دونوں (عشق اور شہوت) کے احساس کو جدا رکھتی ہے اور جب یہ دونوں کامل پاکیزگی کے ساتھ مل کر ایک عظیم الشان احساس اور عمل تولید کی صورت میں ظاہر ہوں تو سمجھنا چاہیئے کہ انسان کا نفس بالغ ہو گیا ہے۔ نوجوان کے نفس میں عارضی طور پر عشق اور شہوت جنسی کے جذبات ایک دوسرے سے بالکل جدا

ہوتے ہیں - یہ اس بحث میں اہم ترین قضیہ ہے - باب اول میں اپنے فلسفہ کا منہاج بیان کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ کوئی نفسی مظہر، جس صورت میں مدرک کے نفس کو محسوس ہوتا ہے اور جو صورت اُس کی منشا کے اعتبار سے ہوتی ہے دونوں میں مطابقت ہونا ضروری نہیں ممکن ہے کہ داخلی احساس کے بعض دائرے تحت الشعور میں بہ لحاظ اپنے منشار کے آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہوں لیکن شعور میں اُنھیں ایک دوسرے سے مطلق سروکار نہ ہو - یہ قول نوجوانوں کے عشق اور شہوت پر بالکل صادق آتا ہے - ایک ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں جذبے بیدار ہو چکتے ہیں لیکن عشق کا موضوع دوسرا ہوتا ہے اور شہوت کا دوسرا - زمانے کے لحاظ سے بھی نوجوان ایک ہی وقت میں دونوں سے انہماک نہیں رکھ سکتا - یقیناً یہ علیحدگی بھی ارتقائے نفس کے لئے مصلحت سے خالی نہیں -

ہم اس مطلب کو ذیل کے الفاظ میں مناسب طور سے ادا کر سکتے ہیں - اس زمانے میں اگر عشق میں شہوت شامل ہوتی تو عشق کامل کا تخیل مٹ جاتا - بہ خلاف اس کے اگر شہوت کو پوری طرح عشق کا تابع بنانے کی کوشش کی جاتی تو کامیابی نہ ہوتی - جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زیادہ خامی اس عمر میں شہوت ہی کے جذبے میں ہوتی ہے - اگر بلوغ کے بعد بھی عشق اور شہوت کا یہ افتراق قائم رہے تو سمجھنا چاہیئے کہ بہ ہیئت کُلّی شخصیت کا ارتقا رک گیا ہے اور اب یہ بات نفسی بیماری کی علامت ہے -

"ایک نیم بالغ لڑکی کا روزنامچہ" جو ۱۹۲۰ء میں وائنا کے "دارالاشاعت تحلیل نفسی" سے شائع ہوا ہے اور جسے ہم نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت مفید سمجھتے ہیں - اُسمیں ہمیں ایک نوجوان خاتون کی تصویر نظر آتی ہے جسے شہوت کے جذبات نے نہیں بلکہ مسائل نے سخت عذاب میں ڈال رکھا ہے غالباً اسپر اس چیز کا اثر اُس سے زیادہ ہے جتنا عموماً نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں پر ہوتا ہے لیکن یہ محض قیاس ہے اور کتاب سے اس بارے میں کوئی یقینی نتیجہ نہیں نکلتا - بہر حال اس کتاب سے اگر کوئی بات ثابت ہوتی ہے تو وہ عشق اور شہوت کے دائروں کا ایک دوسرے سے بالکل جدا ہونا ہے - ان دو عورتوں

Psycho analytischer Verlag ۲ے Sub-consciousness ۱ے

کے متعلق جلنے اس نوجوان لڑکی کو عشق ہے اُس کے دل میں شہوانی جذبات کا شائبہ تک نہیں۔ دوسری طرف شہوت کے معاملے میں بھی خواہشات کا کہیں نام نہیں البتہ جبلّی جستجو کا جذبہ ان باتوں کی اندرن کرید کرتا ہے۔ کتاب محبوب اُستانی کی شان میں ایک عشقیہ غزل پر ختم ہوتی ہے جو اس عمر کی لڑکیوں کی عام روش ہے۔ غرض عشق کی جنسی شہوت کی پابندی سے آزاد ہونے کے ساتھ یہاں عشق اور شہوت کے دائروں کا جدا ہونا بھی صاف نظر آتا ہے۔

البتہ اس عمر میں ایک علامت ایسی ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحت الشعور میں احساس کے یہ دونوں دائرے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ یہ رشک کا جذبہ ہے جو کبھی کبھی عشق کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے لئے یہ ممکن ہے کہ اُن میں سے بہت سے مل کر کسی ایک ہی شخص پر عاشق ہوں۔ عشق کے جمالیاتی پہلو میں رشک کی گنجائش نہیں۔ بھلا کوئی شخص محض اس سبب سے کیوں حسد کی آگ میں جلنے لگا کہ کوئی دوسرا اُس کے جمالیاتی ذوق میں شریک ہے۔ اسلئے جب نوجوانوں کے عشق کیساتھ رشک کا پہلو بھی ہو تو صاف ظاہر ہے کہ اُس کے نفس کی گہرائیوں میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو محض مشاہدہ جمال اور دور سے محبت کرنے پر قانع نہیں۔ سطح کے نیچے خون کھول رہا ہے اور قبضے کی خواہش تڑپ رہی ہے۔

اس تمہید کے بعد ہمیں حق ہے کہ ہم پہلے نوجوانوں کے عشق اور اُس کے اظہار کے طریقوں سے علیحدہ بحث کریں اس کے بعد نوجوانوں کی شہوانی زندگی پر نظر ڈالیں اور آخر میں عشق اور شہوت کا تعلق دکھائیں۔ ان تینوں حصوں میں ہماری تحقیق آجکل کے تمدن اور اُس میں بھی زیادہ تر جرمن قوم کے نظام نفسی تک محدود ہے۔ ممکن ہے کہ جنوبی یورپ اور مشرق کے لوگوں کی حالت اس سے مختلف ہو۔

عشق کی تعریف کرنا دشوار ہے۔ ہم اس سے زیادہ حوصلہ نہیں کرسکتے کہ اس معاملہ میں ترکیب نفسی کی مختلف صورتوں کی طرف اشارہ کردیں۔ مافوق الطبیعی ملاحظات محض تو ہم کے لئے ہیں۔ یہ مضمون ہی ایسا ہے کہ انسان نظام کائنات پر ایک شاعرانہ نظر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا۔ افلاطون کا عظیم الشان فلسفہ بڑی حد تک کیف عشق پر مبنی ہے۔

عشق میں اور ماں باپ بھائی بہن کی محبت یا اُس محبت میں جس کی تلقین مذہب عیسوی کرتا ہے فرق کرنا آسان ہے۔ عشق کی بنیاد نہ اتحاد خون پر ہے اور نہ مذہبی احساس پر جس کی بدولت انسان دوسرے انسانوں کو یہاں تک کہ بیکسوں اور گنہگاروں کو بھی خدا کی محبت و عبادت میں اپنا شریک کرکے اُن کی روحوں اور اپنی روح کو پاک اور برتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ عشق نام ہے کسی حسین چیز کی محبت کا۔ اِسے آرٹ یا عین کی محبت کا کلی مرادف نہیں قرار دے سکتے بلکہ ابتدا میں یہ کسی ذی روح حسین کی محبت تک محدود ہے۔ عشق کی ابتدائی منزل یہ ہے کسی انسان کے خوبصورت جسم میں حسن کی جھلک نظر آئے۔ ارتقا کی بلند تر منزل میں عشق خالص روحانی حسن کی محبت بن جاتا ہے۔ اسی زینے پر افلاطون نے سقراط کی تقلید میں حسن پرست یونانیوں کو چڑھانے کی کوشش کی تھی۔ اور غالباً اگر افلاطون نہ ہوتا تو نوع انسانی کو یہ زینہ کبھی نہ ملتا۔ اُسی نے یہ دریافت کیا کہ نصب العین ایک جھلک ہے سرمدی اور غیر مرئی عین کی یونانی لفظ Kalon جس کا ترجمہ حسین کیا جاتا ہے اصل میں اکثر موقعوں پر "عینی" ideal کے معنی رکھتا ہے۔

کسی حسین جسم کے عشق میں بظاہر انسان محض شباب کی ایک جیتی جاگتی تصویر کے مشاہدے سے مسحور ہو جاتا ہے لیکن اس مشاہدہ میں زیادہ گہری چیزوں کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں اول تو معشوق کی روح کے تناسب اور ہم آہنگی کا احساس، اور دوسرے زبان حال سے فطرت خلاق کی حمد و ثنا کہ اُسنے اس حسین کو پیدا کیا اور اُس کا نظام در پردہ یہی مقصد رکھتا ہے کہ حسین صورتیں پیدا کرے۔ غرض عشق کی پہلی ہی منزل میں فطرت کی روحانیت کا ایک احساس خفی اور اُس کی محبت موجود ہے۔ معشوق عاشق کے لیے حقیقت کا مظہر بن جاتا ہے۔ عشق کے ربط میں ایک تار مذہبی وجدان کا بھی پوشیدہ ہے۔ اسی کیف کے اثر سے کبھی نوجوان کسی حسین نوجوان پر عاشق ہو جاتا ہے کبھی کسی لڑکے پر کبھی نوجوان مرد نوجوان عورت کو چاہتا ہے کبھی نوجوان عورت نوجوان مرد کو۔ اس عمر میں عشق جنس کے امتیاز کا پابند نہیں۔ یہاں جو وجہ امتیاز ہے اُس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ عشق کے احساس

کے ساتھ معشوق سے بیجا حجاب ہونا لازمی ہے۔ ملاقات اور معانقے کی خواہش اگر پیدا بھی ہو تو سختی سے دبادی جاتی ہے۔ انسان برسوں تک دور سے دیکھنے اور دل ہی دل میں سراہنے پر قناعت کرتا ہے۔ اس ذوق نظارہ اور اس حجاب کا بہترین مظہر ڈانٹے کی نظم "حیات نو" ہے۔ اُس کی نظروں میں بیٹرِس محض ارضی معشوق نہیں ہے۔ وہ محض اپنے وجود سے روحانی فیض پہونچاتی ہے۔ اُسکی آرزو ہی میں اتنی قوت تھی جسکے کیف میں شاعر نے دنیا کی سب سے بڑی نظم لکھ دی۔ گوئٹے کو بڑھاپے میں بھی نوزدہ سالہ اولریکہ فان لیوٹیشوے اسی طرح کا عشق تھا۔ کہتا ہے:۔

"اُس کی نظر سورج کی کرنوں کی طرح
اور اُس کی سانس نسیم بہار کے مانند
خودی کو جو برف کی سلوں کی مثال
دل کے سرد غاروں میں جم کر رہ گئی تھی
گھلاکر پانی کردیتی ہے
خودغرضی اور خودرائی
اُس کے آتے ہی کافور ہوجاتی ہے
.... یہ سعادت
مجھے نصیب ہوتی ہے جب میں اُسکے سامنے کھڑا ہوتا ہوں"

روحانی ارتعاش، مجاز کے پردے میں حقیقت کی پرستش، گہرا حجاب، اپنے ناچیز ہونے کی شرم، یہ ہیں خصوصیات عشق کی۔ اس کا موضوع انسان کے پردے میں سرمدی "عین" ہے جسنے انسان کو صورت، تناسب اور زندگی بخشی ہے۔ مناسب ہوگا کہ ہم اس مطلب کو خود افلاطون کے الفاظ میں اداکریں جس کے نام سے یہ عشق بجاطور پر موسوم ہے۔

"جب وہ عارف، جو عالم عینی کا گہرا مشاہدہ کرچکا ہے، کسی حسن کے دیوتا کے جاندار چہرے میں حسن حقیقی کا جلوہ دیکھتا ہے، یا کسی قدِ موزوں کی دلفریبی پر نظر ڈالتا ہے تو وہ سارے بدن سے

لرز اُٹھتا ہے اور اُس پر ویسی ہی مقدس ہیبت طاری ہوجاتی ہے جیسی حسن مطلق کے نظارہ سے ہوئی تھی۔ اُس وقت وہ اس نوجوان، اس خدائے حسن کی دل وجان سے عبادت کرتا ہے بلکہ اگر اُسے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ اُسے احمق سمجھیں گے تو وہ اُس کے سامنے قربانی کرتا جس طرح کسی بُت یا دیوتا کے سامنے کی جاتی ہے۔ اس نظارے کے عالم میں اُس پر عجیب وغریب واردات گذرتی ہے۔ اُس کے جسم کا ارتعاش جاتا رہتا ہے اُس کی جگہ بے انتہا حرارت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ پسینہ میں ڈوب جاتا ہے۔ حسن کی کرنیں آنکھ کی راہ اُس کے وجود میں اُتر جاتی ہیں اور مرغ روح کے گرد ایک جال سا بنا کر اُس کے بازوؤں کو گرما دیتی ہیں۔ یہ گرمی ساری سختی اور جمود کو جن سے پَروں کے نکلنے میں رکاوٹ تھی پگھلا دیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے بازوؤں کی جڑیں حرارت سے غذا پا کر پنکھ بن جاتی ہیں اور پنکھ میں پَر جم آتے ہیں۔ کیونکہ روح میں کسی زمانہ میں پَر لگے تھے: وہ مجسم بال و پر تھی۔ غرض روح گرمی سے کھولنے اور اُبلنے لگتی ہے اور جس طرح بچوں کے مسوڑوں میں دانت نکلتے وقت گدگدی اور ٹیس ہوتی ہے اسی طرح روح میں بھی پر نکلتے وقت میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے۔ اُسے بخار سا محسوس ہوتا ہے اور ٹیک اور ٹیس۔ جب کبھی اُسے معشوق کے حسن کا نظارہ میسر آتا ہے اُسکی آرزو کی کلی کھل جاتی ہے حسن کی حرارت سے گرما کر وہ درد سے نجات پاتی ہے اور خوب ہنستی کھیلتی ہے۔ لیکن محبوب سے جدا ہوتے ہی وصل کی پیاسی روح پھر تڑپنے لگتی ہے۔ بازوؤں کی جڑیں سوکھ کر بند ہوجاتی ہیں اسلئے پنکھ حرکت نہیں کر سکتے۔ اب مقید آرزو اور جکڑے ہوئے پر و بال، نبض کی طرح اچھلتے ہیں اور زنجیروں کو توڑ کر نکلنا چاہتے ہیں۔ اسلئے روح جسمیں ہر طرف سے نشتر چبھ رہے ہیں درد سے بےچین ہوجاتی ہے۔ اگر کسی چیز سے فرحت ہوتی ہے تو معشوق کی یاد سے۔ لذت اور درد کے یوں ملجانے سے روح اپنے آپ سے بیگانہ ہوجاتی ہے۔ اُس پر وحشت، دیوانگی اور بیکسی چھا جاتی ہے نہ رات کو نیند آتی ہے نہ دن کو چین آتا ہے۔ آرزو کی بیتابی کھینچ کر وہاں لے جاتی ہے جہاں حسن کے مالک کو ایک نظر دیکھنے کی اُمید ہو جب روح اُسے دیکھ لیتی ہے اور آرزو کو نکلنے کی راہ ملجاتی ہے تب جا کر قیدیوں کو رہائی اور تازہ ہوا میں سانس لینا نصیب ہوتا ہے۔ روح کانٹوں کی خلش سے نجات پاتی ہے اور چند لمحوں کے لئے بے پایاں مسرت کے مزے لیتی ہے۔"

آگے چلکر افلاطون جہاں ایک معشوق کے نظارے کے وقت ایک شریف اور ایک رذیل گھوڑے کی حالت کا ذکر کرتا ہے

جو روح کے جوے میں ساتھ ساتھ جتے ہوئے ہیں وہاں اصل میں وہ احساس کے انھیں مختلف پہلوؤں کو شاعرانہ پیرایہ میں دکھاتا ہے جنھیں ہم نے عشق اور شہوانی خواہش کہا ہے اور ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے۔ افلاطون نے اس علیحدگی کو قائم نہیں رکھا ہے کیونکہ وہ جن واردات قلب کا نقشہ کھینچ رہا ہے وہ نوجوانوں تک محدود نہیں ہے۔

نوجوان کیلئے حسین جسم کی محبت اور آرزو سے زیادہ فطری کوئی جذبۂ زندگی نہیں ہے۔ وہ خلاق فطرت کے راز کا خود اپنے اعضا کی نشو و نما میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اس عمر میں اپنے آپ سے کسی قدر عشق ہونا بھی بالکل فطرت کے مطابق ہے۔ اگر ہم نیٹشے کی ایک اصطلاح استعمال کریں جسے برگسان شیلر اور زمل نے بھی اختیار کر لیا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اس عمر میں قوتِ احساس "حیاتی قدور" سے قریب ترین تعلق رکھتی ہے۔ نوجوانوں میں باہم دوستی کی بنیاد اکثر اسی پر ہوتی ہے کہ ایک نوجوان دوسرے کے پاک حسن کی کشش سے اس کی روح کا طلبگار ہوکر دامن امید (ڈرتے ڈرتے) اس کی طرف بڑھتا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ عین حسن کے ماتحت ہم جنسوں کی باہمی کشش اسی طرح عام ہے جس طرح مرد اور عورت کا عشق بلکہ عشق کا یہ رخ جس کا اکثر شعور نہیں ہوتا فطری درمیانی منزل ہے جس سے نوجوان لڑکیوں اور نوخیز لڑکوں سب کو گذرنا پڑتا ہے۔ ہمارے پاس قدیم اور جدید عہد کے نوجوانوں کے متعلق جو مواد ہے اس میں صدہا مثالیں اس طرح کے عشق کی موجود ہیں جو پہلے حسن ظاہری کی بنا پر پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ تمام روح پر چھا گیا۔ جسے یہ چیز نظر نہیں آتی اس کی رائے پر تعصب کا غلبہ ہے۔ نوجوانوں کے کھیل اور ورزش میں بھی اگر ہم عشق کے عنصر کو نظر انداز کر دیں تو ہم اُسے پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

لیکن اس معاملہ کا ایک المناک پہلو ہے جس سے گہری طبیعت کے لوگوں کو کسی طرح مفر نہیں۔ ہمارے احساسات میں سب سے دردناک یہ تجربہ ہے کہ حسین انسان ـــ یعنی قوی، متناسب اور حسین جسم ـــ میں اخلاقی اعتبار سے بلند اور پاک روح کا ہونا لازمی نہیں۔ ہمارے نوجوان کو جب یکایک یہ احساس ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اُس کی قوت حکم نے غلطی کی تھی جسے اب صحیح کر لینا چاہیے بلکہ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے اُسے کمینہ پن سے فریب دیا ہے اور اُس تصور عالم کی جو اُس کے دل میں تھا بنیادیں تک ہل جاتی ہیں

بلکہ خود نصب العین خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ہم یہاں فطرت کی وکالت نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ ہم کسی طرح نہیں سن سکتے کہ فطرت جھوٹ بولتی ہے۔ جس طرح نوجوانوں کی روح بجائے خود پاک ہوتی ہے اُسی طرح اُن کا جسم بھی محض جوانی کی بدولت حسین ہوتا ہے۔ اب فطرت کی اس پاکیزہ صورت میں ماحول کی رکاوٹوں اور موروثی خرابیوں کا دخل بڑھتا جاتا ہے۔ ہمیں ایک طالبہ یاد ہے جس کے چہرہ پر چودہ برس کی عمر تک قدیم یونانی حسن کی شان نظر آتی تھی۔ اُس کے بعد آہستہ آہستہ بدنما خط و خال نمودار ہونے لگے اور یہ دیکھ کر دل کانپتا تھا کہ ظاہری حسن باطنی اثرات سے (خالص نفسی اثرات سے جنیں جسمانی اسباب کو بالکل دخل نہ تھا) کس طرح برباد ہو رہا تھا۔

نوجوانوں کے اس طرح فریب کھانے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انکا احساس حسن یکطرفہ ہوتا ہے۔ ابتدا میں انکی نظر محض خال و خط اور رنگ پر پڑتی ہے معنوی اداؤں پر نہیں۔ آہستہ آہستہ جب اُنمیں خود پختگی پیدا ہوتی ہے تب جاکر ان میں اُس حسن کی بصیرت پیدا ہوتی ہے جسمیں صورت و معنی کا امتیاز نہ ہو۔ اُسوقت یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص جو پہلے اعتبار سے بدشکل ہو دوسرے اعتبار سے حسین نظر آنے لگے۔ سب جانتے ہیں کہ بعض "بدصورت" آدمی جب گفتگو کرتے ہیں اور جب اُنکی باطنی حالت اُنکے چہرے کے انداز سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ خوبصورت معلوم ہونے لگتے ہیں۔

یہ وہ منزلیں ہیں جن سے نوجوانوں کو گذرنا پڑتا ہے۔ افلاطون نے اس انسانی وحی کو "دعوت" (Banquet) کے لافانی الفاظ میں بیان کرکے اسے بقائے دوام کی سند دیدی ہے۔ سقراط جسے ظاہری صورت کے لحاظ سے سائیٹر[1] اور باطنی حسن تناسب کے لحاظ سے دیوتا کہنا چاہئے ہمیشہ اس حقیقت کا مجسم نمونہ اور اسکے برعکس اصول کی مثال سمجھا جائیگا۔ وہ لوگ جن کی سیرت روحانی فضائل سے مالا مال ہے ترقی کی دوسری منزل کا راستہ خود بخود تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ نصب العین کو خالص معنوی شکل میں بغیر جسمانی حسن کے واسطہ کے دیکھنے اور روح کی صورت پہچاننے لگتے ہیں۔ اس طرح خالص روحانی عشق پیدا ہوتا ہے جس میں ذہنی نقطۂ نظر سے تخلیق کی صلاحیت اور زیادہ ہوتی ہے۔

[1] ملاحظہ ہو فرہنگ۔

انتقال احساس کے تمہیدی جمالیاتی فعل کے بعد ایک نئی قسم کے ذہنی افعال کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ انھیں افعال کو ہم "سمجھنا" یعنی دوسرے کی ذات کو فطرت کے ذہنی قوانین اور نظام منشا کے ماتحت دیکھنا کہتے ہیں۔ اور اس کے بعد تیسرا درجہ سمجھ کر ہمدردی کرنے کا ہے۔ یہ نام ہے دو روحوں کی ہم آہنگی کا جس کی بنیاد جمالیاتی ذوق پر ہے لیکن جس میں اور قدوروں کے مشترک احساس کا عنصر بھی شامل ہے۔ محبت جو ابتک محض مشاہدہ جمال تک محدود تھی اب ایک گہرے روحانی اتحاد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

یہاں ضرورت ہے کہ ہم ایک خیال کو جس کی طرف افلاطون نے محض خفیف سا اشارہ کیا ہے ذرا تفصیل سے بیان کر دیں۔ خالص روحانی عشق کی بنا نفس کی دو مختلف صورتوں کے تقابل پر ہے جنمیں سے ہر ایک اپنی تکمیل کے لئے دوسری کی محتاج ہے۔ ایک بھولی بھالی، پابند فطرت، لاشعوری حالت میں نشو و نما پانے والی غور و فکر سے آزاد ذات کا دل اُس نفس کی طرف کھچتا ہے جس کے خیالات و احساسات واضح ہو چکے ہیں اور جو جان بوجھ کر اپنی تشکیل آپ کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ انسان جسکی ذات میں ابتک وحدت ہے لیکن جس کا احساس دھندلا ہے اُسکی آرزو کرتا ہے جس کا نفس مختلف شعبوں میں تقسیم ہو گیا ہے مگر جو اپنی ہستی کا شعور رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ جس کا نفس بالکل پختہ ہو چکا ہے یا کم سے کم مقابلتہً پختہ ہے ایسے شخص کی طرف کھچتا ہے جسکی دلفریب لاشعوری قوت نمو ابتک فطرت کے دامن میں پوشیدہ ہے۔ نفس کی یہ دونوں صورتیں جن میں سے ایک سراپا بھولاپن ہے اور دوسری سر بسر عقل ہے لیکن سانچے میں ڈھل چکی ہے۔ مختلف مدارج میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ گویا کائنات کے دو جوہر ہیں جن میں سے ایک کو ہم روحانی جوہرِ انوثیّت اور دوسرے کو روحانی جوہر رجولیّت کہہ سکتے ہیں انسان کی تکمیل ان دونوں کے ملنے پر موقوف ہے۔ ہر انسان میں ان دونوں جوہروں کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی ایک عنصر زیادہ ہوتا ہے دوسرا کم۔ جو کم ہوتا ہے اُسی کی آرزو دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس روحانی جوہر رجولیّت کی پہلی جھلک ایک نوجوان لڑکی کو ایک بالغ عورت میں نظر آئے ایک نوجوان مرد کو ایک بالغ مرد میں اور ایک لڑکے کو ایک نوجوان میں۔ لیکن اصل میں جوہر رجولیت کا مکمل مظہر مرد ہے اور جوہر انوثیت کی عورت۔ یہاں مرد اور عورت سے

کوئی خاص انسان مراد نہین بلکہ عورت اور مرد کا مثالی نصب العین) اس نقطۂ نظر سے عشق مین ہمیشہ جنس کی دوئی پائی جاتی ہی لیکن جنس کی بنا یہان جسمانی ساخت کے اختلاف پر نہین ہے بلکہ نفسی ترکیب کے اختلاف پر۔

اسی خیال کو ہم ایک دوسرے پہلو سے ادا کر سکتے ہین۔ محبت کا موضوع ہمیشہ کوئی قدر ہوتی ہے جسے ہم کسی انسان مین مجسم دیکھتے ہین۔ انسانون مین جو قدر کا سرمایہ ہوتا ہی اسکی دو صورتین ہین ایک تو وہ جسمین انسان کا ذہن قدرون کو مختلف شعبون مین تقسیم کرتا ہی اور اُنکا شعور رکھتا ہی دوسری وہ جسمین وہ فطری اور لاشعوری حالت مین تشکیل سیرت کی وہبی قوت سے مالامال ہوتا ہی۔ ایک وہ جسمین اسکی ذہنی قوتین عقلی اصول پر منقسم ہوتی ہین اور دوسری وہ جسمین اُسکا نفس فطرت کی گود مین وحدت اور ہم آہنگی کی مُبارک زندگی بسر کرتا ہی۔ یہ دونون صورتین ایک دوسرے کی تمنا رکھتی ہین تاکہ وہ مل کر انسان کی سیرت کو بلند تر اور نصب العین سے قریب تر کرین۔ اسلئے بقول افلاطون کے عشق کے یہ دونون حامل ایک ہی وقت مین غنی بھی ہین اور محتاج بھی، منعم بھی اور سائل بھی، اثر آفرین بھی اور اثر پذیر بھی اور نوجوان مین تو یہ کیفیت خصوصیت کیساتھ ہوتی ہی کہ وہ کائنات کی قدر کا ادراک محض اسطرح کر سکتا ہی کہ اُسے محسوس شکل مین کسی شخص کی ذات مین مجسم دیکھے۔ یہان تک کہ حسن اخلاقی قدر کا وہ طالب ہی اسمین اور اُس انسان مین جو اس قدر کا ادراک یا محض ہمارے نوجوان کے خیال مین) حامل ہی وہ کوئی فرق نہین سمجھتا۔ نصب العین سے اُسکی عقیدت اسی شکل مین ظاہر ہوتی ہی کہ وہ اپنے "انسان" سے عقیدت رکھے۔ خدا محفوظ رکھے اُس گھڑی سے جب یہ انسان ویسا نہ نکلے جیسا وہ دیکھنے مین معلوم ہوتا ہے، ہوسکتا ہی کہ ایسی صورت مین ہمارے نوجوان کی نظر مین کائنات کی پوری عمارت مسمار ہو کر بیٹھ جائے۔ عورتون مین یہ طرز خیال نوجوانی کے بعد بھی باقی رہتا ہی۔ عورت دنیا کو صرف کسی محبوب ذات کیواسطے سے سمجھ سکتی ہی لیکن اسکے یہ معنی نہین کہ ہم مذکورہ بالا تقابل جنسی کی اصطلاح مین کہین کہ نوجوان کا افراد کو قدرون کا مظہر اور مجسمہ سمجھنا انوثیت کی علامت ہی۔ جب انسان پختگی کو پہونچتا ہی تو اُسکے خیالات اونچے ہو جاتے ہین اُسے قدر سے من حیث القدر اور شے سے بنفسہ محبت ہو جاتی ہے

اور وہ انھیں اپنی جدو جہد کا موضوع اور اپنی ذاتی قدر کا منبع سمجھنے لگتا ہی۔

غرض نوجوان محبت مین قدور کو کسی انسان کی ذات مین محسوس اور مجسم شکل مین دیکھنے کا پابند ہی اور اسی لئے ہم اُسکے عشق کو جمالیاتی محبت کہتے ہین کیونکہ اگر اُس کی نظر کے سامنے سے جسمانی حسن کا حجاب اُٹھ بھی جائے تب بھی وہ اُس قید سے آزاد نہین ہوتا کہ عام اور عالمگیر قدور کا مظہر اُن چیزون کو سمجھے جنکا مشاہدہ ہو سکتا ہی۔ نوجوان کے نزدیک "عین" عقل و ادراک سے بہت دور زمان و مکان کے ماورا ہوتا ہی وہ اسکا قرب اسطرح ڈھونڈھتا ہی کہ اُسکی جھلک کسی جیتے جاگتے انسان کی ذات مین دیکھے جس سے وہ تبادلۂ احساس کر سکتا ہی جسے وہ کمال اپنی کی مدد سے کسی حد تک سمجھ سکتا ہی اور جس سے وہ ہمدردی پیدا کر سکتا ہی وہ عموماً اس عمر مین اُس روحانی بلند پروازی سے ناآشنا ہوتا ہی جسمین انسان وجد کے عالم مین قید صورت سے آزاد ہو کر شاہد معنی کا وصال حاصل کرتا ہی اسکی حد پرواز تو بس اُس تجویدی عشق تک ہوتی ہی جو کسی حسین انسان کی تصویر کا مشاہدہ کرتی ہی اُسے تخیل کی مدد سے مکمل اور پر اسرار بناتی ہی اور اپنی روح کو اُسکی روح مین ضم کر دیتی ہی۔ خدا کی یہ دین کہ انسان واقعیت کی بگڑی ہوئی صورت مین بھی جمال الٰہی کا مشاہدہ کرے۔ عرفان کا یہ آخری درجہ پختہ مغزون کے لئے مخصوص ہی اور ہم مین سے کون ہے جسکی پختہ مغزی مکمل ہو چکی ہو۔

اس عام بحث کے بعد اب ہم نوجوانون کے عشق کی مخصوص صورتون کا ذکر کرینگے جو کچھ کہا جا چکا ہی اُسکو مد نظر رکھتے ہوئے کسی کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ نوجوانون کے عشق مین معشوق کے لئے عمر اور جنس کی کوئی قید نہین خصوصاً اتحاد جنس کبھی اس عمر مین عشق کے راستہ مین حائل نہین ہوتا البتہ اختلاف عمر سے کسی قدر رکاوٹ پیدا ہوتی ہی۔ ہم نوجوانون کے عشق کی اس اعتبار سے چار قسمین کر سکتے ہین۔

(۱) ایک جنس کے ہمعمر لوگون مین باہم عشق۔

(۲) ایک جنس اور مختلف عمر کے لوگون مین باہم عشق۔

(۳) مختلف جنس کے ہمعمر لوگون مین باہم عشق۔

(۴) مختلف جنس اور مختلف عمر کے لوگون مین باہم عشق۔

ان سب صورتون مین یہ فرض کر لیا گیا ہی کہ ابھی تک شہوت شعوری حالتمین بالکل معدوم ہی۔

نوجوان لڑکون اور لڑکیونکی باہمی دوستی خصوصاً اُنکی جنکی طبیعت مین زیادہ گہرائی ہی۔ عام طور پر عشق پر مبنی ہوتی ہی۔ پہلا قدم ایک دوسرے کے جسمانی حسن کی محبت ہے جو اُن کے ملانے مین واسطہ کا کام دیتی ہے۔ اسکے بعد آہستہ آہستہ روحانی اتحاد پیدا ہوتا ہی جسے ابتدا مین بجائے ایک دوسرے کو پوری طرح سمجھنے کی دونون کی ہم آہنگی کہنا بہتر ہوگا۔ کیونکہ سمجھنا محض جمالیاتی محبت کا نام نہین ہی۔ نوجوان جب سمجھنے کی کوشش کرتے ہین تو اپنی داخلیت پرستی کے سبب اپنے نفسی کیفیات کے حدود سے بہت کم باہر نکلتے ہین دوسرے کے نفس مین اُنھین وہی چیزین نظر آتی ہین جو اُنکی کمال بینی ڈھونڈھتی ہی جرمنی مین "طوفان و تلاطم" کی تحریک کے زمانہ سے اس عجیب نفسی فعل کے لئے "ہمدردی" کا لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہی۔ ہمدردی وہی ہی جو بے جانے بوجھے کی جائے۔ یہی فرق ہی نوجوانی کی محبت مین اور پختہ عمر لوگون کی دوستی مین۔ نوجوان دوسرون کو اُس طرح نہین دیکھتا جیسے وہ ہین بلکہ بہت بڑھا چڑھا کر۔ اور چونکہ اس بلند پروازی کی قوت خود اپنے نفس سے حاصل ہوتی ہی اسلئے اصل مین وہ اپنے دوست کی ذات مین اُسکی خیالی مکمل تصویر نہین بلکہ خود اپنا مرقع کمال دیکھتا ہی اور ظاہر ہے کہ دوست کی واقعی شخصیت کے سمجھنے کا تو کوئی ذکر ہی نہین کیونکہ اسکے لئے بہت زیادہ پختگی کی ضرورت ہی۔ اگر عشق کی کیفیت کبھی عارضی طور پر زائل ہو جائے تو دوسرے کی واقعی سیرت سے سخت مایوسی ہوتی ہی۔ انسان اُس سے خیر مطلق کی توقع کرتا ہی۔ اگر کامل روحانی اتحاد پیدا کرنے مین کامیابی نہ ہو تو طعن و تشنیع کا دروازہ کھل جاتا ہی۔ اس عمر مین انسان دوستی کی بے انتہا سخت شرطین مقرر کرتا ہی جسمانی ہمآغوشی بغلگیری کی خواہش کبھی کبھی بہت قوی ہوتی ہی۔ نوجوان لڑکیان آپسمین معانقہ اور بوس و کنار

مین بہت مبالغہ کرتی ہین (خصوصًا اُس صورت مین جب وہ دوسرون پر یہ جتانا چاہتی ہین کہ تم اس روحانی اتحاد مین شریک نہین ہو) لیکن اصلی شہوانی خواہشین ابھرنے نہین پاتی کیونکہ ان پاک تعلقات کا احترام اسکی اجازت نہین دیتا یہ جوانون کی مخصوص صفت ہی۔ اسی فطرتی حیا کو ترک کردینے کے سبب سے حسین یونانی نوجوان ایسی بیاڈیس بالکل بگڑ جاتا ہی کیونکہ روحانی اتحاد چاہے جتنا بڑھ جائے۔ نوجوان ایکدوسرے سے بے حد حجاب رکھتے ہین۔

اس طرح کے تعلقات کا نتیجہ ہمیشہ دردناک ہوتا ہی۔ کچھ دن کے بعد وہ زمانہ آتا ہی جب ہمارے نوجوانون کی طبیعت بدل جاتی ہی یا اُن مین واقفیت کا احساس بڑھ جاتا ہی۔ خود اپنی سچی شخصیت کے اُبھرنے سے یا دوسرے کی واقعی سیرت کے علم سے خواہ وہ بذات خود اچھی ہو۔ اسطرح کی دوستیونکا خاتمہ ہوجاتا ہی۔ بعض صورتون مین یہ ہوتا ہی کہ ایکدت تک افسوسناک بحثابحثی، سخت طعن و تشنیع اور سچائی کا خون کرنیوالی جنگ و جدل ہونیکے بعد دوستی آیندہ کے لئے ایک نئی بنیاد پر قائم ہوجاتی ہی لیکن دوسری صورتون مین بھی روحانی حیثیت سے قطع تعلق ناممکن ہی کیونکہ خود اپنی ذات کے بہترین عناصر سے اس دوستی کی تعمیر ہوئی ہی۔ کامل جدائی کے معنی یہ ہون گے کہ انسان اپنی زندگی کے ایک پورے دور اور اپنے سب سے گہرے عقیدہ سے قطع تعلق کرے۔ اسلئے دلمین ایک خاموش آرزو ضرور باقی رہجاتی ہی۔ سطحی حیثیت سے برتاؤ مین سردمہری نظر آئے لیکن قلب کی گہرائی مین وہی پرانی آگ بھڑکتی ہی۔ اسی طرح کا تعلق گوئٹے اور یاکوبی مین تھا۔ ان دونون کی پرجوش ملاقات نوجوانی کے جنون خیز زمانہ مین دریائے رائن کے کنارے چاندنی رات مین ہوئی تھی۔ آگے چل کر اُنھین معلوم ہوا کہ اُن کے طبائع مین بیحد اختلاف ہی۔ پھر بھی اُنکے باہمی تعلقات پوری طرح سے کبھی منقطع نہو سکے۔ بہتر سال کی عمر مین یاکوبی نے جو آخری خط لکھا ہی اُس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہی کہ ساری عمر ان دونوںکے دلمین نوجوانی کی محبت کی یاد تازہ رہی۔ وہ نصب العین جس سے انسان کو کبھی عشق رہا ہی ہمیشہ قائم رہتا ہی البتہ عاشق کی طبعیت مین جیسی تبدیلی ہوتی ہی اُسکے لحاظ سے اس نصب العین کا حامل کوئی دوسرا شخص قرار پاتا ہی تاہم پہلے شخص سے جو محبت تھی وہ کبھی دلسے دور نہین ہوتی۔

۲- جسطرح ایک ہی جنس کے ہمعمر نوجوانون مین دوستی اور عشق مین امتیاز کرنا دشوار ہی اُسی طرح مختلف جنس کے لوگون کے باہمی تعلقات مین بھی ان دونون چیزون مین مشکل سے فرق کیا جاسکتا ہے۔ وہ خود ابھی اِس فرق کو نہین سمجھتے کبھی وہ اپنے باہمی تعلق کو دوستی یا رفاقت کہتے ہین حالانکہ وہ عشق ہوتا ہی اور کبھی وہ ایسے تعلق کو عشق سمجھ لیتے ہین جو اصل مین دوستی یعنی خیالات و احساسات کی ہم آہنگی ہی، اِسلئے واقفیت کے سبب سے اکثر سخت تکلیفین اُٹھانا پڑتی ہین خصوصاً عورتون کو اصلی محبت کی علامات نہ پہچاننے کی بدولت بڑی المناک صورتین پیش آتی ہین لیکن یہ محبت اُس عمر مین جسکا ہم ذکر کر رہے ہین نہ ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہی۔ اختلاف جنس سے دوسرے کی نفسی زندگی کی کرید کرنے کا شوق اور بڑھ جاتا ہی۔ دوسرے کے نظام نفسی کا خود اپنے سے مختلف ہونا دل کو محسوس تو ہوتا ہی لیکن سمجھ مین نہین آتا۔ اور یہان بھی باوجود روزمرّہ کے برتاؤ مین انتہائی بھولاپن اور بے تکلفی ہو لیکے بیحد حجاب ہوتا ہی۔ ہم یہان عاشقانہ چھیڑ چھاڑ کا ذکر نہین کر رہے ہین جسمین سچے عشق کے ظاہری پہلوؤن کی پوری نقل اُتاری جاتی ہی۔ لیکن اُسکی روحانی کیفیتون کا پتہ بھی نہین ہوتا اس عشق بازی کے محرک بالکل دوسرے جذبات ہوتے ہین۔ ہماری مراد اُس نئی زندگی سے ہے جو ہمارے نوجوان کے رگ وپے مین دوڑ جاتی ہی۔ جب کسی نظر کو عشق کی روشنی پہلے پہل خیرہ کرتی ہی۔

اسکی بہترین مثال بھی ہمین فیلکس ٹران کی زندگی مین ملتی ہی۔ چودہ برس کی عمر مین وہ پہلی بار اپنے پڑوس کی ایک تیرہ ۱۳ سال کی لڑکی کو دیکھتا ہی اُسکی زندگی مین بالکل انقلاب ہو جاتا ہی۔ اب اُسکی خاموش پرستش کی تنہا موضوع یہی لڑکی ہے جسے وہ "ڈوڈوسا" کہتا ہی۔ دن مین کئی بار وہ راستہ کاٹ کر اِس لڑکی کو دیکھنے جایا کرتا ہی چنانچہ سات برس مین وہ اُسے ۲۷۰۲ بار دیکھتا ہی لیکن اِس پورے سات برس مین اُسنے شاذونادر ہی کبھی اُس سے ہمکلام ہونیکی جرأت کی ہے۔ اُن مین آپسمین جو گفتگو ہوئی ہی اسکی کل کائنات معدودے چند الفاظ ہین۔ اُسنے اپنی محبوبہ کو جتنے گلاب کے پھول دیے ہین اُنکی تعداد انگلیون پر گنی جاسکتی ہے۔ باینہمہ اُسکے دل کی ملکہ اُس کے

خواب ہستی کی تعبیر جو کچھ ہو وہی لڑکی ہے۔ وہ اپنے گھر میں باقاعدہ "ڈوڈوس" کی پرستش کرتا ہے
اُسنے بیشمار نظمیں اس موضوع پر لکھی ہیں۔ یہ طویل روحانی محبت اُسے ادنی لذات کے قعر میں
گرنیسے روکتی ہے۔ "یہ شہوانی رغبت نہ تھی (جو دس برس کی عمر میں شہوانی رغبت) اور نہ سچا عشق تھا
اور نہ قصہ کا عنوان دوسرا ہوتا بلکہ قصہ بیان کرنیکی نوبت ہی نہ آئی) اسکا نتیجہ سوائے اسکے کچھ نہ نکلا کہ
میں نے چند ہزار اشعار لکھ ڈالے اور (یہ البتہ بے انتہا قابل قدر بات ہے) میرے لئے اس محبت نے
محافظ عفت تعویذ کا کام دیا۔" ڈوڈو سا شہوانی خواہشوں سے بالاتر تھی۔ اُس آسمانی ملکہ کی طرح
جو روشنی کے ہالہ میں بادلوں پر سوار محو پرواز رہتی ہے اور جسکے جسمانی حسن سے تمتع کی خواہش بدترین
گناہ ہے یہ ضوفشان، حسین، خاموش، پاک، تصویر بھی اتنے سال تک میری زندگی کی فضا پر چھائی
رہی۔"

ان عاشقانہ تعلقات کی خصوصیت کو زیادہ نمایاں کرنیکے لئے ہم دونوں جنسوں کے باہمی
روابط کی اُن منزلوں پر نظر ڈالتے ہیں جو اس سے پہلے گذر چکی ہیں۔ ان روابط کی نشوونما
کی تین منزلیں قرار دیجا سکتی ہیں۔ اصلی بچپن کے زمانہ میں (یعنی دس برس کی عمر تک) لڑکے
لڑکیاں بالکل بے تکلفی سے باہم ملتے جلتے اور ساتھ کھیلتے ہیں۔ البتہ لڑکوں کی طرف سے لڑکیوں کے
ساتھ مساوات کا برتاؤ نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے رفیقوں کی قدر زیادہ تر طاقت اور جرأت کے اعتبار سے
کرتے ہیں پھر بھی اختلاف جنس کی باہمی کشش کبھی کبھی اپنا اثر دکھا ہی دیتی ہے اور اسکا اظہار ایک
دوسرے کی لطف آمیز خاطر داری اور طفلانہ پرستاری کی صورت میں ہوتا ہے۔ اٹیلر نے اس منزل
کی خصوصیات کا نقشہ اپنی کتاب "لڑکیوں کے دشمن" میں کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن انھیں
اُسے نہ نفسیات کے نقطۂ نظر سے کامیابی ہوئی ہے اور نہ شاعری کے لحاظ سے زندگی کے اُن چند
سالوں میں جو عنفوان شباب سے پیوستہ پہلے گذرتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں عموماً غرور اور حجاب
کیوجہ سے ایک دوسرے سے بالکل جدا رہتے ہیں۔ لڑکوں کی نظر میں لڑکیوں کی وقعت نہیں ہوتی
اور لڑکیاں جنکی دماغی نشوونما لڑکوں سے پہلے ہوتی ہے اُنھیں پھوہڑ اور بدھو سمجھتی ہیں۔ وہ

ایک دوسرے سے دور ہی دور رہنا چاہتے ہین لیکن بڑی نفسیاتی غلطی ہو گی اگر ہمین اس احتراز کی آڑ
مین وہ گہری کشش نظر آئے جو اُن مین باہم لاشعوری حیثیت سے ہوتی ہو۔ یہ لوگ تو اسکا اعتراف
خود اپنے ہم جنسون کے حلقہ مین بھی نہین کرتے۔ لیکن دیکھنے والا دیکھتا ہو کہ لڑکون کو جیسے ہی لڑکیون کی
موجودگی کا احساس ہوا انکی حرکات و سکنات فوراً بدل جاتی ہین اور اسی طرح لڑکیان بھی
دراصل لڑکون سے تغافل نہین برتتین۔ لڑکے اپنی اکڑ فکڑ سے لڑکیون پر "رعب گانٹھنا" چاہتے ہین تو
لڑکیان بھی مصنوعی سنجیدگی اور وقار سے اُنھین مرعوب کرنا چاہتی ہین اور جب انکی تعداد کافی
اور طبیعت موزون ہوتی ہو تو طعن و تشنیع سے بھی نہین چوکتین۔ مگر اس عمر مین ایک دوسرے سے
کسی طرح کا ذہنی فائدہ نہین ہو سکتا کیونکہ دونون تہی دست ہین۔ چنانچہ اس پہلو سے لڑکیون
اور لڑکون کو ساتھ تعلیم دینے کی تائید مین کوئی معقول دلیل نہین ہے۔

بہت سے نوجوانون مین یہ کیفیت آغاز بلوغ کے بعد بھی بہت دن تک باقی رہتی ہے
مگر یہان پہونچکر طبائع دو قسمون مین منقسم ہو جاتی ہین۔ بعض "شوقین مزاجی" اور "عاشقانہ چھیڑ چھاڑ" کیطرف
مائل ہو جاتے ہین اور بعض پر حجاب اور خاموشی کا غلبہ ہو جاتا ہو۔ اس عمر مین داخل ہوتے ہی لڑکو کا
"بننے" لگنا ارتقائے نفسی کے لئے کوئی اچھی علامت نہین۔ اس صورت مین وہ بالکل سطحی زندگی بسر
کرتے ہین۔ اُنکا وقت، قوت اور روپیہ ظاہری چیزون مین برباد ہوتا ہو اور قدرتی طور پر طبقۂ
نسوان سے اُنکی واقفیت اُن عورتون تک محدود رہتی ہو جنکی ذات اپنی جنس کی بہترین خصوصیات
کی مظہر نہین ہے۔ ان لوگون کا لباس، کالر نکٹائی سے لیکر چکنے چمڑے کے دستانون تک فیشن کے
لحاظ سے بالکل مکمل ہوتا ہو۔ انکے بالون کا پیچ و خم حجامت کے مصروف ترین خراج تحسین وصول کرتا ہو
غرض انکی ہر ادا سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ وہ آداب معاشرت کی تمام صورتونکی بے اُن کے معنی سمجھے
ہو بہو نقل اُتار نہین کمال رکھتے ہین۔ یہ نوجوان جو بڑے یورپ کے چھوٹے بڑے شہرون مین تفرج
گاہون اور باغون کی روشون پر جنسے انھین خاص انس ہے گلگشت کرتے نظر آتے ہین۔ ناچ کی تعلیم
جو لڑکون اور لڑکیون کو ساتھ ساتھ دیجاتی ہو بجائے خود بے ضرر ہی کیون نہو لڑکو پر اسکا اثر اچھا

نہین پڑتا کیونکہ ان کی تکمیل ابھی سے وہ صورت اختیار کر لیتی ہی جبکا وقت اصل مین اُسوقت آتا ہی جب انسان خود بھی کچھ ہو جائے" ہم بہت لوگون کو جانتے ہین نفسی ارتقا کے بہترین ثمرات سے ناچ کی تعلیم اور ناچ کی عشقبازی کے "مسرت بخش" لمحونکی بدولت محروم ہو گئے۔ لڑکیون کے لئے اسمین کم خطرہ ہے بلکہ یہ اُنکی حیاتی نشوونما کا خاص میدان ہی۔

دوسری قسم کے لڑکے جنپر حجاب اور خودداری کا غلبہ ہوتا ہی اصل مین صنف لطیف کی کہین زیادہ گہری پرستاری پائی جاتی ہی۔ یا تو وہ تمکین عصمت کے پردے مین ایسا چھپا ہی کہ اپنے خاموش عشق کو مطلق ظاہر نہین ہونے دیتا۔ یا بے انتہا حجاب کیساتھ دور سے اپنی معشوقہ کی پرستاری کرتا ہی۔ چہرے پر حیا کی سُرخی لئے ہوئے وہ اپنی نظرون سے اُسکا (محبوبہ کا) تعاقب کرتا ہی اور اگر کبھی وہ سلام یا مزاج پرسی کرلے تو اسکی مسرت کی کوئی حد نہین رہتی" اس روحانی عشق و محبت سے نوجوان مین قوت تخلیق پیدا ہوتی ہی اور شوقین مزاجی اور ناچ کی تعلیم سے یہ قوت فنا ہو جاتی ہی۔ جبتک نفس مین محبوب کی تصویر رہتی ہے وہ کیچڑ اور گندگی سے آلودہ نہین ہونے پاتا۔ اُسکی خاموش گہرائیو نمین ذہنی تخلیق کی قوت اُبھرتی ہے۔ اس عقیدہ کا کہ کائنات عینی قدر رکھتی ہی جسکے حصول کی سعی مشکور ہوتی ہی سچے عشق سے چولی دامن کا ساتھ ہی۔ جو محبت نہین کر سکتا۔ اُسکا عقیدہ بھی استوار نہین ہو سکتا۔ اور جو شخص اس روحانی سرمایہ کو چھوٹے چھوٹے سکون کی صورت مین خرچ کر ڈالتا ہی۔ اُسکے پاس کچھ نہین بچتا جس سے کوئی قابلِ قدر چیز پیدا کیجا سکے۔ اس لحاظ سے یہی نفسی بہار کا زمانہ وہ ہی جسمین انسان کی آیندہ ذہنی ارتقا کی گہرائی کا فیصلہ ہوتا ہی۔

ہمارے خیال مین عنفوان شباب کے ابتدائی حصہ مین اصلی اور سچی محبت نمودار نہین ہوتی کیونکہ اول تو اس زمانہ مین انسان اپنے آپ کو ڈھونڈھنے مین اسقدر مشغول ہوتا ہے اور دوسرے ابھی تک محض روحانی اتحاد کی آرزو اور کامل جسمانی و ذہنی یگانگت کی تمنا مین باہم اسقدر بعد ہوتا ہی کہ مکمل عشق کی صلاحیت ہی مفقود ہوتی ہی۔ علاوہ اسکے سچا عشق وہ ہے جسمین انسان اپنی محبوب صفات کے مجموعی خیالی نصب العین سے نہین بلکہ کسی جیتے جاگتے انسان سے

محبت کرتا ہے۔ ایسی محبت جیسی گوئٹے کو لوٹے کیسنر سے تھی۔ نوجوانوں کی نظروں میں نہیں سمائی اسلئے آغاز شباب کا عشق شاذونادر ہی اس بلند تر درجہ پر پہونچتا ہے۔ البتہ سچی دوستی کی بنا اس میں پڑ سکتی ہے۔

رجولیت اور انوثیت (یا پیروی اور پیروی) کا فرق جسے جسمانی اختلاف سے کوئی تعلق نہیں، ہمعمر نوجوانوں میں بھی تقریباً سب میں تھوڑا بہت نظر آتا ہے۔ لیکن یہ اسمیں بھی زیادہ نمایاں اُسوقت ہوتا ہے جب مختلف عمر کے لوگوں میں باہم عشق ہو۔ اس کی بنا ایک حد تک جسمانی اختلاف جنسی پر بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اصل میں یہ فرق مختلف عمر کے لوگوں میں اسلئے ہوتا ہے کہ ایک کے نفس میں کیطرفہ جمعیت اور اثر آفرینی ہوتی ہے اور دوسرے کے نفس میں نیم خوابی، بھولاپن اور اثر پذیری پائی جاتی ہے۔

۳۔ جنس مذکور میں عشق کی یہ صورت نوجوان اور لڑکے میں باہم پائی جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ عمر والے کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جسکی کم عمر والے کو ضرورت اور آرزو ہے لیکن اسی کے ساتھ کم عمر والا قوت تخلیق کا وہ خالص فطرتی عنصر رکھتا ہے جس سے زیادہ عمر والا محروم ہے اور اس محرومی سے دلگیر ہے۔

وہ شخص بھی جسنے ابھی عنفوان شباب کی منزل میں قدم رکھا ہے ایک لڑکے سے جسے یہ انقلاب عظیم بہت جلد پیش آنیوالا ہے گہرا انس رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لڑکے کی اس راہ میں حفاظت کیساتھ رہنمائی کرے۔ اسکے ساتھ اُسکے دل کے کسی گوشہ میں یہ حسرت ہوتی ہے کہ فطرت کی گود میں کھیلنے والا بچپن، یہ فردوس گمشدہ اُسے دوبارہ مل جائے۔ ایک بڑی عمر کا آدمی جسکے سینہ میں نوجوانوں کا سا دل ہے۔ لکھتا ہے۔

"ہمیں فطرت کی اس تعلیم سے زندگی کی مردانہ تشکیل میں سبق لینا چاہئے کہ وہ انسان کو بچہ سے، جو کھیل کود اور خواب دیکھنے میں مصروف رہتا ہے اور کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جاؤنگا، نوجوان بناتی ہے جسے یہ معلوم ہے کہ زندگی کی ہزارہا امکانی صورتوں میں سے

اُسے ایک صورت اختیار کرتا ہی جسکی خاطر وہ اپنے نفس کو تنگ اور محدود کرتا ہی اور جسکی شکل مین وہ شعوری
احساس ذمہ داری کے ساتھ منہمک رہتا ہی. کسقدر دلدوز ہے اُس لڑکے کی تشویش جو دفعتاً آنکھ کھولکر
دیکھتا ہی کہ آنیوالی زندگی مین اُسکے بچپن کے خوابون کی کوئی تعبیر نہین جنمین وہ اپنے سر پر تاج شاہی
دیکھا کرتا تھا اور لڑکے کی اس بیداری کو مستحکم اور نتیجہ خیز قوت بنانیکے لئے معلم کی طرف سے انتہائی
محبت وشفقت کی ضرورت ہی یہان وہ تعلیمی پہلو، باہمی تہذیب وتربیت کی قوت خاص طور سے نمایان
ہے جسکی جھلک ہر عشق مین پائی جاتی ہے. گرل پارتسر نے اس پہلو کو تفصیل کیساتھ اُس خاکہ مین
جگہ دی ہے جو اُسنے گوئٹے کے (حصہ اول) کا تتمہ لکھنے کے لئے بنایا تھا. اسمین وہ یہ ثابت کرتے
ہوئے کہ مافوق الانسان بننے کے معنی اپنی خودی کو محدود کرنا ہی. ایک جگہ کہتا ہی،" مین اُسے
(فاؤسٹ کو) ایک ایسے لڑکے سے ملاتا جسکے نفس نے ابھی جاگنا شروع کیا ہو اور اُسے اس لڑکے کا
معلم اور دوست بنادیتا" اس عشق کی بھی ایک گہری مافوق الطبیعی بنیاد ہے. اور وہ یہ ہے کہ
انسان اسکی بدولت فطرت کی بہار کو آدمی کے نفس مین جلوہ گر ہوتے ہوئے دیکھتا ہی دوسری جانب
(لڑکے یا لڑکی کی طرف) سے بھی اسی شدت کے ساتھ ایک بلندتر زندگی کی آرزو ہوتی ہے.

شارلوٹے بوہلر کے روزنامچہ مین ایک جگہ ہے:" کیون کوئی بڑا آدمی ازراہ کرم میری طرف توجہ
نہین کرتا. اگر اس پہلو سے دیکھئے تو عشق تمنا ہی ایک استوار اور پختہ مغز ذات کی. ایک جمال معنوی
کی جو محض جسمانی حسن مین ظاہر نہین ہوتا اور افلاطون کی اصطلاح مین حکمت کہلاتا ہی. ایک نجات
دہندہ کی جو ایک بیکس کو جسے کوئی نہین سمجھتا، سمجھے اور روحانی تنہائی کی قید سے نکالے. اکثر نوجوانون
اور اُن کے سچے رہنماؤن کے باہمی تعلق مین (قدیم جرمن جرگون کے زمانہ سے لیکر موجودہ تحریک
شباب تک جسمین ذہنی پہلو غالب ہے) عشق ہی مضبوط فطرتی رشتہ اتحاد کا کام دیتا ہی. اسطرح کا عشق
نوجوان لڑکیون اور بالغ عورتون کے درمیان بھی پایا جاتا ہی. یہان ایک نئی بات یہ بھی ہوتی ہے کہ
لڑکیان بڑی عورتون کو فطرت نسوانی کے سر عظیم کا محرم جان کر اُن کی پرستاری کرتی ہین
لیکن اس سے قطع نظر کرکے بھی ہمین عورتون مین آپس کے عشق کی مثالین ملتی ہین یہ محض

اتفاقی بات نہین ہے کہ انسان دونون روزنامچون مین جو ہمارے پیش نظر ہین اول سے آخر تک سوانح زندگی کا سب سے اہم موضوع ایک ساتھی کے عشق کی داستان ہے جسمین روحانی مسرت، پرستش، مایوسی اور پھر سے شوق شروع کرنیکا قصہ بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ اس طرح کا عشق استادون کے ساتھ نہین ہو سکتا بلکہ صرف استادون کے ساتھ ہوتا ہے نفسیاتی نقطۂ نظر سے سخت غلط فہمی پر مبنی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہنے والا اس متعصبانہ خیال کا پابند ہے کہ نوجوانی کے عشق کا انحصار محض عضویاتی اختلاف پر ہے حالانکہ اس عمر مین عشق اکثر صورتون مین محض اُس ولولہ کا نام ہے جو انسان کے دلمین اپنے آپ کو انفرادیت کی قید سے آزاد کرنیکے لئے اُٹھتا ہے وہ داخلیت کے خلیج کو عبور کرنیکے لئے پل تلاش کرتا ہے لیکن ایسے پل جو قوس قزح کے مانند ہین اور اُسے کبھی واقعی انسانون تک نہین پہونچا سکتے۔ "میرے نصیب مین یہی ہے کہ مین ہمیشہ تنہا رہون۔ تنہا ستارے کی طرح تنہا! انسان ہمیشہ ستارون کی طرح تنہا رہتا ہے۔"

ایسے وقت مین تخیل مکمل تصویرین پیش کرتا ہے اُن انسانونکی تصویرین جو زندگی کی تفسیر کرکے اُسکے حسن اور دولت کو نمایان کر سکین اور جب ان تصویرون سے مایوسی ہوتی ہے تو صرف یہی نہین کہ تنہائی کا احساس پھر لوٹ آئے بلکہ اکثر انسان کو اپنے آپ سے اور زندگی سے سخت نفرت ہو جاتی ہے۔

جرمنی کی موجودہ تحریک شباب کا ایک اہم عنصر یہی عشق یا ایک دوسرے کی تہذیب و تربیت کی خواہش ہے۔ اسمین مختلف عمر کے لوگون کے باہمی تعلقات صریحًا اسی بنیادی تعلیمی جذبہ پر مبنی ہین کہ سب مل کر نصب العین اور اُسکے حسن و جمال کی پرستش کرین۔ چھوٹی عمر والون کو یہان ایسے لوگ ملتے ہین جو اُن کے طفلانہ مشاہدۂ زندگی کی تفسیر اپنی قوت بصیرت سے کرکے اُنکی رہنمائی کر سکین اور ہمعمرون مین بھی یہ رشتہ اتحاد ہوتا ہے کہ اُنھون نے مل کر دنیا کی اصلاح کا خفیہ عہد کیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس تحریک کی بدولت تنہائی کی نتیجہ خیز خلش، مایوس آرزو کی تخلیقی قوت ضایع ہو گئی ہے۔ سقراط جس رنگ مین اُسے افلاطون نے پیش کیا ہے ہمیشہ اب

مذہب عشق کا پیمبر مانا جائیگا خواہ خود اُسکے نزدیک یہ محض ایک پیالہ ہو جسمین اُسے عکس رخ یار نظر آتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ درد دل کے مزے سے آشنا ہے۔ اور اسمین شک نہین کہ نوجوان کے ناکردہ کار نفس مین جو دلربائی و دلفریبی ہے اُسکا احساس فوق الطبعی واردات کی صورت مین سقراط کو ہو چکا تھا۔ قبل اسکے کہ اُسکا شاگرد افلاطون اس واردات کو اپنی تصوف آمیز شاعرانہ تصنیف "دعوت" مین بقائے دوام کا خلعت پہنائے۔ ہولڈرلین کہتا ہے:۔

"اے مقدس سقراط تو کس لئے
"ہمیشہ اس نوجوان کی پرستاری کرتا ہے۔ کیا تجھے کوئی اس سے بہتر خبر نہین ملتی۔
"کیا وجہ کہ محبت بھری نگاہون سے
"تیری آنکھ اُسے یون دیکھتی ہے جیسے دیوتاؤن کو
"سچ ہے! جسکا خیال بلند ترین حقیقت تک ہو پہنچا ہو اُسے زندہ ترین مخلوق کی چاہ ہوتی ہے
"جسکی نظر نے دنیا کو دیکھا ہو وہ شباب کے راز کو سمجھتا ہے۔
"اور حکیمون کا میلان خاطر
"حسینون کی طرف ہو ہی جاتا ہے۔"

اس طرح کے عشق مین جتنا عمر کا اختلاف ہو اُسی نسبت سے اُسمین خالص روحانی محبت اور عرفان کا رنگ گہرا ہوتا ہے۔ جنسی عناصر معدوم ہو جاتے ہین اور محض جوہر رجولیت اور جوہر انوثیت کا اتصال انکشاف حقیقت کی مخصوص قوتین اور روحانی وصل اور روحانی توالد رہجاتے ہین۔

دوسری جنس کے معمر لوگونکی طرف عاشقانہ میلان نوجوان لڑکیون مین کم عمر مین ہوتا ہے لیکن نوجوان مردون مین بہت دیر مین جا کر پیدا ہوتا ہے گویا اسی پر جوانی کی نشوونما ختم ہوتی ہے۔

نوجوان لڑکیون کا بچپن دل محض اُستادہی پر نہین آتا لیکن ابتدا زیادہ تر اسی سے

ہوتی ہے اکثر یہ محبت ایک طرح کا مذہب بنجاتا ہے جسمیں پورے درجہ کی لڑکیاں ملکر اُستاد کی پرستش
کرتی ہیں اور یہ پرستش تقریبًا ایک مہلک مرض کی سی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اسمیں کبھی کبھی
وحشیانہ مظاہر پرستی کی جھلک نظر آتی ہے! اور عجیب مجنونانہ اوہام شامل ہو جاتے ہیں عورتوں میں یہ
کیفیت ایک حد تک ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ نفس نسوانی کو اپنی نشو و نما میں معمر مردوں سے جو فیض
پہونچتا ہے اُسکا شکریہ اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے فیض پہونچانیوالوں کی ذات سے انس
ہو جاتی ہے۔ عورت کو جس شخص میں زندگی کی قدریں مجسم نظر آئیں وہ اُسکی واقعی سیرت کو کلی یا
جزوی طور پر نظر انداز کرکے دل و جان سے اُسکی ہو رہتی ہے۔ اگر اُسنے کہیں اس جذبات پرستی کو
سچا عشق سمجھ لیا تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں کیونکہ سچے عشق کی بنا واقعیت پر ہوتی ہے
اور یہاں واقعیت کی طرف سے آنکھ بند کر لی گئی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ فطرت نے بالارادہ عورت
کے تخیل کو اسقدر صورت پذیر بنایا ہے تاکہ اُسے قدریں ہمیشہ اشخاص میں مجسم نظر آئیں اور اُسے یہ قوت
دی ہے کہ جو اثرات وہ قبول کرتی ہے اُنکی تشکیل کرے اور چپ چاپ نشو و نما پانے دے۔
بنات فطرت کو فطرت کے اس ارادہ کے آگے سر تسلیم خم کرنا اور سارے مصیبتیں جھیلنا پڑتا ہے۔

اسطرح کا علاقہ ایک حد تک باپ بیٹی میں ہوتا ہے اور کسیقدر کجروی کے ساتھ ماں بیٹیوں میں
بھی نظر آتا ہے۔ ہر تنہا اور یکطرفہ ذہن کو اپنی تکمیل کے لئے بجز اسکے کوئی چارہ نہیں کہ وہ متقابل
جوہر سے ملے اور اثر پذیر ہو اسلئے کونسی تعجب کی بات ہے اگر نوجوان کو معمر عورتوں سے اسطرح کا
تعلق ہو جو محبت تو نہیں لیکن محبت سے بڑھکر ہے پختہ مغز عورتوں کی روح میں تشکیل و تہذیب کی
جو قوت ہوتی ہے اُس سے خصوصیت کیساتھ نوجوان مرد بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو سطح کے
نیچے اپنے آپسے لڑ رہے ہیں اور اپنی سیرت کی تعمیر میں مشغول ہیں۔ جرمنی کی جلیل القدر شخصیتوں میں
مشکل سے کوئی فرد ایسا نکلیگا جسمیں وہ بات جسکے سبب سے ہم اُسکا احترام کرتے ہیں بغیر اسکے حاصل ہوئی
ہو کہ وہ جوہر انوثیت کے کسی مکمل نمونہ کا مشاہدہ کرکے اپنے نفس میں اُسکا سا توازن اور تناسب
پیدا کرے۔ یہ مکمل جوہر انوثیت گوئٹے کو فراؤ فان اشٹائن میں نظر آیا تھا۔ شلر کو فراؤ فان کالب

ہین اور ہولڈرلین کو سوزانا گونٹار ڈ ہین۔ ہنریٹے ہیرتس کی بدولت پہلے نوجوان ہمبولٹ کی تہذیب و تربیت ہوئی پھر نوجوان شلائر ماخر کی مالویڈا فان میزن بگ کی محبت سے کچھ عرصہ کے لئے نیٹشے کو تسکین اور اطمینان خاطر نصیب ہوا۔ ان تعلقات مین جوہر امومت کو بھی دخل دیا ہی۔ لیکن یہ بھی عشق ہی ہی۔ ہر چیز مین جسمین اپنی داخلی زندگی کی تشکیل کی آرزو پنہان ہو اس نوجوانی کے عشق کی جھلک موجود ہوتی ہے۔

قبل اسکے کہ ہم اس باب کو ختم کرین ایک اور بات کہدینا ضروری ہی۔ اس عشق کی جتنی صورتین ہین سب مین محبت کی قوت محرک دراصل اس شخص کی واقعی سیرت مین نہین ہوتی جو معشوق قرار دیا جاتا ہو بلکہ خود اپنی داخلی کیفیات مین یہ نصب العین اپنے ہی نفس کی بہار سے پیدا ہوتے ہین۔ سچے قدر کو دیکھنے کی صلاحیت ابھی تک پختہ اور استوار نہین۔ کثرت سے ایسی صورتین پیش آتی ہیں کہ محبت کا جذبہ احتیاج سے مجبور ہو کر کوئی ذلیل اور کمینہ موضوع ڈھونڈ لیتا ہو اور اپنے تخیل سے کمال کے نقش و نگار سے مزین کر دیتا ہی۔ شلر کو لارا جیسی نظر آتی تھی اصل مین ویسی نہ تھی۔ اور ہولڈرلین کی ڈیوٹیما کے اصل خطوط مین اُسکی سیرت کی وہ شان دکھائی نہین دیتی جسکی شاعر کے لافانی معشوق سے توقع تھی اور عاشق کا تخیل محض معشوق کو نہین بلکہ سارے عالم کو ایک طلسمی نقاب مین چھپا دیتا ہی۔ بعض لمحے ایسے آتے ہین جب آنکھین کھلتی ہین اور واقعیت کا دردناک منظر دکھائی دیتا ہی خصوصاً ان اوقات مین جب خود اپنی کمال بینی کی قوت ساتھ چھوڑ دیتی ہی۔ استعارہ مین اسے یون کہ سکتے ہین واقعی انسان محض کپڑا لٹکانیکے چوبی ڈھانچے ہین جنھین نوجوان اپنے تخیل کا زرق برق لباس پہنا دیتے ہین اور ان لوگون کیلئے اکثر نوجوانون کا یہ طرز عمل ایک مصیبت ہو جاتا ہی۔ گرل پارتسر اپنے فاؤسٹ کے خاکہ کے سلسلہ مین کہتا ہی: "ہم اس زمانہ مین محض ان تصویرون کے عاشق ہوتے ہین جو ہمارا تخیل کھینچتا ہی۔ وہ لڑکی جسے ہم اپنے خیال مین چاہتے ہین اصل مین ایک پردہ تصویر ہے جسپر تخیل نے اپنے نقش و نگار بنائے ہین اور اپنے رنگ بھر دیے ہین۔ میں نے ایکبار کسی کو کہتے ہوئے سنا ہے (یا شاید مین نے خود ہی کہا ہو) کہ

"میں کسی پر عاشق ہوں مگر یہ نہیں معلوم وہ کون ہے۔ اس سے بڑھکر سچا اور نوجوان کی خصوصیات کا ظاہر کرنیوالا قول میں نے کبھی نہیں سنا۔

لیکن اس حقیقت سے عشق کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی ہے بلکہ محض نوجوانوں کی ارتقائے نفسی کے لئے اُسکی اہمیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جسطرح آرٹ کا شوق اور تماشاگری کی آرزو نفس کو وسعت دیتی ہے اسی طرح عشق اُسمیں بلندی پیدا کرتا ہے۔ اگر انسان میں عشق کا احساس نہ ہوتا تو اُسے کبھی خبر نہوتی کہ نصب العین کیا چیز ہے اس روشنی میں ہر چیز کل زندگی اور ساری فطرت حسین نظر آنےلگتی ہے۔ عشق کے پردہ میں ہمارے نفس میں حقیقی خلاق صورت آفرین ارتقا طلب قوتیں سرایت کرجاتی ہیں۔ فطرت اور ذہن کی وحدت کا راز نہاں یہاں آشکارا ہو جاتا ہے۔ فطرت کی قوت تخلیق کا طوفان عہد شباب کی نفسی بہار میں ذہنی تخلیق کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کیا حرج ہے اگر اعیان (Ideas) ابھی تک دور دراز ستاروں کی طرح سرحد ادراک سے ماوراء معلوم ہوتے ہیں وہ گھڑی بھی کبھی نہ کبھی آہی جاتی ہے جب یہ لطیف اعیان واقعیت کے کثیف مادے کے ساتھ مل کر ایک پر پا صورت اختیار کر لیتے ہیں جب یہ وقت آجائے تو بقول ارسطو کے بالغ بننے کا عمل ختم ہو جاتا ہے اور بلوغ کی عمر شروع ہو جاتی ہے۔

پانچوان باب

نوجوانون کے شہوانی جذبات کی نفسیاتی بحث

عشق اور شہوت مین ہم نے جو کلی فرق رکھا ہی وہ محض منطقی تجرید پر مبنی نہین بلکہ جیسا ہم بار بار کہہ چکے ہین خود نوجوان کے شعوری احساس مین یہ دونون چیزین بالکل جدا ہوتی ہین اس سے یہ مطلب نہین کہ انمین آپسمین کوئی تعلق نہین ہوتا۔ ہمارا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ نفسیات بیانی کے لحاظ سے عموماً یہی ہوتا ہی اور نفسیات ارتقائی کے نصب العین کے مطابق اصولاً یہی ہونا بھی چاہئے۔

اسوقت تک ہم جو بحث کر چکے ہین اُسی سے ثابت ہو گیا ہو گا کہ عہد عنفوان شباب کے کل مظاہر کی توجیہ عضویاتی ارتقا کے نقطۂ نظر سے نہین کیجا سکتی۔ انسانی زندگی کے نفسی عنصر مین بہت سی ایسی مستقل ترکیبین موجود ہین جنھین ہم محض جسمانی بلوغ کا تابع نہین قرار دیسکتے اور یون بھی سچ پوچھئے تو عضویاتی مظاہر کے ذریعہ سے ہم نفسیاتی نقطۂ نظر سے کسی چیز کو نہین سمجھ سکتے۔ جسمانی زندگی کے تغیرات کو معنوی نظام مین نفسیات افہامی مین اُسوقت دخل ہوتا ہی جب یا تو خود مدرک کو اُن کا احساس ہو یعنی وہ اُسکی مجموعی نفسی زندگی کے عناصر بنجائین یا فوق الافراد نظام منشا کے نقطۂ نظر سے وہ کسی ارتقا پذیر نفسی جسمانی وجود سے ایسا تعلق رکھتے ہون جو سمجھا جا سکے۔

پہلی شرط کے لحاظ سے موجودہ بحث مین یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ شہوانی جذبات کا جو جسمانی عناصر پر مبنی ہین خود نوجوان کو کیا احساس ہوتا ہی؟ اب ہی دوسری شرط اُسکا یہ حال ہے کہ عموماً لوگ اس معاملہ مین نہایت کم مایہ عوام پسند مادیت پرستی اختیار کرتے ہین جسمین نہ فلسفیانہ شان پائی جاتی ہے اور نہ مسئلہ زیر بحث کے حل کرنے مین مدد ملتی ہی جب ہم نے

یہ فرض کر لیا کہ فطرت کے پیش نظر جسمانی اور نفسی ارتقا مین کوئی مقصد ہے تو اس مقصد کے تعین
مین ہمکو ذرا دقت نظر سے کام لینا چاہئے اور یہ لکیر جیب نہ ہو رہنا چاہئے کہ فطرت کا منشا مرد اور
عورت کی منی پیدا کرنا ہی تاکہ اُس سے ایک نیا جسم پیدا ہو۔

خود عضویات کے نقطۂ نظر سے یہ طریقہ بالکل سطحی اور ناقص ہے کہ نوجوانی کا آغاز لڑکی کو
پہلی بار حیض کا خون آنیسے اور لڑکے کو پہلی بار احتلام ہونیسے سمجھا جائے یہ محض جہلا کی عضویات ہی
علم طب کی نئی تحقیقات سے اس مسئلہ مین قابل قدر انکشافات ہوئے ہین جنسے معلوم ہوتا ہی کہ
رطوبات کی اندرونی تفریق کو انسانی جسم کے مجموعی ارتقا مین اور خصوصًا زمانہ بلوغ کی تقدیم و تاخیر
مین بہت اہمیت حاصل ہی۔ ہمین اسمین ذرا بھی شبہ نہین کہ ان عضویاتی افعال کو نفسی تغیرات سے
تعلق ہے خواہ اسطرح کہ وہ ایک ہی عمل کے جداگانہ اجزا ہین یا اس طرح کہ دونون اصل مین ایک ہی
چیز کے دو رخ ہین۔ ہم صرف دو نظریون کے مخالف ہین ایک تو اس ثقیل مادیت پرستی کے
جسکی رو سے اہم اور بنیادی چیز جسمانی ارتقا ہی اور نفسی ارتقا محض اسکا "عکس" یا تابع مہمل ہے
دوسرے اس طرز خیال کے جو اسکے مقابلہ مین لطیف لیکن اسیقدر غلط ہے کہ غدودون کے کبھی
نئے فعل کے شروع ہونے یا پرانے فعل کے قوی ہو جانیسے ہم نفسی تغیرات کو سمجھ سکتے ہین کیونکہ
جسمانی مظاہر کا سمجھنا یعنی نظام نشا کے ماتحت انکی تفسیر کرنا صرف اسوقت ممکن ہے جب وہ بلاواسطہ
یا تحقیق اور غور و فکر کے واسطے سے ہمارے احساس مین آچکے ہون۔ علاوہ اسکے خود نوجوانون کے
نزدیک نفسی پہلو اتنا اہم ہی کہ اسے محض قوائے شہوانی کے تغیرات کا تابع مہمل نہین قرار دیسکتے۔
نفسیات شباب کے ابتک اسقدر محدود اور ناقص ہونیکا سبب یہ ہی کہ یہ علم مخفی طور پر مادیت پرستانہ
اوعائی عقائد کا پابند تھا۔ اور اسکی حد پرواز اُن مظاہر سے آگے نہ تھی جنکے پہلو بہ پہلو جسمانی مظاہر
بھی موجود تھے۔

موجودہ باب مین اصل مسئلہ یہ ہے کہ مجموعی نفسی ترکیب مین مخصوص شہوانی احساسات کسطرح
جگہ پاتے ہین۔ ہم طبیبون کی تحقیق و تجربہ کے دائرہ مین خصوصًا شہوانی امراض کی سمجھنے مین

دخل و معقولات دینا نہیں چاہتے جسکی بابت ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ عالم نفسیات کے لئے بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہے گو اس سے لوگوں نے زیادہ تر بے سروپا خیال آرائیوں اور بلند پروازیوں کا جولانگاہ گویا ایک طرح کا "سفینہ خضر" علم بنا رکھا ہے۔

لیکن اس معینہ مقصد کو پورا کرنیکے لئے ضروری ہے کہ ہم شہوت کے مفہوم کو وضاحت کیساتھ سمجھ لیں۔ یہ لفظ عام طور پر تین معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ سب سے تنگ پہلا مفہوم ہے جسکی رو سے ہم صرف اُن نفسی مظاہر کو شہوانی کہہ سکتے ہیں جنھیں مرد اور عورت کے عضویاتی فرق اور فعل جماع سے تعلق ہے۔ اس عنوان کی تحت میں بہت سے ایسے جسمانی اور نفسی مظاہر نہیں آتے جنمیں صریحاً شہوانی رنگ موجود ہے اور جنھیں خاص طور پر زمانہ قبل بلوغ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ فضلا خوار بچوں کے شہوانی احساسات، لواطت جلق، شہوت پر مبنی مذہبی جذبات وغیرہ۔

سب سے وسیع وہ تعریف ہے جو فرائڈ نے کی ہے۔ جسمیں نہ صرف ہر قسم کی جسمانی اور نفسی غلط کاریاں شامل ہیں بلکہ شہوت کی ارتقا کو نمایاں کرنیکے لئے اس لفظ کے مفہوم میں جسم کے وہ تمام حصے جنمیں شہوانی لذت کی صلاحیت ہے اور وہ سب صورتیں جنسے یہ لذت حاصل ہو سکتی ہے داخل کرلئے گئے ہیں بلکہ فرائڈ باوجود کبھی کبھی شہوانی تحریک اور نفسانی تحریک[1] میں فرق کرنیکے شہوت کے معنی کو اس سے بھی زیادہ وسیع سمجھتا ہے اور اسکو زندگی کا مرکز قرار دیتا ہے۔ اُسکے نزدیک اس مظہر کو اولیت حاصل ہے اور باقی تمام ذہنی مظاہر "محض" اسکی تبدیل شدہ یا ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔

معنی شہوت کی اس توسیع کو جو کھلی ہوئی زبردستی اور صریحی نظری اغلاط پر مبنی ہے ہم قبول نہیں کر سکتے۔ بلکہ مذکورہ بالا مفہوموں کے بجائے ہم ایک تیسرا مفہوم پیش کرتے ہیں جو دونوں کے بین بین ہے۔ ہمارے نزدیک نظام نفسی میں شہوت احساس اور خواہش کا وہ مرکب ہے جسمیں ایک مخصوص قسم کی شہوانی لذت پائی جائے اور نظام جسمانی میں اُن اعضاء اور وظائف کا

---

[1] یہاں تحریک سے مراد ہے ارادہ کی ابتدائی منزل اور نفسانیت سے مراد ہے خودی یا خودپرستی۔

مجموعہ ہی جسکو مذکورۂ بالا دائرۂ احساس سے تعلق ہو۔

اُس نفسی جسمانی ترکیب مین جسے ہم دائرۂ شہوت کہتے ہین بلاشبہ مرکزی حیثیت جسمانی پہلو سے اعضائے تناسل کو اور نفسی پہلو سے اُس حسی ہیجان کو حاصل ہی جو ان اعضا تک محدود ہے لیکن یہ صورت اُسوقت ہوتی ہی جب ترکیب نفسی کی ارتقا مکمل ہو چکی ہو۔ قرین قیاس ہی کہ اس سے پہلے نفس ایسے منازل سے گذرتا ہی جنمین ہنوز یہ تخصیص اور تفریق نہین ہوتی قدیم خیال کے مطابق عنفوان شباب کی یہی علامت ہی کہ اس عمر مین اعضائے تناسل ایک خاص قسم کی نشوونما کے بدولت اپنا فعل پورا کرنیکی صلاحیت حاصل کرتے ہین اور شہوانی رنگ کا نفسی ہیجان اب پہلے پہل پیدا ہوتا ہی۔ یہ بات بجائے خود غیر اغلب ہے کیونکہ اسطرح کے "حادثات" جنمین یون آناً فاناً انقلاب ہو جائے عمل ارتقا مین نہین ہوتے یا ہوتے ہین تو شاذونادر۔ منہاج بحث کا یہ تقاضا ہو کہ ہم فرض کرلین کہ اس عمل کی جو بظاہر دفعتاً واقع ہوا ہو پہلے سے تیاری ہو رہی تھی عضویاتی حیثیت سے اسطرح کہ ان مخصوص اعضا کے وظائف آہستہ آہستہ نشوونما پارہے تھے گو ابتک ظاہر نہین ہوئے تھے اور نفسی حیثیت سے اسطرح کہ جذبات، احساسات اور تحریکات کی ایک ھنڈلی سے روپیدا ہو چکی تھی جسکا ہنوز شعور نہین تھا۔

ہمین صرف نفسی پہلو سے دلچسپی ہے۔ البرٹ مول نے ماہرین تحلیل نفسی سے جدا یہ نظریہ قائم کیا ہو اور واقعات سے اسکا ثبوت دیا ہو کہ بچپن ہی سے شہوانی احساس موجود ہوتا ہی اسطرح کی صورتین اتنی نظر آتی ہین کہ سکو بیماری اور قبل از وقت بلوغ کا نتیجہ ٹھہرا دینا ناممکن ہے بیماری خود عموماً اُس کیفیت کی شدید صورت ہی جو ایک خفیف حد تک ہر شخص مین ہر وقت موجود رہتی ہے۔ یہان بھی ہمین مسلسل اور تدریجی تغیر کے اصول کو اپنی تحقیقات مین دلیل راہ بنانا چاہیے اس سے ایک نا واقف فن بھی اختلاف دیگا کہ بچہ مین کم سے کم ایک طرح کا شہوانی تجسس پایا جاتا ہی اور علاوہ اسکے وہ بے تکلف "خلاف تہذیب" باتون کی طرف توجہ کا اظہار کرتا ہی جسکے ساتھ صریحاً لذت کا ہیجان بھی ہوتا ہی۔ چونکہ اس ہیجان مین وہ مخصوص حسی لذت ہوتی ہے جسکا ذکر ہو چکا ہی اسلئے

[illegible] اہمیت رکھتی ہین۔

۱۔ بچہ کی شہوت احساس اور تحریک کا ایک ایسا رُحجان ہے جسمین اور دوسرے رحجانات مین تفریق نہین ہو سکتی۔ انھین اپنے اور دوسرون کے ننگے بدن خصوصًا اعضائے تناسل کے اور ان قریب کے حصون کو دیکھنے کا بہت شوق ہوتا ہو اگر اسمین تحریک یا طلب کا کوئی عنصر شامل ہے تو وہ ابتک بالکل دھندلا اور اُسکا موضوع غیر معین ہے لیکن اسکے جسم اور اُسکے تخیل مین صریحًا شہوانی لذت کی صلاحیت موجود ہو۔ شیرخوار بچہ کا ہر چیز کو چوسنا اور آگے چل کر اپنے ناخونکو چبانا کہان تک شہوانی لذت کی تحت مین آتا ہو؟ اس سوال کے جواب سے ہم احتیاطًا قطع نظر کرتے ہین۔ ہمین یہ سمجھنے کا کوئی حق نہین کہ ہر بوسہ اور ہر معانقہ مین شہوت کا عنصر ہوتا ہو اسیطرح یہ بات ہمین نفسیات ارتقا کی رو سے غلط معلوم ہوتی ہے کہ شہوانی تحریکون کے دبانیکو تربیت کے اثرات یا اخلاقی تصورات سے کوئی تعلق ہے۔ اصل مین خود ترکیب نفسی مین اس تحریک کے ساتھ ہی ایک دوسری تحریک بھی موجود ہوتی ہے جو اسے دباتی ہے یعنی بچون کو ان سب چیزون سے انتہائی شرم ہوتی ہو جسکا اظہار اس طرح ہوتا ہو کہ باوجود علم نہونیکے ان کا "ضمیر" انھین ان باتون پر ملامت کرتا ہے۔ فرائڈ کی تحلیل نفسی نے اس پہلو کو بالکل نظرانداز کر دیا ہو۔

اگر بچہ کی یہ احساس اور ہیجان کی صلاحیت کم عمری مین شدید شہوانی اثرات کے ذریعہ سے زیادہ اُبھاری جائے تو ---------- اسکے لئے ضروری نہین کہ بچہ نے کسی شہوانی فعل کا مشاہدہ کیا ہو یا خود اسپر ایسا فعل گذرے۔ محض عریان جسم کو دیکھنے زدوکوب کے واقعات (اس سلسلہ مین روسو کے بچپن کے واقعات پر غور کیجئے) یا تخیل مین ہیجان پیدا کرنیوالی تصویرون سے ناتجربہ کار بچون کے نفس پر یہ کیفیت گذرنا ممکن ہے۔ ارتقائے نفسی کے متعلق جو جدید تحقیقات ہوئی ہو اُسکا ایک اہم نتیجہ یہ بھی ہے کہ عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہو کہ ان قبل از وقت شہوانی احساسات مین مستقل بنجانے اور آیندہ ارادی زندگی پر دائمی اثر ڈالنے کی صلاحیت

ہوتی ہے بلکہ شاید ہمیں حامیانِ تحلیل نفسی کے ہم زبان ہوکر یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ یہ ساری غیر منقسم شہوانی کیفیت تحت الشعور میں باقی رہتی ہے اور اگر بلوغ کے بعد بھی انسان صحیح شہوانی افعال سے قاصر یا محروم رہے تو یہ چیز اسے اسکی تلافی کے عجیب عجیب طریقے سمجھاتی ہے۔ فرائڈ کا رجحان اسطرف ہے کہ ہر طرح کی خلاف وضع فطری حرکتوں کی توجیہ نظریۂ ارتقائے نفس کی رو سے یوں کرے کہ ایسی صورتوں میں انسان کے نفس میں بچپن کی دھندلی اور وسیع شہوانی کیفیت بدستور باقی رہتی ہے یا عود کر آتی ہے۔ اس نظریہ کی رو سے جلق، اغلام، لواطت، ظالمانہ شہوت وغیرہ سب کو عمل ارتقا کے رُک جانیکا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔

ہم اس بات کا فیصلہ کرنیکی جرأت نہیں کرتے کہ یہ نظریہ بجائے خود پوری طرح صحیح ہے یا نہیں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ عہد بلوغ سے قبل کی عمر میں اسطرح کی لغزشیں بہت ہوتی ہیں اور ان خلاف فطرت باتوں کا تھوڑا بہت تجربہ خواہ وہ محض تخیل ہی میں کیوں نہو ایسی ارتقائے نفسی میں بھی پیش آتا ہے جو ممکن ہے آگے چل کر بالکل صحیح اور مطابق فطرت ہو۔ یہاں بھی ہمیں وہی بات دکھائی دیتی ہے کہ فطرت بہت سے امکانات کا تجربہ کرتی ہے اور بہترین صورت میں ان میں سے اُنکا انتخاب کر لیتی ہے جو سب سے اعلیٰ قدر رکھتے ہوں۔

ان چیزوں کا مفصل ذکر کرنیسے قبل ہمیں اُس صورت پر نظر ڈالنا چاہیے جو عموماً پیش آتی ہے۔ فرض کر لیجئے کہ آغاز بلوغ سے قبل انسان کے نفس میں کبھی کوئی قوی احساس ایسا نہیں پیدا ہوا جسمیں شہوانی رنگ صریحًا نظر آئے۔ اب یہ معلوم کرنا ہے کہ جب کبھی ایسا احساس پہلی بار پیدا ہوگا تو نفس کی کیا کیفیت ہوگی۔

خود اپنے شعور میں شہوانی بیداری اکثر اسطرح پیدا ہوتی ہے جیسے دفعتًا جھٹکا لگ جائے اور کبھی کبھی یہ بھی بتایا جاسکتا ہے کہ فلاں لمحہ میں یہ واقعہ گذرا۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ حیات خصوصًا جب اُسکے ساتھ لذت کا قوی احساس بھی موجود ہو ہمارے نوجوان کو سعادت کا سرچشمہ معلوم ہوتی اور ساری زندگی کو مسرت اور روشنی سے معمور کر دیتی ہوگی۔ لیکن صورتِ حال اس کے

بالکل برعکس ہے۔ اس رازِ نہان کے آشکار ہوتے ہی جو چیز دل کو محسوس ہوتی ہی وہ خوف
اور دہشت کی کیفیت ہے۔ ضروری نہین کہ یہ حالت تربیت کے اثر سے یا ضمیر کی ملامت کے سبب سے
پیدا ہو بلکہ فطرت کے ان مافوق الطبعی اسرار پر نظر ڈالنا بجائے خود ہولناک کیفیت پیدا کرتا ہی اگر کوئی
یہ اعتراض کرے کہ بہت سے نوجوان پہلے ہی دن سے شہوانی لذت کا لطف اُٹھانے لگتے ہین
اور انھین نت نئی ہوس رانیوں کے سوا کسی چیز کی خواہش نہین رہتی تو ہم اُسکے جواب مین کہین گے
کہ بیشک بہت سے لوگونکی طبیعت مین احساس کی گہرائی اسقدر کم ہے کہ انھین صرف حسّی لذت کا شعور
ہوتا ہی اور یہ خبر نہین کہ اسکے ساتھ اُنکے سازِ روح کے تارون مین بھی لرزش ہوتی ہے لیکن اگر
نفس کے بیدار ہوتے وقت وہ توجہ سے کام لیتے یا انھین یہ ابتدائی احساسات یاد رہتے تو
صورتِ حال وہی ہوتی جو ہمنے بیان کی ہے۔ ممکن ہے کہ محض خیالات کے گورکھ دھندے سے
ہم اس نتیجہ پر پہونچین کہ شہوانی جذبات مین جو پہلو اثباتِ زندگی کا ہے اُسکا احساس ابتدا ہی سے
جوش و خروش کیساتھ نشاۃ ثانیہ کی صورت مین ہوتا ہی لیکن نفسیاتی مشاہدات سے ثابت ہوتا ہی کہ
معاملہ بالکل برعکس ہے عقلیت پرست اسکی تاویل مین کہتے ہین کہ اسکا سبب مذہب عیسوی کی ہدایت
ہے جسنے وراثت اور تربیت کے ذریعہ سے صدیون مین لوگون کی طبیعت کا یہ انداز کر دیا ہے۔ ہم
ان لوگون سے۔ پوچھتے ہین کہ آخر مذہب عیسوی پر یہ اُصول کیسے حاوی ہو گیا۔ یہ بات تو
سمجھ مین آتی نہین کہ عیسائیت کا کوئی عقیدہ جو نظامِ فطرت اور نظامِ نشا کے بالکل مخالف ہو۔
اسطرح دنیا مین رواج پا سکے۔

بہر حال اس اندازِ احساس کا منبع جہان کہین بھی ہو ہمارا کام تو یہ ہے کہ اسے ذرا
تفصیل سے بیان کر دین۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسّی لذت مین بجائے خود اسطرح کی ہیبت
ہرگز موجود نہین بلکہ شہوانی احساس کا جو اثر ذہنی زندگی پر پڑتا ہی اس سے رغبت اور دہشت
کی مخلوط کیفیت پیدا ہوتی ہی اگر ہم شہوانی جذبات مین سے جو آجکل کے لوگونکی آدھی شخصیت پر
قابض ہوتے ہین تخیل کا عنصر نکال لین تو جو حصّہ باقی رہیگا کھانے پینے یا جسم کی دوسری ضرورتون کو

پورا کرنیکی طرح ایک معمولی سی بات ہوگی۔ بالفاظ دیگر شہوت مین بھی عشق کی طرح اسرار کائنات کی جھلک موجود ہے لیکن عشق انسان کو عالم علوی کی پر نور بلندی پر چڑھاتا ہے اور شہوت عالم سفلی کی پستی مین گراتی ہے۔ البتہ اگر عشق اور شہوت مین اتحاد کامل ہوجائے تو دوسری بات ہے۔ نوجوانون کے نفس مین شہوت کا عشق سے جدا ہوکر نمودار ہونا گویا ہستی کے اسرار کا دروازہ کھل جانا ہی۔ ابتدا مین ایسا معلوم ہوتا ہی کہ فطرت کی یہ چال جو وہ بقائے حیات کی غرض سے کرتی ہے اسکی شان کے منافی ہے اور انسان اور فطرت دونون کے لئے یہ باتین قابل شرم ہین۔ شہوانی احساس کے ساتھ ہی گہری شرم بھی نمودار ہوتی ہی بلکہ خود احساس مین موجود ہوتی ہے۔ اسکی تصدیق اُن اساطیر سے ہوتی ہے جو اس انداز احساس کی بنیاد پر وضع ہوا کرتی ہین۔ (یہ غلط ہے کہ خود یہ انداز خیال ان اساطیر کے اثر سے پیدا ہوتا ہی) مثلاً ہبوط آدم کا قصہ جسمین یہ راز بیان کیا گیا ہی کہ نیکی اور بدی کا احساس پہلے پہل شہوانی بیداری کیساتھ پیدا ہوتا ہے۔

ہم قطعی طور پر یہ نہین کہہ سکتے کہ فطرتِ انسانی کا مقصود اس طرز احساس سے اپنی حفاظت ہے تاکہ وہ افعال جنپر توالد کا مدار ہے روحانیت سے خالی نہ رہجائین۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ شہوت مین شرم اور اخفا کا جو عنصر ہے اُسے ترکیب نفسی کے اعتبار سے انفرادیت کے بنیادی احساس اور بے پایان تنہائی پسندی سے جنھین ہم نے عنفوانِ شباب کی خصوصیات قرار دیا ہے گہرا تعلق ہی عموماً جب نوجوان پر یہ راز آشکار ہوجاتا ہے تو اسے اپنے والدین کی طرف سے بہت بے اعتباری اور کشیدگی پیدا ہوجاتی ہے اسکی ساری ہستی دفعتاً شاہدۂ نفس کی گہرائی مین ڈوب جاتی ہی شہوانی احساس کی سطح پر چاہے جتنی حسی لذت اور ظاہر پرستی نظر آئے اسکی تہ مین یہانتک کہ مغلوب الشہوت قاتل کی مجنونانہ آرزو کے پردہ مین بھی گہرے راز کی جھلک ہوتی ہے۔ احساس شہوت مین ہمیشہ حسی شورشون کی آڑ مین کچھ نہ کچھ باطنی رنگ ہوتا ہے اسی لئے تخیل بار بار اُس کی طرف کھنچتا ہی گویا کوئی بھید باقی ہے جسے کھولنا ضروری ہے اور یہ تخیل اس بھولے بھالے

رغبت آگین تخیل سے بالکل مختلف ہے، جسکے ذریعہ سے بچہ اپنی کسی محبوب غذا کے مزے دل ہی دل مین لیتا ہو۔ یہ ایک طرح کی تپ محرقہ ہے۔ لذت گناہ کا ایک لفریب جادو ہو۔ ایک شیطانی طلسم ہو جو اسلئے اور بھی دلکش ہے کہ اسمین وہی دوئی موجود ہو جو نکہت مردود مین تھی۔

اس نقطۂ نظر سے ہم اُن نفسیاتی اثرات کو بھی سمجھ سکتے ہین جو احساس شہوت سے صادر ہوتے ہین اور ساری نفسی زندگی کو اپنے رنگ مین رنگ لیتے ہین۔ نوجوان نہ صرف نظام کائنات کے ایک پوشیدہ حصہ کا محرم ہو جاتا ہو بلکہ اسے خود اپنی ذات کے ایک بالکل نئے پہلو سے آگاہی حاصل ہوتی ہو۔ ذرا تصور کیجئے کہ اگر ہم برسون اپنے نفس کیساتھ چپ چاپ زندگی بسر کرنیکے بعد دفعتًا اپنے آپ مین کوئی ایسی چیز پائین جو بالکل اجنبی معلوم ہو تو ہمارا کیا حال ہو گا۔ تب جاکر معلوم ہو گا کہ آغاز شباب مین نوجوان کے نفس مین کیا انقلاب واقع ہوتا ہو۔ اس تلاطم کو جتنا شدید سمجھا جائے کم ہے۔ ابتک نفس نے جو کچھ بنایا ہو اور حاصل کیا ہے۔ سب کی طرف سے شک پیدا ہو جاتا ہے اور جسقدر آسانی سے یہ نیا سیلاب پرانی زمین پر بڑھتا ہو اسی نسبت سے شک اور شبہ قوی ہو جاتا ہے۔ حقیقت مین جب انسان اپنے آپ مین یکایک اتنا بڑا تغیر دیکھے تو اس کا خوف زدہ ہونا ضروری ہو۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اسے کسی انسان پر اعتبار نہ رہے اور ساری دنیا سے اسکے تعلقات مین اجنبیت پیدا ہو جائے۔

اسی طرح اس نئی زندگی مین اخفا کی خواہش اسلئے پیدا ہوتی ہے کہ انسان کو ایک بھید کا پتہ چلا ہے۔ لیکن ابھی اسپر قابو حاصل نہین ہوا۔ شہوانی معاملات مین جو شرم ہوتی ہے یہ تربیت سے پیدا کی ہوئی عصمت آبی نہین ہو بلکہ فطرتی طور پر احساس شہوت مین یہ کیفیت موجود ہوتی ہو۔ اور دوسری کوششین جو نوجوان اپنی اندرونی زندگی کو دوسرون کی نظرون سے چھپانیکے لئے کرتے ہین اُنکا تعلق بھی شہوت کے شدید ہیجان کے اخفا سے ہے۔ جب ہم ایک بار اس قید مین گرفتار ہو جائین تو پھر یا تو سچی اور خالص محبت ہمین نجات دلا سکتی ہے یا موت۔ اس ہیجان کا اظہار نہ صرف "خوف کائنات" کے رنگ مین (جو خفیف ہو کر "درد کائنات" اور

ملال و یاس بنجاتا ہی) ہوا کرتا ہی بلکہ بڑھتے بڑھتے مردم ترسی اور مردم بیزاری تک پہونچ جاتا ہی۔
جسکی کمزور صورت جھینپ در جھجک ہے) اگر لوگون نے نامردی کے نفسی پہلو کی توجیہ کی ہے کہ انسان اپنے
"ہم صحبت" سے ڈرتا ہی تو بیجا نہین کیا۔ لیکن یہ ڈر محض پابندی کا ڈر نہین ہی جو مردانگی کی کمی پر
مبنی ہی بلکہ کبھی دوسرکو اپنے گہرے راز مین شریک کرتے ہوئے خوف آتا ہی۔ یہان بھی صرف سچی
محبت دستگیری کرتی ہی۔

نوجوانون کی شہوانی زندگی کی نفسیاتی تحلیل کرتے وقت شہوانی دلچسپی اور شہوانی
خواہش مین سختی سے امتیاز کرنا چاہئے۔ دونون کے بین بین شہوانی تخیل ہے۔ شہوانی دلچسپی
بجائے خود ذہن کے نظری عنصر سے تعلق رکھتی ہی۔ انسان اُن نئے واقعات کا علم وضاحت
کیساتھ حاصل کرنا چاہتے ہین جنھین خود اسکی زندگی سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ بخلاف ان لوگون کے
جو بچون کو شہوانی مسائل کی تعلیم دینے کے حامی ہین ہمارے خیال مین اگر ارتقائے نفس پر بیرونی
اثرات نہ پڑین تو آغاز بلوغ سے قبل بچون کو ان مسائل کا علم ہی نہین ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ بچون کو
ان باتون کا تجسس ہوتا ہی لیکن جیسے اور معاملات مین ان کا تجسس دیرپا نہین ہوتا اسی طرح اس
معاملہ مین بھی نہین ہوتا۔ ان مسائل سے جو دلچسپی ہے وہ بہت جلد دوسری چیزون کی طرف منتقل
ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی محتاط ماں اپنے لڑکون کو دس برس کی عمر سے پہلے خوش اسلوبی کے ساتھ
سمجھادے کہ بچے کیسے پیدا ہوتے ہین تو اُسے کچھ دن کے بعد یہ دیکھکر حیرت ہوگی کہ وہ سب کچھ بھول
گئے۔ عموماً ساتھ کھیلنے والے لڑکے اسکا خیال رکھتے ہین کہ یہ لاعلمی جلد سے جلد دور ہوجائے اور
اُنمین اس سے کہین زیادہ وضاحت سے کام لیتے ہین جتنی مطلوب ہے۔

نفسیاتی بحث مین اخلاقی اور تعلیمی مسائل چھیڑنے کا کوئی موقع نہین۔ ذیل مین ہم جو
بات کہین گے اُسکا مقصد تعلیمی نصیحت نہین ہے بلکہ اس مین ایک ایسا سوال پنہان ہے جو نفسیات کے
نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے۔ جب مشاہدہ ہمین یہ بتاتا ہی کہ بعض مخصوص صورتون مین یعنی فطری زندگی
مین یا تہذیب کے بااصول عیاشی سے پاک ماحول مین، ہم خوب جانتے ہین کہ یہ الفاظ بدوی زندگی

یا دہقانی زندگی کے کامل مرادف نہین - انسان کو شہوانی مسائل مین بہت دن کے بعد ورک حاصل ہوتا ہی تو قیاس یہ کہتا ہی کہ فطرت کی مجوزہ ترتیب کے مطابق یہ علم اسوقت تک پختہ نہین ہوتا جبتک اسکے موضوع کا مجموعی تجربہ پختہ نہو جائے غالبًا ایک صحیح معنی مین دوشیزہ لڑکی کو اپنی مخصوص نسوانی خدمت کا پورا علم اُس مکمل جسمانی نفسی عمل کیوقت ہوتا ہی جب اُسکا دولھا اُسے روشن اور برتر سچی محبت کے سایہ مین پہلی بار آغوش مین لیتا ہی -

یہ سچ ہے کہ ہماری تہذیب کی موجودہ حالت مین یہ صورت محض خیالی وجود رکھتی ہی عمومًا عورتون کو یہ علم قبل از وقت حاصل ہوجاتا ہی لیکن کبھی بعد از وقت بھی ہوتا ہی کیونکہ شب عروسی مین دُلہن کے نفس مین نہ شہوت بیدار ہوتی ہی نہ محبت - لیکن اُس خیالی مکمل صورت کے فرض کرنیسے یہ بات تو صاف ظاہر ہو جاتی ہی کہ شہوانی مسائل کا قبل از وقت تجسس محض بے نتیجہ ہے کیونکہ اس سے محض ایک نظری خاکہ حاصل ہوتا ہی اور وہ مجموعی نفسی تجربہ جو اس خاکہ مین آب و رنگ بھرتا ہی موجود نہین ہوتا - خوب سمجھ لینا چاہیے کہ نوجوانون کی شہوانی زندگی مین ساری پیچیدگی یہی ہی - وہ معاملہ کو صرف آدھا جانتا ہے اور تجربہ اسے دسوین حصہ کا بھی نہین ہوتا - اسلئے کوئی تعجب نہین اگر جستجو کبھی ختم نہین ہوتی اور طبیعت کو کبھی چین نہین آتا -

خواہ یہ سوال خود اپنی طبیعت سے پیدا ہو یا خارجی تحریک سے مگر اب جب ایکبار پیدا ہو گیا تو نوجوان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ بچہ کی طرح اس سے پیچھا چھڑا سکے - خیالات ہر پھر کر افعال توالد و تناسل کے عضویاتی اور تشریحی پہلو کی طرف جاتے ہین - اس "مطالعہ" مین شہوانی تخیل اور کبھی کبھی شہوانی خواہش بھی شامل ہو جاتی ہی - نوجوان لوگ اکیلے مین یا مل جل کر عجیب عجیب خیالی گورکھ دھندون کے ذریعہ سے اپنی معلومات کی کمی پورا کرنیکی کوشش کرتے ہین - قاموس اور لغت کھنگالی جاتی ہین مشتبہ "روشنی ڈالنے والی" کتابین چاٹی جاتی ہین - ان مسائل کے متعلق دھندلے اور غیر واضح مفروضات اکثر تحت الشعور مین وہم کی حیثیت سے باقی رہتے ہین - کبھی کبھی یہ اوہام برسون تک شعور مین جم جاتے ہین اور ساری

نفسی زندگی کی صحت میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ خصوصاً نوجوان لڑکیاں جنھیں ابھی تک سعاوت یاورا کا
ذرا بھی احساس نہیں ہوتا توالد و تناسل کے افعال کے عجیب خوفناک تصور رکھتی ہیں لڑکے تو خیر
کسی نتیجے پر پہونچتے ہیں اگرچہ ان کے خیالات اس بارے میں پرانی وضع کے طبیبوں کے خیالات
سے بھی زیادہ سطحی ہوتے ہیں۔ اس بے چین جستجو اور کوفت کا اگر اندازہ کرنا ہو تو وہی "نیم بالغ
لڑکی کا روزنامچہ" پڑھنا چاہئے جو ہمارے خیال میں کم سے کم بڑے شہروں کی نوجوان لڑکیوں کی
سچی تصویر ہے۔ دیہات کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو پودوں اور جانوروں کے مشاہدہ کی بدولت
کم عمر میں صحیح عضویاتی معلومات حاصل ہو جاتی ہے جسکی تصدیق فروہل کے بچپن کے حالات سے
ہوتی ہے، میں اُسمیں سے ایک موٹی سی مثال دیتا ہوں۔ ڈؤبجویون نے اپنے خیال میں یہ پتہ
چلایا ہو کہ ان کی معلمہ عاشقانہ تعلقات کے متوقع نتیجہ کی فکر میں گھل رہی ہے۔ وہ ایک قاموس کے ذریعہ سے
اسقاط حمل کی ایک ترکیب سے واقف ہو گئی ہیں۔ وہ اسے ایک گمنام خط لکھتی ہیں جسمیں وہ نیک
نیتی سے اسے یہ خلاصی کی ترکیب سمجھاتی ہیں۔ بظاہر اُس سے بڑھکر کم سنی کی آوارگی نہیں ہو سکتی لیکن
ہمیں اسمیں کوئی آوارگی نظر نہیں آتی بلکہ انتہائی نفسی بیکسی کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔

بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر نوجوانوں کو یہ مسائل صاف صاف سمجھا دیے جائیں
تو ان سب مصیبتوں سے چھٹکارا ہو۔ ثبوت میں وہ "بیداری بہار" سے وینڈلا کا آخری نوحہ
پیش کرتے ہیں۔ "اماں۔ تم نے مجھے ساری باتیں پہلے سے کیوں نہیں بتا دیں"۔ ان لوگوں کے
نزدیک توالد و تناسل کے مسائل سمجھا دینے سے شہوانی مصائب و غلط کاریوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔
ہم اسکے مخالف نہیں ہیں کہ جس عمر میں شہوانی معاملات کی جستجو یا شہوانی خواہش بیدار ہو چکی
ہو اُسمیں نوجوانوں کو سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ یہ باتیں سمجھائی جائیں۔ لیکن ہمیں اسمیں
شک ہے کہ محض اتنا کرنے سے سارا کام بنجائیگا۔ کیونکہ قطع نظر اس بات کے جسے سب جانتے ہیں کہ
عضویاتی معلومات اور طبی نصیحتوں سے طبیعت کے ہیجان کا رُخ نہیں بدلتا اس طرحکی افہام تفہیم میں
یہ ناگزیر نقص ہے کہ اس ذریعہ سے خارجی واقعات عقلی حیثیت سے تو سمجھائے جا سکتے ہیں لیکن

اُس گہری واردات کا احساس نہین پیدا کیا جا سکتا جو خود نفس کے اندر سے اُبھر کر ان چیزون مین جان ڈالتی ہے۔ اور انھین عینی منشا اور بلند ترین سرمایۂ حیات کی لطافت سے مالامال کر دیتی ہے۔ بلوغ کے ابتدائی زمانہ مین یہ کسی طرح ممکن نہین کہ نوجوان لڑکے یا لڑکیان ان گہرائیون کا خفیف سا اندازہ بھی کر سکین اسلئے اس مسئلہ مین اُنکی خالص دماغی کشمکش سے کسی فائدہ کی امید نہین بلکہ اُلٹا نقصان کا خطرہ ہی۔

اصل مین یہ کشمکش محض دماغی نہین ہے۔ اسکے ساتھ شدید احساس کے عناصر بھی شامل ہو جاتے ہین اور اس سارے مسئلہ کو شورش انگیز بنا دیتے ہین۔ اکثر نوجوانون کا تخیل اُکتا دینے والی یکسانی کے ساتھ بس اسی نقطہ کے گرد چکر لگایا کرتا ہی۔ ہیجان انگیز اور اکثر پر شہوت تصویرین اپنے لئے نفس مین راستے بنا لیتی ہین جو گہرے ہو کر نہرون کی صورت اختیار کر لیتے ہین اور شعور کا دھارا ہمیشہ انھین مین بہا کرتا ہی۔ ان ہیبتناک احساسات سے تنگ آ کر لڑکیان شادی کے نام سے کانون پر ہاتھ دھرتی ہین اور لڑکے جماع کا تصور اس طرح کرتے ہین گویا اسے عشق سے کوئی تعلق نہین۔ ایسی حالت مین اگر زور شہوانی پہلو پر دیا جائے تو شہوت اور عشق کی ایک دوسرے سے جُدائی جسے ہم نے ابتدائی زمانۂ شباب کی خصوصیت قرار دیا ہی خطرناک چیز بن سکتی ہی۔ لیکن اب بھی یہ کہنا غلط ہی کہ نوجوان کی طبیعت پر خالص بہیمیت غالب آ گئی ہی۔ اگر انسان در حقیقت بہائم ہوتے تو کوئی مہلک صورت نہ پیدا ہوتی مہلک عنصر یعنی بحران کی کیفیت احساسات کا تلاطم، بار بار اُٹھنے والا ہیجان جسمانی افعال سے نہین پیدا ہوتا بلکہ اس نیرنگ تخیل سے جو ان افعال کے ساتھ اس نقاب کو چاک کرتا ہی۔ مختصر یہ کہ ان معاملات مین جو پیچیدگی پیدا ہوتی ہی وہ محض نفس کے سبب سے علی ہذا القیاس شہوت پرستی مین نہ صرف جسمانی وظائف کے ساتھ ظلم کا برتاؤ ہوتا ہی بلکہ نفس یا روح کے ساتھ بھی۔ شہوانی لذات مین جتنی نام نہاد "لطافت" پیدا کی جاتی ہے وہ محض نفس کی طرف سے ہوتی ہی ورنہ خالص جسمانی نقطۂ نظر سے کم و بیش اور مفید و مضر کی تفریق تو ہوتی ہی مگر لطیف و کثیف کی ہرگز نہوتی۔

ا‌ے لوگ عصمت فروشی کو بہیمیت کہتے ہین مگر ہمارے خیال مین یہ مشتبہ ہی۔ اس پیشہ کی ذلت کا باعث محض یہی نہین کہ ایک جسم اور ایک روح کی بیحرمتی ہوتی ہی بلکہ یہ کہ اس حرمتی کا شعور بھی شہوانی لذت کی تحصیل ہو جاتا ہے اور اس خیال سے لذت مین اضافہ ہوتا ہی کہ طرفین کا نفس ذلیل ہو رہا ہی۔ عصمت فروشی بہیمیت

اس سے زیادہ بے ثمر اور کیا چیز ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے تخیل عوز و فکر اور رغبت کا مرکز شہوانی پہلو کو بنا لے۔ ایسے شخص کی زندگی ہمیشہ ایک ہی دائرہ مین حرکت کیا کرتی ہو۔ وہ اضطرار اور سراسیگی کی حالت مین ناولون اور ڈرامون کی ورق گردانی کرتا ہو تاکہ اس مضمون کے ٹکڑے ڈھونڈھ کر نکالے۔ تخیل کی سیری جسمانی نامردی پر پردہ ڈالتی ہے اور روحانی نامردی کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

گاڈ فرید کیلر نے اپنے ناول (Dergrüne Heinrich) مین ایک خاندان کا ذکر کیا ہو جسکی عورتین ناپاک کتابون کے مطالعہ سے عمر بھر کے لئے برباد ہو جاتی ہین۔ بہت سے نوجوانون کا یہی انجام ہوتا ہو یہان اگر کوئی چیز کام آتی ہو تو مستحکم اور بلند نصب العین مگر شرط یہ ہو کہ اسکا احساس پہلے سے پیدا ہو چکا ہو جن لوگون کی طبیعت مین ذہنی عنصر غالب ہوتا ہو وہ محبت جنسی کی بے سروپا خودساختہ مافوق الطبیعات مین گرفتار ہو کر رہجاتے ہین۔ دوسرونکے یہان گرداب تخیل سے واقعی شہوانی رغبت پیدا ہوتی ہے اور جسمانی مواصلت کی عارضی تسکین کے بعد وہ پھر اُسی بیہودہ اُدھیڑ بن اور لذت پرستانہ تخیل مین ڈوب جاتے ہین۔

اس ناقابل برداشت نفسی کشمکش سے نجات پانیکے لئے وہی راہ اختیار کی جاتی ہے جسمین کم سے کم مزاحمت ہو۔ اگر کم عمری مین دوسری جنس سے ہم بستری کا موقع مل جائے تو اس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے البتہ اگر عین وقت پر جذبۂ عشق مدد کرے اور وہ نفرت جو اس عمر مین فطری طور پر جماع سے ہوتی ہے اُبھر آئے تو نجات ہو جاتی ہے۔ سب سے خطرناک بات نوجوان کے لیے یہ ہے کہ جس سے اُنھیں گہرا عشق ہو اُسی کو شہوت رانی کا آلہ بنائین اس خدع نفس (خدع نفس اسلئے کہ اصل مین شہوت اور عشق ابھی تک ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہین) کی بدولت طبع انسانی کا بہترین عنصر برباد ہو جاتا ہو۔ عالم عینی کی عمارت مسمار ہو جاتی ہے اور عموماً اس کا دوبارہ تعمیر کرنا ناممکن ہوتا ہو۔

لیکن یہ شاذ و نادر دیکھنے مین آتا ہو کہ بلا واسطہ شہوانی جبلت کے اثر سے نوجوان قبل از وقت بدکاری مین مبتلا ہو جائین۔ باوجودیکہ نفس مین زہر پھیل جانیکے اُنکی فطری حیا اُنکی حفاظت

کے لئے کافی ہو بشرطیکہ دوسری چیزین اُنکی شہوت کو اُبھارنے مین مدد نہ دین۔ ان چیزون مین سے
ایک کا یہ گھمنڈ ہے کہ اپنی "مردی" کا عملی ثبوت دین۔ پھر بڑون کا اغوا ہی جو اپنے خیال مین
اُن کے ساتھ سلوک کرتے ہین اور سب سے بڑھکر بعض طبقون کے نامعقول خیالات ہین مثلاً یہ عقیدہ کہ
نوجوان کے لئے کسی عورت سے "تعلق" رکھنا لازمی ہو یا اُسکی صحت کے لئے ضروری ہے۔ لڑکیون کو جنہین
بقول تجربہ کار لوگون کے کبھی یہ نہین ہوتا کہ شہوانی جذبات طبیعت کو بے قابو کر دے بلکہ اُن کے
بگڑنے کا باعث ابتدا مین گمراہ کرنیوالی "ہمجولی" ہوتی ہے جو پہلے سے "زندگی" سے واقف ہے یا
بننے ٹھننے کا شوق، یا غرور اور عیش پسندی یا کبھی کبھی بھولے پن سے مردون کے اصرار کے آگے
سر تسلیم خم کر دینا جسمین ایک جھلک پسندیدہ مقاصد کی بھی پائی جاتی ہے مثلاً آجکل کے "فلسفہ نجات"
کی لیکن انجام عموماً یہی ہوتا ہو کہ یہ دعوائے پاکبازی و ذوق نظر غلط۔

اس طبی سوال کا کہ جماع سے پرہیز کرنا مرد کے لئے مضر ہے یا نہین، ہم کوئی قطعی جواب
دینے کی جرأت نہین کرتے۔ البتہ یہ بات یقینی ہو کہ اگر شہوت کو خوب اُبھارنے کے بعد اُسے روکنے کی
کوشش کیجائے تو بہت سخت اعصابی خرابیان پیدا ہوتی ہین جنسے بہت اذیت ہوتی ہو یہانتک کہ
آدمی کسی کام کے قابل نہین رہتا۔ اسکے علاج کی بحث فن تعلیم کے جنسیاتی حصہ سے تعلق رکھتی ہے۔
البتہ اتنا ہم یہان بھی کہہ سکتے ہین کہ جب شہوانی ہیجان انتہا کو پہونچ جائے تو ایسی ویسی عارضی تدابیر سے
بالکل کام نہین چلتا بلکہ اسکا صرف ایک علاج ہو وہ یہ ہے کہ انسان اپنی ساری قوت عمل کو یکجا کر کے
اپنی مجموعی جسمانی اور نفسی زندگی کی اصلاح پر تل جائے۔ اس معاملہ مین بھی نفس "مردانگی" دکھا
سکتا ہو جو سچی قدرون کے سرمایہ سے مالا مال ہو۔ قبل از وقت شہوانی تعلقات پیدا کرنیسے قبل اِن
کو عموماً وہ قیود و موانع آتی ہین جو بزرگون کی نگرانی اور معاشرتی حالات کی صورت مین عائد
کیجاتی ہین لیکن یہ ہیجان جب ایک بار بھڑک اُٹھے تو وہ کوئی نہ کوئی راہ اپنے نکلنے کی ڈھونڈھ لیتا ہے
عموماً جو صورت اُسے میسر آتی ہو وہ تنہائی کی غلط کاری ہو جسپر بہت کچھ بحث ہوا کرتی ہو۔ اس
مرض کے پھیلنے کے جو قطعی اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہین وہ ہمارے خیال مین محض بے بنیاد ہین

اور علمی تحقیقات کے لئے کوئی قیمت نہین رکھتے البتہ جتنا مواد حاصل ہو سکتا ہی اسکی بنا پر تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ عادت تمام طبقون مین جنمین دیہات کے باشندے بھی شامل ہین پائی جاتی ہی۔ ہمین یہان صرف نفسانی پہلو سے تعلق ہی۔ ہمارے خیال مین یہ سمجھنا غلط ہی کہ اسکے پیدا ہونیکا بڑا سبب دوسرون کا بہکانا ہی کیونکہ جن باتون کی نقل کیجاتی ہی اُنکی اصل بھی کہین نہ کہین ہوتی ہی عضویاتی نقطۂ نظر سے ایک اہم عنصر یہ ہے کہ تنگ کپڑے پہننے سے یا زیادہ بیٹھے رہنے سے خون کا دباؤ اعضائے تناسل پر پڑتا ہی۔ مگر یہان بھی تخیل کے پہلو کو نظر انداز نہین کرنا چاہیئے۔ اکثر نوجوانون کو اپنے جسم کے دیکھنے سے لذت حاصل ہوتی ہی جسمین آدھا جمالیاتی عنصر ہوتا ہی مگر آدھا اپنے آپ سے محبت کرنیکا بھی ہوتا ہی ہمارے خیال مین یہ کہنا غلط نہین ہی کہ موجودہ تحریک شبانہ لباس کے انتخاب مین محض عقلی حفظان صحت کے اصول کو مدّ نظر نہین رکھا ہی۔ نوجوانون کے صحیح احساس حیات کے دو پہلو ہین جنمین سے کبھی ایک غالب ہوتا ہی کبھی دوسرا۔ اسمین کچھ تو مشاہدۂ حسن کا خالص جمالیاتی احساس ہوتا ہی اور کچھ کھولتا ہوا خون اسٹنلے ہال کے خیال مین جسم کی نمائش کا شوق انسان مین بدو فطرت سے ہے مگر یہ تو دیکھیے کہ جس تہذیب مین سارے جسم کو چھپانا رائج ہو چکا ہی اُسمین ذرا سے حصّہ کو کھول دینے سے فطرت کا تقاضہ پورا ہو سکتا ہی لیکن جس تہذیب مین پوشاک محض برائے نام ہو وہان اسکا کیا ذکر ہے۔ "تہذیب عریانی" کا جو مفہوم خط استوا کے قریب رہنے والے حبشیون کے یہان ہی وہ ہمارے یہان ہرگز نہین ہو سکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ نوجوانون مین جو رجحان اپنے آپ سے محبت کرنیکا ہی وہ مستانہ احساس جسم پر جمالیاتی رنگ چڑھا دے اور انھین اس سے محفوظ رکھے کہ اُنکی شہوانی جبلت کا ہیجان غالب آکر کثیف شہوانی افعال کی صورت اختیار کرے۔

اگر یہ صورت پیدا ہو گئی تو سمجھیے کہ نفسی تحریک کا لطیف اور بلند عنصر رُیا ہو گیا اب ایک ایسی راہ کھل جاتی ہی جسپر انسان جب چاہے چل سکتا ہی اور یہ امکان باقی نہین رہتا کہ شہوانی افعال مین گہری روحانیت پیدا ہو سکے۔ خالص عضویاتی احساس غالب آجاتا ہی اور اس سارے عمل کی حیثیت یہ رہجاتی ہی کہ جسمانی خواہشات محض جسمانی طور پر پوری ہو جائین

اسکے ساتھ جو تخئیلی عناصر ہوتے ہین انمین خواہ کتنا ہی انفرادی فرق ہو سب مین یہ مشترک خصوصیت پائی جاتی ہی کہ وہ "بے ثمر" ہوتے ہین۔ انمین مافوق الطبعی تخلیق کی قوت اور کسی طرح کی تولید یا تعمیر سے کوئی علاقہ مطلق نہین رہتا۔ سب سے بڑی لعنت اور شامت یہ ہو کہ یہ افعال جذبۂ عشق کے برتر نور سے کوسون دور ہٹ جاتے ہین۔ اگر اعلیٰ نظام منشا کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سارا عمل ایک بند گلی کی طرح ہی جسمین انسان بار بار جا کر سراسیمہ و پریشان لوٹ آتا ہی۔

جس ماحول مین ہر طرف اعصابی ہیجان کا سامان موجود ہو وہان نوعمری ہی مین نظام عصبانی بیحد اثر پذیر ہو جاتا ہو۔ نفسی نقطہ سے نظر رکھنا چاہئے کہ تخیل مین ہر وقت یہ صلاحیت رہتی ہو کہ زیر بحث شہوانی فعل کی شکل مین پھوٹ نکلے اور نفس کی ساری پیچیدگی کا آسانی سے خاتمہ کر دے۔ اگرچہ یہ خاتمہ اس پیچیدگی کا "حل" نہین ہے۔ ایسی صورت مین شہوانی خواہش بتدریج ظاہر نہین ہوتی بلکہ دفعتاً ایک دھچکے کی طرح جو اتنی قوت رکھتا ہو کہ مزاحمت کی تاب نہین رہتی۔ اس موقع پر انسان وہی راہ ڈھونڈھتا ہو جسمین عارضی جسمانی تسکین حاصل ہو جاتی ہو۔ اور نہ کسی دوسرے کی زندگی مین دخل دینا پڑتا ہی نہ کسی کی رضا جوئی کی حاجت ہوتی ہو۔ لیکن جب ایک بار یہ راہ کھل جاتی تو اُسے مہلک عادت بن جانے مین زرا بھی دیر نہین لگتی۔ پہلے تو طبیب اور غیر طبیب سب نقصانات کے بیان کرنے مین اکثر بیحد مبالغہ سے کام لیا کرتے تھے مگر اب معلوم ہوتا ہو کہ اسکے برعکس نظریہ کا دور ہو جس سے اس قبیح عادت کو اور تقویت پہونچتی ہی۔

لیکن ہم نے ابتک اُن خالص نفسی عناصر کا جنھین اس مسئلہ مین اہمیت حاصل ہو تفصیل سے ذکر نہین کیا ہی۔ اس فعل کے ساتھ تخیل کے انتہائی ہیجان اور شہوت آفرین خیالی تصاویر کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ دوسری موقع پر تو انسان اپنے تخیل کے بہلاوے مین نہین آجایا کرتا یہان یہ نوجوان کیون اتنی آسانی سے مغلوب ہو جاتے ہین تو اُسے یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ لوگ اپنی مجموعی نفسی حالت کی وجہ سے کتنے بیچین اور ڈانوان ڈول ہوتے ہین۔ عموماً خود اسکی ذات مین کوئی مضبوط اروک نہین ہوتی نہ عظیم الشان مقاصد ہوتے ہین نہ مستحکم ارادہ نہ دل کو معمور کرنیوالی محبت۔

اس انتہائی نفی ذات کی حالت مین اوپر سے اور شہوانی ترغیبون کا زغہ ہوتا ہے۔ دائمی جلق مین ایک انداز اپنے آپکو جان بوجھکر برباد کرنیکا ایک جھلک منفی تصور کائنات کی ہوتی ہے۔ وہی نوجوان جسکے پیش نظر ابھی ابھی بڑے بڑے نصب العین تھے نفسی زلزلہ کے ان لمحات مین محض حسی جبلت کے اثبات پہ عقیدہ رکھتا ہے بلکہ اس سے اُسے تسکین ہوتی ہے کہ دم بھر کے لئے اسے ایک مستقر ملگیا ہے۔ مگر اس مین شک نہین کہ جیسا حسی لذات کا قاعدہ ہے یہ تسکین محض ایک لمحہ کے لئے ہوتی ہے۔ اسکے بعد اپنے آپسے دو چند نفرت ہو جاتی ہے۔ اسلئے جلق کے عادی کی نفسی حالت ہر اُس شخص کی طرح جو کسی بلند تر مقام سے شہوانی لذت کی پستی مین گرتا ہو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سامنے دو عالم دیکھتا ہے۔ جب عالم ذہنی مین رکاوٹین پیش آتی ہین تو وہ حسی لذت کی دلدل مین گرتا ہے۔ اگر اسکا معمول ہو جائے تو شہوانی تخیل آہستہ آہستہ پھیلتا جاتا ہے اور نفس کے بقیہ عنصر کو فنا کر دیتا ہے۔ جلق کی عادت مین یہی روحانی خطرہ ہے۔ وہ محض فنا وخون ہی کا باعث نہین ہوتی بلکہ تعمیری قوتون کو اور جمعیت نفس کو برباد کر دیتی ہے۔ بقول بیرباؤم کے یہ ایک سُور ہے جو لطیف عناصر کو تھوڑا تھوڑا کرکے کھا جاتا ہے اس سے اُس نفرت کو تقویت پہونچتی ہے جو انسان دنیا سے دوسرے انسانون سے اور اپنے آپسے رکھتا ہے یہانتک کہ قوت ایمان اور قوتِ حیات ٹھٹھر کر رہجاتی ہین۔

”تو نے اُسے برباد کردیا ہے حسین دنیا کو“[1] ایسی صورت مین کوئی دوا کام نہین آتی بلکہ صرف وہ چیز جسکی طرف ”روحون کے کورس“ کے آئندہ مصرعے اشارہ کرتے ہین ”اُسے از سر نو پہلے سے زیادہ شاندار بنا۔ اپنے سینے مین اُسے دوبارہ تعمیر کر۔ کھُلے دل سے نئی زندگی شروع ہونیدے اور نئے نغمون کی آواز کو فضا مین گونجنے دے“[2]۔ مطلب یہ ہے کہ ان تباہ کن قوتون پر غالب آنے مین سوائے نو زائیدہ عقیدہ زندگی کے کوئی چیز مدد نہین دیتی[3]۔

[1] و [2] یہ مصرعے گوئٹے کے فاؤسٹ کے اُس حصہ سے لئے گئے ہین جہان روحون کا کورس فاؤسٹ کو صلاح دیتا ہے کہ دنیا سے مایوس ہونیکے بعد اُسے اپنی تہذیب نفس کرنا چاہئے۔

[3] ہر مرتبہ جب نیک سرشت نوجوان خالص حسی لذت کی نئی پستی مین گرتا ہے تو خود بخود اسکے دلمین آرزو پیدا ہوتی ہے کہ اس سے نکلنے کیلئے کوئی ذہنی

ہم نے نوجوانون کے نفس کی جو مجموعی تصویر پیش کی ہو اُس سے اور مندرجہ بالا سطور سے اس خیال کی تائید ہوتی ہو کہ جس زمانہ مین نئی جبلت انتہائی قوت کے ساتھ نفس مین رونما ہوتی ہو اسوقت اگر نوجوان شہوانی غلط کاریون مین مبتلا ہو جائے تو اُسے ہمیشہ اور ہر صورت مین غیر معمولی چیز یا مرض نہین سمجھنا چاہئے۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہین کہ بہت سے مظاہر جو شہوانی زندگی کے منشا کے لحاظ سے خلافِ فطرت ہین وہ عہد بلوغ کے طوفانی زمانہ مین بہت عام ہوتے ہین۔ اس عہد کے شروع ہونیسے فوراً پہلے نوجوانون مین بعض ایسے رجحانات ہوتے ہین جنمین ظالمانہ شہوت اور دوسری غلط کاریون کی جھلک نظر آتی ہو۔ اور اس عمر کے اکثر شہوانی رجحانات کی طرح یہ چیز بھی کبھی کبھی متعدی مرض کی صورت اختیار کرلیتی ہین۔ مثلاً مدرسونکی جماعتون مین مجھے یاد ہو کہ جب مین مدرسہ مین پڑھتا تھا تو ایک بڑا افسوسناک زمانہ گذرا جسمین میری جماعت کے لڑکے اپنے مین سے بعض لڑکون کو ہنسی مین چھڑیان مارا کرتے تھے اس حرکت مین مجھے اس زمانہ مین بھی کسی عجیب چیز کی جھلک نظر آتی تھی اور آگے چلکر تو صاف ظاہر ہو گیا کہ اسمین ظالمانہ شہوت کا ہلکا سا رنگ موجود تھا۔ مگر اس قصہ کے انجام سے یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ ان چیزون کا نوجوانون پر کوئی گہرا اثر نہین ہوتا۔ مین نے یہ ترکیب کی کہ جو لڑکا اسمین سب سے زیادہ پیش پیش تھا اسے توڑ کر اس بیہودہ حرکت کے خلاف ایک انجمن قائم کرادی۔ انجمن کا خیال اس بھولے جرمن لڑکے کو اسقدر پسند آیا کہ اُسنے اپنی ساری جدوجہد اسکے لئے وقف کردی اور جماعت کے لڑکون کو بھی یہ نئی پھلجھڑی ایسی بھائی کہ کچھ دن کے بعد انجمن کا کوئی مخالف نہ رہا اسلئے وہ خود بخود ٹوٹ گئی۔ اسطرح کی باتین جنھین ظالمانہ شہوت کی سرحد پر سمجھنا چاہئے۔ لڑکیون مین بھی پائی جاتی ہین۔ انکے عاشقانہ جذبات کبھی کبھی ایسی صورتون مین ظاہر ہوتے ہین کہ وحشیانہ حرکات کی یاد تازہ ہو جاتی ہو۔ اس طرح کی غلط کاریان خصوصاً لڑکیون کے اقامتی مدرسون مین قریب قریب حد قیاس سے گذر جاتی ہین۔ نفس انسانی مین ایک اور بلند طبقون کے نیچے میلے اور ناپاک طبقے بھی موجود ہین۔ گوئٹے کے مرنیکے بعد اسکا جو کلام دستیاب ہوا ہو اسمین بلکہ دوسرے ذہن عالی رکھنے والے لوگون کے یہان بھی ایسے غیر مہذب تخیلات

پائے جاتے ہین جنمین معلم اخلاق اس پُرفریب تصویر سے مٹانیکی آرزو رکھتا ہی لیکن ماہر نفسیات جانتا ہی کہ
یہ نقوش بھی اس تصویر کا لازمی جزو ہین۔ یونان کے سورما ہرکولیس کو جیسا کہ کانٹ نے شلر کی تردید
مین کہا ہی۔ صرف بوؤن کو جھاڑنا ہی نہین پڑا بلکہ اگیاس کا اصطبل بھی صاف کرنا پڑا۔ اور یہ کام
اسی لئے ہرکولیس کے کرنیکا تھا کہ یہ اصطبل خود اسکے نفس مین موجود اور اُسکی ذات کا ایک جزو تھا
نوجوانون مین ہمیشہ ہرکولیس کی سی طاقت نہین ہوتی۔ ان کے نفس مین کبھی کبھی ادنی بلکہ خلاف
فطرت جذبات کا خوفناک غلبہ ہو جاتا ہی۔ ہم اپنی نفسیات مین اس بارے مین خاموش نہین رہ سکتے
اسلئے کہ ان دشمنون سے نوجوانون کو جان توڑ کے لڑنا پڑتا ہی۔ اگر مثالون کی تلاش ہے تو وہ بہت موثر
صورت مین موسل کے قصے "ایک لڑکے موسوم بہ ٹورلیس کی مصیبتین" مین ملینگی۔ عام حیثیت سے یہ
کہا جا سکتا ہی کہ اس عمر مین شہوانی جبلت اپنا موضوع تلاش کرتے وقت روحانیت سے بالکل خالی ہوتی ہے
یہ سب ارتقائے نفسی کے "مظاہر" ہین۔ یہی مظاہر اسوقت ارتقا کے سد راہ اور ارتقائی امراض
بنجاتے ہین۔ جب وہ بیرونی صدمات یا اندرونی ضبط نفس کی کمزوری سے "مستقل" ہو جائین۔ ایسی
صورت مین شہوانی افعال کے ساتھ جتنے "رسوم تخیل" جو مختلف افراد کے یہان مختلف ہوتے ہین رونما
ہون اُن سب کو امراض مین شمار کرنا چاہیئے۔

اس سلسلہ کے آخر مین ہم کو معکوس شہوت یعنی خلاف وضع فطری خواہشات و افعال کا
ذکر کرنا ہی جو نوجوانون کےلئے خاص طور پر اہم ہی۔ پچھلے باب مین جنسی عشق کا بیان نفسی نقطۂ نظر سے
آچکا ہی جسمین ہم نے اُسے شہوانی خواہشات سے جُدا رکھا ہی۔ یہ محض لفظی فرق نہین ہی بلکہ جیسا بارہا
کہا جا چکا ہی یہ دونون چیزین ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہین خصوصًا نوجوانون کے نفس کے لئے۔ نوجوانون مین
باہم روحانی عاشقانہ اُنس ارتقائے نفسی کے ضروری مظاہر مین سے ہے۔ یہ اُس جمالیاتی دلکشی پر مبنی ہے
جو ایک نوجوان کا حسین جسم دوسرے کے احساس جمالیات کے لئے رکھتا ہی جسکی بدولت بہت گہری ذہنی تحریکین
اُبھرتی ہین۔ البتہ عاشقانہ راز و نیاز اور بوس و کنار جو خصوصیت کیساتھ نوجوان لڑکیون مین باہم کثرت سے
ہوتا ہی۔ شہوانی عنصر سے خالی نہین اور اس سے انکار نہین ہو سکتا کہ ان چیزون مین ادھر ہم جنسانہ شہوانی

تعلقات مین خصوصاً بار بار یہ وہ قائل ہو ہمجنسانہ شہوانی تعلقات سے ہم محض وہی افعال مراد نہین لیتے
جنھین قوانین نافذہ نے سزا کا مستوجب قرار دیا ہی بلکہ ہم جنسون مین ہر طرح کا جسمانی اتحاد ہونا جسمین
صاف طور سے شہوانی لذت پائی جائے۔

غالبًا یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچ چکی ہی کہ بعض لوگون مین خلقی طور سے جنسی معکوسیت ہوتی ہے۔
جن لوگون مین یہ نفسی جبلت ہوتی ہو انھین بڑی مصیبت کا سامنا ہوتا ہی جسکا باعث محض نفرین خلائق
اور قانونی تشدد ہی نہین بلکہ خود اپنے نفس کی افسوسناک حالت بھی ہی۔ پھر بھی اس اہم فطری نقص کے
باوجود جس حد تک ایک مکمل شخصیت کی تعمیر ممکن ہو اُس حد کے اندر یہ لوگ بعض اوقات اعلی فضائل کے
مالک ہوتے ہین لیکن اس زمانۂ ارتقا مین انکا وہی حال ہوتا ہی جو تقدیر پرستون کا ہوتا ہی۔ لوگ
سمجھتے ہین کہ تقدیر پرستی قوتِ عمل کو فنا کر دیتی ہی لیکن مشاہدہ اکثر اسکے خلاف یہ دکھاتا ہی کہ تقدیر
پرست عمر بھر سعی و عمل مین منہمک رہتے ہین کیونکہ ہر شخص دل و جان سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہی کہ مین مردود
بندون مین سے نہین بلکہ مقبول بندون مین سے ہون۔ صرف وہ لوگ جو اپنے آپ کو ابتدا سے مردود
سمجھتے ہین وہ ایسے ہو بھی جاتے ہین کیونکہ وہ ہمت ہار بیٹھتے ہین۔ اسی طرح جن نوجوانون کو ابتدا سے
یقین ہوتا ہی کہ وہ معکوس الجنس ہین وہ اسی طرح کی زندگی بسر کرتے ہین اور عادت اس چیز کو جو
غالبًا خلقی نہین بلکہ عارضی تھی پختہ اور راسخ کر دیتی ہی چنانچہ نوجوانون کو خاص کرکے معکوس الجنس
بنانیکے لئے خلقی معکوسیت جنس کے نظریہ سے بہتر کوئی تدبیر نہین۔ بلکہ عام طور پر نفسیات شباب لکھنے والیکو
یہ دیکھنا چاہئے کہ شہوانی زندگی کے متعلق جو نظریے رائج ہین اُن کا اثر نوجوانون کی نفسی زندگی پر
کیا پڑتا ہی۔ ان نظریون کو جو زندگی کے اہم شعبون کے لئے فیصلہ کن ہین۔ عام لوگ علمی استحکام
کے معیار پر نہین جانچتے ہین بلکہ اس نظر سے دیکھتے ہین کہ انسے کہان تک ہمارے موجودہ طرز
زندگی کی تائید ہوتی ہی۔ ان کی مثال یہ ہی جیسے کوئی کسی گیت کا سُر پہلے سے بنالے اور
مضمون پیچھے اسلئے اس قسم کے نظریون کی تنقید کا حق محض علم الاخلاق ہی کو نہین بلکہ
نفسیات کو بھی ہی۔

ہم جنسانہ شہوت پرستی جو بخلاف نوجوانون کے عشق کی گہری حیا کے ہم جنسانہ شہوانی
تعلقات کی صورت اختیار کر لیتی ہی۔ اپنی تائید مین یونان کی عہد قدیم کی زندگی کو پیش
کرتی ہے اسکے عالمون کا خیال ہے کہ یہ قبیح عادت جو اس زمانہ مین رائج تھی ان لوگون کی
ضلالت کی علامت نہین بلکہ اُن کے اعلیٰ ذہنی تہذیب کی تنہا اور کافی علّت تھی اس واقعہ کو کہ
سقراط اور افلاطون اپنے ہموطنون کو اسی حسّی لذت کی غلامی سے نجات دیکر آزردئے نفس
کی روحانی تقدیر کا ذوق دلانا چاہتے تھے یہ لوگ اپنے مطلب کے خلاف سمجھکر نظر انداز کر دیتے ہین

کچھ دن ہوئے ہانس بلوہر نے یہ دعوی کیا تھا کہ جرمنی کی تحریک شباب کی پہلی جماعت جو قدیم
”سیلانی پرندون“ کے نام سے مشہور ہی اصل مین ہمجنسانہ عشق کے اثر سے قائم ہوئی تھی اپنی
بعد کی تصانیف مین جن پر روز بروز فرونڈ کا رنگ غالب آتا گیا اور عوام پسند علم معاشرت کے عناصر
شامل ہوتے گئے بلوہر نے یہان تک کہدیا کہ معکوس الجنس لوگ خواہ وہ قانون فطرت پر پورے اترین
یا نہ اُترین تہذیب و تمدن کے نقطۂ نظر سے خاص طور پر قابل قدر ہین اور خالص ”مردانہ معاشرت“
کی تخلیقی روح کے علم بردار ہین۔ اسکے مقابلہ مین نسوانی ہمجنسانہ عشق کی حمایت کرنے والیان بھی
مخصوص ”زنانہ معاشرت“ کی معنویت کا نظریہ پیش کرنے سے قاصر نہین رہین۔ بلوہر اپنی پہلی ہی
کتاب ”جرمن سیلانی پرندون“ تحریک بحیثیت عشقیہ کے مظہر مین اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ چونکہ ہم جنسون سے
محبت کرنیوالے اعلیٰ تمدنی قدر رکھتے ہین اسلیے ”معکوسیت جنس کو جائز قرار دینا صحت نفسی کے نقطۂ نظر
سے ضروری ہی۔“ اسی خیال کو اُسنے ایک اور کتاب ”مردانہ معاشرت مین عشق کی اہمیت“ مین جو دو
جلدون مین شائع ہوئی زیادہ تفصیل کیساتھ بیان کیا ہی۔

شہوانی مظاہر کے مطالعہ مین لوگون نے ابتک بے سوچے سمجھے من مانے اصول گڑھ دینے
سے آگے ترقی نہین کی ہی اسلیے ہم اس بحث مین شریک ہونیکو دخل درمعقولات نہین سمجھتے۔ سب سے
پہلے ”واقعات“ کی تحقیقات کرنا ہی۔ بلوہر کے اس قول کی کہ ”سیلانی پرندون“ کی بنا ہم جنسانہ عشق کے
حامیون نے ڈالی ہی۔ اس تحریک کے تاریخی حالات جو خود اسنے اپنی کتاب مین بیان کیے ہین

تردید کرتے ہین البتہ اس سے انکار نہین ہو سکتا کہ تحریک شباب کی جماعتون مین محبانہ عشق بلکہ محبانہ نہ شہوانی تعلقات کی بہت سی مثالین پہلے بھی ملتی تھین اور اب بھی ملتی ہین۔ اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہین ہو سکتا کہ نوجوانون کی ان جماعتون مین بہت سے "بالغ" لوگ جنمین محبانہ شہوت پرستی پہلے سے راسخ ہو چکی ہے گھس آئے ہین۔

یہان بھی عشق اور شہوت کی تفریق ضروری ہے جسے ہمنے عنفوانِ شباب کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ تعلیمی اور ذہنی عناصر کو جنکی بنیاد عاشقانہ یعنی جمالیاتی تعلق خاطر پر ہوتی ہے۔ نوجوانون کی جماعتون کے قیام مین ہمیشہ سے اہمیت رہی ہے۔ یہ ان مظاہر مین سے ہین جو نفسیاتی حیثیت سے عہد شباب کی خصوصیات ہین۔ انسان مین بغیر عشق کے گہرا تعلیمی جوش صرف اس صورت مین ہو سکتا ہے کہ کوئی مکمل پختہ سیرت رکھنے والا انتہائی خلوص کیساتھ اپنے آپ کو نوجوانون کی رہنمائی کے لئے وقف کردے۔ اسکی خالص ترین مثال پستالوزی کی ذات ہے لیکن کم عمر لوگون کے دلمین جنکی سیرت ابھی خود معرض تشکیل مین ہے خوبصورت لڑکونکا حسن اور قدرت کی صناعی جسکے یہ مظہر ہین اکثر بطور پر مسلمانہ عشق پیدا کرتی ہے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کوئی عقدہ نہین۔ اسی طرح جو لوگ واقعات سے چشم پوشی نہین کرتے ان کے نزدیک یہ بھی حیرت انگیز نہین کہ یہ روحانی میلان خاطر کبھی کبھی محض حسی تعلقات کی صورت اختیار کر لیتا ہے خصوصاً اس حالت مین کہ ہر وقت ساتھ رہنے سے اس قسم کا گہرا تعلق پیدا کرنے مین مدد ملتی ہو۔ نوجوان کی شہوانی جبلت کا تفریق سے ناآشنا ہونا جسپر ہم بہ تفصیل نفسیاتی پہلو سے نظر ڈال چکے ہین ان چیزون کی توجیہ کیلئے کافی ہے۔

آخر مین ہم اس خیال کی بھی تائید کرتے ہین کہ بعض صورتون مین یہ عارضی رجحانات مستقل ہو جاتے ہین اور شہوانی خواہشات کے پورا کرنیکے جو طریقے اس عمر مین اختیار کئے جاتین وہ ہمیشہ کے لئے متعین ہو جاتے ہین۔ اسکے اسباب حسب ذیل ہوتے ہین۔

۱- تخیل کو بار بار ایسے موضوع کا ملتے رہنا کہ وہ باوجود اندرونی رکاوٹوں کے عشق کے بجائے شہوت پرستی کی طرف مائل ہو جائے۔

۲۔ کم عمری میں مجنبانہ شہوانی افعال کا مرتکب ہونا۔

۳۔ اس قسم کے علمی نظریے جیسا بلوہر کا ہے جو نوجوانوں سے محض یہی نہیں کہتے کہ تم اعارضی طور پر) ایسے ہو بلکہ یہ کہ تم ایسے ہونے پر مجبور رہو۔

یہ تیسرا سبب غالباً خلاف فطرت رجحانات کے "استقلال" کے لئے سب سے زیادہ مؤثر ہے اسلئے اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظریہ جسکی رو سے ہمجنسانہ شہوت پرستی دبالے جانیسے یا عملی صورت اختیار کرنیسے انسان کو کارہائے نمایاں کے انجام دینے کے قابل بنا دیتی ہے بجائے خود صحیح ہے یا نہیں۔ خود بلوہر کا یہ خیال ہے کہ ہمجنسانہ "عشق" اصل میں ارتقائے نفسی کی ایک عارضی منزل ہے۔ وہ نوجوانوں کی تین قسمیں کرتا ہے ایک تو وہ جن کا رجحان فوراً غیر جنسانہ عشق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے دوسرے وہ جنکا کچھ عرصہ کے بعد ہوتا ہے تیسرے وہ جنکا کبھی نہیں ہوتا۔ اُسکے خیال میں معمولی سماج میں رہنے سے نوجوانوں کو دوسری اور تیسری قسم کی تربیت ملتی ہے "سیلانی پرندوں" کے نوجوانوں میں سے جو لوگ ڈانوان ڈول ہوتے ہیں اُنمیں اور دوسروں میں یہ فرق ہوتا ہے کہ وہ غیر جنسانہ عشق کی جبلت کو جو آغاز بلوغ کے بعد ہی ہم جنسانہ عشق کی جگہ لینا چاہتی ہے۔ صرف چند سال تک روک سکتے ہیں۔ لیکن سورما مرد جو اس انقلاب کی رو سے بچ جاتے ہیں ہمجنسانہ عشق کے سایہ میں پرورش پاکر زندگی کے اُس مستقل اور بلند رتبہ پر پہونچ جاتے ہیں جس سے عورتوں کو کوئی نسبت نہیں (بشرطیکہ یہ نوجوان اعصابی امراض میں مبتلا نہ ہو جائیں)

ہم اسپر اتنا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں اس نظری میلان کے روکنے اور خلاف فطرت رجحان کو مستقل بنانے میں کسی چیز سے اتنی مدد نہیں ملی ہے جتنی بلوہر کے نظریہ پر آنکھ بند کرکے ایمان لے آنے سے۔ جہاں بلوہر نے ہمجنسانہ عشق اور شہوت پرستی کا تحریک شباب کے بعض حلقوں میں واقعی مشاہدہ کیا ہے وہاں اُسنے خود ان چیزوں کو ایک وسیع دائرہ میں رواج بھی دیا ہے۔ اسکے سبب سے بہت سے نوجوانوں کا جو المناک انجام ہوا ہے اسکی بیشمار شہادتیں موجود ہیں۔ لیکن اس سے قطع نظر کرنیکے بعد بھی ضرورت ہے کہ

ہم اُس کے نظریہ کی صحت کو اچھی طرح جانچین اور پرکھین۔ مگر چونکہ اس نے اپنی کتاب
مین بچون کی "تفریق ناآشنا شہوانی جبلت" اور آئندہ جبری روک تھام کو بحث کا مرکز
قرار دیا ہے۔ اس لیے ہمارا رُوئے سخن خود بلوہر کی طرف نہین بلکہ فرائڈ کی طرف ہوگا جسکی
بلوہر نے ہر جگہ سند دی ہے اور اسمین بھی ہمین محض ان باتون سے سروکار ہے جو عنفوان شباب
کی نفسیاتی ارتقاء سے تعلق رکھتی ہین۔

باب ششم

عشق اور شہوت کا باہمی تعلق،

ہمارا موضوع بحث نفسیات ارتقائی کا ایک حصہ ہے اس سے مراد جیسا کہ ہم منہاجی باب مین بیان کر چکے ہین دو باتین ہو سکتی ہین۔ پہلے تو نفسی واقعات کو اسطرح بیان کرنا ضروری ہی جسطرح وہ مدرک کے تجربہ (احساس) مین پیش آتے ہین یعنی موجودہ صورت مین اُن واقعات کی صحیح تصویر کھینچنا ضروری ہی جو نوجوان کے شعور اور تجربہ مین ہوتے ہین مگر یہ کافی نہین۔ ہمین چاہیے کہ اسکے علاوہ اُن واقعات کی جو تجربہ مین بے ربطی کی حالت مین ہوتے ہین تفسیر بھی کرین خواہ تحت شعوری نظام نشا کی مدد سے خواہ اس مافوق الافراد نظام کے ذریعہ سے جسکا تعلق تمدن کے ذہن خارجی سے یا فطرت کے قوانین سے ہے۔

پہلے نقطۂ نظر سے ہمنے یہ حقیقت بیان کی تھی کہ عشق اور شہوانی خواہش کے موضوع عموماً جُدا ہوتے ہین لیکن یہان بھی ہمین تسلیم کرنا پڑا تھا کہ ایک حد تک یہ دونون چیزین ملنے کی کوشش کرتی ہین اور اسکی تائید اس بات سے ہوئی تھی کہ عاشقانہ تعلقات مین جذبۂ رشک موجود ہوتا ہی جسکی بنیاد محض جسمانی یا روحانی حُسن کے جمالیاتی ذوق مشاہدہ پر نہین ہو سکتی۔ اب اگر غور کیجئے تو "بنیاد ہونا" جیسے الفاظ کا استعمال یہ ظاہر کرتا ہی کہ ہم محض تجربہ اور احساس پر اکتفا نہین کرتے بلکہ ہمارے پیش نظر اسکے ماورا کوئی چیز ہے۔ اسکے معنی یہ ہین کہ ہم ان مسائل پر دوسرے نقطۂ نظر سے غور کرتے ہین اور "نشا" کے علاقون کو ڈھونڈھتے ہین جو بظاہر جدا نظر آنے والے مظاہر کو ایک دوسرے سے مربوط کرتے ہین۔ یہ بات کہ انفرادی نفس ایک کُل ہے جسمین کوئی چیز بے ربط نہین علمی اور منہاجی حیثیت سے مسلّم ہے (ایک بدیہی قضیہ ہی) لیکن یہ معلوم کرنیکے لئے کہ یہ ربط کس طرح کا ہے زیادہ گہری چھان بین کی ضرورت ہی اور اسطرح ناگزیر طور پر بیان نفس، نظریہ نفس پہنچنا ہی

ایک نیا نفسیاتی نظریہ عشق اور شہوت کے تعلقات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہی۔
فرائڈ کی "تحلیل نفسی" اصل مین بحیثیت ایک طریقہ علاج کے معرض وجود مین آئی ہی اور اسلیئے اُس مین
بعض کیطرفیان موجود ہین جلسے احتراز ممکن تھا اگر اس معاملہ مین نظریہ کی صحت پر زیادہ زور دیا جاتا
اور اسکے طبی استعمال پر کم۔ نتیجہ یہ ہی کہ بار بار تجربہ کی مدد لینے کے سبب سے نظریہ کی مکمل تدوین نہو سکی۔ پھر بھی
ان لوگون کا دعوی ہی کہ یہ نفسیات ارتقائی کا عام نظریہ ہے لہذا ہم اسے نظرانداز نہین کرسکتے۔

جس طرح مارکس کا نظریہ تاریخی واقعات مین ایک "جوہر حامل" تلاش کرتا ہی جسکے مقابلہ
مین اور سب چیزین محض عرض یا "بالائی منزل" کا حکم رکھتی ہین اسی طرح فرائڈ کی نفسیات انفرادی
نفس مین وہ بنیادی مظہر ڈھونڈھتی ہی جو جوہر کہا جا سکے۔ وہ اس نتیجہ پر پہونچتی ہی کہ ایسا جوہر شہوت ہے
اپنے وسیع معنی مین جسکی تحت مین شہوانی لذت حاصل کرنیکی ساری صورتین آجاتی ہین۔ اس بنیادی
جبلت کے مقابلہ مین ساری ذہنی جد وجہد اور عینی احساس و عمل کی حیثیت محض ایک تغیر یا
ترقی کی ہے۔ (یہ بات قابل غور ہی کہ خود اس نام مین ایک اخلاقی نقطۂ نظر پوشیدہ ہی) یہ ترتیب
محض وجود کے لحاظ سے نہین بلکہ ارتقا کے اعتبار سے بھی ہی۔ یعنی انفرادی نفس کی نشو و نما مین شہوانی
جبلت (جو ابتدا مین مجتمع نہین بلکہ منتشر ہوتی ہی) پہلے سے موجود ہوتی ہی اور ذہنی بیداری بلوغ
کے زمانہ مین اسی شہوت کی تحویل و ترقی سے پیدا ہوتی ہی۔ فرائڈ نے زمانۂ بلوغ کی نفسیات کی
تفصیلی بحث نہین کی ہی اُسکے شاگرد ہمیشہ اُسکی صحیح تقلید نہین کرتے۔ اصولی بات ہی کہ انسان ایک
نظریہ کو یا تو مانے یا نہ مانے۔ اُس سے حسب موقع مدد لینے سے کام نہین چلتا بلکہ اُسے پوری طرح اختیار
کرنیکی ضرورت ہی۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس نظریہ کی رو سے صورتِ حال یہ ہو گی کہ زمانۂ بلوغ
مین شہوانی ارتقا اصلی اور بنیادی چیز ہے اور دوسرے نفسی تغیرات جو اس زمانہ مین ہوتے
ہین اسی کا عکس ہین۔

نفسیات کی بحث کرتے کرتے بہک کر عضویات یا تشریح کی حد میں چلے جانیسے ممکن ہے کہ جسم و نفس کے علاقے بہ حیثیت افعات کے معلوم ہو جائیں لیکن ان سے "سمجھنے" میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ فرویڈ محض اُن افعات پر اکتفا نہیں کرتا جو شعوری حالت میں نفس میں پیش آتے ہیں۔ بلکہ وہ اُن کا تعلق نظام منشا سے معلوم کرنا چاہتا ہے اور ترکیب نفسی میں وہ رشتے ڈھونڈھتا ہے جو خود مدرک کے احساس کی دسترس سے باہر ہیں اور صرف تحلیل نفسی کے ذریعہ سے جو سقراط کے سوالات کی یاد تازہ کرتی ہے، مل سکتے ہیں، چونکہ تحلیل نفسی نفس انفرادی کے گہرے اور لاشعوری طبقوں کی تحقیقات کرتی ہے اسلئے اسے نفسیات عمق بھی کہتے ہیں۔ اصل میں ہم اسے علم طبقات الارض کی رعایت سے علم طبقات النفس کہہ سکتے ہیں۔ اسٹینلے ہال قانون ارتقائے حیات کی بنا پر جس علم کی ضرورت علم آثار النفس کے نام سے بتاتا ہے۔ اُس سے یہ زیر بحث علم بہت مشابہ ہے البتہ اس کا موضوع دوسرا ہے۔

فرویڈ نفسی زندگی کی تحلیل "جبلی رجحانات" میں کرتا ہے جو باہم برسر پیکار رہیں خودی کی جبلتیں اور شہوانی جبلتیں۔ مقدم الذکر کی ماہیت اور اصل پر وہ کوئی روشنی نہیں ڈالتا بلکہ جو نام اسنے تجویز کیا ہے وہ بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ اسکی تحت میں وہ نہ صرف بقائے نفس کی جبلت کو رکھتا ہے بلکہ تمام معاشرتی رجحانات، تمام اخلاقی رجحانات مختصر یہ کہ تمام ذہنی رجحانات کو بھی، آگے چل کر تفصیلی بحث میں ان جبلتوں کی وہ اہمیت ظاہر نہیں ہوتی جسکی ہم توقع رکھتے ہیں بلکہ شہوانی جبلت بنیادی جبلت قرار پاتی ہے جسکی قوتوں کی تحویل سے دوسری چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

فرائڈ کے نزدیک بچپن میں شہوانی جبلت کا موضوع بالکل غیر معین ہوتا ہے۔ بچہ ہر چیز میں شہوانی لذت ڈھونڈھتا ہے۔ مثلاً ماں کی چھاتیوں میں خود اپنے (جسم کے مختلف اعضا) میں اور ہر چیز میں جسے (شہوت انگیز کہا جا سکتا ہے) خصوصاً ماں سے جو محبت ہوتی ہے وہ شہوانی ہے۔ خالخہ بچہ اور ماں میں جو شہوانی "رشتہ" ہے وہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ

اسکے سبب اُسے باپ سے رشک مخالفت بلکہ رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ بچّہ کے شہوانی ہیجان کی راہ میں اخلاقی حکم کی روک حائل ہوتی ہے (کوئی پوچھے کہ یہ چیز کہاں سے آگئی) بلکہ عموماً شہوانی جبلّت کی آزاد جدّ و جہد میں اخلاقی احکام سدّراہ ہوتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس جبلّت کو جس کا موضوع معین نہیں ہو دبا کر نفس کے لاشعوری طبقہ میں ڈھکیلنا چاہتا ہے۔ اب دو صورتیں ہیں یا تو اُسے دبانے میں کامیابی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی (بعض اوقات کچھ ہوتی ہے کچھ نہیں ہوتی) پہلی صورت میں شہوانی جبلّت کی زندہ قوت پوری طرح معدوم نہیں ہوتی بلکہ وہ ذہنی کارگذاریوں میں تبدیل ہو جاتی ہے (یہ مدرک کے شعور میں واقع ہوتا ہے لیکن شہوانی جبلّت بھیس بدلے ہوتی ہے اسلئے محسوس نہیں ہوتی) اسی عمل کو ترقی کہتے ہیں۔

دوسری صورت میں شہوانی جبلّت شعور کی چوکھٹ پر سطح کے نیچے ہملٹ کے باپ کی طرح کنڈی کھٹکھٹایا کرتی ہے اور باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈھتی ہے۔ یہ راستہ اُسے اسطرح ملتا ہے کہ شہوانی خواہش کو مصنوعی ذرائع سے کچھ خیالی میں اور کچھ واقعی تسکین دے۔ یا اگر فطری خواہش بالکل ہی دب جائے تو اعصابی امراض پیدا ہو جاتے ہیں جنکی علامات میں مسدود شہوانی جبلت کی مساوی قوت ہوتی ہے۔ مصنوعی ذرائع تسکین سے مراد شہوانی جبلت کو جو پختہ عمر میں غیر جنبانہ ہوتی ہے دوسری چیزوں کی طرف موڑنا ہے فرائڈ کے خیال میں اگر دیکھا جائے تو ان کی حقیقت یہ ہو کہ نفس کی ارتقا رک گئی ہو اور وہ شہوانی زندگی کی طفلانہ منزل پر ٹھہر گیا ہے جسمیں شہوت کا موضوع معین نہیں ہوتا۔ اسی طرح غیر فطری انحراف اصل میں طفلانہ تسکین شہوت کی صورتوں کی طرف رجوع کا نام ہو۔ یہ ارتقا کی رکاوٹیں ہیں جو اسلئے پیدا ہوتی ہیں کہ بلا واسطہ تسکین کا راستہ مسدود ہو گیا ہے۔ اس طرح جو "تحویل" واقع ہوتی ہے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ مسدود جبلت کا ردعمل یا تو شہوانی خوابوں کی صورت میں

ہوتا ہے۔ یا ایسی غلطیوں کی صورت میں جو بظاہر بالکل بے معنی معلوم ہوتی ہیں یا امراض ذہنی کی صورت میں (مثلاً Œdipus Complex وغیرہ) یا وہ اپنے لئے واقعی راستے پیدا کر لیتا ہے مثلاً جلق، ہم جنسانہ شہوانی افعال .... وغیرہ۔

یہیں سے انسان کو شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ فرائڈ اعلیٰ درجہ کا مداری ہے جسے ایک چیز سے دوسری چیز بنا دینے میں کمال ہے۔ کیونکہ اسکی تحلیل نفسی نے جو جو تحویل کی صورتیں اور مصنوعی ذرائع تسکین ڈھونڈھ کر نکالے ہیں وہ ہر سیدھی سادھی چیز کو کسی نہ کسی طرح پوشیدہ شہوانی خواہش بنا کر دکھا دیتے ہیں۔ لیکن یہیں زیادہ دلچسپی بحث کے اس پہلو سے نہیں ہے بلکہ عمل ترقی سے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ "اس عمل میں شہوانی جبلت اپنے اصل مقصد یعنی جزوی شہوانی لذت یا جماع کی لذت کو ترک کر دیتی ہے اور ایک دوسرا مقصد اختیار کر لیتی ہے جو ارتقائی حیثیت سے تو پہلے مقصد سے تعلق رکھتا ہے لیکن بجائے خود شہوانی نہیں بلکہ متمدنی کہلاتا ہے۔ ہم اس عمل کا نام ترقی رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں ہم عام اخلاقی احکام کی تقلید کرتے ہیں جو معاشرتی مقاصد کو خود غرضانہ شہوانی خواہشات سے برتر قرار دیتا ہے۔ یہاں فرائڈ نے اپنا پہلا نظریہ ترک کر دیا ہے کہ خودی کی جبلت اور شہوانی جبلت ایک دوسرے کی حریف ہیں۔ بجائے اسکے "معاشرتی جبلت" آن کو دی ہے جس کی بحث میں تمام ذہنی جد و جہد رکھی گئی ہے قطع نظر اسکے کہ علم النفس کی رو سے یہ اصطلاح بالکل ناقص ہے اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ وہ خود شہوانی جبلت کو ذہنی جد و جہد کا منبع قرار دیتا ہے۔ یہ کایا پلٹ بھی عجیب و غریب ہے۔ شیلر نے سچ کہا ہے کہ "فرائڈ کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسکے نزدیک ذہنی جد و جہد کے تمام اعمال خواہ وہ علمی مشاغل ہوں یا صناعانہ کمالات، یا مختلف پیشوں کی کارگزاریاں، مسدود شہوانی خواہش کا نتیجہ ہیں۔ اگر واقعی اسکا یہ خیال ہے تو بحث کرنا فضول ہے کیونکہ ہمیں کسی ایسی ذہنی کیمیا کے وجود کا مطلق علم نہیں جسکی بدولت "شہوانی لذت" سے "قوت خیال"

اور "نیکی" وغیرہ بنجائیں"۔ حقیقت میں یہاں یہ نظریہ خالص نظری حیثیت سے بھی بیکار ہوجاتا ہے کیونکہ اس سے کسی واقعہ کی توجیہ نہیں ہوتی بلکہ ہمیں منطقی غلطیوں میں مبتلا کردیتی ہے۔ لیکن ایک دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ کمزور ہے جسکی طرف شیلر ہی نے توجہ دلائی ہے۔ جو قوتیں شہوانی خواہش کو روکتی ہیں۔ یہ وہی قوتیں ہیں جو اس کو روکنے سے پیدا ہوتی ہیں "اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ جیسا فرائڈ کہتا ہے۔ "شہوانی لذت مجموعی نفسی قوت بنجاتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس سے وہ قوتیں کیسے تشکیل پا سکتی ہیں جنکا کام اُسے روکنا ہی یہ شہوانی لذت بھی قریب قریب علم الاساطیر کا طلسم بنگئی ہے۔ اس کی مثال بالکل فختےؔ[1] کے "انا" کی سی ہے جو خود ہی اپنے آپ کو محدود کرتا ہے۔

اس عجیب نظری غلطی کے اسباب آسانی سے معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ فرائڈ نے اگر عضویاتی مادیت کو ترک بھی کردیا ہو تو نفسیاتی مادیت بدستور باقی رہی۔ اُسکے نظریہ میں یہ بات چپ چاپ تسلیم کرلی گئی ہے کہ شہوانی جبلت کا وجود تو بدیہی ہے دوسری جبلتوں کا وجود ثابت کرنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اس غرض کے لئے تغیر قوت کے عجیب عجیب کھیل استعمال کئے گئے ہیں جنکا ہم ذکر کرچکے ہیں۔ لیکن یہاں بھی پڑھنے والے کی تسکین کے لئے نام نہاد اعلیٰ جبلتوں کی یہ گت بنائی گئی ہے کہ اُن کی اصل وہی شہوانی جبلت قرار دی گئی ہے اور اسی کی ترقی پر دوسری جبلتوں کا پیدا ہونا منحصر کیا گیا ہے۔

جس موقع پر فرائڈ نے "ترقی" کا ذکر کیا ہے وہاں کھلم کھلا مروّجہ اخلاقی احکام کی مخالفت کرتا ہے باوجودیکہ اس کی اصطلاحات ان سے متاثر ہیں۔ اصل میں نفسیات کا یہ کام نہیں کہ "ادنیٰ" اور "اعلیٰ" کا تعین کرے۔ البتہ اُسے اس سے چارہ نہیں کہ اپنی بحث میں اس اخلاقی تفریق کو بھی بحیثیت موضوع احساس شامل کرے۔ بحیثیت ماہر نفسیات ہم

[1] فختے مشہور جرمن فلسفی ہے جو اُنیسویں صدی کے نصف اول میں گذرا ہی اُسکے نزدیک ابتدا میں صرف "انا" یعنی مدرک کا وجود تھا جسنے خود ہی اپنے آپ کو "انا" اور "غیر انا" میں تقسیم کردیا اسطرح دنیا وجود میں آئی۔ ۱۲

یہ حق نہیں رکھتے کہ فرائڈ کے فطرت پرستانہ "نظریہ شہوانیت" کا دوسرے فلسفیانہ نظریوں سے مقابلہ کر کے اُسکی اخلاقی قدر پر حکم لگائیں۔ ہماری بحث کے سلسلہ میں تو یہی سوال کیا جا سکتا ہے کہ اُس کا نظریہ واقعی نفسی مظاہر کو ترکیبی اصولوں کے مطابق "سمجھا" سکتا ہے یا نہیں۔

غالباً فرائڈ اپنے خیال کی تائید واقعات سے کرے گا۔ وہ کہے گا کہ دیکھو ذہنی تخلیق کے اعلےٰ کارنامے عموماً انھیں زمانوں میں عمل میں آئے ہیں جب عشق و محبت کی گرم بازاری تھی۔ ہر تخلیق کا مخاطب در پردہ کوئی محبوب ہے۔ ہر عظیم الشان تصنیف ایک خاموش ہدیہ محبت ہے۔ لیکن ہم اس قول کی تکمیل کیلئے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ موضوع عشق ہمیشہ کوئی انسان نہیں ہوتا بلکہ اُس کی حیثیت اکثر محض ایک آئینہ مجاز کی ہوتی ہے جسمیں حقیقی نصب العین کی صورت نظر آتی ہے۔ اصل میں عشق "ابدی انوثیت[1]" سے ہوتا ہے (مگر اُس کے ناقص مظاہر کے واسطے سے) ذہن خلاق بہ ہیئت کلی کسی مجازی محبوب کو علامت قرار دیکر حقیقت کی جستجو کرتا ہے۔ کیا اِن سب باتوں کو محض مسدود جبلت اور شہوانی لذت "سمجھنا" چاہئے۔

اس طرح کی نفسیات کو ہم "نفسیات عمق" نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ تو حقیقت میں "نفسیات سطح" ہے۔ یہ اُسی جزو کو لے لیتی ہے جسکا ہم اس ظاہری آسانی سے احاطہ کر سکیں اور کہتی ہے کہ یہی تمام مظاہر کی تہ میں بحیثیت تخلیقی قوت کے کام کرتی ہے۔ ہم اِن جزوں کے باہمی تعلق سے انکار نہیں کرتے مگر ہمارے نزدیک وہ نظریہ مردود ہے جو اِن میں سے ایک کو چن لے اور اسے تنہا جوہر حامل قرار دے۔ ہم اسکی برعکس غلطی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے اور شہوت کو نفس کی "خرابی" یا اس کا "ہبوط" فطرت پرستی اور مادیت پرستی کی طرف نہیں

[1] یہ اصطلاح گوئٹے نے وضع کی ہے۔ اس سے مراد ہے کائنات کا جوہر انوثیت۔ گوئٹے کے نزدیک عشق میں انسان عورتوں کو واسطہ بنا کر اسی جوہر انوثیت کو تلاش کرتا ہے۔

ٹھہراتے۔ ہم جسم کو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ فرشتہ مردود ہے جو اپنی ارضی شکل میں نظر آتا ہے بلکہ ہمارا قول یہ ہے کہ نفس کے کل میں دونوں پہلو۔ ذہنی عشق اور وحشی شہوت مساوی اور مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ہمیں یہاں مافوق الطبعی رنگ میں گفتگو کرنے کی اجازت ہوتی تو ہم کہتے کہ جسمانی جبلت تولید کی حقیقت پہلے پہل عشق کے رنگ میں محسوس ہوتی ہے۔ عشق ہی فطری عمل تولید کو معنوی لباس پہناتا ہے۔ یہ ایک شعلہ ہے فطرت خلاق کی ذہنی حقیقت کا، اور جہاں دونوں چیزیں (عشق اور شہوت) مل کر اعلیٰ اتحاد زندگی کی صورت اختیار کرتی ہیں وہاں ہم دراصل فطرت کے آغوش میں ہوتے ہیں جو ہر رنگ میں ایک ہے، بہت بڑی ہے، اور روحانیت سے لبریز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح ارتقائے نفس میں شہوت اور عشق باہم متحد ہو جانے کی کوشش کرتے ہیں یہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے ایک ہیں البتہ ان کا احساس دو مختلف پہلوؤں سے یا دو مختلف اعراض کی صورت میں ہوتا ہے۔ شہوت کا "منشار" اصل میں عشق کے ذریعہ سے پورا ہوتا ہے۔

لیکن یہ محض یک رخی تصویر ہے۔ کیونکہ نفسیات ارتقا کے بلکہ عام نفسیات کے نقطۂ نظر سے بھی یہ دونوں چیزیں کبھی ایک دوسرے سے جدا بھی ہو جاتی ہیں۔ تب ایک طرف تو عشق ہوتا ہے جو شہوت سے خالی ہی نہیں، بلکہ انتہائی شرم و حیا کے ساتھ اس سے دور اور خائف رہتا ہے کیونکہ اس منزل پر اور اس صورت میں اتحاد سے فطرت کا اعلیٰ منشار پورا نہیں ہو سکتا۔ نوجوان اسی منزل میں ہوتا ہے۔ اُس کا نفس عشق کی قوت تولید سے لبریز ہوتا ہے لیکن اس کا جسم پوری طرح تولید کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ دوسری طرف شہوت ہوتی ہے بغیر عشق کے، بغیر روحانی مقاصد کی قوت پرواز کے، یہ بھی ایک مظہر فطرت ہے مگر یہ شہوت بالکل معنویت سے خالی اور بے مقصد ہے۔ نوجوان کو یہاں بھی کبھی نہ کبھی ہونے والی جبلت سے سابقہ پڑتا ہے جو عشق اور شہوت دونوں میں کارفرما ہے۔ لیکن اگر اسکے نفس کے کسی گوشہ میں ذرا سی بھی معنویت باقی ہے تو وہ اسے اس شہوت کو ہرگز پسند نہ کرے گا۔ یہ اسے خالص جسمانی خواہشات و

ضروریات کے دائرہ میں کھینچ لاتی ہے اور ایسی زندگی میں مبتلا کر دیتی ہے جسمیں نہ وہ اپنے آپ میں رہتا ہے اور نہ اپنے آپ کو پا سکتا ہی۔ جنسی لذتوں میں بھی ایک جھلک ذہنی مقاصد کی نظر آتی ہے مگر آلودگی کے لباس میں اور سیدھے راستہ سے بھٹکانے والی جو نفس کو احساس گناہ اور ندامت سے معمور کر دیتی ہے۔ یہ جذبات ہمیشہ اس حالت میں نمودار ہوتے ہیں جب انسان محسوس کرے کہ میں وہ نہیں ہوں جو میں ہو سکتا ہوں اور جو مجھے ہونا چاہئے۔

پس عشق شہوت کا تابع نہیں ہے اور نہ شہوت عشق کی تابع۔ البتہ دونوں منشائے ارتقا کے ماتحت نفس کے احساس کلی میں باہم مربوط ہیں۔ دونوں ایک ہی زمین سے نکلتے ہیں اور کچھ دن تک الگ الگ چلنے کے بعد ہماری زندگی کے نقطۂ کمال پر پھر ایک دوسرے سے ملجاتے ہیں۔ ان کے باہمی تعلق کو سمجھنے کی کوئی اور صورت ممکن ہی نہیں۔

اب یہاں سے ہمیں ہمجنسانہ شہوت کے مسئلہ پر دوبارہ نظر ڈالنا چاہئے۔ وہ شہوانی نظرئے جنکا نمائندہ ہم نے بلوہر کو قرار دیا ہی۔ نوجوان کے دلمیں یہ یقین پیدا کرتے ہیں کہ وہ ہمجنسانہ شہوانی تعلقات کے ذریعہ سے اپنے فطری اور معنوی منشائے تخلیق کو پورا کر سکتا ہے اگر واقعی اس طرح اس کی مجموعی جسمانی اور ذہنی ہستی کی کامل نشو ونما ہو سکتی تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہوتے کہ یہ راستہ بھی انسان کو اپنے آپ تک یعنی اپنے نصب العین تک پہونچا سکتا ہے لیکن واقعہ اسکے خلاف ہی۔ فطرت کا کھلا ہوا اشارہ ہی کہ یہ اتحاد بے ثمر ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ خیر جسمانی تولید نہ سہی ذہنی تولید تو ممکن ہے۔ مگر یہ نہیں سمجھتے کہ شہوت جو اپنے اصل مقصد میں ناکام رہتی ہے ذہنی تولید کو بھی مسخ کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں بجائے تسکین کے نفرت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اس قسم کی بحث نفسیات کی سرحد سے باہر ہے۔ اور ان باتوں کا کوئی قطعی ثبوت بھی نہیں دیا جا سکتا۔ زندگی کے بنیادی مسائل معانی کی بحث میں نہیں لائے جا سکتے۔ ان کی تعلیم زندگی خود دیتی ہے۔ یہ زندگی ہمجنسوں کے باہمی بصیرت افروز عشق کو

جائز قرار دیتی ہے کیونکہ اس سے ذہنی ترقی ہوتی ہے لیکن اُن میں جو شہوانی تعلقات ہوں
انھیں ناپاک اور ناجائز قرار دیتی ہے۔ ایسے تعلقات عشق کی ذہنی قوت کو کمزور کر دیتے ہیں
مگر ان کے مقابلہ میں عورت اور مرد کا سچی محبت پر مبنی جسمانی اور روحانی اتحاد دونوں کو
بجائے خود مکمل بناتا ہے اور انھیں اولاد عطا کر کے بقائے جسمانی بخشتا ہے۔ اُن کی رگوں میں
فطری خون دوڑتا رہتا ہے جس میں روحانیت کی شان نظر آتی ہے۔ تولید کے عمل میں مرد اور
عورت پر فطرت کی طرف سے بڑی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ بغیر عشق کے اُن کا اتحاد روحانیت
سے خالی خود فروشی اور گمراہی ہے۔ لیکن عشق کے سایہ میں یہی چیز انسان کے لئے سب سے
بڑی دولت ہے کیونکہ شب عروسی کو دو جسمانی روحانی صورتوں کی ہم آغوشی سے ایک تیسری جیتی
جاگتی صورت پیدا ہوتی ہے۔

کیا نوجوانوں کے شہوانی مصائب کی کہانی پوری ہو گئی؟ نہیں۔ نہ پوری ہو لی ہے
اور نہ کاغذ کے صفحوں پر ہو سکتی ہے۔ بعض لوگ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ عموماً نوجوانوں کو
ایسی مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ والٹر ہوفمان کا خیال ہے کہ یہ باتیں صرف اعصابی کمزوری رکھنے
والے نوجوانوں کو پیش آتی ہیں کیونکہ شہوانی تعلقات اُن کے نفس پر ایسی حالت میں حملہ کرتے
ہیں جب وہ بہت اثر پذیر ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے مگر یہ اعصابی کمزوری نوعنفوانِ شباب میں قریب قریب
سب نوجوانوں میں ہوتی ہے۔ کیونکہ اعصابی امراض کی بابت ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ یہی ہے کہ انکا
اظہار زود حسی، کمزوری، بے چینی، جسمانی، اور نفسی قوتوں خصوصاً تخیل اور جبلت کے جلد
تھک جانے کی صورت میں ہوتا ہے۔ خصوصاً بڑے شہروں کے طرز معاشرت میں روزمرہ کی زندگی
ہی ایسی ہوتی ہے جس سے یہ صورت حال پیدا ہو۔ صبح سے شام تک شور و غل، نت نئے تاثرات
تازہ ہوا میں حرکت کا موقع نہ ملنا، اسکول میں دن بھر بیٹھ کے اپنے بوتے سے زیادہ کام کرنا
امتحان پر امتحان دینا، اُس پر طرہ یہ ہے کہ ہر طرف طبیعت میں ہیجان پیدا کرنے والے اسباب
موجود ہیں۔ لباس کے فیشن جنمیں خاص شہوانی اثرات مد نظر رکھے جاتے ہیں۔ دوکانوں کی

گھڑیوں میں شہوت انگیز تصویریں، نام نہاد ظریفانہ اخبار، گندی کتابوں کا پڑھنا، شراب کا استعمال عام تماشہ گاہ بائسکوپ اور خود اعلیٰ تھیٹر۔ بھلا بتائیے کہ ان سب کے متحدہ حملہ کا کونسا انسان مقابلہ کرسکتا ہے؟ فرانک ویڈے کنڈ جن لوگوں کی تصویر کھینچتا ہے وہ اس فضا میں پرورش پاتے ہیں۔ اور اس طرز زندگی کو اُن کے اس مغرورانہ احساس سے اور تقویت پہونچتی ہے کہ اُن کی ذات ایک نہایت ترقی یافتہ یا کم سے کم نہایت "دلچسپ" انسان کا نمونہ پیش کرتی ہے جب سے کہ فروئڈ اور وائننگر، بلوہر، اور ویونیکن نے اس زندگی کے لئے ایک نظری بنیاد پیدا کردی ہے اور ادب لطیف میں زیادہ تر شہوانی انحرافات کا ذکر ہوتا ہے اُسوقت سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ "تہذیب شباب" مکمل ہوگئی ہے۔

ہمارے ہائی اسکولوں کے اونچے درجوں میں، خصوصًا ان میں جو امیروں کے محلوں میں ہیں یہ تہذیب بہت رائج ہے اور اسکے معتقدوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ اور کیوں نہو آخر اولوالعزم "اسکول ریفارمر" نے اس تہذیب کی تائید کا بیڑا اٹھایا ہے اس قسم کے نوجوان ایک حد تک اس گندی زندگی میں خوش بھی ہیں خود ان کو کسی شہوانی مصیبت کا احساس نہیں ہے۔ بلکہ اس کا احساس اصل میں باہر سے دیکھنے والے کو ہوتا ہے جب وہ اس آنیوالی زندگی کا تصوّر کرتا ہے جو ان جڑوں سے پیدا ہوگی اور ان "ترقیوں" کا صحت عامہ کے نقطہ نظر سے مشاہدہ کرتا ہے حقیقت میں یہ تیاریاں ہیں "غروب مغرب" کی۔ قدیم یونانی اور رومی، تہذیب کی تباہی کا سبب بھی نہ تو اقتصادی اور سیاسی خرابی تھی، نہ لامذہبی بلکہ محض یہ بات کہ اُسکے اعلےٰ طبقوں کی جڑیں کھوکھلی ہوگئی تھیں یعنی ان کے شہوانی اور عاشقانہ جذبات گندے ہوگئے تھے۔

لیکن اگر اس انتہائی صورت سے قطع نظر کرکے دیکھئے تو واقعی اکثر نوجوانوں کو اس مصیبت کا احساس ہے خصوصًا اسلئے کہ ادھر شہوانی جبلت اُبھرتے ہی نہایت شدید صورت اختیار کرتی ہے اور اُدھر موجودہ تہذیب کی مشکوک حالت کے سبب سے عمومًا

نفس میں مدافعت کی قوت بہت کم ہوتی ہے۔ آج واقعی دنیا میں نہ تو تازہ نصب العین کے لئے گنجایش ہے نہ ایسے عمل کے لئے جو کسی مقصد کو پیش نظر رکھکر اور کامیابی کی اُمید دل میں لے کر کیا جائے اور نہ ایسے عقیدہ کے لئے جو دُنیا یا آخرت پر مضبُوطی سے قائم ہو۔ باوجود اسکے نوجوان تلاش اور سعی کا دامن نہیں چھوڑتا۔ وہ اب بھی دنیا میں اپنے لئے کوئی جگہ ڈھونڈھتا ہے اسلئے شہوانی خطرے ایسے وقت میں پیدا ہوتے ہیں جب نفس اور طبیعت کی عام حالت بہت نازک ہوتی ہے (یعنی نفسی زندگی میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ کوئی مرکز باقی نہیں رہتا) نتیجہ یہ ہے کہ اُسے لڑائی میں شکست ہوتی ہے۔ شہوانی زندگی کی تنظیم محض جسم کے ذریعے سے نہیں ہوسکتی بلکہ اسکے لئے سارے نفس کی ترتیب و تہذیب کی ضرورت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کھیل اور ورزش اس قسم کے ہیجان کو دھیما کرنے میں بہت کام دیتی ہے۔ لیکن ہر شخص جسنے اس بات پر غور کیا ہے کہ خود ورزشی کھیلوں میں ایسے عناصر موجود ہیں جن میں شہوانی رنگ جھلکتا ہے وہ تسلیم کرے گا کہ محض ان کھیلوں سے کام نہیں چلتا۔ بعض لوگ یہ رائے دیتے ہیں کہ کم عمری ہی میں شادی کر دینا چاہئے۔ مگر اسکے فوائد بھی مشتبہ ہیں۔ کیونکہ شادی کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان میں نفسی پختگی پیدا ہو چکی ہو اور "سیلانی پرندوں" کی شادیوں کا جو طرز ہے اسکی تقلید کی کسی کو ہمت نہیں پڑتی۔ شہوانی مصیبت کے دُور کرنے کی اگر کوئی ترکیب ہے، تو یہی کہ نفس کو بڑے بڑے مقاصد اور نصب العین سے معمور کر دیا جائے۔ جو خود نفس اپنی حفاظت کے لئے سچے عشق کا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔ جو کمینہ افعال سے بچنے کی سب سے کارگر تدبیر ہے۔

عہد قدیم میں لوگ موسیقی کی اخلاقی تاثیر سے واقف تھے لیکن ہم آج اس سے بالکل کام نہیں لیتے۔ ورنہ اصل میں ساری نفسی زندگی کو روانی اور ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔

آخر میں ہم ایک عام نقطۂ نظر پر پہونچتے ہیں جس سے وہ حقیقت جو نظریۂ تحلیل کی تہ میں چھپی ہوئی ہے۔ پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ فرائڈ کی تحلیل نفسی سمجھتی ہے کہ امراض

نفسی کے علاج کے لئے محض اُن گشیدگیوں اور چوٹوں کا دور کرنا کافی ہے جو شہوانی جبلت کے دبانے سے پیدا ہوگئی ہیں۔ مگر صحیح نفسی نشوونما میں رُکاوٹ ڈالنے والی صرف مسدود شہوانی جبلتیں ہی نہیں ہوتیں بلکہ ہر قسم کے نقائص اور خامیاں جو نفس میں موجود ہوں اسی لئے شکستہ اور ناقص طبیعتیں ہر طرح کے جبلی ہیجانات سے بہت آسانی سے مغلوب ہو جاتی ہیں۔ جب انسان کا نفس قوی اور گہرے احساسات کے ہاتھوں سیدھے راستہ سے دُور جا پڑتا ہے۔ جب وہ ان میں تنظیم و ترتیب پیدا نہیں کر سکتا تو اُسکی عموماً یہ حالت ہوتی ہے کہ ہیجانات کا ایک طوفان ہوتا ہے جسے وہ بہت دباتا ہے مگر قابو میں نہیں لا سکتا۔ اگر ایسی صورت میں شہوانی ہیجان حملہ کر دے تو وہ اپنے سامنے ایک قلعہ دیکھتا ہے جسمیں مدافعت کا بہت کم سامان ہے جو شخص اس ہیجان پر غالب آنا چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ اپنے ساری نفس کو از سر نو نصب العین اور اخلاقی جوہر کی بنیاد پر تعمیر کرے۔

شہوانی مصیبت سے صرف وہی نفس محفوظ رہ سکتا ہے جو ایک مستحکم "صورت" رکھتا ہے، جسمیں تمام قوتیں اپنے مراتب اور اپنی قدر کے لحاظ سے ایک نظام میں مرتب ہو چکی ہیں۔ یہ کوئی اخلاقی مقولہ نہیں ہے بلکہ ایک خالص نفسیاتی تصدیق، کیونکہ ہم نفس کو ایک "ترکیب" سمجھتے ہیں جسکی ارتقا ایک "قانون صورت" کے ماتحت ہوتی ہے نفس کی صحیح ارتقا کے لئے ضروری ہے کہ یہ "قانون صورت" بحیثیت ایک "اخلاقی قانون" کے محسوس ہو۔

اس معاملہ میں مشکلات کا مقابلہ کرنا اور اُن پر غالب آنا ناگزیر ہے۔ وہ المناک کشاکش جس کا احساس سب سے زیادہ شہوانی اُمور میں ہوتا ہے۔ نظام کائنات اور خود انفرادی زندگی میں ایک جزو ترکیبی کی حیثیت رکھتی ہی۔ ہر شخص جانتا ہی کہ صنعتی کاموں کے لیے فطری قوتوں پر قابو پانا، انھیں موڑنا، اور اپنے مقصد کے ماتحت لانا ضروری ہی پھر بھلا ہمیں یہ سمجھنے کی کیا وجہ ہی کہ زندگی کے نظام قدر یعنی جوہر اخلاق کی تعمیر بلا فاتحانہ قوت ارادی کے ممکن ہے جو ادنیٰ قوتوں کو مغلوب کرتی ہی تاکہ اعلیٰ قوتیں اُبھر سکیں۔

نوجوانوں کا تعلق سماج (سوسائٹی) سے

ہم سماج کو وسیع معنے میں ایک غیر معین نام سمجھتے ہیں۔ اس کا اطلاق اُس تعلق
اور ربط کی کل عارضی اور دائمی صورتوں پر ہو سکتا ہے جو افراد اور مافوق الافراد منشا رکھنے
والی جماعتیں ایکدوسرے سے رکھتی ہیں۔ جماعتوں میں باہم امتیاز کی بنا ہمیشہ یہی نہیں ہوتی
کہ اُن کے ارکان مختلف ہیں بلکہ اصل وجہ امتیاز ان ارکان کے احساس وابستگی کا مختلف ہونا
اور اُن قدور کا مختلف ہونا ہے جو جماعت کے مقاصد میں پائی جائیں۔

ہم سماج کو ایک خارجی تمدنی مظہر قرار دے سکتے ہیں جو مافوق الافراد ہے اور بعض اوقات
افراد کے بدل جانیکے باوجود باقی رہتا ہے (اجتماعیات کا نقطۂ نظر) مگر ہم اُسے اس کے
ارکان کے احساسات اور عمل کی نسبت سے بھی دیکھ سکتے ہیں (نفسیات اجتماعی کا نقطۂ نظر)
دوسری صورت میں سب سے اہم عنصر "احساس وابستگی" ہے جسکی بدولت فرد اپنے آپ کو ایک
حد تک ایک مستقل رکن سمجھتا ہے جو دوسروں سے تعامل رکھتا ہے اور ایک حد تک کل سماج کا نمائندہ
سمجھتا ہے۔ ذاتی احساس وابستگی کی بنیاد ایک طرف اُس قدر پر ہے جسے سماج حاصل کرنا
چاہتی ہے اور دوسری طرف اُن واقعی مقاصد پر جنمیں یہ قدر معنویت پیدا کرتی ہے۔
بعض سماجیں ایسی ہیں جو محض منفرد، زمان و مکاں کے لحاظ سے محدود اغراض کیلئے
قائم ہوئی ہیں اور جنکے ارکان کا باہمی ربط انہی منفرد اغراض پر مبنی ہے نہ کہ اخلاقی قدر
کے عقیدہ پر۔ ان کا نام ہم "اشتراک اغراض" قرار دیتے ہیں۔ مگر بعض سماجوں کی بنیاد
معنوی قدور کے اشتراک پر ہے اسلئے وہ اپنے ارکان کی ذاتی ترکیب قدور میں جز

پکڑ لیتی ہیں۔ اگر یہ اشتراک محض ایک قدر میں ہو تو ہم ایسی سماج کو "اشتراک قدر" کہتے ہیں لیکن اگر شخصی زندگی کے تمام قدور مشترک ہوں تو سماج "اتحاد ذات" کہلاتی ہے پھر بعض سماجوں میں احساس وابستگی جبلّی ہوتا ہے جو بلا شعوری "اتحاد ذات" "اتحاد قدر" بلکہ بلا اشتراک غرض کے بھی افراد کو جبلّی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہے۔ یہ وابستگی اکثر شعوری اشتراک کے لئے ایک فطری اساس کا کام دیتی ہے۔ اسمیں سب سے پہلے "اتحاد خون" کا شمار ہے۔ اسی ذیل میں جنسی کشش کے تعلقات بھی ہیں جو نوع انسانی میں اتحاد خون کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں فرد بہت سی سماجوں کا رُکن ہو سکتا ہے۔ اس لئے بحیثیت خارجی مظاہر کے یہ سماجیں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہیں۔ یا تو ان میں سے بعض وسیع ہوتی ہیں اور دوسری کو اپنے اندر شامل رکھتی ہیں یا اپنے مقاصد اور اثرات کے لحاظ سے کسی نقطہ پر ملتی ہیں اور اس ملنے کا اثر فرد کے اندرونی احساس وابستگی پر بھی پڑتا ہے۔

کسی سماج کی وحدت خارجی اور داخلی وابستگی پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کا اظہار نہ صرف اس احساس وابستگی سے ہوتا ہے جو سماج کے ارکان آپسمیں رکھتے ہیں بلکہ اکثر اُس اختلاف سے بھی جو وہ قدور اور اغراض میں باہر والوں سے رکھتے ہیں۔ خود سماج کے اندر جو احساس وابستگی ہوتا ہے اس کی بنا حکومت و اطاعت، رقابت و جنگ پر بھی ہوتی ہے اور جبلّت و سیرت اور قدر و مقصد کی یکجہتی پر بھی۔ یہاں ہم سماجی وابستگی کی چاروں سمتیں معین کر سکتے ہیں۔ ایک خط کے دونوں سروں پر اُنس اور نفرت ہیں اور دوسرے کے دونوں سروں پر آزادی اور غلامی۔ ہر سماجی تعلق اِن سمتوں کی نسبت سے ایک معین محل وقوع رکھتا ہے۔ اور چاروں سمتوں سے اُسے کوئی نہ کوئی واسطہ ہوتا ہے۔

ہم نے جو چار قسمیں سماج کی (اتحاد خون، اتحاد ذات، اشتراک قدر، اشتراک اغراض) قرار دی ہیں اُس میں آسانی بھی ہے اور موجودہ بحث میں فائدہ بھی ہے لیکن اگر کوئی چاہے تو بجائے اس تقسیم کے خالص منطقی اصُول پر ذیل کے نقطہ ہائے نظر سے تقسیم کر سکتا ہے۔

۱۔ اصل کے لحاظ سے فطری اور خلقی سماج (اُمّت، قبیلہ، خاندان) اور موضوع سماج (یعنی جسے انسان نے خود غور و فکر کی بنا پر اختیار کیا ہو) اگر پہلی قسم میں اس سماج کو بھی شامل کیا جائے جو بجائے اخلاقی قوانین کے اخلاقی جبلّت پر مبنی ہے تو دوستی اور محبت بھی خلقی سماج کہلائے گی گو اُسمیں اتحاد خون اور اتحاد نسل نہو۔

۲۔ منشار کے لحاظ سے وہ سماج جسمیں قدوروں اور اغراض کا کلی اشتراک ہو (جو ساری زندگی یا سارے تمدن پر حاوی ہو) اور وہ سماج جسمیں قدوروں اور اغراض کا جزوی اشتراک ہو پہلی قسم کی مثال خاندان یا ریاست ہے اور دوسری کی مثال علمی اکادمی یا آتش زدگی کے بیمہ کی انجمن ہے۔

۳۔ سماجی زندگی کی تنظیم کے لحاظ سے:۔ اسکے مختلف مدارج ہیں وہ سماج جو واجب التعمیل قوانین کے ماتحت ہو، وہ جو محض خود ساختہ قواعد کی پابند ہو اور وہ جسمیں اسقدر آزادی ہو کہ سوائے رواج اور دستور کے کسی طرح کی قید کا احساس نہو۔ ایسی سماج کو جو واجب التعمیل قوانین کے ماتحت ہو (مثلاً ریاست) کوئی شخص ترک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ ملک کو خیرباد نہ کہے۔ وہ سماج جو خود ساختہ قوانین کی پابند ہے (مثلاً کوئی انجمن) ترک کی اجازت دیتی ہے۔ بے ضابطہ سماج مثلاً دعوت کے جلسہ یا دوستی میں بظاہر کوئی قید ہی نہیں مگر اصل میں ان میں کم سے کم آپس کے برتاؤ کا ایک طریقہ اور دستور خود بخود بندھ جاتا ہے خواہ وہ الفاظ میں معین نہ ہوا ہو۔

۴۔ احساس وابستگی کی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے:۔ اتحاد ذات جو ساری شخصیت اور اخلاقی سیرت پر حاوی ہوتا ہے اور اشتراک اغراض جو محض جزوی اور عارضی اغراض پر مبنی ہوتا ہے۔

۵۔ مدت قیام کے لحاظ سے:۔ ایسی سماج جسکی عمر افراد کی عمر سے زیادہ ہوتی ہے جسکے ارکان بدلتے رہتے ہیں مگر وہ خود خارج میں موجود رہتی ہے۔ مثلاً ایک حلقہ احباب کا

قیام ان اشخاص کی زندگی پر منحصر ہے جنکے ملنے سے وہ بنا ہو۔ لیکن ایک امت یا ایک خاندان یا ایک تجارتی کمپنی عرصۂ دراز تک قائم رہتی ہے باوجودیکہ اُسکے پرانے ارکان مرتے جاتے ہیں اور نئے اشخاص اُنکی جگہ لیتے جاتے ہیں۔

سماجوں کے خارجی مقاصد اور اُن کے ارکان کے داخلی احساسات کی مختلف قسمیں جنھیں ہم نے یہاں عمل تجرید کے ذریعہ نمایاں کیا ہے اُس نوجوان کے لئے جو ان سماجوں میں داخل ہونا بلکہ ان کے قیام میں حصّہ لینا چاہتا ہے مخصوص ارتقائی ضروریات اور ارتقائی مشکلات پیدا کرتی ہیں۔

ہم آگے چل کر سماج کی اُن ترکیبوں سے جو واقعی موجود ہیں الگ الگ اور ترتیب کے ساتھ بحث کریں گے۔ ہم یہ دکھائیں گے کہ نوجوان سماجی اخلاق سے، قانون ملکی سے، سیاسی زندگی سے، پیشہ سے اور اقتصادی زندگی سے کس طرح تعلق پیدا کرتا ہے۔ لیکن بطور تمہید کے ہم کوشش کرتے ہیں کہ انسانوں کے مل کر رہنے کی اس شاخ در شاخ ترکیب کو بطور ایک کل کے سمجھیں اور نوجوان کی سماجی زندگی کے عمل بلوغ پر بحیثیت ارتقائے نفسی کے ایک کلی عمل کے نظر ڈالیں۔

فرض کیجئے کہ نوجوان زمانۂ حال کی بڑے شہروں کی سماج میں داخل ہونا، اسے نظری حیثیت سے سمجھنا، اور اُس سے تاثیر و تاثر کا سلسلہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ تلاطم خیز گرداب ہمارے تمدن کی شاخ در شاخ زندگی کا مرکز ہے۔ لیکن جس پہلو سے دیکھئے یہ طرز زندگی اُس داخلی ترکیب کے بالکل متضاد ہے جو ہمارا نوجوان ابتدا میں اپنے خاندان سے یا طفلانہ زندگی کے دائرہ سے ساتھ لاتا ہے۔

آئیے ہم سماج کی اُن قسموں پر جو ہم نے قرار دی ہیں اُلٹی ترتیب سے نظر ڈالیں یہ سماج پہلے سے بنی بنائی ارتقا کی نہایت پیچیدہ منزل میں موجود ہے۔ نوجوان اپنی مرضی سے اسمیں داخل نہیں ہوتا بلکہ ابتدا میں یہ مافوق الافراد زندگی اُسے نگل جاتی ہے

اور بہت دن کے بعد وہ اس قابل ہوتا ہی کہ بحیثیت ایک منفرد رکن کے اسمیں تخلیقی حیثیت سے حصّہ لے سکے اور اُسکا حامل بن سکے۔ پھر یہ کہ اس سماج کے بہت کم حصّوں میں ایک انسان کو دوسرے انسان سے تعلق ہوتا ہی بلکہ عام طور پر یہاں پورے انسان سے نہیں بلکہ اس کی شخصیت کے ایک خاص محدود پہلو سے واسطہ ہوتا ہی لیکن نوجوان کو بجائے کسی خاص مقصد کے لئے سرسری طور پر ملنے کے کلّی اتحاد ذات کی آرزو زیادہ ہوتی ہے۔ تیسرے بالغ افراد کی سماج ملکی قوانین سے لے کر سڑک پر چلنے کے قواعد اور نشست و آداب تک سرتاپا ضابطہ میں جکڑی ہوئی ہے۔ لیکن نوجوان ایسے باہر سے آنے والے ضوابط کا مخالف ہوتا ہے۔ وہ ہر طرح کی قیود سے بری ہونا اور نقل و حرکت کی آزادی چاہتا ہی اگرچہ اسپر بہت جلد یہ حقیقت کھلجاتی ہے کہ ضبط اور نظم کے بغیر خود اس کا کام نہیں چل سکتا۔ سماج نے تقسیم محنت اور مہارت خصوصی کے اصول کو انتہا کو پہونچا دیا ہی۔ وہ کہیں اسکی اجازت نہیں دیتی کہ انسان سالم زندگی بسر کرے جسکی ہمارے نوجوان کو (جو اپنے نفس کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرنے کی بہت کم صلاحیت رکھتا ہی) آرزو ہوتی ہے بلکہ ہر جگہ زندگی کے مکانکی اجزا سے سابقہ پڑتا ہی جنکی حامل بے شمار خارجی اغراض پر مبنی انجمنیں ہوتی ہیں اور وہ سب کی سب شخصی عنصر سے خالی ہوتی ہیں۔ پھر یہ کہ سماج کے اس پختگی کی منزل پر پہونچنے کے بعد اتحاد کی نامی اور خلقی صورتیں محض برائے نام باقی رہگئی ہیں۔ زیادہ تر مصنوعی طریقہ اجتماع سے کام لیا جاتا ہے جو انتہائی غور و فکر کے بعد عقلی اصول پر معین کیا جاتا ہے۔

غرض اُن انجمنوں کی ترکیب میں جو آجکل تمدن کی حامل ہیں اور نوجوان کے نفس میں جو ہنوز سادہ اور غیر منقسم ہی بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہی۔ لیکن اگر نوجوان کو تمدنی زندگی کے قابل بننا ہی تو اُسپر لازم ہی کہ کسی نہ کسی طرح اس گتھی کو سلجھائے۔ اس عمل ارتقا کی نوعیت کا انحصار اسپر ہوتا ہی کہ نوجوان ابتدا میں سماج کے کس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے

اصل میں یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اہل جرمنی کے مختلف طبقوں اور اُن کے نوجوانوں کی خصوصیات کا ذکر کریں کیونکہ ان سب مسائل پر بحث کرنیکے لئے موجودہ تاریخی دور کی خصوصیات کا لحاظ کرنا ناگزیر ہے۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہو گا کہ ہم مروجہ تاریخی تقسیم کی بنا پر نوجوانوں کی تقسیم منصبداروں، کسانوں، شہری شریفوں، اور مزدوروں میں کریں، اسمیں ایک تو یہی خرابی ہے کہ ہمارے زمانہ میں سماج کے طبقوں کی پُرانی تقسیم میں بہت بڑا تغیر ہو رہا ہے مثلاً آجکل شہروں کے متوسط طبقہ کی وہ حالت ہو رہی ہے جو کسی زمانہ میں مزدوروں کی تھی اور ملازمان سرکار اور افسران فوج حکومت کے ساتھ وہ مخالفانہ رویہ رکھتے ہیں جو پہلے ادنی طبقہ کے حوصلہ مند لوگ رکھتے تھے۔ اس غیر معینہ حالت میں مستقل مثالیں قائم کرنیکے لئے ہم علم الاجتماع کے عام نقطۂ نظر سے کام لیتے ہیں جو پُرانی تاریخی تقسیم سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ ایسی تفریق کرتا ہے جس سے ہر طبقہ متاثر ہو۔

نفسیات ارتقا کی رو سے یہ نہایت اہم سوال ہے کہ نوجوان سن بلوغ میں قدم رکھتے وقت بدستور اپنے پُرانے سماجی طبقہ میں رہتا ہے یا اسکی حالت میں ایسا تغیر ہوتا ہے جسے سچ مچ "زندگی کا آغاز" کہہ سکتے ہیں۔ بعض چودہ برس کے بعد بھی اپنے خاندان ہی کی فضا میں رہتے ہیں اور وہاں سے مدرسہ جایا کرتے ہیں جو خود ایک تعلیمی سماج ہے۔ لیکن بعض اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی اوقات اور قوتوں کا مرکز اپنے پیشہ کو یا اپنے کارخانہ کو بنائیں دونوں پر زمانۂ بلوغ میں سخت نفسی مصائب گذرتے ہیں جنکا تعلق احساس وابستگی سے ہوتا ہے (اگر سماج کے مقاصد یا قدر سے ہوناضروری نہیں) لیکن دونوں کے یہاں مصیبت کی نوعیت مختلف ہے۔ اول الذکر پر تو یہ مصیبت ہے کہ وہ گھر میں قید ہیں اور آزادی کے لئے تڑپتے ہیں اور آخر الذکر پر یہ مصیبت ہی کہ اُن سے گھر چھُٹ گیا ہے۔

آئندہ بحث میں ہمیں یہ تفریق عموماً مدنظر رکھنا چاہئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس معاملہ میں عمر کے فرق سے صورتِ حال مختلف ہو جاتی ہے۔ ۱۷ برس کی عمر میں

زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۴ سے ۱۷ برس تک کی عمر میں نوجوانوں کی سماجی زندگی کی ترکیب اور ہوتی ہے اور ۱۷ سے ۲۱ برس تک کچھ اور۔ اس فرق کی ماہئیت کو اختصار سے بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ خصوصاً اسلئے کہ یہاں بھی تحریک شباب نے قدیم معینہ تقسیم میں بہت کچھ تغیر کر دیا ہے۔ مگر ۱۷ برس کی عمر کی حد خود تحریک شباب میں بھی اہمیت رکھتی ہے۔ کم عمر والوں کا باوجود خواہش آزادی کے ابتک یہ رجحان ہوتا ہے کہ بڑوں کی تقلید اور مقررہ قواعد کی پابندی کریں۔ اور زیادہ عمر والے (خواہ وہ طالب علم ہوں یا "سیلانی پرندے" یا بے سیکھے مزدور) قریب قریب ہمیشہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ انھیں قواعد خود بنانے اور انھیں اپنی طبیعت کے رنگ کے مطابق تشکیل دینے کا حق دیا جائے۔

مگر ایک جبلت ایسی ہے جسے مرکز قرار دے کر ہم اس عمر کے سماجی تعلقات اور نزاعات کا بہترین اندازہ کر سکتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو "منوانے"[1] کی خواہش ہے اس لئے ہم اسکی روشنی میں ان مظاہر کو دیکھیں گے۔ نوجوانی کے زمانہ میں حاکمی اور محکومی کے تعلقات بہ مقابلہ اشتراک عمل اور مساوات کے تعلقات کے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں کیونکہ آخرالذکر تو بلا کسی دقت کے گویا خود بخود قائم ہو جاتے ہیں۔ اسکے بعد ہم نئی سماجوں میں داخل ہونیکی مشکلوں اور مصیبتوں پر نظر ڈالیں گے اور آخر میں تحریک شباب بحیثیت زمانۂ بلوغ کے ایک سماجی مظہر کے بحث کرینگے۔ اپنے آپکو منوانے کی خواہش اُسی طرح ایک مستقل جبلت ہے جیسے بقائے نفس کی خواہش۔ مگر عمل میں یہ نفسی اجتماعی مظہر اچھی سے اچھی اور بُری سے بُری صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔

اصل میں اس منوانے کی خواہش میں ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والی نفسی کیفیات کی ایک پوری گتھی ہوتی ہے جسکی کافی تحلیل نفسیات نے ابھی تک نہیں کی ہے۔ ہم ان کا

[1] منوانے کی خواہش جرمن لفظ Geltenwollen کا ترجمہ ہے اس سے مراد ہے اپنی قدر و منزلت کو دوسروں سے تسلیم کرانا ۱۲

مجموعی نام اثبات خودی کی جبلتیں قرار دیتے ہیں۔ اسمیں حسب ذیل عناصر ہوتے ہیں اور بچپن ہی سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ خود رائی مانے جانے کی خواہش، اپنے طبقہ کی عزت کا خیال، دوسروں پر حکومت اور اثر حاصل کرنے کی جبلت، جنگ و جدل کا رجحان اور بہترین صورت میں ضبط نفس کی قوت اور اجتماعی حدود کے اندر اپنا وقار قائم رکھنے کی آرزو، ظاہر ہے کہ نوجوان میں جنکی بابتہ ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ اب پہلی بار اپنے نفس میں ایک جداگانہ دنیا دیکھتا ہی اور اس پر غور کرتا ہی۔ یہ کیفیات دفعتہً بے ترتیبی کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہیں جیسے کسی پہاڑی ندی کا پانی بلندی سے گر کر منتشر ہو جاتا ہی۔ جو شخص کہ اسطرح پر اپنے نفس میں محو ہی اسکا دل قدرتی طور پر ایثار اور خدمت کے جذبات سے متاثر ہونے سے پہلے اپنے ولولۂ حیات کے لئے میدان تلاش کریگا۔ نوجوان کی اپنے آپکو منوانے کی خواہش بہت سی علامتوں سے ظاہر ہوتی ہے پہلے تو وہ اپنی ظاہری وضع و لباس ہی سے اثر ڈالنا چاہتا ہے"۔ وہ جانتا ہی کہ لوگوں کی نظریں اُسپر پڑتی ہیں اور وہ چاہتا بھی یہی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنیکے طریقے مختلف افراد میں اور مختلف سماجوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ یا تو ہمارا نوجوان اپنے کپڑوں پر خاص توجہ کرتا ہی اور ہمیشہ سب سے نئے فیشن کے مطابق ایسی پوشاک پہنتا ہی جسپر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہو بلکہ انگلیاں اُٹھیں۔ یا وہ دوسری راہ اختیار کرتا ہی یعنی اپنی ظاہری وضع کی طرف سے بے پروائی اختیار کرتا ہی اور ایسا انداز رکھتا ہی جس سے شاعرانہ وحشت ٹپکتی ہو۔ مثلاً بہت سے "سیلانی پرندے" خاص کر کے خانہ بدوشوں کی وضع اور گھونگھر والے بال رکھتے ہیں اور عجیب طرح کی ہونق شکل بنا لیتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی حیثیت سے ان میں اور ترشے ترشائے چھیلا میں کوئی فرق نہیں۔

عورتوں میں اسقدر بد مذاقی بہت کم نظر آتی ہے۔ مگر وہ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ایسے سلیقہ سے کام لیتی ہیں کہ سب کی نظر ان پر پڑے۔ یا تو وہ نہایت اہتمام سے فیشن کی پابندی کرتی ہیں (جو اب ان کی زندگی کا ایک بہت اہم جز ہو جاتا ہی) یا مروجہ فیشن سے

اس دانشمندی کے ساتھ انحراف کرتی ہیں کہ وہی بات حاصل ہو جاتی ہے۔

یہ بات کل طبقوں کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ شمالی یورپ کے کسانوں کے لڑکے اپنے خاص انداز میں اُسی خود نمائی سے کام لیتے ہیں جس سے کسی شہر کے اسکول کے لڑکے یا نیم برہنہ کھلاڑی۔ لباس یا (بے لباسی) کے علاوہ اور علامتیں بھی ہیں جن سے اس بات کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ہم بھی مردوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ مثلاً زور سے تھوکنا بہت ہی مؤثر طریقہ ہے کیونکہ اسمیں لوگوں کی تحقیر بھی پائی جاتی ہے، رعب جمانا، گالیاں دینا، شراب اور سگرٹ وغیرہ پینا مردانہ صفتیں سمجھی جاتی ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ باتیں زمانہ کے تغیر کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ آجکل تحریک شباب ایک حد تک ان علامتوں کی مخالف ہے، مگر اُسنے انکے بجائے دوسری چیزیں اختیار کی ہیں جو محض دل خوش کرنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ لوگوں کو مقابلہ کی دعوت دیتی ہیں اور انھیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ بہر صورت یہ تحریک ازراہِ انکسار گوشہ گیری نہیں اختیار کرتی بلکہ تن کر چلتی ہے اور دیکھتی ہے کہ لوگوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔

نوجوان لڑکیاں چاہتی ہیں کہ لوگ اُنھیں پسند کریں اور ان پر سب کی نظریں پڑیں، اُن کی طاقت اور حکومت کی جبلت یہی صورت اختیار کرتی ہے۔ وہ اس راہ پر خاموشی اور سبک روی سے قدم اُٹھاتی ہیں۔ لیکن منزل کی طرف سے غافل وہ بھی نہیں ہوتیں اپنے آپ کو "دلچسپ" بنانے یا جیسا برلن والے کہتے ہیں "خوشنما بنانے" کے بہت سے طریقے ہیں۔ کشیدگی اور خاموشی، چھوٹی جماعتوں میں سب سے آگے رہنا، دل کھول کر قہقہے لگانا مرصع تقریر کرنا، بلکہ تتلا کر بولنا، ڈگمگا کر چلنا، بات بات میں شوخی دکھانا، بلا وجہ روٹھ جانا،

ہمارے کانوں کو سب سے زیادہ نوجوان لڑکوں کی شیخیاں سُننا پڑتی ہیں۔ ہما
چلتے زیادہ سنتا ہے کہ یہ لوگ درشت لہجہ میں بڑھ بڑھ کے باتیں بنا رہے ہیں جن سے

ایسی خود اعتمادی کا اظہار ہوتا ہے کہ سننے والا ڈر جائے۔ لیکن یہ خوش نصیب لوگ ان چیزوں میں کسقدر اناڑی ہوتے ہیں! باتیں کرتے وقت وہ کیسی گھبراہٹ کے ساتھ دوسروں کو دیکھتے جاتے ہیں۔ آجکل سب سے زیادہ کھیلوں کا ذکر مہارت فن کے انداز سے کیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ اُستادوں سے بے نتیجہ لڑائیوں، ادبی مسئلوں اور ذاتی کارگذاریوں اور ارادوں کا چرچا رہتا ہے۔ سب سے زیادہ اپنی عیاشیوں کے متعلق شیخی بگھاری جاتی ہے تاکہ لوگ محض زاہد خشک نہ سمجھ لیں، دوسری جنس کی واقعی یا فرضی تسخیر کے قصے بیان کئے جاتے ہیں اور ان سب تقریروں کی ابتدا "میں" سے ہوتی ہے۔

ان کے لئے بڑی مصیبت ہوتی ہے جب وہ ایسے ماحول میں پہونچتے ہیں جہاں لوگ واقعی کچھ ہوتے ہیں اور سچ مچ کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں یا ایسے ماحول میں جہاں (اُنکے ہم عمر) چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُن سے زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔ گاڈ فرڈ کیلر نے Der grüne Heinrich) میں اس قسم کے ایک مثالی[1] موقع کا ذکر کیا ہے۔ ہنری اپنے گاؤں میں واپس آتا ہے جہاں اُسکے پچھلی بار آنے کے بعد سب لڑکے لڑکیاں بہار شباب کی منزل میں داخل ہو چکے ہیں انہیں بس عشق و محبت کی گفتگو ہے اور یہی چیز خیال میں بسی ہوئی ہے۔ ایک لڑکی انیا فرانسیسی سویزرلینڈ سے خوب چٹاخ پٹاخ گفتگو کرنا سیکھ کر آئی ہے۔ اور اس سے بیچارے ہنری کو اپنے چچا کے دسترخوان پر طرح طرح سے شکست کھانا پڑتی ہے۔ خصوصًا فرانسیسی بولنے میں جسمیں سادگی اور ایمانداری کے سبب سے اُسکا ٹٹو نہیں چلتا حالانکہ اُسکی دلی آرزو ہے کہ اسمیں وہ پیچھے نہ رہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اُسکی انسانیت کی قدر مجروح ہو رہی ہے اسلئے کبھی تو وہ جارحانہ اقدام کرتا ہے اور کبھی پسپا ہوتا ہے اور روٹھ کر بیٹھ رہتا ہے۔ لیکن نیکدل لڑکیاں اُسکی تنہائی اور بیکسی نہیں دیکھ سکتیں اور اُسے واپس بلا لیا کرتی ہیں۔

"چونکہ مجھے زک اور شرمندگی اُٹھانا پڑا تھا اسلئے وہ مناسب سمجھتی تھیں کہ مہربانی کا برتاؤ

[1] مثالی (Typical) کا ترجمہ ... [illegible]

کر کے مجھے اس حالت سے نجات دیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ میں عہدِ شباب کی رسم کے مطابق خود سے اُن کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس عمر میں رُو ٹھنے کی ایک آن ہوتی ہے۔ اور اسکے لئے ایک خاص قانون کی پابندی کرنا پڑتی ہے"۔

ہم ان سب جزوی خصوصیات کو ایک ہی بنیادی کیفیت کے مظاہر سمجھ سکتے ہیں نوجوان اب اس پر کسی طرح راضی نہیں کہ بچّہ بنا رہے۔ اور لوگ اُس سے اسطرح خطاب کریں اور ایسا برتاؤ کریں جیسا بچوں سے کرتے ہیں۔ یہ غرور اکثر بچپن ہی میں ظاہر ہوتا ہے خصوصًا ایسے طبقوں میں جہاں لوگوں سے ملنے جلنے میں فیشن کے ماتحت بہت اہتمام اور مبالغہ کیا جاتا ہے۔ اسلئے بچوں کو اس محبت سے محروم رکھے جانے کا خاص طور پر احساس ہوتا ہے۔

وائنا کی وہ لڑکی جسکے روزنامچہ میں سے ہم نے متعدد مقامات نقل کئے ہیں، گیارہ ہی برس کی عمر میں اس بات پر خفا ہے کہ اُسکی بہن اُسے بچہ کہتی ہے۔ لیکن اس طرح کا احساس کسی نہ کسی حد تک سادہ زندگی بسر کرنے والے خاندانوں کے بچوں میں بھی ہوتا ہے۔ آرنسٹ لاؤ لکھتا ہے کہ برلن میں غریبوں کی لڑکیاں جو "تعلیم مزید کے مدرسوں" میں پڑھتی ہیں، اپنے اسکول کے زمانہ کو زیادہ پسند کرتی ہیں بہ نسبت اس زمانہ کے جو سترہ اور بیس برس کی عمر کے درمیان گذرتا ہے۔ اصل میں سترہؔ برس سے کم کی لڑکیوں کی نظر میں بیس برس کے بعد کی عمر کوئی خاص دلکشی نہیں رکھتی۔ پھر بھی سترہ برس والیوں کو سب سے زیادہ اس پر اصرار ہوتا ہے کہ لوگ اُنھیں "مس" کہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ سترہؔ برس کی عمر میں لڑکی "مس" ہو جاتی ہے۔ اور اٹھارہ برس کی عمر میں "نوجوان خاتون" ایک ۱۶ برس کی عمر کی لڑکی "مس" کی تعریف یوں کرتی ہے۔ "جو ہال میں، ناچ میں، اور کاروبار کے لئے جاتی ہو"۔ دیکھئے یہی مغرورانہ خواب یہ لڑکیاں دیکھتی ہیں۔ میں اس بات کو سمجھتا ہوں! اس عمر میں لوگ بچہ کہے جانے سے اسی لئے اتنا

خفا ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ میں بچپن محسوس کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ابھی انھیں پورا انسان بننے کے لئے بہت دن چاہئیں تاہم بیچ میں ایسے دن بھی آتے ہیں اور عرصہ تک رہتے ہیں جب یہ نوجوان بچپن کی یاد میں رہا کرتے ہیں اور ابھی سے اس فردوس گمشدہ کا ماتم کرنے لگتے ہیں اسی لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ بچہ بن کر نہیں رہنا چاہتے کیونکہ یہ کہنا کہ وہ جوان بننا چاہتے ہیں کچھ ضروری نہیں کہ ہمیشہ صحیح ہو۔ آج کل کی تحریک شباب میں اس مقصد کی بالکل تائید نہیں کیجاتی بلکہ ایک حد تک اسمیں خاص کرکے دیر کیجاتی ہے۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اسمیں ایک حد تک نامردی، نکماپن، بچپنا، اور بدویت پائی جاتی ہے۔ لیکن جن لوگوں میں اس طرز زندگی کے محرک بہتر مقاصد ہیں وہ جس حال میں ہیں اُسی میں رہنا چاہتے ہیں یعنی عہد شباب کی برکتوں اور زحمتوں، اُبلتی ہوئی قوت کے احساس اور مسرت بخش لاابالی پن کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہتے۔

اس زمانہ میں ان کے پاس تخیل کی مستی کا وہ سرمایہ اور وہ قوت ہوتی ہے جو بلوغ کے بعد کی ہوشیاری سے کہیں زیادہ قابل قدر معلوم ہوتی ہے انہیں سے اکثر اپنے تخیل کی مدد سے (خواہ اپنے کو نوجوان سمجھ کر یا پختہ عمر سمجھ کر) کوئی نرالی شان اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ڈرامے، ناولوں، اور بائسکوپ سے اس خواہش کو نت نئی غذا ملا کرتی ہے۔ اس عمر میں ہر تندرست نوجوان کے دلمیں سورماؤں کے عہد کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یعنی اسکی رگ و پے میں سورماؤں کا احساس زندگی خون بن کر دوڑتا ہے اور نوجوان لڑکیاں بھی اپنے مخصوص انداز میں یہ رنگ رکھتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ رومانی انداز میں محبت کریں اور اُن سے سُورماؤں کی طرح محبت کی جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ اعلیٰ خیالات میں شریک ہوں اور مردوں کو اپنا شیدا بنا کر فتح کے شادیانے بجائیں۔ ہمارے زمانہ میں یہ سورماپن طرح طرح کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسکی ایک صورت یہ ہے کہ نوجوان آرزوؤں کے خواب دیکھا کرتے ہیں

اکتفا کرتے ہیں کہ عالم خیال میں اعلیٰ درجہ کے موجد یا دریافت کنندہ، یا ماہر سیاست کی زندگی بسر کریں لیکن ہر شخص کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی طبیعت کی مناسبت سے کسی نہ کسی طرح اپنی بڑائی ظاہر کرے۔ یہ پرامیتھیس کا سا جذبہ اکثر جسارت اور گستاخی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہودی نوجوانوں میں یہ جذبہ قومی جذبۂ نفی کے ساتھ ملا جلا ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال لاسال کا روزنامچہ ہے جو لائپزگ کے ایک تجارتی مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ اسکے مقابلے میں لڑکیوں کے جذبات ظاہر کرنے کے لئے ہم ایک اٹھارہ سال کی ذہین یہودی لڑکی کے چند شعر نقل کرتے ہیں۔

"مجھ سے خفا نہو۔ خدا کے لئے مجھ سے اس بات پر خفا نہ ہو"
"کہ میرا خواب وہ نہیں ہے جو تمہارا خواب ہے"
"اور میں نے معمولی عورتوں کی طرح"
"شادی کو انتہائی مسرّت کا سرمایہ نہیں سمجھا"
"سچ بتاؤ کہ تم پر میرے دل کا حال کیسے کھل سکتا ہے"
"جب کہ تم شاعر نہیں ہو ---------"
"بھلا تمہیں میرے خیالات کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے"
"جبکہ تم نے کبھی یاس و حرماں کا مزہ نہیں چکھا"

لیکن نوجوان کی واقعی حالت کو اس خود پسندانہ بلند پروازی سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ اصل میں وہ ابھی تک کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر اُسے انتہائی آزادی ملتی تب بھی وہ کچھ نہ ہوتا۔ اسکی تخلیقی قوت ایک آرزو ایک تمہید سے زیادہ نہیں اسکا ارادہ ابھی مستحکم نہیں۔ اسکی رائے صائب نہیں اسکے جذبات ہموار نہیں۔ وہ دنیا کے سفر کا خواب دیکھتا ہے مگر جب اُسے اپنے شہر کے باہر ملازمت ملتی ہے تو تین ہی مہینہ میں مایوس ہو کر واپس آجاتا ہے۔

جب وہ آنکھ کھول کر اپنی ہستی کو دیکھتا ہے۔

ایسی حالت میں اُس کا رُجحان یہ ہوتا ہے کہ اپنی ناکامی کا باعث اُس ماحول کو قرار دے جسمیں اُسنے ابتک نشو و نما پائی ہے۔ وہ اندر ہی اندر اس ماحول سے قطع تعلق کرنے لگتا ہی۔ اُسکے دلمیں اپنے والدین کی طرف سے کدورت پیدا ہو جاتی ہے خصوصًا باپ کی طرف سے جس کا وہ مالی اعتبار سے دست نگر ہوتا ہی اور جو بیخبری میں اُسکے ساتھ وہی برتاؤ کئے چلا جاتا ہی جو بچوں کے ساتھ ہوتا ہی۔ اگر لڑکا اُسے ابتک کمال بینی کی نظر سے دیکھتا رہا ہو اور تمام اعلیٰ انسانی صفات کا مجموعہ سمجھتا رہا ہو تو اب اُس کی واقعی حالت کے کھل جانے سے مخالفت اور نفی اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ اُسے اب معلوم ہو جاتا ہے کہ اسکے اس دنیا میں آنے کا باعث کون ہی۔ زندگی بار گراں گذار ہوتا تو درکنار آجکل کے نوجوانوں کے دلمیں باپ کی طرف سے یہ شکایت ہوتی ہے" یہ تمہارا ہی قصور ہو کہ میں پیدا ہوا"۔ اس عمر میں نوجوان کے دلمیں نہ صرف حقوق انسانی کا شخصی احساس پیدا ہوتا ہو بلکہ" فرد اور اُسکے مخصوص انفرادی حقوق" کا بھی۔ مگر حکومت اور قوت ساری باپ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہی کھیت (یا دوکان) کا مالک ہوتا ہی، وہی ہر کام کے لئے روپیہ دیتا ہے۔ وہی گھر کے سارے طور طریقے معین کرتا ہو (یہ چھوٹی باتیں اکثر سبے زیادہ کھٹکتی ہیں) نوجوان کو کوئی پیشہ اختیار کرتے وقت اسکی اجازت درکار ہو عشق و محبت کے معاملات بھی اسکا دخل ہے اور افسوس ہو کہ وہ ان چیزوں کو ایسے پیمانے سے ناپتا ہے جسکے سمجھنے سے نوجوان قاصر ہے۔ مختصر یہ ہے کہ دل ہی دل میں عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ محض زبردستی ہے کہ لوگ ان باتوں کا سبب اُس مفروضہ شہوانی تعلق کو جو بچہ ماں سے رکھتا ہے اور اُس پوشیدہ رقابت کو جو اُسے باپ سے ہوتی ہے قرار دیتے ہیں اسکے اصلی محرکات صاف ظاہر ہیں۔ ہر نوجوان ان پر خود اپنے دل میں غور کر سکتا ہے۔ اُسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک مظلوم ہے ایسے ماحول میں جہاں دوسرے اُسے

نہیں سمجھتے اور وہ دوسروں کو نہیں سمجھتا۔ یہ وہ موقع ہے کہ نوجوان جو بیجا اور بے جا مطالبے بڑوں سے کرتے ہیں اُنمیں انھیں پہلے پہل نہایت تلخ مایوسی ہورہی ہو۔
یہ کشمکش ہمیشہ اسقدر شدید نہیں ہوتی۔ جن خاندانوں میں آپس کے تعلقات اچھے اور معنویت پر مبنی ہوتے ہیں وہاں لڑکا اکثر ان چیزوں کو شکر گزاری کے ساتھ قبول کرتا ہے جو اُسے اپنے باپ کی مخصوص سیرت کی بدولت ملتی ہیں بعض صورتوں میں وہ اُسے چپ چاپ اپنی زندگی کے لئے نمونہ بناتا ہو لیکن مجھے اسمیں شبہ ہو کہ ابتداہی سے معاملہ کا یوں صلح و آشتی سے طے ہوجانا کوئی اچھی علامت ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہو کہ لڑکے میں استقلال اور بوجھ کی کمی ہے۔ یہ واقعہ ہو کہ وہ لڑکے جو بغیر کسی کشمکش کے آنکھ بند کرکے اپنے باپ کے قدم بقدم چلتے ہیں وہ شاذونادر ہی اوسط درجے سے آگے بڑھتے ہیں۔ عالموں کے لڑکے جو بلاسوچے سمجھے خود بھی عالم بن جاتے ہیں اُنمیں حقیقی زندگی کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ تاجر جو اپنے باپ کے کاروبار کو سیکھتا ہو اور پھر اُسے ورثہ میں پاتا ہو اگر اُسے تھوڑی بہت ترقی بھی دے تو زبان خلق کہتی ہے اور بجا کہتی ہے کہ وہ تو بچھے بچھائے بستر پر سوتا ہو۔ اگر باپ سے کشیدگی ہو تو جتنی یہ کشیدگی بڑھتی جائیگی اتنا ہی اُسطرف میلان ہوگا کہ ماں سے جو قریبی تعلق ہے وہ بدستور باقی رہے۔ اور باپ سے قطع تعلق کی کوشش میں بھی عجیب متضاد نفسی کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ ارتقائے نفسی کی ایک منزل ہو۔ قلب کی خاموش گہرائی میں وہ کشش موجود ہو جو کبھی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیتی۔ اس محبت آمیز نفرت کی دردناک تصویر اگر دیکھنا ہو تو اسٹرندبرگ کی کتاب "مُردوں کا ناچ" اور گیرارٹ ہاؤپٹمان کی "دشمن کی دعوت" پڑھنا چاہئے۔ اگر مغائرت مستقل صورت بھی اختیار کرلے تب بھی اُس بیزاری کے مقابلے میں جو بیٹے کو باپ سے ہوتی ہے تھوڑی سی محبت کی گرمی باقی رہتی ہے جسے کوئی چیز مٹا نہیں سکتی۔ یہی کیفیت اُس لامذہب کی ہوتی ہو جو خدائے حی وقائم سے سرکشی کرتا ہو اگر ایسا نہ ہوتا تو لامذہبی بجائے ایک ثبوتی عقیدہ ایک مذہب بن جانیکے محض ایک روکھی پھیکی نفسی کیفیت ہوتی۔

جو باپ اِن ارتقائی ضروریات کو سمجھتا ہے (بہتوں کو تو ان کا سان گمان بھی نہیں ہوتا)، وہ خود بخود اس نازک زمانہ میں مداخلت کم کر دیتا ہے کیونکہ سچ پوچھئے تو نوجوان کا کسی دوسرے کی مدد سے کام بھی نہیں چلسکتا۔ ورنہ بنی نوع انسان پشتہا پشت کے مجموعی تجربے سے کسقدر دانشمند اور عاقبت اندیش ہو گئے ہوتے! بہترین صورت یہ ہے کہ انسان نوجوان سے کہدے۔ "جا بھائی تو خود غلطیاں کر اور خود اُنھیں بھگت میں اُسوقت تک دخل نہ دوں گا جبتک تجھے تیرے ہاتھوں سے بچانے کی شدید ضرورت نہوگی"۔ اس عمر میں وہ منزل شروع ہو جاتی ہے جب تعلیم بظاہر مخفی اور منفی ہوتی ہے اسکا بہترین اثر اسوقت ہوتا ہے جب معلم نوجوان پر صاف صاف ظاہر کردے۔ "میں ہمیشہ تیرے لئے موجود ہوں تو جب چاہے مجھے بلالے"۔

ماں بیٹی کا تعلق اس سے کسی قدر مختلف صورت اختیار کرتا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ یہاں بھی وہ کشیدگی پیدا ہوتی ہے جو ارتقا کے لئے ضروری ہے۔ یہ کبھی اس شکل میں بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ماں یہ دیکھ دیکھ کر کڑھتی ہے کہ بیٹی جوان ہو کر بحیثیت عورت کے اسکی حریف بن رہی ہے۔ لیکن عام طور پر یہ جلن فوراً اس خوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ خود اُسکی جوانی اُسکی بیٹی میں لوٹ آئی ہے۔ اسکے علاوہ دونوں کا اُن تکالیف میں ایک دوسرے کا شریک ہونا جو عورتوں کے لئے مخصوص ہوتی ہیں، لڑکی کی بیکسی اور تمام جسمانی اور نفسی امور میں اپنی ماں کا محتاج ہونا اور دونوں کا مردوں کے خلاف اتحاد (جو محبت اور ایثار پر مبنی ہے) ایسی چیزیں ہیں کہ جو اُن کے آپس کے رشتے کو اور قوی کر دیتی ہیں اسلئے تعلقات میں جب کشیدگی ہوتی ہے تو زیادہ دن نہیں رہتی۔ جوں جوں لڑکی عورت بنتی جاتی ہے اسمیں اور ماں میں اتحاد بڑھتا جاتا ہے اسکی بھی ایک عمدہ مثال وائنا والے روزنامچہ میں ملتی ہے۔ بہت دن تک دونوں بہنیں ماں سے آزردہ اور بیزار رہتی ہیں لیکن کچھ دن کے بعد چھوٹی دیکھتی ہے کہ بڑی بہن ٹوٹ جاتی ہے اور ایک سفر میں ماں سے گہری دوستی کر لیتی ہے۔ اسنے اب یہ سیکھ لیا ہے کہ وہی باتیں جنکی بابتہ وہ "ابتدا" میں کہا کرتی تھی کہ میں قیامت تک ماں کو نہیں بتا سکتی، اب اُس سے

لھدیا کرتی ہے۔

والدین اور بچوں کی باہمی کشیدگی کا ایک اور پہلو ہے جسکی بنیاد قوموں کی عام ذہنی زندگی کے قوانین پر ہے۔ نئی نسل اور پرانی نسل میں جو تضاد ہوتا ہے وہ محض عمر اور احساس زندگی کے اعتبار سے نہیں ہوتا بلکہ نئی نسل کی ذہنیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ زندگی کی جو منظم اور معین صورت انھیں ملتی ہے اُسکے ایک بہت بڑے حصہ کو وہ ایک معمولی چیز سمجھکر بغیر کسی شکریہ کے قبول کر لیتے ہیں اُن کے احساس میں نمایاں وہ پہلو ہوتے ہیں جنمیں کوئی کمی ہے، داخلی اور خارجی زندگی کے وہ مقامات جو ناقص اور نامکمل رہ گئے ہیں۔

جو چیزیں ابتک پیدا نہیں ہوئی ہیں وہ عالم وجود میں آنیکا مطالبہ کرتی ہیں۔ چنانچہ نئی اور پرانی نسلوں میں اختلاف کی تحریک اسطرح پیدا ہوتی ہے کہ نوجوانوں کا دل اس زندگی کی طرف کھینچتا ہے جو ابھی بسر نہیں ہوئی ہے۔ نوجوان ہر عہد میں کل انسانی قوتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں جنھیں عمل اور احساس کی آرزو بیچین رکھتی ہے۔ ان قوتوں کے لیئے پرانی زندگی کے جس پہلو میں میدان عمل نہیں ملتا اُسی پہلو کی طرف زندگی کا دھارا اور بھی شدت کے ساتھ بہتا ہے۔ اسی لیئے پادریوں کے بیٹے فوج کے افسر اور فوجی افسروں کے بیٹے پادری بنتے ہیں۔ اسی لیئے عقلیت کے دور کے بعد رومانی دور آتا ہے اور تاریخ پرستی کے عہد کے بعد تاریخ کی مخالفت کا عہد۔ اسکے بعد جب زندگی پختہ ہو جاتی ہے تو ترکیب کا زمانہ آتا ہے۔ ہیگل کا اصول ارتقا محض خیالات یا معانی کا طلسم نہیں بلکہ زندگی کی حرکت کی تصویر ہے۔ یہ قدریں زندگی ہیں جو یہاں آپس میں لڑتی ہیں تاکہ آگے چل کر ایک بلند تر سطح پر مل جائیں۔

اس لڑائی میں ابتدا میں ظاہری فتح پرانی نسل کو ہوا کرتی ہے کیونکہ واقعی طاقت اُسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اسکی رائے بھی واقعی زندگی میں آزمائی اور پرکھی ہوئی ہوتی ہے نوجوان کو ایک بلند تر زندگی کا احساس اُبھارے رہتا ہے لیکن اپنے پرانے یا نئے ماحول کے کسی حصہ میں بھی وہ مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ گھر میں وہ "بچہ" کہلاتا ہے۔ مدرسہ میں "لڑکا" "کارخانہ

"نو سکھیا" اور سماج میں "صاحبزادہ" یا "بے وقوف چھوکرا"۔ اسلئے کوئی تعجب نہیں کہ وہ اُس راہ کو اختیار کرتا ہی جسمیں سب سے کم مزاحمت ہو۔ ہر شخص کسی نہ کسی میدان میں اپنے آپ کو منوانا چاہتا ہی اگر مدرسہ کی عام تعلیم میں لڑکا امتیاز حاصل نہ کر سکے تو وہ جسمانی ورزش یا ڈرائنگ میں خاص مستعدی اور توجہ دکھاتا ہی۔ اور لڑکی دستکاری میں۔ اگر نوجوان معمولی سماج میں اپنے آپکو نہیں منوا سکتا تو وہ آوارہ گردوں اور منچلوں کی صحبت اختیار کرتا ہی۔ اس میدان میں وہ اپنے کمالات دکھاتا ہی یا کم سے کم وہ کلفت آمیز احساس قوت حاصل کرتا ہی جو ایک "منکر" میں ہوتا ہی۔ گنڈے پن کی زندگی بنفسہٖ بری محرکات کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ اسکی اصل ایک طرح کی رومانی کیفیت ہی اور یہ اس بات کی دلیل ہی کہ نوجوان جس طرز زندگی کے لئے موزوں ہے اسکی ہماری موجودہ سماج میں گنجائش نہیں۔ اگر کوئی نوجوانوں کی آوارگی کے ثبوتی پہلو کو سمجھ لے تو اُنھیں راہِ راست پر لگا سکتا ہی۔ اُنھیں اوّل تو یہ احساس چاہئے کہ وہ زندگی کے کسی شعبے کے لئے ضروری ہیں اور اُن کی عزت کیجاتی ہے اور دوسرے کسی قدر تخیل کی رنگ آمیزی اور ظاہری شان۔ گذشتہ چند سالوں کے تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہی کہ پہلی بات تو اسطرح حاصل ہو سکتی ہی کہ وحشی نوجوانوں کے سپرد کوئی عمدہ کوئی بھروسہ اور ذمہ داری کا کام کردیا جائے اور دوسری بات اسطرح کہ انھیں ہماری "کیف و مستی" سے خالی کاروباری زندگی کے پہلو بہ پہلو زیادہ آزاد زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس سے جو تعلیمی نتائج حاصل ہوئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہی کہ ہم نے جو نفسیاتی محرکات قرار دی ہیں وہ صحیح ہیں۔

اس سے بھی زیادہ عام الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر شخص کی سیرت میں کوئی نہ کوئی ثبوتی پہلو ہوتا ہی۔ اگر اس پہلو کو نشو و نما کا موقع نہیں ملتا تو جبلت قوت اسکے بدلے میں کوئی اور طریقہ اپنی تسکین کا ڈھونڈھتی ہے اور انسان خارجی امتیاز سے محروم

بیشہ بنا لیتا ہی کوئی اپنی سمجھ کے مطابق نیٹشے کے فلسفہ کا علم بردار بنجاتا ہی اور کوئی اپنے
خاص انداز میں یہ سمجھ کر کہ اُسے دنیا نے نہیں سمجھا ہی اور اُسنے خاص کر کے میدان مقابلہ سے
کنارہ کشی اختیار کر لی ہے، اپنے قوت بخش احساس تنہائی کے مزے لیتا ہی ان چیزوں کی بنا
عموماً نوجوانی ہی کے زمانے میں پڑ جاتی ہی۔ اس زمانہ کے مجروح احساس خودی میں ردعمل کی
قوت بہت شدید ہوتی ہے۔ اور مدتوں تک باقی رہتی ہے۔ اُسکا تخلیقی پہلو یہ ہی کہ انسان جن
چیزوں سے محروم رہا ہی اُن کے بدلے میں وہ دوسری کارگزاریوں کا حوصلہ دلاتی ہی لیکن
ضروری نہیں کہ یہ نمو تی عنصر اجتماعی تمدنی زندگی کے موافق ہو۔ اس نظر سے دیکھئے تو وہ
کبھی تعمیری راہ اختیار کرتا ہی کبھی تخریبی۔ تیسری راہ ایک طرح کی غیر جانبدرانہ زندگی کیطرف
جاتی ہے۔ جو نہ تمدن کی تائید کرتی ہی نہ مخالفت بلکہ ایک جُداگانہ طرز معاشرت اختیار کرتی ہی۔
جو نوجوانوں کے مزاج کے مطابق ہی۔

ماکس آڈلر کے مذہب تحلیل نفسی نے یہ بڑا کام کیا ہی کہ وہ نوجوانوں کے نفس کے ان
تغیرات کا مطالعہ کرتا ہے مگر اس سے محفوظ رہتا ہی کہ ہر چیز میں شہوت جنسی کی جھلک دیکھے
کسی نفس کی نشو و نما خصوصًا اسکی کجروی کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہی کہ انسان کھوج لگاتے
لگاتے عہد شباب کے اُس نقطہ تک پہونچ جائے جب اُس نفس کو کوئی دھچکہ لگا ہو۔ اسکی اگر جبی
مدد کرتا ہے تو اسکی بھی یہی واحد تدبیر ہے، ارتقا کے یہ نقائص عموماً اس زمانہ میں پائے جاتے
ہیں جب نوجوان کو بڑوں کی سماج سے نیا نیا سابقہ پڑا ہو۔

مثلاً یہ صورت بہت عام ہے کہ کسی نوجوان پر اس زمانہ میں اپنے ماحول کے کسی
قوی طبیعت کے شخص کا بہت زیادہ دباؤ ہو جسکی وجہ سے خود اُسمیں استحکام اور اپنے آپ پر بھروسہ
نہ پیدا ہو سکے۔ ایسا شخص عموماً باپ ہوتا ہی۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ بہت سخت گیر اور مستبد ہو۔
کبھی ایسا بھی ہوتا ہی کہ باپ یا ماں کے گہرے تجربے اور ذہنی برتری کے سبب سے نوجوان کو ہر

ان لوگوں کو جنپر ایسا دباؤ ہوتا ہے اس بات سے بہت نقصان پہونچتا ہی کہ انھیں مشکلات اور کشمکش کو اپنی طور پر بھگتنے اور برداشت کرنیکا موقع نہیں ملتا. ہر مشکل کا حل پہلے سے تیار ہوتا ہی اس سے طبیعت میں مضبوطی نہیں رہتی اور خود اپنی قوتوں میں زنگ لگ جاتا ہی. نوجوانوں خصوصاً نوجوان لڑکیوں کی ایسے موقع پر جبلی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اندرونی پختگی اور مضبوطی کی خاطر اس اثر سے آزاد ہوجائیں. لیکن "بڑے" اس معاملہ کے سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں. بڑی عمر میں بھی جب لوگوں کی سیرت پختہ ہوجاتی ہے. اس کا اندازہ ہوسکتا ہی کہ ان لوگوں پر نوجوانی میں کوئی دباؤ تھا. انھیں ایک طرح کی نفسی تقلید کی عادت ہوجاتی ہے. اُنکی ساری زندگی دوسروں کے اشاروں کی پابند ہوتی ہے. اسی لئے جب وہ شخص جسکا ان پر دباؤ ہوتا ہی مر جاتا ہے تو انکے دل کی ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے جس میں بے کسی اور آزادی کا احساس ملا جُلا ہوتا ہے.

والدین اور معلّم اس زمانہ میں نوجوان کے بے انتہا نازک احساس خودداری کا بہت کم لحاظ کرتے ہیں. اکثر محض ایک لفظ کہدینے سے خواہ وہ نیک نیتی سے کہا جائے اور نفس معاملہ کے اعتبار سے بالکل صحیح ہو نوجوانوں کی سخت دلشکنی ہوتی ہے کیونکہ ان کے نفس کی حالت ہی ایسی ہے کہ اسمیں مطلق استحکام نہیں اور اسکی انتہائی حفاظت کی ضرورت ہی. خودداری کے مجروح ہونیسے جس کی محرک اکثر ایسی خفیف چیزیں ہوتی ہیں جو نظر بھی نہیں آتیں ساری شخصیت کی اندرونی تعمیر خطرے میں پڑجاتی ہے. اور اُسکے تباہ کن اثرات برسوں تک قائم رہتے ہیں. شاگردوں کے دل میں اپنے استادوں کی اُن باتوں سے عمر بھر گرہ پڑی رہتی ہے جنھیں یہ استاد ایک ہی گھنٹہ میں بھول جاتے ہیں. ایسے زخم نوجوانوں کے لئے مہلک مرض کی صورت اختیار کر لیتے ہیں. جذبۂ خودداری کو ہر ٹھیس سے بچانا اسلئے اور بھی ضروری ہی کہ یہ محض احساس ہی نہیں ہی بلکہ ضابطۂ اخلاق کا بھی کام دیتا ہی. اسے قوی کرنیکی

صحیح تمکنت کی طرح ترقی کی ایک ابتدائی تحریک ہے اور اپنی اور دوسروں کی نظروں میں ذلیل ہونے سے بچاتا ہے۔

اپنے آپ کو منوانے کی خواہش اور خودداری کے احساس کیساتھ نوجوانی کے زمانے میں جنگ و جدل کی جبلتوں کا بھی ایک مرکب پایا جاتا ہے۔ ان کا اظہار تردید کی عادت سے لے کر کھلی ہوئی مخالفت اور تجربے کے شوق تک بیشمار صورتوں میں ہوتا ہے۔ نوجوان میں فاضل قوتوں کا ہونا یا کم سے کم قوت کا داخلی احساس ارتقا کے لئے اس قدر اہم ہے کہ اُسکی نفس کی اُس اُبھار کو بے سوچے سمجھے دبا دینا کسی طرح جائز نہیں۔ اگر انسان ان چیزوں کو سمجھتا ہو تو ان سے بہترین نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اسکے لئے مثلاً یہ ضروری ہے کہ باپ اپنے بیٹے کی تردید کی عادت کو ایک فطری چیز سمجھے جسکا ایک خاص عمر میں ظاہر ہونا اُسی طرح لازمی ہے جس طرح تین برس کے بچے میں ضد اور ہٹ کا ہونا۔

ہم یہاں کوئی اخلاقی یا تعلیمی نصیحت نہیں کر رہے ہیں بلکہ محض "سمجھنے" کا طریقہ بتا رہے ہیں۔ جو شخص نوجوانوں کو سمجھتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس عمر میں اپنے ماحول سے شدید کشمکش پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اگر یہ صورت نہ پیدا ہو تو ایسا ہے جیسے بادبانی کشتی کے لنگر اُٹھاتے وقت ہوا بالکل ساکن ہو۔ بھلا بتائیے اس طرح وہ کشتی دُور جا سکے گی۔ اسطرح کی کشیدگی اور نفی کا ہونا ضروری ہے اسے محض شرارت اور ارتقا کی رُکاوٹ نہیں سمجھنا چاہئے۔

اس ترک موالات کی مصیبت کے مقابلے میں دوسرے حالات میں نوجوان پر یہ مصیبت ہوتی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو تنہا اور متروک پاتا ہے۔ اُسمیں ابھی یہ قوت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے کہ اجنبی ماحول میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ کیونکہ نوجوان کی ترکیب نفسی سماج کے نظام سے جسمیں اب وہ داخل ہونے لگتا ہے بہت سی اہم باتوں میں مختلف ہے۔ ہم اختصار کے ساتھ اُن خاص اختلافات کا ذکر کرتے ہیں جو موجودہ تمدنی حالت میں اہمیت رکھتی

موجودہ تمدنی سماج ایک ایسی چیز ہے جو سراسر تاریخی روایات پر، عقلی اصول پر، اور واقعیت پسندی پر مبنی ہے۔

پہلی بات کو لیجیے یعنی اس کا تاریخی روایات پر مبنی ہونا۔ نوجوان اس بات کو کہ موجودہ تہذیب کا منشا کیا ہو اور اُسکا موجودہ حالت میں ہونا کیوں ضروری ہو اتنا بھی نہیں سمجھتا جتنا ایک زیادہ عمر کا آدمی جسنے تاریخ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہو اُسکے پاس وہ کنجی ہی نہیں جو اس بھید کے قفل کو کھول سکے۔ علاوہ اسکے نوجوان میں بحیثیت نوجوان کے یہ رُجحان بھی نہیں ہوتا کہ تاریخی چیزوں کا احترام کرے۔ اور انھیں اپنی زندگی میں دلیل راہ بنالے۔ نوجوان شوق سے گذشتہ عہد کی کہانیوں کو طلسم تخیل سمجھ کر پڑھتے ہیں اور تاریخ سے رومانی ذوق رکھتے ہیں لیکن وہ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالتے کہ انھیں اپنی قوم کے ماضی کو ایک ایسی قوت تسلیم کرنا چاہئے جو ان سے بالا ہو۔ اور اُن کی زندگی کی تشکیل کرتی ہو۔

اسمیں شک نہیں کہ اس بارے میں مختلف قرنوں میں فرق ہوتا ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہو (مثلاً جرمنی میں ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۰ء تک اور ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۰ء تک) کہ فضا میں تاریخ چھائی ہوئی ہو اور علوم ذہنی کو اپنے رنگ میں رنگ لے۔ لیکن عموماً صورت حال اس کے خلاف ہوتی ہے۔ نوجوانوں کا عموماً یہ رُجحان ہوتا ہو کہ اپنی زندگی کو حتی الامکان روایات سے آزاد رکھیں۔ نیٹشے کا اوائل عمر کا رسالہ " تاریخ کے نقصانات اور فوائد زندگی کے لئے " گویا نوجوانوں کے نفس کی تصویر ہو۔ لیکن اس طرز خیال سے خارجی واقعات تو بدل نہیں سکتے اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارا تمدن بالکل تاریخی روایات پر مبنی اور اُنکا پابند ہے بھلا اُن تازہ قوتوں سے جو نوجوانوں میں ابتدائے شباب میں ہوتی ہیں کہاں تک کام چل سکتا ہو۔ ان سے زندگی کی ساری چیزوں کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ ہر چیز پہلے سے موجود ہے۔ ہر خیال پہلے سے لوگوں کے ذہن میں آچکا ہو۔ محض تعلیم کی دور دراز راہ سے انسان

اس منزل تک پہونچ سکتا ہے جہاں وہ تمدّنی کاموں میں دوسروں کا ہاتھ بٹا سکتا ہے۔

۱۔ سوال یہ ہے انسان میں پچیس چھبیس برس کی عمر تک تخلیق کا مادہ ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب اثبات میں صرف اس حد تک دیا جا سکتا ہے کہ نوجوان اپنے احساس اور طرزِ عمل کے لحاظ سے ایک نیا ٹائپ (نمونہ) پیش کرتا ہے۔ اُسکے عمل میں نہیں بلکہ اُسکی ذات میں ایک تمدن کی تجدید کرنے والا عنصر موجود ہے گو اُسے خود اسکا احساس نہیں ہوتا لیکن یہ عنصر قوت سے فعل میں اُسوقت آتا ہے جب بلوغ کے طوفان گذر چکتے ہیں۔ اور اُسکے نفس کی نئی "صورت" عالمِ واقعی سے سمجھوتا کرنے کے بعد ہر پہلو سے منظم اور مستحکم ہونے لگتی ہے۔ بلاشبہ اٹھارھویں صدی کی تحریک "طوفان و تلاطم" کے حامل اپنی نوجوانی کے زمانے یعنی ۱۷۷۰ء کے بعد ہی نئے رنگ کے لوگ تھے۔ لیکن اُن کی زندگی کے پختہ پھل ۱۷۸۰ء بلکہ ۱۷۹۰ء کے بعد پیدا ہوئے اور پھر یہ بھی ہے کہ پھولنے کے زمانے میں جو خواب دیکھے جاتے ہیں وہ سارے سارے کے سارے پھلنے کے زمانے میں پورے نہیں ہوتے۔ ان دونوں کے درمیان ہر قرن میں تازہ وارد تیز رو نوجوانوں کو جیتی جاگتی تاریخ سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو بنے بنائے تمدّن کی شکل میں اُن کی مزاحمت کرتی ہے لیکن ساتھ ہی اُنکو تعلیم اور مدد بھی دیتی ہے۔ ہر عام مدرسے اور پیشہ کی تعلیم دینے والے مدرسہ میں یہ بات مذاق شباب کے خلاف ہوتی ہے کہ وہ نوجوان کو جو مستقبل کی آرزو میں بیچین ہوتا ہے۔ پہلے ایک بار تاریخ میں غوطہ دیتا ہے اور نوجوان کے تخیلات اور تجربات کے مقابلے میں "قدیم آزمودہ قوتوں" پر زور دیتا ہے۔

سماج میں داخل ہونے والے نوجوان کے لئے دوسری مشکل یہ ہوتی ہے کہ موجودہ تمدن نے قدیم فطری اور نامی[1] طرزِ معاشرت کی ایک ہلکی سی بنیاد پر اغراض و مقاصد کی ایک ایسی عمارت بنا دی ہے جو بالکل مصنوعی اور عقلی اُصولوں کے ماتحت ہے۔ یہاں بخلاف پہلی صورت کے

[1] (Organic) وہ چیز جو نباتات کی طرح نمو کی قوت رکھتی ہو۔ ۱۲

لاشعوری تاریخی ارتقا اور نشو و نما کی کمی ہے۔ اب زندگی کی کوئی صورت ایسی نہیں جو اگتی اور بڑھتی ہو۔ بلکہ ہر چیز "بنائی" جاتی ہی۔ عزیزوں کی محبت، خون کا جوش، ہمسایوں سے یگانگت، زندگی کا کلی احساس۔ ان چیزوں کو آجکل کوئی نہیں پوچھتا، بجائے اسکے مصنوعی (یعنی جان بوجھ کر بنائی ہوئی) انجمنوں، لاشخصی تنظیموں، مخصوص کام کرنیوالی جماعتوں کا دور دورہ ہی۔ مشین نے اپنے رنگ میں انسانی زندگی کو بھی رنگ لیا ہی۔ ہر چیز کی تنظیم ہوتی ہے۔ نوجوان بجائے اس بے روح زندگی اور انتشار کے یہ چاہتا ہی کہ اُسے اپنے دلی مخفی آرزو و تحریک پر عمل کرنے کی اجازت ہو اور یہ محسوس ہو سکے کہ اسکا حامل ایک ایسا کل ہے جو روح رکھتا ہی۔ اسلئے "سیلانی پرندوں" کے اس فعل کو کہ انھوں نے اپنی جماعت کو "شرکت سیاحان رجسٹرشدہ موسوم بہ سیلانی پرندے" بنا لیا ہی۔ آئین شباب کے خلاف سمجھنا بالکل بجا ہی۔ دوسری طرف اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ نوجوان میں یہ صلاحیت بالکل نہیں ہی کہ بہت بڑی جماعتوں میں شریک ہو سکے۔ وہ جس سے ملتا ہی ذاتی اور کلی اتحاد کی کوشش کرتا ہی۔ یہ بات اُسے یا تو کسی ایک آدمی میں ملتی ہی جسے اُسنے خود انتخاب کر کے "اپنا" آدمی بنا لیا ہے یا کسی چھوٹے سے فرقے میں جسمیں ہر فرد ایک شخصیت سمجھا جاتا ہی اسکا سبب انسان کی یہ نفسی ضرورت ہی کہ کوئی اُسے بحیثیت کل کے سمجھے اور ظاہر ہے اسطرح کے سمجھنے کا کسی انجمن میں جو چھوٹے جانوروں کی "پرورش" کے لئے قائم کی گئی ہو یا انجمن بین الاقوامی برائے خدمت بنی نوع انسان" میں کیا ذکر ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ نوجوان انجمنوں میں بہت شوق سے داخل ہوتے ہیں۔ لیکن انھیں جو چیز (اگر تھوڑے دن کے لئے) اُدھر کھینچتی ہے وہ محض ظاہری ساز و سامان ہے (انجمن کے امتیازی نشانات عہدہ داروں کا انتخاب، انتظامی بحثیں وغیرہ) مجموعی حیثیت سے نوجوانوں کی تنظیم بہت دشوار ہی یہ جرمنی کے نوجوانوں کے لئے مخصوص نہیں ہی جنمیں انفرادیت پسندی قومی خصوصیت کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ نفسی ارتقا کی اس منزل میں جبکہ انسان ہمیشہ اپنی اندرونی کیفیات میں

محور رہتا ہے سب قوموں میں یہی صورت پائی جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ نوجوان دلسے محض اثر قبول کرنے پر راضی نہیں بلکہ خود بھی اپنے ماحول پر اثر ڈالنا چاہتے ہیں لیکن انھیں ابتک نہ اس کا موقع حاصل ہے اور نہ صحیح طریقوں کا علم ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہماری بالغوں کی سماج سراسر واقعیت پسند اور تخیل اور شاعری سے بالکل خالی ہے۔ نوجوان دنیا کے جو خواب دیکھتے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔ انھیں انسانوں کی بابتہ واقعی علم نہ ابھی تک ہے اور نہ وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ابھی تک اپنے اعمال کے نتائج اور اپنی قوت کے حدود کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ تخیلی زندگی اور تھیٹر، بائسکوپ، اور منچلے افسانوں کے تاثرات، روزانہ زندگی کی یکساں رو کے ساتھ مل جل جاتے ہیں۔ اور چونکہ ان میں بچپن کا اتنا اثر ابتک باقی ہوتا ہے کہ دل میں جیسی لہر آئی ویسا کر گذرے اسلئے ذراسی بات میں خطرناک کشمکش تک نوبت پہونچ جاتی ہے جو کرنے والے کے نقطۂ نظر سے معمولی سی بات ہے لیکن عقل سخت گیر کی عدالت میں جرم قرار پاتی ہے۔ مثلاً روپے کو لیجئے خود جو ایک بے رنگ چیز ہے مگر اُس سے ہر چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ نوجوان کو جب زر نقد ملتا ہے تو وہ بلا تامل اُسکے بدلے میں سب سے پہلی شے جسکی اسے خواہش ہو حاصل کر لیتا ہے کیونکہ وہ ایسی صورت رکھتی ہے جسکا فائدہ سمجھ میں آتا ہے۔ یا پھر وہ روپیہ کو ایک پراسرار جادو کی چھڑی سمجھتا ہے جس سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے اور جس کا انسان کے پاس ہونا دنیا کے ہر کام کے لئے ضروری ہے۔ اس کا نفس منچلے پن کے کاموں کا عجیب غریب واقعات کا بھوکا ہوتا ہے! ور یہ کہیں نظر نہیں آتے اسلئے وہ خود تخیل کی دنیا کو واقعیت کا لباس پہنا کر ان چیزوں کو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ دل میں کہتا ہے کسی مکان کے خیگہ کو جلتے ہوئے دیکھنے میں کیا لطف آئے گا! کسقدر آسانی سے انسان شہر کے دروازے کے باہر کھلی ہوا میں چھاؤنی چھا سکتا ہے! پھر اسکا یہ عقیدہ ہے کہ جن لوگوں سے اُسے محبت ہے اُن کی خاطر کوئی کارنمایاں انجام دینا اُس کا فرض ہے اسلئے وہ کہتا ہے اور کچھ نہیں تو چلو کسی پر

حملہ کر ڈالیں یا ساری دنیا کے گرد سفر ہی کر آئیں، ضرورت کے وقت ہمارے سورما کو اسی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے کہ کسی مجسمے کی ناک توڑ دے۔ اسطرح سے گنڈوں کے جتھے بنتے ہیں جو سماج کو بہت دق کرتے ہیں لیکن داخلی پہلو سے اُن کی اصل ایسی قابل نفرین نہیں ہوتی جیسی سمجھی جاتی ہے۔

مجرد عقلی قیاس ہی کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کبھی کبھی نوجوانوں کو ایک جبلی جوش اُٹھتا ہے اور وہ عام تمدنی زندگی سے ترک تعلق کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ بے چون و چرا سماج میں شامل ہو جانے اور اس سے مقابلہ کرنیکے خطرناک طریقے کے درمیان ایک تیسرا راستہ ہے۔ یہ بھی تحریک شباب کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اس پوری کتاب میں ہمارے پیش نظر یہ مقصد نہیں ہے کہ اُس تحریک شباب کا بہ حیثیت ایک منفرد تاریخی منظر کے ذکر کریں جو آج ایک خاص حالت میں موجود ہے، ایک دن پہلے کچھ اور تھی اور ایک دن بعد کچھ اور ہو جائے گی بلکہ ہمیں یہاں تحریک شباب سے بہ حیثیت ایک ٹائپ (امثال) کے سروکار ہے اور وہ بھی اُسکی اخلاقی قدر و قیمت سے نہیں (جو ہمیشہ بدلتی رہتی ہے) بلکہ اُسکے سماجی پہلو سے۔

تحریک شباب ہر عہد میں ہوتی ہے۔ لیکن خاص طور پر نظر تب آتی ہے جب وہ دلوں کی خاموشی سے نکل کر نوجوانوں کے جتھوں اور انجمنوں کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ تحریک شباب کے دوگونہ منشا کو مدنظر رکھیں۔ ایک تو اُسمیں ایک نئی پختہ تہذیب کی تمہید ہوتی ہے۔ نسلوں کے باہمی تضاد سے ایک نیا تمدنی عہد پیدا ہوتا ہے۔ جو نئی ذہنی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ اس طرح کی تحریک ایک ذہنی انقلاب کی شان رکھتی ہے جس سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ دوسرے ہر تحریک شباب میں بڑوں کے اثر سے آزاد ہونیکے لئے جنگ ہوتی ہے جسکی اہمیت محض نوجوانی کے زمانیکے لیے ہے اور تاریخ عالم سے اسکا محض اتنا تعلق ہوتا ہے کہ

جس زمانہ میں ذہن تاریخی (تمدن) میں زیادہ جمود پیدا ہو جاتا ہے اس میں تحریک
شباب خاص طور پر زور دار اور پر جوش ہو جاتی ہے۔

نفسیات شباب میں ہمیں نوجوانوں اور بڑوں کے مقابلے پر خاص طور پر غور کرنا چاہئے
سب جانتے ہیں کہ ہم عمر لوگ اپنی ترکیب نفسی کے اتحاد کے سبب سے آپس میں بڑی ہمدردی رکھتے
ہیں اسی لئے اُنہیں ایک دوسرے سے میل جول کی بہت زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ صورت
غیر ترقی یافتہ قوموں میں بھی ہوتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے تمدن میں بھی۔ ہمارے یہاں "توشہ خانوں"
کی "خاندانی میزوں" پر بارکوں کی بنچوں پر بوڑھے بوڑھے لوگ جمع ہوا کرتے ہیں۔ گویا
پنشن یافتوں کا ایک کلب قائم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ عمر اور قویٰ کے لحاظ سے
معراج کمال پر ہوتے ہیں اُن میں مشترک مقاصد کا باہمی رشتہ ہوتا ہے۔ شادی شدہ
لوگوں اور کنواروں کے بھی جدا جدا حلقے بنجاتے ہیں۔ بچوں میں بھی یہی ہے کہ عمر کے
لحاظ سے اُن کی الگ الگ ٹکڑیاں بنجاتی ہیں۔ اس اجتماعی قانون سے نوجوان بھی مستثنیٰ
نہیں۔ لیکن اُن کے لئے یہ خاص طور پر مشکل ہے کہ اپنا مخصوص زندگی کا میدان تلاش
کریں کیونکہ وہ عمر کی اُس سرحد پر ہوتے ہیں جب نہ تو وہ بچے رہتے ہیں اور نہ سنجیدہ تمدنی
زندگی میں حصہ لینے کے لائق ہوتے ہیں۔

جرمنی کے جدید تمدن میں اس عمر کے انداز زندگی کے لئے کہیں گنجائش نہیں ہے
نوجوان اس عمر میں یا تو اسکولوں کے اونچے درجوں میں ہوتے ہیں یا کوئی کام سیکھتے ہیں
یا کسی پیشہ میں مشغول ہوتے ہیں۔ لیکن ان تینوں میں ایک جگہ بھی ایسی نہیں جو عنفوان
شباب کی ضروریات سے خود بخود پیدا ہوئی ہو۔ اسلئے ان سب کے نوجوانوں میں کم و بیش
شورش اور بغاوت رہتی تھی۔ ایسے موقع پر جو تاریخ میں اکثر پیش آتا ہے خود نوجوانوں
میں سے یا ان لوگوں کی کوشش سے جنھیں انکی مصیبت سے دلی ہمدردی ہوتی ہے تحریک شباب
پیدا ہوا کرتی ہے جو جان بوجھ کر یا بے جانے نوجوانوں کے لئے ایک زندگی کا میدان ڈھونڈھتی ہے

ڈیونکن نے اسکے لیئے تمدنِ شباب کی اصطلاح گھڑی ہے۔ لیکن دراصل نوجوان کوئی اپنی جداگانہ تمدنی پونجی نہیں رکھتے (کیونکہ وہ چیزیں جو تمدن کی موضوع ہیں عمر کے اختلافات سے بالا ہیں) بلکہ صرف وہ اجتماعی "صورت" جسمیں وہ تمدنی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں مختلف ہوتی ہے۔

اگر نوجوانوں کی یہ کوشش کامیاب ہوجائے تو ایک ایسی سماج کی بنیاد پڑے گی جو بالکل زمانۂ بلوغ کی ترکیب نفسی کے مطابق ہوگی اسیطرح جیسے بچے خاندان میں یا خاندان کے باہر ایک حد تک اپنی ایک مخصوص زندگی رکھتے ہیں اور بڑے اپنی "دنیا" رکھتے ہیں۔ یہ دھندلی خواہش جو نوجوانوں میں خود بخود پیدا ہوجاتی ہے ممکن ہے کہ تعلیمی مصالح سے بالارادہ بھی پیدا کی جائے لیکن ایسا اُسوقت تک نہ کرنا چاہیئے جب تک پہلے سے غور نہ کرلیا گیا ہو کہ کتنے دن کے بعد یہ لوگ بڑوں کے پختہ تمدن میں شریک ہوجائیں گے۔ کیونکہ یہ بہت خطرناک بات ہے کہ ارتقا رک جانے سے نوجوان بڑوں کی تمدنی زندگی میں شریک ہونے ہی نہ پائیں۔

اسطرح کی "آزادی شباب" کی خصوصیات موجودہ تحریکِ شباب کے مشاہدے سے آسانی سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ سنِ بلوغ کا طرزِ زندگی چھپا نہیں رہتا۔ ہمیں ایک ہی نظر میں معلوم ہوجاتا ہے کہ نوجوان اجتماعی زندگی کی قدیم صورتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ گویا اسٹنلے ہال کا یہ مبالغہ آمیز قول صحیح ہے کہ نوجوانوں کو اپنی انفرادی ارتقا میں ایک ایک کرکے اُن تمام سابقہ مدارج سے گزرنا پڑتا ہے جنسے تمدنِ انسانی گزر چکا ہے۔ ان میں قبائل کی زندگی اور خانہ بدوشی کا بہت شوق پایا جاتا ہے۔ بعض باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو سورماؤں اور بانکوں کے زمانے کی یادگار ہیں اور بعض ایسی ہیں جنمیں پھرنے والے کاریگروں، اور طالبعلموں یعنی آوارہ گردوں کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں جب ہماری جدید دنیا میں جگہ پاتی ہیں تو ان کی کچھ اور ہی صورت ہوجاتی ہے۔ یہاں افراد زیادہ نمایاں شخصیت رکھتے ہیں اور احساس اجتماعی کے رشتہ میں مربوط ہوتے ہیں۔ اس لیۓ لوگ قدیم یونانی زندگی کی تقلید کرنا چاہتے ہیں جسمیں نوجوان اپنے علیحدہ کھیل کے مقابلے اور مباحثے کی مجالس رکھتے تھے لیکن اسی کے ساتھ عام قومی زندگی میں بہ حیثیت ایک اہم عنصر کے شامل تھے اور قومی جشنوں کے موقعہ پر کسرت اور موسیقی کے مقابلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انگلستان نے نشاۃ ثانیہ کے زمانہ ہی میں اس اجتماعی طرز کو اختیار کرلیا۔ ہمارے ملک میں بھی اب بہت کوششیں ہورہی ہیں کہ ایک نوجوان کا

اولمپیا[5] قائم کیا جائے جسمیں مختلف جماعتوں اور طبقوں کے آپس کے تفرقے جو موجودہ تہذیب کی ترکیب میں موجود ہیں مٹادیے جائیں۔

سب سے پہلے یہ آرزو "سیلانی پرندوں" میں پیدا ہوئی۔ اس جماعت میں بھی ہمیں نفسیات بلوغ کی تمام خصوصیات نظر آتی ہیں۔ جمالیاتی تخئیلی طرز زندگی، اپنے جسم کی قوت اور صحت کا لطف اٹھانا، سیر و سیاحت کا رومانی شوق، نظارۂ فطرت کا ذوق، شاعری، بانسری بجانا، دوستی اور نفسی اتحاد میں گہرے عشق کا رنگ، اپنے دیس کا بھیس اور وہ سادگی جسکی آرزو روسو کو تھی۔ لیکن اجتماعیات کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو ان کے یہاں نہ کوئی تنظیم ہے نہ ضابطہ، نہ رائے مانگنا نہ انتخابات، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے آزاد اور بے تکلف میل جول سے سارے مراحل طے ہوجاتے ہیں۔ ان کے یہاں لیڈری کا کوئی عہدہ نہیں جو امتحان پاس کرنے سے ملتا ہو۔ اسکا دارومدار ذاتی صفات پر ہے جنکا اثر براہ راست دوسروں پر پڑتا ہے۔ ان صفات کے ساتھ لیڈر میں یہ بات بھی ہونا چاہیئے کہ اپنے سے چند سال چھوٹے نوجوانوں کے جذبات و کیفیات کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور فطری جوہر جو ایک معلم میں ہونا چاہیئے رکھتا ہو۔ ان لوگوں کی زندگی میں جن صورتوں نے حقیقت کا جامہ پہنا ہے اُن کے مطالعہ سے نفسیات شباب کے نتائج حاصل کرنے میں اتنی مدد ملتی ہے جتنی کسی چیز سے نہیں ملتی۔ بلکہ اُن چیزوں کا بھی جو یہاں موجود اور اُن لوگوں کو مرغوب نہیں بلکہ اُن کی نظروں میں مردود ہیں تقابل کے ذریعہ سے واضح اور معین علم ہوجاتا ہے اول تو یہ کہ تقسیم و انضباط، لاشخصیت، زندگی کو عقلی اصول پر ڈھالنا، یکطرفہ عقلیت، سخت قواعد اور قوانین ان چیزوں کا ان کے یہاں گذر نہیں۔ اگر ہم اس کے مقابلے میں قدیم طرز کے مدرسوں کو رکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کے طرز زندگی میں اور اس طرز میں جو خود نوجوانوں کی اندرونی ضروریات سے پیدا ہوتا ہے کسقدر فرق ہے (اس نفسی رو کو پیدا کرنا خود نوجوانوں کا کام ہے۔ اسکے نہ ہوتے میں صرف مدرسے ہی کا قصور نہیں ہے

تحریک شباب میں سترہ برس کی عمر نو سکھیوں اور محرمانِ راز کے درمیان حدِّ فاصل ہوتی ہے۔

---

[5] یونان میں کھیلوں کے مقابلے اولمپس پہاڑ پر ہوتے تھے اس لئے اولمپیا کہلاتے تھے۔

چودہ سے سترہ برس تک کی عمر والے بھی عہدِ عنفوانِ شباب میں قدم رکھ چکے ہیں لیکن انہیں دوسروں کی پیروی کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اُن میں ہنوز احساسِ شباب واضح اور گہرا نہیں ہوتا۔ سترہ برس اور اس سے زیادہ عمر والے اس تحریک کے اصلی حامی ہیں۔ ان کی طبیعت سے بچپن تقریباً زائل ہو چکا ہے۔ کم عمر والوں کے مقابلہ میں یہ لیڈر ہیں لیکن خود اپنے حلقہ میں خالص ذہنی نقطۂ نظر سے بعض لوگوں کو لیڈر تسلیم کرتے ہیں۔ نوجوانی کی خصوصیات نوجوانوں کے اس اپنے راج میں اُس سے زیادہ مدت تک باقی رہتی ہیں جتنی بڑوں سے ہر وقت سابقہ پڑنے کی صورت میں۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ اس قسم کی زندگی میں نوجوان بدایوں کے مُلّا کی طرح چوبیس برس تک نابالغ بنا رہے بلکہ اس کے بعد بھی اسمیں اس عمر کا اثر باقی رہتا ہے۔ تیس برس سے زیادہ عمر والے جو اس زمانہ میں تحریکِ شباب میں شریک ہوتے ہیں یا تو اعلیٰ قابلیت کے سربرآوردہ لوگ ہیں یا اس سے ایک درجہ گھٹ کر وہ لوگ ہیں جنھیں نوجوانوں کی مدد اور خدمت کا شوق ہوتا ہے اور مصلحتاً انہوں نے نئے رنگ کو اختیار کر لیا ہے۔ یا ان سے اور گھٹ کر چالاک فسادی لوگ ہوتے ہیں جو تحریکِ شباب اس لیئے "پیدا کرتے ہیں" کہ آجکل یہ کامیابی کا اچھا ذریعہ ہے۔ ان تین بالکل مختلف قسم کے لوگوں کی نفسی خصوصیات بیان کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ پہلی قسم پر سب سے زیادہ غور کرنا چاہیئے۔ اس کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ نوجوانوں کا ایک امام ہونا چاہیئے جو اُن کو ایک نئی دنیا کا راستہ دکھائے جبکہ پُرانی دنیا ایک اندھی گلی میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل اس خیال نے کتنی ترقی کر لی ہے کہ بالغوں کی سماج کے پہلو بہ پہلو نوجوانوں کی ایک علیٰحدہ دنیا ہونا چاہیئے۔

لیکن یہ خیال بہت کچھ بحث طلب ہے۔ ایک طرف تو نوجوانوں کا طرزِ زندگی ایک طرح کا تموّج ہے جسکی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ کوئی معینہ شکل اختیار کرتے ہی اسمیں شباب کی شان نہیں رہتی۔ اس لیئے تحریکِ شباب کے سچے حامی ہمیشہ خبردار کرتے رہتے ہیں کہ دیکھو ہماری ساری تحریک میں جمود پیدا ہو رہا ہے یہ ایک معینہ راہ اختیار کرتی جاتی ہے "ناتمامی" نوجوانوں کا جوہر ہے "منزل سے ناآشنا ہونا" انکی تحریک کا مِنْ منشا ہے۔ نوجوان ہمیشہ "انقلاب پسند" ہوتے ہیں خواہ انھیں خود نہ معلوم ہو کہ وہ کس چیز میں انقلاب کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی قابلِ غور ہے کہ آخر یہ نوجوان ہمیشہ تو جذباتِ شباب کے طلسم

میں رہ نہیں سکتے۔ جب یہ طلسم ٹوٹے گا تو کیا ہوگا؟ یا تو یہ لوگ "سیلانی پرندے" بن جائیں گے جن کی ناتجربہ کاری اور لاابالی پن دیکھ کر وہ طالب علم یاد آتے ہیں جو عمر بھر پڑھا کرتے ہیں یا انھیں ایک فوری دھچکے کے ساتھ واقعیت کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی زمانہ انھیں جھنجوڑ کر بیدار کرتا ہے اور دنیاداری کی زندگی میں ڈھکیل دیتا ہے۔

ان لوگوں سے ہمارے مشاہدے کے مطابق وہ مخلوط طبائع کہیں بہتر ہیں جو شباب کا نشہ رکھتی تھیں لیکن اس طرف سے غافل نہ تھیں کہ انھیں آگے چل کر دنیا میں اپنی جگہ لینا ہے۔ نئے طرزِ زندگی کی طرف مڑنے کا صحیح طریقہ اب تک دریافت نہیں ہوا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ تحریکِ شباب میں عزم اور مردانگی کی کمی ہے۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ادبی میدان تک میں اس نے کسی قابلِ ذکر قوتِ تخلیق کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ کچھ تو اس نے خاص کر کے اس سے پرہیز کیا ہے کیونکہ مذہبی جذبات پرستوں کی طرح وہ بھی تسلیم و رضا اور خاموشی اختیار کرنا چاہتی ہے۔ جس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے مگر کچھ یہ بات بھی ہے کہ وہ موجودہ تمدّن سے ضرورت سے زیادہ خفا ہے۔ اُس نے ایسی سادگی اختیار کی ہے جو موجودہ حالات میں خلوص پر مبنی نہیں ہے اس لئے دیکھنے والے کو بُری معلوم ہوتی ہے۔ یہ بیماری کی علامتیں ہیں اور جلد سے جلد دُور ہوجانا چاہئیں۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ نوجوان اپنی ایک الگ دنیا بنائیں۔ وہ بھی اس پر مجبور ہیں کہ اسی دنیا میں زندگی بسر کریں۔ البتہ اُن کی زندگی میں ایک جداگانہ شان اور تازگی و آزادی ہونا چاہئیے۔ لیکن اِن آوارہ گرد ہونق لڑکوں اور نیم برہنہ وحشیوں کی صورت سے جنھیں صفائی کی قدر اُس وقت ہوتی ہے جب وہ اتوار کے دن گاؤں کی لڑکیوں کو صاف ستھرے کپڑے پہنے دیکھتے ہیں زنانہ پن ٹپکتا ہے اور ان کا مجمع ایک سوانگ سا معلوم ہوتا ہے۔ اُن کے لاابالی پن میں اُسی خود پسندی اور بناوٹ کی جھلک نظر آتی ہے جو پہلے کسی چھیلا میں پائی جاتی تھی انھیں وہ چیز جسے وہ ڈھونڈنے نکلے تھے یعنی نوجوانی کی سچی زندگی ابھی تک ہاتھ نہیں آئی ہے۔ اگر وہ اُسے پالیں گے تو اُن کے دیس والے انتہائی مسرت کے ساتھ اُس کے نظارے سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچائیں گے۔

باب ششم

نوجوانوں کی اخلاقی نشوونما

نوع انسانی اور افراد میں اخلاقی احساس کی نشوونما پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اخلاق کی حقیقت کے متعلق کوئی رائے قائم کرلیں۔ اخلاق کی تحت میں دو چیزیں آتی ہیں جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، ایک تو سماجی یا اجتماعی اخلاق اور دوسرے شخصی اخلاق۔ سماجی اخلاق تمدن خارجی یا ذہن خارجی کا ایک جز ہے۔ یہ لب لباب ہے ان اخلاقی احکام کا جو سماج بہ حیثیت ایک ما فوق الافراد فاعل کے اپنے ارکان کے طرز خیال اور طرز عمل کے متعلق قائم کرتی ہے۔ یہ احکام سارے سماج پر عائد ہوتے ہیں اور ہر فرد کی اخلاقی زندگی پر ان کا اثر پڑتا ہے۔ ان احکام کے ظاہر ہونے کی تین صورتیں ہیں (الف) وہ اعمال جو ان احکام کی تحت میں ہوں (ب) عام اخلاقی اصول (مطالبات جو سماج کرتی ہے) (ج) ارکان کے طرز عمل پر سماج کی طرف سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار۔ ہر بڑی یا چھوٹی سماج اس طرح کا اخلاق رکھتی ہے۔ اس کی مخصوص ماہیت کو اس کی گذشتہ تاریخ معین کرتی ہے۔ اور اس کا گذشتہ تعلق کسی موجودہ سماج سے ویسا ہوتا ہے جیسا اس سماج کی تمدنی حالت کا تقاضا ہو۔ یعنی ایک ہی قوم کے اندر اجتماعی اخلاق سماج کی اندرونی تقسیم کے لحاظ سے مختلف طبقوں اور مختلف حلقوں میں مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کسی جماعت کا اخلاق دکھانا ہو تو ماضی اور حال دونوں کے لحاظ سے اس پر نظر ڈالنا چاہئے۔ افسوس ہے کہ اس قسم کی کتابیں جس میں اس واقعی اخلاق کی تصویر دکھائی گئی ہو موجود نہیں ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو اس طلسم حیات، اس نیرنگ تغیر کی مصوری ہے بھی بہت مشکل۔

شخصی اخلاق اس تعلق کا نام ہے جو فرد کی ذات عالم قدر اور اس کی ترتیب سے رکھتی ہے اور یہ تعلق اخلاقی امر مطلق کے اندرونی احساس پر مبنی ہوتا ہے جس سے خود فرد کی مجموعی قدر معین ہوتی ہے۔ اس لئے علم اخلاق کی بحث کرتے وقت قانون اخلاق اور فرد کے اخلاقی عقیدہ میں جو اس قانون سے کم و بیش

منحرف ہوتا ہے فرق کرنا چاہئے۔ اگر انسان قانون اخلاق کو مافوق الافراد سمجھے (محض اجتماعی معیار سے نہیں بلکہ عینی اعتبار سے) تو اسے وہ افلاطون کا عین خیر[1] یا کانٹ کا امر مطلق[2] یا ہیگل کا ذہن مطلق[3] قرار دے سکتا ہے۔ یہ مافوق الافراد قانون ہر فرد کو ایک معین شکل میں یعنی اپنے ذاتی مقصد زندگی یا ضمیر یا معیار قدر کی صورت میں محسوس ہوتا ہے اور پھر یہی وہ قانون صورت بن جاتا ہے جس کی پابند انسان کی مجموعی شعوری اخلاقی زندگی ہوتی ہے۔ قانون اور مقصد زندگی (یا عین اخلاق اور ذاتی نصب العین یا اجتماعی اخلاق اور شخصی اخلاق) میں باہم پوری مطابقت نہیں ہوتی کیونکہ یہ ایک واقعات سے تعلق رکھنے والا مسئلہ ہے جس کا جواب نفسیات دے سکتی ہے کہ اخلاقی احکام کا کتنا حصہ فرد کے شعور میں وجوب کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اور اس واقعی اخلاق شعور کے دائرہ میں بھی اخلاقی وجود اور اخلاقی وجوب میں یعنی ان اخلاقی احکام میں جنھیں کسی شخص نے واقعی اپنی زندگی اور اپنے عمل کا جز بنا لیا ہے اور ان میں جو اس کے سامنے محض احکام کی حیثیت سے موجود ہیں فرق ہے۔ ان موخر الذکر احکام کو شخصی ضمیر کہتے ہیں۔ خیر مطلق اس اخلاقی درجے سے جہاں تک انسان پہنچتا ہے اور اُن معینہ احکام سے جو اس کی ضمیر میں موجود ہیں بلند تر ہے۔ یہ ایک ذہنی راہنما ہے جو ہمیں لامحدود کا راستہ بتاتی ہے اور جب کبھی ہمارے شعور میں آتی ہے تو مخصوص قوانین یا معینہ احکام کا لباس پہن لیتی ہے۔ لیکن چونکہ ان احکام کا احساس ہمیں اس طرح ہوتا ہے کہ یہ خود ہماری ذات کی گہرائیوں سے نکلے ہیں اس لئے ان کی حیثیت ان قوانین کی ہوتی ہے جنھیں ہم خود بنائیں۔

---

[1] افلاطون کے نزدیک دنیا کی ہر شے کی مکمل لافانی اور غیر متغیر مثال عالم معقول میں موجود ہے اور عین کہلاتی ہے۔ ان سب میں اعلیٰ اور برترین عین خیر ہے۔ یہی عین خیر دراصل افلاطون کا خدا ہے۔ [2] کانٹ کہتا ہے کہ بعض اخلاقی احکام مشروط ہوتے ہیں کہ اگر ایسا ہو تو ایسا کرو لیکن ایک حکم غیر مشروط یا قطعی ہے اسی کو وہ امر مطلق کہتا ہے۔

[3] ہیگل کے فلسفہ میں ذہن مطلق خدا ہے جو ذہن داخلی یعنی ذہن انسانی اور ذہن خارجی یعنی تمدن کو متحد کرتا ہے۔

.......اجتماعی اخلاق اور شخصی اخلاق کا فرق جتنا عام طور پر بیان کیا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ سب سے پہلے تو اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا وجود اس وقت تک محال ہے جب تک دوسرا بھی موجود نہ ہو۔ ہر فرد ایک ایسے اخلاقی ماحول میں میں پیدا ہوتا ہے جس پر تاریخ کا گہرا اثر ہے اور جو ایک مخصوص تاریخی انداز رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے شخصی اخلاق کی نشو و نما سراسر اس اجتماعی اخلاقی روح کی پابند ہے۔ نفسیات ارتقا کے نقطۂ نظر سے یہ مروجہ اخلاق جس میں کھوٹے اور کھرے دونوں کا میل ہے۔ جبری معلوم ہوتا ہے اور فرد کے شعور کے لئے جو نشو و نما کی حالت میں ہے یہ ایک باہر سے آنے والے واجب التعمیل حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بیرونی حکم کے ساتھ فرد کا رویہ دو طرح کا ہوسکتا ہے یا تو (۱) وہ اس سے اتفاق رکھتا ہے اور اسے خوشی سے قبول کرتا ہے۔ اس صورت میں جبر تبدیل ہو کر اختیار بن جاتا ہے۔ باوجودیکہ اس کا ماخذ فرد نہیں بلکہ سماج ہے اور یا (۲) فرد کے عقیدہ یا قوت تحمل میں اور اجتماعی اخلاق میں نزاع پیش آتی ہے۔ سماج کے نقطۂ نظر سے یہ اجتماع ہمیشہ اخلاقاً ناپسندیدہ ہے لیکن فرد کے نقطۂ نظر سے اس کا احساس یا تو (الف) قصور کی حیثیت سے ہوتا ہے اور یا (ب) بلند تر اخلاقی نصب العین کی حیثیت سے۔ دوسری صورت میں اخلاقی عین کے نقطۂ نظر سے فرد کا اخلاقی معیار جماعت کے اخلاق سے بڑھ جاتا ہے۔ اب ہمیں ان اصولوں سے نفسیات شباب میں کام لینا ہے۔ اس کے تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ بچپن کے زمانے میں جبری اخلاق کا غلبہ ہوتا ہے یہ سچ ہے کہ نیکی کی طرف شخصی رجحان اس عمر میں بھی ہوتا ہے اور اسے بچے اپنی طفلانہ زندگی میں اس لطافت سے برتتے ہیں کہ بعض اوقات خود ان کے مربی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ لیکن بچہ کا ذاتی ضمیر ہنوز اخلاق آفریں نہیں ہوتا۔ اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد مستقل تنقید یا اختیار پر ہو۔ عام طور پر بچے وہی "مانتے" ہیں جسے والدین یا استاد اچھا کہیں۔ اور یہ احکام اس وقت تک ایک خاموش عمل انتقال کے ذریعہ خود ساختہ قانون یعنی ذاتی اخلاقی انتخاب کا موضوع بنتے جاتے ہیں جب تک وہ خود اپنی جبلتوں کے خلاف نہ

واقع ہوں۔ آسان پسند طریقہ تعلیم اس صورت حال سے فائدہ اٹھاکر بچوں کو یہ سمجھا دیتا ہے کہ جو کچھ "لوگ" کہیں وہی اعلیٰ اخلاقی نصب العین ہے کس قدر غلط اور گمراہ کن ہی یہ اصول بھلا کہیں خیر و شر کا فیصلہ کثرت رائے سے ہوتا ہے؟ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ یہ کن لوگوں کی رائے ہے اور بچوں کو خودداری اور ہردلعزیزی کا سبق پڑھانا اُسی وقت کچھ معنی رکھتا ہی جب سابقہ اچھے لوگوں سے ہو مگر یہ بحث اصل میں تعلیمات سے تعلق رکھتی ہے۔

جہاں تک بچے کی جبلتوں کا تعلق ہے اُسے مروجہ اخلاق سے جس کی پابندی پر وہ مجبور کیا جاتا ہے اکثر نزاع پیش آتی ہے۔ بچے کا بھولا بھالا احساس زندگی ہنوز اس قدیم دفتر حکمت کے سمجھنے سے بہت دور ہوتا ہے اور یہ ناممکن ہی کہ وہ اس چیز کی ایسی بے غرض تائید کرے جیسی بڑے کرتے ہیں جو عملاً اس سے انحراف کرتے وقت بھی دل میں اس کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں عہد طفلی کے اختتام پر بچے کے دل میں جتنا زیادہ شخصی قوت کا احساس پیدا ہو اسی قدر سختی سے وہ مروجہ اخلاق سے لڑتا ہے۔ لیکن یہ ہم پھر کہے دیتے ہیں کہ اس بات کا شعور بچہ کو شاذونادر ہی ہوتا ہی کہ وہ اپنے ذاتی بلند تر اخلاقی احساس سے خارجی پابندیوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اخلاقی ارتقا میں ایک نہایت اہم منزل ہے۔ عہد شباب اس اعتبار سے بھی بہت نازک زمانہ ہی۔ اس عہد کا آغاز اس طرح بھی ہوتا ہے کہ انسان مروجہ سماجی اخلاق میں حصہ لینے اور بذات خود اُسے سمجھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کرے۔ اس بہترین صورت میں بھی کسی نہ کسی حد تک نزاع کا پیش آنا ضروری ہے۔ لیکن یہاں اس کا وہ رنگ نہیں ہوتا جو بچے کی زندگی میں ہوتا ہے۔ نوجوان اپنے ماحول کے اخلاقی اصول کے اعتبار سے کتنا ہی قصور وار کیوں نہ ہو اس کی ترکیب نفسی میں بالکل نیا پہلو یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی نزاع میں اُسے اپنے ذاتی اخلاقی "حق" کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی حیثیت محض ایک گنہگار کی نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسے شخص کی جو اخلاقی کشمکش کے گرداب میں مبتلا ہو۔

اگر ہم اُس کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنا چاہیں جو نوجوانوں کی اخلاقی احساس میں ہوتی

ہے تو ان کی مجموعی جسمانی اور نفسی حالت پر نظر کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ان کا نظریہ اخلاق "یہ ہے کہ حق قوت کی نسبت سے ہوتا ہے یا یہ کہ ہر شخص کو حق ہے کہ زندگی سے غیر محدود لطف اٹھائے۔ گہرا اخلاقی احساس ہمیشہ ایک کشمکش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ موجودہ صورت میں نوجوانوں کو ایک سچی اخلاقی کشمکش پیش آتی ہے اور اسی طرح کی واردات زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی گذر سکتی ہے؛ مختصر یہ کہ عہد شباب میں اخلاقی احساس وعمل کا نیا پہلو یہ ہے کہ نوجوانوں کو اخلاقی شعور کے ساتھ اندرونی نزاع اور کشمکش کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

بچوں کی اخلاقی ارتقا جس طرح ہوتی ہے اور جو صورتیں اختیار کرتی ہے اس کا اب تک ہمیں بہت کم علم ہے۔ لیکن ذیل کی چند باتیں یقینی ہیں اس لئے ہم ان پر زور دے سکتے ہیں۔ بچوں کی اخلاقی نشوونما پر ان کے ماحول کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ وہ بچے جنھوں نے گہرے اخلاقی ماحول میں ایسے تعلیمی ارادے کے سائے میں پرورش پائی ہے جو ہمیشہ سچی اخلاقی روح پر زور دیتا ہے اور اس کے مخالف رجحانات کو دباتا ہے، ان بچوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں جو منافی اخلاق ماحول میں تعلیم پاتے ہیں کہ جہاں سوائے مدرسے کے اثر کے اور کوئی تربیت دینے والی قوت نہ ہو۔ (یہ اختلاف اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کا پابند نہیں بلکہ شاید وہ طبقے جنھیں اخلاقی مسائل میں کشمکش پیش آتی ہے ان سے اچھے رہتے ہیں جو عمدہ اصول کو بلارد وقدح مانتے ہوں) پہلی صورت میں بچہ آسانی سے خود بخود اخلاقی تعلیم قبول کرلیتا ہے لیکن اس میں غالباً وہ پختگی نہیں ہوتی جو اخلاقی کشمکش سے گذرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ دوسری صورت میں غالباً اسے اس واردات قلبی کا جس میں اخلاقی احکام محض روایات یا من مانے اصول نہیں بلکہ ناگزیر ذاتی اور طبعی رجحانات معلوم ہوتے ہیں مطلق شعور نہیں ہوتا یا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ لیکن عموماً بہت کم بچے محض نیکی یا محض بدی کے ماحول میں رہتے ہیں۔ زیادہ تعداد ایسی ہے جو نور وظلمت دونوں کی سیر کرتے ہیں ان کی وہ حالت ہوتی ہے جو ڈیلیان کی یا

کی بچپن میں تھی۔ یہ دو رنگی خطرناک ہے لیکن موافق حالات میں خطرے بھی مفید ہیں۔ چنانچہ اخلاقی خطروں سے بہت اچھے اخلاقی نتائج نکلتے ہیں بشرطیکہ عین وقت پر ضروری مدد پہنچ جائے۔

اصل میں نفسیات کا کام یہ ہے کہ عمر کے مختلف مدارج میں نفس کی شعوری کیفیت خصوصاً پختہ اخلاقی صلاحیت (خواہ وہ نیکی کی ہو یا بدی کی) اور شخصی ضمیر کی حالت اس طرح دکھائے کہ اُس عمر کی خصوصیات واضح ہو جائیں۔ لیکن ان چیزوں کا احصار بہت دشوار ہے اور جو طریقے اب تک اختیار کئے گئے ہیں وہ غلط ہیں۔ عام خیال یہ تھا کہ بچوں اور نوجوانوں سے اہم اخلاقی اصطلاحات کی تعریف کرانے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان میں اخلاقی احکام کا احساس ہے یا نہیں۔ اس سے عجیب غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اخلاق اور علم الاخلاق میں خلط مبحث ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ بچوں میں بعض چیزوں کا اخلاقی احساس اور عمل موجود ہو لیکن وہ ان کے اخلاقی معانی کا شعور نہ رکھتے ہوں یا انہیں الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ سچ پوچھئے تو بچوں پر کیا موقوف ہے بڑوں میں بھی ایسے کم نکلیں گے جو اس میں کامیاب ہوں۔ خالص ذہنی نقطۂ نظر سے بھی یہ فرض کر لینا غلط ہے کہ اگر کوئی شخص کسی معنی کی "تعریف" نہ کر سکے تو وہ اس سے بالکل ناآشنا ہے۔ اصل میں ضرورت اس کی ہے کہ عملی طرز و روش کا مشاہدہ کیا جائے۔ بچوں اور نوجوانوں کے خیالات ارسطو کی منطقی اصطلاحات کے پابند نہیں بلکہ مجموعی حیات سے نامی اور زندہ تعلق رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بچوں کے اخلاقی شعور میں کسی نیکی کا خیال راسخ ہو چکا ہو (خصوصاً اس صورت میں جب وہ اس کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکے ہوں) لیکن اس کا صحیح نام انھیں نہ معلوم ہو۔ سترہ برس کی عمر سے پہلے اخلاقی معانی کا علم چند مروجہ اصطلاحات تک محدود ہوتا ہے بلکہ ان کے استعمال میں بھی اکثر خلط مبحث ہو جاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو خود فلسفیوں کے یہاں بھی علم الاخلاق اور اخلاق میں ہمیشہ مطابقت ہونا ضروری نہیں۔ سقراط اسی عدم مطابقت کے اظہار سے لوگوں کے دل میں اخلاقی بیداری پیدا کرنے کا کام لیا کرتا تھا۔ اس کی تعلیمی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ نوجوانوں پر بار بار یہ ثابت کرتا تھا "تمہارے دل میں ایک مستحکم اخلاقی نقطہ پنہاں ہے لیکن تم اسے معنی کی شکل میں لا کر ظاہر نہیں کر سکتے۔ اسی سبب سے تم میں اب تک

اخلاقی ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی"۔ افلاطون کے ان مکالمات سے جن میں واقعی سقراط کے خیالات ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ سقراط سارا زور اس بات پر دیتا ہے کہ لوگوں سے تعریفات کی فرمائش کرکے ان کے اخلاقی سرمایہ کو نمایاں اور مستحکم کرے۔ چنانچہ اگر وہ کسی نوجوان کے دل میں احتساب نفس کی خواہش بجلی کی طرح دوڑا دے تو پھر اسے اس کی پروا نہیں رہتی کہ ساری بحث کا کوئی علمی نتیجہ نکلا یا نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اس اندرونی تحریک کا اثر خود بخود بڑھتا جائے گا۔ اس کی کوشش وہ کبھی بھول کر بھی نہیں کرتا کہ اخلاقی معانی "بیان" کرے یا اخلاقی اصول کی "تعلیم" دے۔ خود اسی کے الفاظ میں اس کا کام محض یہ ہے کہ دائی کی طرح جننے میں مدد دے یعنی اس اخلاقی رجحان کو جو انسانوں میں ودیعت کیا گیا ہے ابھارے۔

اگرچہ اخلاقی علم اور اخلاقی احساس یا اخلاقی زندگی میں بہت فرق ہے پھر بھی بچوں سے اخلاقی امور کے متعلق سوالات کرنے یا عام اخلاقی معانی کی تعریف کرانے سے کچھ نہ کچھ مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ شرط ہے کہ اگر بچوں کا اخلاقی علم ناقص ہو تو اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ ان میں اخلاقی احساس یا اخلاقی رجحان کی کمی ہے۔ پولمان نے بغیر کسی معقول نفسیاتی یا منطقی نظریہ کی مدد کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ عام ابتدائی[1] مدرسوں کی آٹھوں درجوں میں لڑکے اخلاقی معانی سے کس حد تک واقفیت رکھتے ہیں۔ ہم یہاں اس کا ایک تجربہ مثال کے طور پر نقل کرتے ہیں تاکہ اس طریقہ کی خامیوں کا اندازہ ہو سکے۔

---

[1] جرمنی میں ہر بچے کے لئے چھ برس کی عمر سے لے کر چودہ برس کی عمر تک تعلیم پانا لازمی ہے۔ غربا، عام طور پر اس عمر کے بعد اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلا سکتے۔ چنانچہ ان کے لئے علیحدہ آٹھ درجے کے مدارس قائم کئے گئے ہیں جو *Volksschulen* کہلاتے ہیں۔ ہم نے اس لفظ کا ترجمہ عام ابتدائی مدارس کیا ہے۔

گناہ کیا ہے؟

سال اول

۱۔ "جب انسان روٹی پھینکدے"

۲۔ "کسی کام کو گناہ کیوں کہتے ہیں معلوم نہیں اللہ میاں اس سے خفا ہوتے ہیں"

۳۔ "جھوٹ گناہ نہیں۔ آدمی فقط جھوٹ ہی تو بولتا"

سال چہارم

۱۔ "جب آدمی خدا کے حکم کے خلاف کرے تو گناہ ہوتا ہے"

۲۔ "برے آدمی گناہ کرتے ہیں"

۳۔ "میں بھی کرتا ہوں لیکن یہ تو ہم سب کر چکے ہیں مگر ہمیشہ نہیں بہت کم"

سال ششم

۱۔ "گناہ ان چیزوں کو کہتے ہیں جن سے خدا نے منع کیا ہے"

۲۔ "آدمی کو خود ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کام نہ کرنا چاہئے"

۳۔ "مگر سب ہی لوگ گناہ کرتے ہیں۔ میں بھی کرتا ہوں مگر خوشی سے نہیں۔ مجھے معلوم نہیں یہ کیسے ہوتا ہے"

سال ہشتم

۱۔ "گناہ ہر اس فعل یا خیال کو کہتے ہیں جو خدا کے احکام کے مخالف ہو"

۲۔ "ہر شخص عادلانہ احساس سے جو اس میں ہوتا ہے یہ حکم لگاتا ہے کہ کونسا کام گناہ ہے"

۳۔ گناہ کس طرح واقع ہوتا ہے یہ مجھے معلوم نہیں مگر برے افعال برے خیالات سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض آدمی اتنے برے ہوتے ہیں کہ انھیں اس

آپ دیکھتے ہیں کہ اس طریقہ سے زیادہ کام نہیں چلتا۔ ابتدا میں تو بچے الحمد للہ اس کے عادی نہیں ہوتے کہ اپنے خیالات میں منفرد الفاظ اور مجرد معانی سے کام لیں۔ اور آگے چلکر وہ ایسے سوالات کے جواب میں وہی باتیں کہہ دیتے ہیں جو ان کو پڑھائی گئی ہیں۔

خاص عنفوان شباب کی عمر سے متعلق لاؤ نے تین محرک الفاظ کے طریقہ کی مدد سے تحقیقات کی ہے۔ اس طریقہ کے مفید ہونے کی نسبت ہم پہلے ہی شبہ ظاہر کر چکے ہیں۔ علاوہ اس کے ذہانت اور اخلاقی پختگی کو مساوی سمجھنے میں ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ مثلاً اسے ہم سوائے قوت ترکیب کی کمی کے کیا سمجھیں کہ ایک عوام کے ثانوی مدرسہ کے چہاردہ سالہ غبی" طالب علم نے بہکانا۔ پشیمانی مزاحمت جیسے بے جوڑ الفاظ کو ملا کر (جنھیں دیکھکر بہت سے "ذہین" طالب علم بھی گھبرا جائیں گے) ذیل کے جملے بنائے "اگر کوئی چوری کرے اور پکڑا جائے تو اسے پشیمانی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کے بہکانے میں آجاتے ہیں۔ اگر کچھ لوگ آپس میں مارپیٹ کریں تو وہ مزاحمت کرتے ہیں" چودہ سال کی عمر کے غبی طالب علم اگر پشیمانی کے معنی پکڑا جانا سمجھیں تو کیا تعجب ہے۔ لیکن اس سے محض یہ

---

(۱) یہ طریقہ نفسیات شباب اور نفسیات طفلی کی تحقیقات میں اکثر استعمال ہوتا ہے۔ تجربہ کرنے والا تین الفاظ بتاتا ہے جنھیں باہم کوئی تعلق نہ ہو اور نوجوانوں اور بچوں سے کہتا ہے کہ ان کو ملا کر پورا جملہ بناؤ۔ اب جس طریقہ سے وہ ان چیزوں میں ربط پیدا کرے اس سے اس کی ذہنی سیرت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ شاعرانہ صنعت کی حیثیت سے یہ چیز ہماری زبان میں انمل کی صورت میں موجود ہے۔

(۲) غربا کے ان بچوں کو جو خاص طور پر محنتی اور ذہین ہوں ابتدائی جبری تعلیم کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفے دیئے جاتے ہیں۔ اور ان کے لئے علیحدہ ثانوی مدارس ہیں جو Fortbildungsschulen کہلاتے ہیں۔ ہم نے اس لفظ کا ترجمہ عوام کے ثانوی مدارس کیا ہے۔

ثابت ہوتا ہے کہ کمزور دماغ کے لوگوں کے ذہن میں پشیمانی کا واضح تصور صرف اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ ناکامیابی کو اس کا پیش خیمہ سمجھیں لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا کہ خود یہ لوگ جب تک کوئی جرم کرکے پکڑے نہ جائیں اس وقت تک انھیں پشیمانی کا احساس نہیں ہوتا اس لئے ان تجربات کی تفسیر کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ ان کی اصلی اہمیت ایک دوسرے پہلو سے ہے۔ ان سے ہمیں یہ اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے کہ بڑے شہروں میں عوام کے ثانوی مدارس کے طلبہ اور طالبات کو کن کن اخلاقی آزمائشوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ یعنی ان سے ایسا مواد تو ملسکتا ہے جس کی بنا پر حکم لگایا جاسکے کہ بچوں کو آئندہ کیا اخلاقی مواقع پیش آئیں گے۔ لیکن ایسے نتائج بہت کم حاصل ہوتے ہیں جن سے معلوم ہو سکے کہ ان میں کس حد تک اخلاقی استحکام اور پختگی ہے۔ ایسے سوالات کا تحریری جواب دیتے وقت جو سکون ہوتا ہے وہ اکثر واقعی آزمائش کی گرمی اور شورش کی تاب نہیں لاسکتا۔ "اپنے ہم سبقوں کو نہ پیٹو" یہ ایک عام اور مسلم قانون ہے۔ لیکن ہر لڑکا یہ سمجھتا ہے کہ میں جو اس وقت اپنا ہاتھ نہیں روک سکا اور اپنے ساتھی کو ایک چانٹا رسید کر بیٹھا یہ ایک بالکل جداگانہ امر ہے۔ لاڈ کے اس قول سے کہ (فرض۔ والدین۔ مسرت) کی ترکیب میں فرض کا استعمال غبی لڑکے بھی صحیح کرتے ہیں۔ ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ سب کے دل میں فرض کا احساس ہوتا ہے بلکہ ہمارے نزدیک اس کا یہ ضمنی فقرہ زیادہ اہم ہے کہ ان الفاظ کی ترکیب میں بچوں نے دلچسپی ظاہر نہیں کی۔

اتنا تو ہم بغیر تجربہ اور مشاہدہ کی مدد کے کہہ سکتے ہیں کہ جن بچوں کو چودہ برس کی عمر تک تقلیدی تربیت دی گئی اور ان کا احساس قدور پختہ نہیں ہوا ہے ان کے لئے بعض اوقات وہ آزمائشیں جو زمانۂ بلوغ کی نئی قابو میں نہ آنے والی جبلتوں سے پیدا ہوتی ہیں بہت خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ اگر ان کا اخلاق محض تقلیدی ہے یعنی اگر انھوں نے اُسے اپنے مستقل ذاتی احساس قدور کی تعمیر میں جگہ نہیں دی ہے تو یہ انجام ہوتا ہے کہ وہ ان باتوں میں جو انھیں نامرغوب ہوں اپنے تربیت کرنیوالوں کی تقلید چھوڑ کر کسی دوسرے کی تقلید کرنے لگتے ہیں جو انکی دلکی بات کہتا ہو اسلئے ہمیں ایسے طریقۂ تربیت سے پرہیز کرنا چاہئے جس میں ابتدا ہی سے اس کا خیال نہ رکھا گیا ہو کہ بچہ اچھی باتوں کی تقلید اپنی مرضی

سے کرے اور اپنے باطن کے اس نقطے کو دریافت کرے جہاں خیر مطلق کی آرزو ہوتی ہے۔ اسی طرح بچے کم سنی میں اخلاقی قوانین کو بغیر اس خاص شعور کے قبول کر لیتے ہیں جسے ہم نے تفکر کہا ہے اور عنفوان شباب کی نئی نفسی خصوصیت قرار دیا ہے۔

لیکن جن بچوں میں تقلیدی احساس اخلاقی اخلاق عنفوان شباب سے پہلے خودساختہ قانون کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ان میں زمانہ بلوغ میں دو مخصوص کیفیتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

نوجوان یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ جو مطالبہ ہماری سماج دوسروں سے کرتی ہے اُس میں اور خود اس کی عام سیرت اور افعال میں بہت فرق ہے۔ اگر نوجوان محض یہ محسوس کرتا کہ لوگوں کا اخلاقی سرمایہ سماج کے اخلاقی احکام سے پست ہے تو شاید اُسے اتنا سخت صدمہ نہ ہوتا۔ لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ لوگ دوسروں سے ان اخلاقی قوانین کی پابندی چاہتے ہیں جن پر وہ خود عمل نہیں کرتے بلکہ جن کے وہ اصولاً بھی زیادہ قائل نہیں ہوتے تو اُسے ان کے قول اور فعل میں شدید تفاوت اور اُن کی بے ایمانی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی نظریں پہلی بار ظاہر اور باطن کی دوئی یعنی اس ریاکاری کو دیکھتی ہیں۔ اور غضب یہ ہے کہ یہ انکشاف صرف غیروں کے متعلق نہیں ہوتا بلکہ خود اپنے اقربا، والدین معلم وغیرہ کی وہ تصویر جواب تک ذہن میں تھی بدل جاتی ہے۔ یہ واقعیت کا علم ایک نیا عنصر ہے۔ جس کی بدولت نوجوان مشاہدۂ نفس میں محو ہو جاتا ہے اور اپنے دل سے پوچھتا ہے "اب کسے رہنما کرے کوئی"۔ اس انکشاف کا اثر مختلف نوجوانوں پر ان کے اخلاقی سرمایہ کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ بعض تو اخلاقی معاملات پر سنجیدگی سے غور کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور اخلاق کو بھی اسی طرح ایک بچوں کو ڈرانے والی فرضی چیز سمجھ لیتے ہیں جیسے انہوں نے بچپن کا زمانہ گذرنے کے بعد ہوّے کو سمجھا تھا۔ اور بعض پہلے سے بھی زیادہ عالم عینی میں ڈوب جاتے ہیں اور اخلاقی اعیان کو واقعیت کی زہریلی ہوا سے بچا کر اپنی دل کی گہرائی میں تبرکات کی طرح رکھتے ہیں جن کا وہ کبھی ذکر نہیں کرتے لیکن جن سے ان کی روح کو ایک طلسمی قوت حاصل ہوتی ہے۔ پہلی قسم کا تجربہ

کو دیکھنے میں روز بروز تیز ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اخلاق ان کے نزدیک ایک بے معنی چیز رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر یہاں تک نوبت نہ پہنچے تو یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ تقلیدی اخلاق سے دست کش ہو جاتے ہیں اور ان میں وہ دوسری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا ہم آگے ذکر کرتے ہیں۔

عنفوان شباب کے ساتھ انسان میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بجائے دوسروں کی رائے کی پابندی کرنے کے خود رائے قائم کرے یا بالفاظ دیگر بجائے دوسروں سے تعلیم پانے کے اپنے آپ کو تعلیم دے۔ اب وہ دوسروں کے اخلاقی احکام کو چپ چاپ قبول نہیں کرتا بلکہ تنقید اور غور سے کام لینے لگتا ہے۔ یہی صورت نفسی ارتقا کے لئے زیادہ مفید ہے۔ یہی وہ نتیجہ خیز تشکیک ہے جو خارجی برباد شدہ دنیا کو داخلی پہلو سے از سر نو تعمیر کرتی ہے۔

اس اخلاقی تعمیر کے عمل کو ہم یہاں خود نوجوان کی کارگذاری سمجھ سکتے ہیں۔ آگے چلکر معلوم ہوگا کہ اس میں دوسروں کی تقلید کا بھی نمایاں حصہ ہوتا ہے لیکن اس تقلید کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ اخلاقی استقلال کے نشو و نما کا پہلا درجہ جس پر مشاہدہ کرنے والے کی نظر آسانی سے پڑتی ہے یہ ہے کہ نوجوان عام قوانین کی سختی سے پابندی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اصولی اخلاق کی منزل ہے جس کے ساتھ اخلاقی تشدد لازمی ہے جیسا ہم کانٹ کے یہاں دیکھتے ہیں۔ ہمارا نوجوان بطور خود قدر اور عمل کے احکام کا ایک نظام تیار کرتا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کے لئے قاعدے بناتا ہے۔ نشست و برخاست خورونوش دوستوں کا انتخاب اور ان کا برتاؤ۔ دعوتوں اور تفریحی صحبتوں میں شریک ہونا، لڑکیوں سے ملنا جلنا، مالی معاملات، اپنے پیشے کا انجام دینا غرض کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جس کے لئے وہ اصول نہ مقرر کرے۔ ان سب باتوں میں وہ تصنع اور تکلف سے کام لیتا ہے کیونکہ یہ ابھی تک قدرت کے بنائے ہوئے پیر ہیں جن سے انسان چلتا ہے بلکہ بیسا کھیاں ہیں جن سے وہ بہ دقت گھسٹتا ہے۔ انسان کو اپنے آپ پر اعتبار نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنے اوپر سخت قیود عاید کرتا ہے۔ قلب کی گہرائی میں رہنے والے شدید جذبات

ہوتے ہیں۔ نوجوان لوگ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اہم اور غیر اہم ہر طرح کے مسائل کی بابت کہتے ہیں "میں اس معاملے میں معینہ اصول پر عمل کرتا ہوں"۔ ظاہر ہے کہ ان اصولوں کی تعمیر زندگی کی بنیاد پر نہیں ہوئی ہے اس لئے وہ بہت عام ہیں اور نازک موقعوں پر ان سے کام نہیں چلتا۔ لیکن نوجوانوں میں ابھی یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کلی اصولوں اور انفرادی صورتوں میں مطابقت پیدا کرسکیں۔ قدرتی بات ہے کہ نوجوان ان اصولوں کی پابندی کے دوسروں سے بلکہ ساری دنیا سے طالب ہوتے ہیں۔ اس طرح نوجوان اصلاح زندگی کا لائحہ عمل بنایا کرتے ہیں۔ اس کا موضوع حفظانِ صحت، جنسی، اخلاق، صداقت، حقوق انسانی، صلح پسندی، عیش پرستی کی مخالفت وغیرہ ہوتے ہیں۔ دنیا کی اصلاح کی خواہش نوجوانوں کی سیرت کے بہترین اور پاک ترین پہلو سے پیدا ہوتی ہے۔ باوجود اس کے یہ اخلاقی تلقین اس لحاظ سے عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس کے کرنیوالوں نے دنیا کو جسے وہ بدلنا چاہتے ہیں محض دور سے دیکھا ہے اور انھیں ابھی تک اس سے مستحکم تعلق نہیں پیدا ہوا ہے۔ اس کا اصلی مقصد جو خود انھیں بھی معلوم نہیں یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے آپ سے اپنی محافظت کے لئے ایک زرہ تیار کریں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انضباط نفس اس صورت میں بہت آسان ہوجاتا ہے جب بہت سے لوگ مل کر اس کی کوشش کریں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نوجوانوں کے اس اخلاقی تشدد میں ان کے خیالات کی سادگی کو بھی دخل ہو۔ یہ اسے ممکن سمجھتے ہیں کہ زندگی کو خصوصاً ان شعبہ ہائے زندگی کو جن سے ان کے ذاتی جذبات وابستہ نہوں اخلاقی حیثیت سے مکمل بنادیں۔

یہی سبب ہے کہ نوجوانوں میں رواقی[1] کثرت سے ہوتے ہیں۔ اصل میں تو نوجواں کے نفس کو رواقی مشرب سے بہت بعد ہوتا ہے۔ رواقیت کا اصل اصول یہ ہے کہ تخیل کو قابو میں رکھا

---

[1] رواقی Stoics کا ترجمہ ہے۔ یہ یونانی فلسفیوں کے ایک گروہ کا نام ہے جن کے نزدیک سوائے نیکی کے دنیا کی کوئی چیز قدر نہیں رکھتی۔

جائے تاکہ وہ دنیاوی لذات کے جال میں نہ پھنس جائے اور اپنی جبلی خواہشوں اور جذبوں کو جو رواقیوں
کے نزدیک عقل کی بیماریاں ہیں روکا جائے۔ نوجوانوں کا نفس ہرگز اس راہبانہ نصب العین کو پسند
نہیں کرتا لیکن وہ اسے بہ طور ایک سپر کے خود اپنے تخیل اور جذبات کی شورش سے بچنے کے لئے
استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنے طرز زندگی کی بنیاد ضبط نفس کے ایک شدید نظام پر رکھنا چاہتا ہے۔ اگر
یہ روح نوجوانوں کی ایک پوری جماعت میں سرایت کر جائے تو وہ سختی کے ساتھ ایک دوسرے
کی نگرانی کرتے ہیں ایک دوسرے کی سیرت کے خطرناک گوشوں پر نظر رکھتے ہیں اور اسی مشکل
معیار پر ساری دنیا کو پرکھتے ہیں۔

اس اصولی اخلاق کی منزل سے گذرنے کے بعد اکثر بہت جلد نوجوان یہ کوشش کرتے
ہیں کہ اخلاقی اصول کو انفرادی حالت کے مطابق بنائیں۔ جتنا زیادہ ایک نوجوان اپنے نفس کے
مشاہدے میں ڈوبتا ہے اپنی بیکران داخلی زندگی سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور اس کی اہمیت
میں مبالغہ کرتا ہے اسی قدر شدت سے اس میں یہ عمل شروع ہوتا ہے کہ عام اخلاقی قوانین کو انفرادی
نقطۂ نظر سے دیکھے۔ اب وہ یا تو گوئٹے کے ویرتھر کی طرح اپنے آئینہ دل کو "بجا بجا کے" رکھتا ہے یا ان
سوفسطائیوں کی طرح اخلاق کی مخالفت کرتا ہے جن کی تصویر افلاطون نے گورگیاس میں اور ریاست
کے پہلے حصہ میں نہایت خوبی سے کھینچی ہے یا اگر اس میں کافی اخلاقی سرمایہ ہو تو وہ خود اپنی سیرت
کی تشکیل کرنے لگتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اپنی تعلیم یعنی اپنی ذات کی
مجموعی تہذیب کیا چیز ہے۔

اس عمر میں نوجوان کو اپنی ترکیب نفسی کی فطری داخلیت کے سبب سے ہمیشہ خطرہ رہتا ہے کہ کہیں
وہ انتہائی انفرادیت پرستی میں مبتلا نہ ہو جائے۔ موجودہ زمانے میں جو اجتماعی روح پیدا کی گئی ہے اس
میں یہ چیز اکثر اشتراکیت اور جمہوریت کے عقائد کے پردے میں نظر آتی ہے۔ اور عہد شباب
میں تو زندگی کا مرکزی عزم للحیات اور عزم للقوۃ ہوتا ہے۔ بہت کم یہ نظر آتا ہے کہ نوجوان جذبۂ
انس پر مبنی اخلاق کے قائل ہوں اگر ایسا ہو تو اسے کلیہ کا استثنا سمجھنا چاہئے اور اس کے اسباب

کی جستجو کرنا چاہئے۔ اکثر یہ اخلاق نوجوان اسی رہبانیت کے سلسلہ میں اختیار کرتے ہیں اور اپنے
فطری رجحان کی مخالف قوتوں کو کوشش کرکے بیدار کرتے ہیں۔ فطری چیز تو اس عمر میں محض
زندگی کی خواہش ہے۔ "زندگی کا پورا لطف اٹھانا" نوجوانوں کا مخصوص مشرب ہے۔ یہ بھی نوجوانوں
ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ کبھی اپنے دل سے یہ سوال نہیں کرتے کہ ان کے نفس کا کون سا
پہلو زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے بیقرار ہے۔

ایک اور خصوصیت جس پر فوراً نظر پڑتی ہے وہ اخلاقی بیدردی ہے جو سترہ سے چوبیس
سال تک کی عمر والے نوجوان اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ برتتے ہیں۔ انھیں دوسروں
کی داخلی زندگی سے حال ہی میں واقفیت ہوئی ہے۔ وہ اکثر ان لوگوں کا جن سے انھیں محبت
ہے دل دکھاتے ہیں تاکہ خود اپنا دل دکھے۔ یہ دل آزاری اور خود آزاری بھی ان کی ایک مخصوص صفت
ہے۔ اس میں مختلف نفسی عناصر شریک ہوتے ہیں اول تو بچوں کو جسمانی اذیت پہنچانے میں مثلاً
جانوروں کو تکلیف دینے میں جو عجیب قسم کی خوشی ہوتی ہے اس سے ملتی جلتی کوئی چیز نوجوانوں میں بھی
ہوتی ہے۔ انھیں روحانی صدمہ پہنچانے میں لطف آتا ہے۔ یہ اصل میں ایک تجربہ ہے جو انسان
دوسروں کے نفس کے ساتھ کرتا ہے کہ "دیکھیں اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے، کیا وہ اس اذیت کے
امتحان میں پورا اترے گا"! علاوہ اس کے اپنے نفس کے ساتھ بھی وہ اخلاقی تجربہ کرتا ہے جس میں
ہمیشہ یہ سوال پنہاں ہوتا ہے کہ "میں کس حد تک ظلم کرسکتا ہوں"! جو شخص باہر سے ان چیزوں کا
مشاہدہ کرتا ہے اُسے نوجوان کی اس اخلاقی پستی سے حیرت اور نفرت ہوتی ہے لیکن اگر ارتقائے
نفس کے سلسلہ میں دیکھئے تو یہ کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں۔ اسے ہم اس منظر سے تشبیہ دے
سکتے ہیں جہاں ایک بچہ تجربہ کرنے کے لئے پہلی بار کسی اونچی دیوار سے کودتا ہے اور پکار
اُٹھتا ہے "دیکھو ہم کہاں سے کودے"! اگر انسان کو مضبوط اور جری بننا ہے تو اس کے لئے
خطرے کے پوشیدہ لطف کا مزا چکھنا ضروری ہے۔ البتہ غریب ماں باپ کی موت ہے
جو اس تجربے کو نہیں سمجھتے اور اس کے علاوہ بعض نوجوان ان خبیث روحوں سے جنھیں انھوں نے

خود بلایا تھا کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ یعنی ان کی طبیعت میں سنگ دلی راسخ ہو جاتی ہے۔ انھیں اس کا احساس نہیں ہوتا کہ تجربہ بالکل ناکامیاب ثابت ہوا۔ بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے قوی اور جواں مرد بن گئے ہیں۔ اس عمر میں سچی مردانگی حاصل کرنے کی کوشش اکثر ناکامیاب ہوتی ہے۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ طبیعت میں خود سری اور ضد پیدا ہو جاتی ہے یعنی بچپن اور لڑکپن کا طرز زندگی عود کر آتا ہے اور ان اخلاقی پیچیدگیوں کو دور کرنے میں اکثر کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔

مردانگی حاصل کرنے کی ناکامیاب کوشش کی ذیل میں اور بہت سے اخلاقی ارتقائی مظاہر ہیں۔ مرد بننے کی جستجو میں اکثر نوجوان عجیب فضولیات پڑ جاتے ہیں۔ موچھوں پر تاؤ دینے اور گالیاں بکنے سے لیکر عیاشی کی بدترین حرکتوں تک جن میں کچھ نہ کچھ جرأت واستقلال کی ضرورت ہے جتنی مردی کی ظاہری علامات ہیں وہ سب یہ لوگ اختیار کر لیتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس لڑکیوں کو بھی عورت بننے کی ہوس ہوتی ہے البتہ ان کی زندگی کا مرکز غلط معنی میں ایثار اور محبت کا نصب العین ہوتا ہے۔ زندگی کی بھول بھلیاں میں پھنسکر دونوں جنسیں بلندی پر پہنچنے کی کوشش غلط زینے سے کرتی ہیں اور جو کوئی اس زینے پر چڑھ جاتا ہے اس کے لئے پھر اترنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

اور یوں بھی عموماً نوجوانوں کے نفس کو یہ اخلاقی تجربہ ہوتا ہے کہ اکثر ایسی لغزشوں سے جو بجائے خود بے ضرر ہوتی ہیں انسان جرم وخطا کے جال میں پھنس جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ایک تنگ پنجرے میں قید ہو گیا ہے اور اب اس کے لئے سر اٹھانا اور سیدھے راستہ پر ایک قدم چلنا بھی دشوار ہے۔ اکثر لوگوں پر یہ کیفیت واقعی نہیں گذرتی بلکہ محض ان کی قوت متخیلہ برائیوں کے تصور میں جکڑ جاتی ہے یا خواہ مخواہ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کی اخلاقی قوت کمزور ہو گئی ہے۔ انھیں اسباب سے خصوصاً اس صورت میں جب نوجوان مذہبی ماحول میں رہتے ہوں ان کے دل میں وہ عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے "خوف گناہ" کہتے ہیں۔ بعض اس خوف سے بالکل نا آشنا ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ معصوم نہیں ہوتے۔ بہ خلاف اس کے بعض لوگوں کے سارے عہد شباب کو یہ روحانی کرب تلخ کر دیتا ہے۔ ان کی ترکیب نفسی کی بدولت

ان میں ایک دوئی آسا تصور کائنات پیدا ہوتا ہے جس میں وہ ان دونوں متضاد روحوں کو جو خود ان کے جسم میں ہوتی ہیں مافوق الطبعی رنگ دے کر دو عالم بنا دیتے ہیں۔ نور و ظلمت کی اس جنگ میں جو ان کے خیال میں دنیا میں برپا ہے وہ خود بھی شریک ہوتے ہیں۔ لیکن وہ محسوس کرتے ہیں کہ پست یا شیطانی عنصر خود ان کے اندر بہت نزدیک موجود ہے۔ اگر اس جنگ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس کی ابتدا ہمیشہ عنفوان شباب کے زمانے میں نظر آئے گی۔ یہ اس موقعہ کی یادگار ہے جب انسان پہلی بار اپنے نفس کا مشاہدہ کرتا ہے اور کراہت کے ساتھ پیچھے ہٹتا ہے یہ ذلت نفس جو انسان محسوس کرتا ہے بعض اوقات ایک مضبوط تعمیری قوت بن جاتی ہے۔

جتنا گہرا انسان اپنے نفس کا مشاہدہ کرتا ہے اِسی شدت سے وہ احتساب نفس بھی کرتا ہے اور یہی احتساب، تہذیب نفس یا تعلیم کی بنیاد ہے۔ بہت کم نوجوان ایسے ہوتے ہیں جو اپنی تعلیم کو اس قدر مکمل سمجھیں کہ انھیں اپنے دل میں مزید تعلیم کی ضرورت نہ محسوس ہو۔ لیکن ان کا رویہ تعلیم کے متعلق بچے کے رویے سے اصولاً مختلف ہے کیونکہ وہ مختلف اثرات میں سے انتخاب کرکے وہ اثر قبول کرتے ہیں جو ان کی تعلیم کے لئے مفید ہو۔ جب اس انتخاب کے ساتھ ضبط نفس اور اپنی سیرت کی شعوری تہذیب کی کوشش بھی شریک ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ زمانہ ختم ہو گیا جب دوسرے اُسے تعلیم دیتے تھے اب وہ اپنے آپ کو تعلیم دے گا۔ اب کسی طرح ممکن نہیں کہ جب تک نوجوان خود نہ چاہے دوسروں کی تعلیمی کوششوں کا اس پر کوئی اثر ہو سکے۔ چنانچہ اس منزل کے بعد سے تعلیم کی صرف یہی صورت ہے کہ نوجوان کے دل میں اپنے آپ کو تعلیم دینے کی صلاحیت ابھاری جائے۔

سقراط لوگوں کو احتساب نفس پر آمادہ کرکے یہ مقصد حاصل کیا کرتا تھا۔ کیونکہ جو شخص اپنی ذات کو ایک "مسئلہ" سمجھ کر اس پر غور کرے گا وہ اس کی اصلاح و ترقی کو ایک "مقصد" سمجھ کر اس کے لئے سعی بھی کرے گا۔ نوجوان اکثر اس معاملہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بہت سنجیدہ اور

قطعی انداز سے کرتے ہیں۔ وہ اپنے روزنامچوں میں نہایت دیانت داری سے اپنی ترقی کی جانچ کرتے ہیں اور اگر وہ اپنے نصب العین سے پیچھے رہ جائیں یا یہ محسوس کریں کہ ترقی کرنے کے بعد پھر تنزل کر رہے ہیں تو دردناک الفاظ میں اپنے رنج کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن نوجوانوں کی (اور اس پر کیا موقوف ہے سب انسانوں کی) قسمت ہی میں یہ ہے کہ انھیں منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے بار بار کوشش کرنا پڑے۔ نوجوانوں کا صحیح احساس زندگی شوپن ہائر کے اس یاس انگیز فلسفہ سے مطلق متاثر نہیں ہوتا کہ انسانی سیرت غیر تغیر پذیر ہے۔ نوجوان کا عقیدہ ہر کام کے متعلق یہ ہوتا ہے میں اسے کر کے چھوڑوں گا"۔ . . . .

اس معاملے میں نوجوان خود بہ خود رہبانیت کے طریقوں سے کام لیتے ہیں جو پرانے زمانہ میں مذہبی اثرات سے وجود میں آئے تھے سب سے مشکل کام ان کے لئے اپنی سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں عموماً اندرونی زندگی کی "توسیع" میں انھیں سہولت ہوتی ہے۔

جن مختلف صورتوں میں نوجوان اپنی تعلیم و تربیت کی کوشش کرتے ہیں ان کی عمدہ مثالیں دیکھنا ہو تو شارلوٹے بوہلر کا شائع کردہ نوجوان لڑکی کا روزنامچہ دیکھئے لیکن کچھ اسی پر موقوف نہیں نوجوانوں کے اعترافات اور خطوط میں ہر جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

مذکورہ بالا روزنامچہ کے بتیسویں صفحہ پر ہے "مجھے اب سب سے پہلے یہ کوشش کرنا چاہئے کہ دوسروں کے اثر سے آزاد ہو جاؤں اور اپنی دنیا آپ بناؤں"۔ پھر چالیسویں صفحہ پر مایوسی کا اظہار ہے" اے کاش انسان کچھ کر سکتا کچھ پا سکتا۔ ساری کوششیں بے سود ہیں بالکل بے سود"۔ اس پوری کتاب کا یہ ایک دلچسپ پہلو ہے کہ ہر دعوے کے ساتھ یا تو فوراً یا ایک سال بعد احتساب نفس ہوتا ہے جو کبھی کبھی نفی ذات یعنی گزشتہ زندگی سے نفرت کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ جرمن ادب میں اپنے آپ کو تعلیم دینے کی بہترین داستان ہرڈر کا روزنامہ سفر ہے جو اس نے ۲۵ برس کی عمر میں ۱۷۶۹ء سے شروع کیا تھا۔ علاوہ اس کے شلائر ماخر اور ہمبولٹ کے عہد شباب کے خطوط سے

زندگی اختیار کرنے سے پہلے وہ اپنے عام انسانی قوئی کی تربیت کریں محض جرمن تحریک انسانیت"
کے اثر کا نتیجہ نہیں سمجھی جاسکتی بلکہ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "انسانیت" کا تعلیمی نظریہ خود اس
نشاۃ ثانیہ پر موقوف ہے جو انسان کی سیرت میں بار بار نمایاں ہوا کرتی ہے۔ یہ جنگ جو انسان
اپنے آپ سے کرتا ہے یوں شروع ہوتی ہے کہ اس کا قلب پہلے پہل ان اخلاقی قوانین کے
وجدانی احساس سے متاثر ہوتا ہے جو خود اس کی ذات کی گہرائیوں سے ابھرتے ہیں اور اس لحاظ
سے گویا خود اس کے بنائے ہوتے ہیں الیزبیتھ کنوخے نے اپنی کتاب میں ایک پندرہ سال کی لڑکی
کی ایک نظم نقل کی ہے جس کا یہ مضمون ہے:۔

اگر تو دنیا میں رہنا چاہے
تو انسان بن کر رہ
اور انسان نام ہے لڑنے والے کا
پس تجھے تلوار سے جھجکنا نہ چاہیئے
اگر تیرا ہاتھ بہادری سے تلوار چلائے
تو یقیناً تو فتح پائے گا۔

اب ہمیں سب سے اہم سوال کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ نوجواں کی اخلاقی ارتقا پر فیصلہ کن اثر
کس چیز کا پڑتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے۔ اس ایک شخص کی ذات کا جسے ہمارا نوجوان انتہائی عقیدت
کے ساتھ اپنا رہنما بنائے۔ اس کی دلی آرزو ہوتی ہے کہ کوئی ایسا شخص مل جائے وہ چاہتا ہے کہ
کوئی اس کا سمجھنے والا ہو جسے وہ اپنے دل کا حال سنائے اور جس کی مدد سے وہ اپنی سیرت کی تشکیل
کرسکے۔ ہم سمجھنے کی اس تعلیمی قوت کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔ اس طرح کے تعلقات میں اگر زیادہ عمر والے
رہنما میں سچی تعلیمی روح موجود ہو تو وہ اپنے کم عمر پیرو کے نفس پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے کہ اُسے

سے کہتا ہے "میں تجھے ایسا انسان سمجھتا ہوں اِس لیئے ضرور تو ایسا ہی ہے" دوسری طرف سرگشتہ جستجو
نوجوان جسے ابھی تک اپنے نفس پر اعتماد نہیں اپنے پختہ کار رہنما کی سیرت کو اپنے لئے شمعِ ہدایت سمجھتا ہے۔
اور اسکی روشنی میں اپنی آئندہ زندگی کی تصویر دیکھتا ہے۔ اگر اس رہنما میں وہ سب صفات موجود ہوں
جو نوجوان کے نزدیک مکمل انسان میں ہونا چاہئیں تو عرصہ تک اسکی زندگی اس شخص کی ذات سے وابستہ
رہتی ہے۔ اور وہ دانستہ یا نادانستہ ہر چھوٹی بڑی بات میں یہانتک کہ حرکات و سکنات، چال ڈھال
اور انداز گفتگو تک میں اسکی تقلید کرتا ہے۔ نوجوان پیرو کی نظر میں جو تصویر اپنے رہنما کی ہوتی ہے
اور اس پختہ کار رہنما کی نظر میں جو تصویر نیم پختہ پیرو کی ہوتی ہے۔ ان دونوں کے ملنے سے ایک
تیسری ہم آہنگ تصویر مکمل انسان کی بنتی ہے۔ اور یہی وہ ذہنی عنصر ہے جسکے ماتحت دونوں میں
باہم یہ گہرے تعلقات نشوونما پاتے ہیں۔ جن اشخاص کو نوجوان اپنا رہنما بناتے ہیں وہ مختلف طبقوں
کے ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر نوجوان کا رہنما اُستاد، یا مذہبی پیشوا، یا کوئی ہیرو ہو بلکہ
بعض کسی سنجیدہ نوجوان، کسی مضبوط سیرت والے رفیق، یا کسی محترم خاتون، کسی باعصمت اور باوقار
دوشیزہ کو بھی اپنا رہنما بناتے ہیں۔ ان معلموں کا انتخاب نوجوان بالکل اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔ اور
اس معاملہ میں ان کی طبیعت کا جو رجحان ہو اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آئندہ ان کی سیرت
کیسی ہوگی۔

"دوست کی آرزو ہمارا راز فاش کرتی ہے۔" مگر ہر صورت میں نوجوان اس "دوست" سے
اور خود اپنی ذات سے بڑی توقعات رکھتا ہے۔ "جہاں تک ہوسکے مجھے اپنے دوست کی خاطر بننا
سنورنا چاہیئے، کیونکہ تیری ہی ذات میں اسے مافوق الانسان کا عکس نظر آتا ہے۔" زیادہ عام
الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہی عینی تصاویر پر نوجوانوں کے عقیدۂ زندگی کا دارومدار ہوتا ہے

نوجوان دنیا میں اس خاموش آرزو کے ساتھ، اس پوشیدہ اُمید کے ساتھ قدم رکھتا ہے
کہ ایک ایسے آدمی کو ڈھونڈے جو اُسے زندگی کی تفسیر عام قضایا کی صورت میں نہیں بلکہ خود اسکو

آخر یہ انسان ہمیشہ کیا ڈھونڈا کرتا ہے۔ اُسے کس چیز کی آرزو رہتی ہے۔ مجھے تو فی الحال ایک آدمی کی جستجو ہے۔ میں کب تک دل ہی دل میں کڑھتا رہوں۔ اس سے کام نہیں چلیگا۔ کوئی تو ایسا ہو جسے میں اپنی داستان سُنا سکوں جو اتنا عالی ظرف ہو کہ میرے سر پر شفقت اور تسکین کا ہاتھ رکھے اور میرے دل میں جو حقیر سرمایہ ہے اسکی قدر کرے۔"

مگر آخر اسکی کیا ضرورت ہے کہ نوجوان کسی شخص کا پابند ہو کر رہے۔ کیا اخلاقی تربیت کے لئے کوئی عینی یا امر مطلق یا خیر محض کا دائمی تصوّر کافی نہیں؟ نہیں ہرگز نہیں یہ فلسفیوں کی خام خیالی ہے۔ شخصی سیرت کی تشکیل کے لئے کسی شخص ہی کی ضرورت ہے جسکی سیرت خود تشکیل پا چکی ہو، ذرا دیر کے لئے آپ اس عملِ تشکیل کا تصوّر کیجئے۔ ایک شخص ہے جو ابھی اپنے آپ کو نہیں جانتا جو اپنے دل کے اندر نظر ڈالتا ہے تو امکانات اور رجحانات کا ایک ہنگامہ دیکھتا ہے۔ یہ قوتیں ابھی اسکے قابو میں نہیں بلکہ اُسے اپنے ساتھ ادھر ادھر بہائے پھرتی ہیں۔ لیکن وہ اس کشتی کی ناخدائی کرنا اپنے نفس میں وحدت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے نفس کے اندر مختلف السیرت والدین کی وراثت میں باہمی نزاع ہو۔ ممکن ہو کہ اس کے نفس کے مختلف طبقوں میں تین مختلف سیرتوں کے عناصر موجود ہوں جو کبھی ظاہر ہوتے ہوں اور کبھی چھپ جاتے ہوں۔ اس مشکل کا وہ تنہا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ کسی دوسرے شخص کا پابند نہ ہو، وہ خود شخص نہیں بن سکتا۔ اور یہ دوسرا شخص ایسا نہیں ہونا چاہئیے جسکی سیرت پوری طرح پختہ ہو چکی ہے۔ اور جو مبتدیوں کی کشمکش کو نہ سمجھ سکتا ہو۔ بلکہ ایسا جو انسانی زندگی کے ہر کیف کی لذت سے آشنا ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی جہاں گیر ودار میں کچھ معرکے جیت بھی چکا ہو۔ اگر انسان کچھ دن اپنی زندگی ایسے کی زندگی میں ضم کر دے تو خود اسکی سیرت بھی موزونیت اور "صورت" اختیار کرتی ہے۔ اب یہ موزونیت چاہے نظری اصول کا استحکام ہو چاہے نفس کی جمالیاتی ہم آہنگی ہو، چاہے عالمگیر انس ومحبت ہو، چاہے آزادی اور ضبطِ نفس ہو، چاہے وہ سکون ہو جو عبادتِ الٰہی سے حاصل ہوتا ہے۔ وحارت کی

اور شاید وہ ذوق و شوق کے مختلف مدارج کے ساتھ یکے بعد دیگرے ہر راہ پر چلتا بھی ہے۔ اُسے ایک "نمونہ" کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسے تعلیم تقلیدی کہتے ہیں۔ لیکن اسکا منبع اپنی تعلیم آپ کرنے کا ارادہ ہے۔ نوجوانوں کی یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں کے اثر سے آزاد ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ ارتقا نفس کی جس منزل میں وہ ہوتے ہیں وہ اُنھیں صرف جبری بیرونی اثر سے آزاد کراتی ہے۔ لیکن خو اس عمر کا تقاضا یہ ہے کہ انسان بطیب خاطر محض کسی دوسرے کی اطاعت ہی نہ کرے، بلکہ دل و جان سے اسکا ہو رہے۔ نوجوان کو اپنے اِس عمل کا احساس نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ بغیر کسی ارادے کے خود بخود واقع ہوتا ہے۔ لیکن کچھ دن کے بعد جب وہ اپنے منتخب کیئے ہوئے رہنما سے دفعتہً یا بتدریج جدا ہوتا ہے تب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اِتنے دن سے وہ اسکی اطاعت کر رہا تھا۔ یہ واقعہ اکثر عہدِ شباب کے خاتمہ پر ہوتا ہے اور بہت نازک صورت اختیار کرتا ہے۔ اسوقت نوجوان کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ اس شخص کا جسے وہ انسان کامل سمجھتا رہا ہے اب تک پابند ہے۔ حالانکہ وہ بھی گوشت پوست رکھنے والا ایک معمولی انسان ہے جس میں نقائص بھی ہیں اور خامیاں بھی بلکہ بعض اوقات اس شخص کے خلاف جسکی اطاعت کرنے کا نوجوان عادی ہو گیا ہے اسکے دلمیں نفرت پیدا ہوتی ہے، ممکن ہے کہ یہ ناشکرگزاری جسکے سبب سے انسان پُرانے دیوتاؤں کو جلا ڈالتا ہے محض عارضی ہو اور کچھ دن کے بعد دور ہو جائے۔ لیکن اس کا ظاہر ہونا خصوصاً قوی طبیعت کے نوجوانوں میں ناگزیر ہے۔ اور ہر شخص کو جو حقیقی تعلیمی نقطۂ نظر سے نوجوانوں کا رہنما بنتا ہے اس کے لئے طیار رہنا چاہیئے۔ اور اسے روکنے کی کوشش بھی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا مثنیٰ بن جائے۔ بلکہ خود اس میں جو اعلیٰ صلاحیتیں ہیں اُن کی تکمیل کرے۔ پختہ کار شخص نوجوان کو اپنے نفس کا انتشار دور کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ وہ دایہ کی طرح جننے میں مدد دے سکتا ہے لیکن دوسرے کے بجائے جن نہیں سکتا۔ ہرڈر میں جو ہر بچا کو دو...

تھی کہ وہ اُس المناک پہلو سے بچ سکتا جو معلم کی ذات کے لیے مخصوص ہے۔ اس لیے جہاں لوگ اس کی طرف کھچتے تھے وہاں اس سے دور بھی ہٹتے تھے۔ حالانکہ محبت کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ انسان جسے اپنا بنائے اُسکی آزادی سلب نہ کرے صرف اسی طرح انسان دوسرے کو اپنا کرکے رکھ سکتا ہے۔

عورت کے نفس میں یہ عمل یعنی کسی رہنما کی پیروی کرنا اور اسے اپنے لیے نمونہ بنانا دوسری طرح واقع ہوتا ہے۔ یہاں پیروی زیادہ وسیع اور پابندی زیادہ گہری ہوتی ہے۔ اسکا عشق میں بلکہ اکثر مخلوط روحانی جسمانی محبت میں بدلجانا لازمی ہے۔ یہاں پیروی کرنے والیوں کو محرومی کا الم سہنا پڑتا ہے اس لیے کہ ان تعلقات کو کامل رفاقت زندگی سمجھنا شدید غلطی ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ نوجوان لڑکیاں اس شخص کی ذات سے محبت نہیں کرتیں جسکی وہ معتقد ہوتی ہیں۔ وہ اسکے پردے میں نصب العین بانئے حیات سے محبت کرتی ہیں لیکن وہ اس واقعی انسان سے جو ان کے اور اس نصب العین کے درمیان واسطہ کا کام دیتا ہے بہت کم واقفیت رکھتی ہیں۔ اس تعلیمی واردات قلب کی بنیاد پر شادی کی عمارت بنانا بہت مشکل ہے۔ اس نئے تعلق کیلئے دونوں اسوقت تک پختہ نہیں ہوسکتے جبتک وہ اپنے آپ کو بالکل بدل نہ ڈالیں کیونکہ شادی کا اعلیٰ مقصد یہی ہے کہ وہ محض نصب العین کی دنیا میں نہ رہے بلکہ نصب العین کو میاں بیوی کی واقعی دنیا میں لائے۔ اعلیٰ عمدہ شادی بہار شباب کا آخری پھول ہے جو پھلوں کے پکنے کا پیام لاتی ہے۔

نوجوان مردوں کی اپنی تعلیم آپ کرنے کی کوشش (انہی شرائط کے ساتھ) اسوقت پوری ہوتی ہے جب ان کا اتصال نسوانی ذہن سے ہوتا ہے جسطرح بجلی کی دو مخالف لہریں آپسمیں ملیں۔ صرف وہی انسان پختگی کو پہنچتا ہے جو اپنی یکطرفہ ترکیب نفسی پر نفس نسوانی کی جمعیت اور ہم آہنگی کا اثر قبول کرتا ہے۔ اُسکے ذہن میں بھی جوہر انوثیت ایک علین کی شکل میں ہوتا ہے نہ کہ جیتی جاگتی عورت کے روپ میں۔ مگر اسے کیا کیا جائے یہ ناگزیر امر ہے۔ مرد کی تکمیل صرف اسی طرح ہوسکتی ہے کہ وہ سچی نسوانیت کو سمجھتا ہو، اور اُسے اپنے نفس میں جو انتشار اور کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے جگہ دے۔ چنانچہ فاوسٹ کی مشکل کا گوئٹے نے جو پہلا حل بتایا تھا

جو ہمیشہ سعی و جستجو میں مصروف رہے اسے ہم نجات دے سکتے ہیں۔

اس سے یہ دوسرا مل جسکی طرف اُس نے صرف اشارہ کیا ہے ، اور کہیں تشریح نہیں کی

ازلی جوہر انوثیت ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے

بہتر اور بلند تر ہے ۔

نفسیات ارتقار کے ان واقعات سے علم الاخلاق بھی سبق لے سکتا ہے ۔ نیکی کے واجب العمل قانون کی شرح محض فرض کے عام اصول سے نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ یہ ایک قانون صورت ہے جو ایک زندہ ترکیب نفسی کی ہدایت اور رہنمائی کے لیئے ہے ۔ اس قانون میں انفرادی عین پسندی ذہن خارجی سے گھل مل جاتی ہے، اسے نفس میں جگہ دیتی ہے ، اور اسکی نشوونما میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتی ہے اسلیئے اخلاقی نصب العین ہمیشہ کسی شخص کی تصویر ہوتی ہے جس نے اپنی زندگی کی تشکیل ذہنی قوانین کے مطابق کی ہو ۔ نیکی محض افلاطون کے عین کا نام نہیں جو اس دنیا کے ماورا کسی دوسرے عالم میں ہے ۔ بلکہ ایک نظام قدور کا نام ہے جو ہر زندہ شخص میں اسکی طبیعت کی مناسبت سے ہوتا ہے جسے ارسطو جوہر قابل کہتا ہے اور جو ہماری اسی زندگی میں بہ حیثیت رہنمائی کرنے والی قوت کے موجود رہتا ہے ۔

مگر جیسا ہم کہہ چکے ہیں یہ اخلاقی نصب العین نوجوانی میں ایک مخصوص صورت اختیار کرتا ہے یہاں بھی اسکا اظہار شخصی پیرایہ میں ہوتا ہے ۔ یعنی اس شخص کی شکل میں جسے نوجوان اپنے لیے "نمونہ" بناتا ہے اور جسمیں وہ خود اپنے نصب العین کے رنگ بھر دیتا ہے ۔ لیکن خود یہ شخصی تصور پوری واقعیت سے بہت دور ہوتی ہے ۔ یہ روزمرہ کی حقیر ضرورتوں اور مصروفیتوں کے ماورا اس دنیا کے باہر ایک بلندی پر جھلکتی رہتی ہے ۔ اسمیں ہمیشہ ایک عینی عنصر رہتا ہے جس کا ذکر ابسن نے اپنے Wild Duck میں کیا ہے ۔ عینی انسان اور واقعی انسان میں اب تک پوری مطابقت نہیں ہوتی ۔ عین پسندی میں ذہن کو جو آزادی ہوتی ہے اور جسطرح نظر کے آگے عالم ناممدود کے دروازے کھلجاتے ہیں اسمیں ضرور کوئی ارتقائی منشا اور مصلحت ہے ۔ ایک بلند تر سطح پر یہ دو...

یعنی عشق اور حسی شہوت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے ۔ جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں ۔ نوجوانوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے (اور یہ اُن کے ارتقا کے لیئے ضروری ہے) کہ وہ انسان کے ناقص اور محدود ہونے کو تسلیم نہ کریں ۔ ان میں اب تک وہ "غیر محدود جبلت" ہوتی ہے جسکے مدنظر عالم واقعی اور اسکی موجودات کے ماورا بھی کچھ ہوتا ہے ۔

"ہم ایک سکیدہ دریا کے پار رہتے ہیں"

اب اس مقام سے اگر ہم تحلیل نفسی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ زاویۂ نظر کہ تمام اعصابی اور دماغی امراض شہوت جنسی کے دبانے کا نتیجہ ہیں بہت محدود ہے اور اس سے بہتر اور وسیع تر اصول ہو سکتا ہے ۔ وہ یہ کہ انسان کو اپنی فطری "صورت" کے اختیار کرنے یعنی شخص بننے کی کوشش میں اکثر ایسے صدمے پہنچ جاتے ہیں جنسے ارتقا میں خلل واقع ہو ۔ اسوقت ان کی نسبت خالص فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے نفس کے کسی عنصر سے یا اپنی تقدیر سے مطمئن نہیں ہیں ۔ یہ مطمئن نہ ہونا اسطرح ظاہر ہوتا ہے کہ پُرانی واردات قلب کی یاد پھر تازہ ہوا کرتی ہے ، جس سے نفس بے چین ہوتا ہے ، اور اندرونی جمعیت خاطر اور سکون غارت ہو جاتا ہے ۔ ایسی طبیعت کے لوگ اپنے نفس کے غالب رجحان کو ڈھونڈھنے میں کامیاب نہیں ہوتے ۔ وہ یا تو ہمیشہ کے لیئے بالکل حالت بلوغ میں یعنی خامی کی حالت میں رہ جاتے ہیں ۔ یا کم سے کم ان کے نفس کے بعض پہلو پختہ نہیں ہونے پاتے ۔ اور ان سے پوری سیرت کو ہمیشہ خطرہ رہتا ہے ۔ اس لیئے ان کی اندرونی کشمکش آگے چلکر بھی ایک طرح کا جزوی بلوغ معلوم ہوتی ہے ۔ ان کی اخلاقی زندگی میں اکثر بچپن کی خامیاں عود کر آتی ہیں ۔ انہیں انسان اسیوقت سمجھ سکتا ہے جب وہ ان کے اصلی زمانۂ بلوغ پر جو ارتقائے نفسی کی بنیاد ہے گہری نظر ڈالے ۔ وہاں یہ خامیاں بامعنی اور مناسب وقت نظر آئیں گی ، آگے چلکر یہ ارتقا کی گزری ہوئی منزل کی نامناسب یادگار بنکر رہتی ہیں ۔

لیکن جو زمانہ ہمیں بظاہر ارتقائے نفسی کا قطعی خاتمہ معلوم ہوتا ہے وہ اصل میں عارضی

ڈھونڈھے جو اسکے مناسب حال ہے - ہر دور کے لیئے علاوہ ایک مخصوص فلسفہ کے جس کی طرف گوئٹے نے اشارہ کیا ہے ایک مخصوص قانون اخلاق بھی ہوتا ہے - نوجوان کے لیئے اس اخلاق کی ضرورت ہے - جو واقعات سے لڑتا اور دور دراز نصب العین کی طرف بڑھتا ہے - پختہ کار مرد کے لیئے اسکی جو نصب العین اور واقعے میں مطابقت اور مصالحت پیدا کرتا ہے - اور پیر سالخوردہ کیلئے اسکی جو ذات سرمدی سے لو لگانے اور حاصل کردہ نصب العین میں مگن رہنے کی تعلیم دیتا ہے -

باب نہم

نوجوانوں کا قانونی احساس

یہاں یہ توقع نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم قانون کی ماہیت سے تفصیلی بحث کرینگے۔ مناسب یہ ہے کہ پہلے ہم قانون کے مختلف معانی کا فرق بیان کردیں۔ جیسا ہم نے پچھلے باب میں اخلاق کے بارے میں کیا تھا۔ قانون ایک طرف تو نظام قانون کی حیثیت سے ایک خارجی تمدنی مظہر ہے۔ اور دوسری طرف اصول قانون کے احساس اور قانونی حقوق وفرائض کے احساس کی حیثیت سے فرد کی طبیعت کی ایک داخلی روش کا نام ہے۔ ان دونوں کے ماوراعین عدل کی جھلک نظر آتی ہے جو قانون کا بلند ترین مطمح نظر ہے۔ یہ عین اخلاق کی مجموعی ترکیب کا صرف ایک پہلو ہے۔ یہ خود واقعی قانون نہیں بلکہ محض ایک معیار، ایک مطالبہ ہے۔ اگر اس عین عدل کے مقابلہ میں ہم خارجی نظام قانون کو بہ حیثیت ایک تاریخی حقیقت کے رکھیں تو یہ عین زیادہ وسیع معنی اختیار کرکے نظری قانون یا حقیقی قانون کہلاتا ہے۔

قانون دو بالکل مختلف معنی رکھتا ہے۔ اسیطرح عدل پسندی بھی بہ حیثیت داخلی صفت کے دو معنی رکھتی ہے۔ ایک عدل پسندی اخلاقی عین کے معنی میں ہوتی ہے۔ اور دوسرے مروجہ قانونی معنی میں۔

پہلے معنی میں عدل پسندی پر اگر کوئی خارجی قانون مبنی ہو تو وہ ایک مکمل اور عینی قانون ہوگا دوسرے معنی میں عدل پسندی سے محض مروجہ قانون کی حمایت مراد ہے جو اخلاقی حیثیت سے ناکمل ہوتا ہے لیکن رسمی حیثیت سے واجب العمل سمجھا جاتا ہے۔ عینی عدل پسندی کا وجود کسی شخص کے

نفس میں بغیر اسکے بھی ممکن ہے کہ وہ مروّجہ قانون سے واقف ہو۔ اس اخلاقی عین کے صحیح مفہوم کا سمجھانا بہت مشکل ہے۔ بظاہر اسکے دو بنیادی اُصول ہیں جنمیں ہمیشہ کشمکش رہتی ہے۔ پہلا تو یہ ہے "سب کے حقوق مساوی" اور دوسرا "ہر شخص کا حق بہ قدر استحقاق" دوسرے اصول کے مطابق عدل کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جمہوری عقلی نقطۂ نظر سے سب لوگوں کو جو مجرم نہ ہوں مساوی سمجھا جائے بلکہ یہ کہ ہر شخص کے ساتھ وہ کیا جائے جسکا وہ ایک با اخلاق جماعت میں اپنے وجود اور عمل کی بدولت مستحق ہے۔ عدل کے ان دونوں معنوں کا فرق مثال کے طور پر معلم کی طبیعت میں دیکھئے۔ اسکو ایک اہم مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ آیا سب لڑکوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے یا ہر ایک کی انفرادی سیرت اور انفرادی حالت کا لحاظ رکھے جو اُسے معلوم ہے مگر جماعت سے چھپی ہوئی ہے۔

غالباً صحیح فیصلہ یہ ہے کہ عدل میں تناسب کو ترجیح دی جائے اور مساوات کو محض ثبوتی قانون[1] کے تنگ دائرے کے لیے رہنے دیا جائے۔ اس ثبوتی عدل کے لیے قانون سے اور ان ضوابط سے جنکے ذریعہ سے قانون نافذ ہوتا ہے پوری طرح واقف ہونے کی ضرورت ہے ایسی واقفیت تحریری عدالتی قانون سے بآسانی حاصل ہوسکتی ہے لیکن رسم ورواج کے قانون سے بدشواری۔ اس ثبوتی قانون کی پابندی بھی ایک اخلاقی صفت ہے لیکن یہ اخلاق کی ایک بہت محدود، اور مخصوص شاخ ہے۔ اسکی بنا اس عقیدہ پر ہے کہ انسان کو مروّجہ قانون کی اطاعت کرنا چاہیے تاکہ ایک نظام قائم رہے خواہ یہ نظام عینی نقطۂ نظر سے مکمل نہ ہو بلکہ مفید بھی نہ ہو۔ ثبوتی قانون کی روحِ رواں یہ پانچ نکتے ہیں۔

۱۔ اسکی بنا (اخلاقی عین عدل کے ماتحت) مافوق الافراد اور غیر جانبدارانہ ارادے

---

[1] ثبوتی قانون کی اصطلاح عینی قانون کے مقابلہ میں استعمال ہوتی ہے۔ عینی قانون تو وہ مکمل منصفانہ قانون ہے جو عین کی صورت میں ہر عدل پسند کے پیش نظر ہوتا ہے اور ثبوتی قانون وہ ناکمل قانون ہے جو واقعی مرتب کرکے رائج کیا گیا ہے۔ ۱۲

پر ہونا چاہیئے۔

۲- یہ ارادہ اُصولی ہوتا ہے یعنی اسکا تعلق عام اُصول سے ہوتا ہے نہ کہ جزوی واقعات سے۔

۳- اسطرح ایک اجتماعی نظام قائم ہوتا ہے جسکی ساری خوبی اسمیں ہے کہ اس کا نفاذ یقینی ہو اور کوئی استثنا نہ ہو۔

۴- اس نظام کا کام صرف افراد کی قوت اور آزادی کی حدبندی ہونا چاہیئے (وہ بھی خارجی دائرۂ عمل میں) اور اسے عقیدہ اور مشرب یا محرکات عمل کی بحث میں نہیں پڑنا چاہیئے۔

۵- ہر ثبوتی قانون خواہ وہ تاکیدی ہو یا استناعی اس جماعت کے ہر فرد کے لیئے جس میں وہ رائج ہے واجب العمل ہے یعنی اسکی خلاف ورزی خواہ دوسرے اعتبار سے کیسی ہی ہو ثبوتی حیثیت سے خلاف عدل کہلائے گی اور اس سزا کی مستحق ہوگی جو قانون نے اس کے لیے مقرر کی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ثبوتی قانون بہت پیچیدہ ترکیب رکھتا ہے جسکا سمجھنا سہل نہیں ہے۔ اس کے لیئے روز بروز مہارت فن کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ مگر علمی قانون کا احساس ضمیر میں موجود ہونے کے لیئے محض ذہن کی عام پختگی کی ضرورت ہے۔ دونوں میں باہم یہ تعلق ہے کہ علمی قانون کو ثبوتی قانون کا اخلاقی منبع اور اخلاقی معیار ہونا چاہیئے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسپر بہت سے اور عناصر کا اثر پڑتا ہے۔ (مثلاً سیاسی حالات خارجی اغراض وغیرہ) یہاں بھی ہم پچھلے باب کی طرح خارجی نظام قانون اور داخلی احساس قانون دونوں میں مخصوص نصب العین تک پہنچنے کے تین درجے قرار دے سکتے ہیں۔ علمی عدل کی نسبت سے دیکھیئے تو ایک درجہ تو عدل سے انحراف کا ہے اور دوسرا موجودہ نظام عدل اور احساس عدل کا، اور تیسرا علمی عدل کے احکام کا جنھوں نے ہنوز حقیقت کا جامہ نہیں پہنا۔ لیکن عالم خارجی اور عالم داخلی میں بہ حیثیت معیار قائم کرنے والی قوتوں کے موجود ہیں۔

اب تک جو نفسیات شباب موجود ہے اس نے اس فرق کی اہمیت کو نہیں سمجھا اور اس لیے مسئلہ پر صحیح پہلو سے نظر نہیں ڈالی - یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہم ایک مختصر سے خاکے پر اکتفا کرتے ہیں -

(۱)

عینی عدل کا احساس بچوں اور نوجوانوں میں حیرت انگیز طور پر قوی ہوتا ہے - لیکن یہ چیز جسکا انہیں احساس ہوتا ہے ، عدل کا ایک بہت دھندلا عین ہے - یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ مردم شناسی یا معاملہ فہمی پر مبنی ہو ، پھر بھی یہ عین بہ حیثیت ایک مستحکم معیار کے موجود ہوتا ہے جس پر انفرادی معاملات فوراً اور اکثر حیرت انگیز صحت کے ساتھ پرکھے جا سکتے ہیں -

یہ بات دو حیثیتوں سے اہم ہے - ایک تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عین اور دوسرے اعیان (مثلاً حق ، خیر ، حسن) خود ذہن داخلی کی ترکیب میں مضمر ہیں - اور خلقی تو نہیں مگر تجربات سے آزاد ضرور ہیں - افلاطون اس چیز کو اساطیری انداز میں تذکرہ کہتا ہے - اس کے نزدیک جب کسی عین کا خیال آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی پہلی زندگی کی کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ رہی ہے - کیونکہ بھلا دنیا میں ، خصوصاً آج کل کی دنیا میں وہ کون سی جگہ ہے جہاں انسان مکمل عدل کا تجربہ یا مشاہدہ کر سکتا ہے - نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ ایک عین اصلی ہے جو ہمیشہ اس نفس میں جسمیں ذہنی زندگی کو خارجی اثرات نے خراب نہ کیا ہو ، دمبدم اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے - لیکن نفسیات شباب کی بحث میں اتنی بات اور خاص طور پر کہنے کی ضرورت ہے کہ ارتقا کی اس منزل میں انسان کو عین اس دنیا میں نہیں بلکہ دوسری دنیا میں نظر آتا ہے یہ اب تک تجربی زندگی سے بالکل بے تعلق ہوتا ہے - اور ہنوز اسمیں کسی مخصوص تمدنی حیثیت کی رعایت یا کسی مصلحت کی آمیزش نہیں ہوتی - عین کا مجرد ہونا (یعنی اس زندگی سے بے تعلق ہونا) جس پر افلاطون نے اپنے درمیانی دور میں اسقدر زور دیا ہے ذہن انسانی کے دور شباب کی ترکیب سے مطابقت رکھتا ہے -- افلاطون کا فلسفہ شباب کا فلسفہ ہے - ارسطو

نے بھی اپنا جداگانہ نظام فلسفہ پختہ عمر میں مرتب کیا جب وہ افلاطون سے علیحدہ ہو چکا تھا۔

نفسیات شباب کے نقطۂ نظر سے نوجوانوں کی یعنی انتہا پسندی بھی اسی سے متعلق ہے۔ ان کے انتہا پسند ہونے کا یہی سبب ہے کہ ان کے قبضہ میں پوری طرح صرف یہی معینہ معیار ہوتا ہے۔ اور وہ عین کو ہنوز مخصوص حالات اور مخصوص صورتوں سے مطابقت نہیں دے سکتے جو ایک لطیف عمل ہے مگر اسی کے ساتھ مشتبہ اور خطرناک بھی ہے۔ اسے مدنظر رکھتے ہوئے نوجوانوں کی بہت سی خصوصیات کی توجیہ ہو جاتی ہے۔ ان کی حق پرستی کی جو بہ حد جنون پہنچ جاتی ہے، ان کے حشر انگیز راست روی کے مطالبات کی جو وہ دنیا سے اور انسانوں سے کرتے ہیں۔ انکی نفرت کی جو انہیں اس بات سے ہوتی ہے کہ انفرادی نقطۂ نظر سے اخلاقی امور میں حالات اور مصالح کا لحاظ کیا جائے نوجوان لوگ ہمیشہ اس چیز کی کوشش کرتے ہیں جو تعینات اور حدود سے آزاد ہو۔ وہ یقیناً اس قول میں نطشے کے ہمزبان ہونگے "میں اس شخص کو پسند کرتا ہوں جو ناممکنات کی خواہش کرے" اسی لئے جرمنی کے نوجوان شلر سے مانوس ہیں۔ جسکے کلام میں اسطرح کی بلند پرواز آرزو پائی جاتی ہے۔ اسیطرح یہ لوگ نطشے کو، سارے خیال آرائی کرنے والے انتہا پسندوں کو، ابسن کی کتاب آتش زنی کو، اور ہر طرح کی ہنگامہ آرا پیشین گوئیوں کو جو بڑی ہستیوں نے کی ہیں اور روسو، نطشے، ٹالسٹائے، کیر کے گارڈ نے اگر صاف الفاظ میں نہیں کیں تو ان کی کتابوں سے اخذ ضرور کی جا سکتی ہیں۔

لیکن یہاں بھی وہی صورت ہے جسکا ذکر ہم پچھلے باب میں عام اخلاقی نشوونما کی ذیل میں کر چکے ہیں کہ اس بات میں کہ انسان کی شخصی اخلاقی زندگی میں کسی عین کی جھلک موجود ہو اور اسمیں کہ وہ اسکی ماہیت الفاظ اور معانی میں کہہ کر ادا کر سکے یا اسکی تعریف کر سکے بہت فرق ہے۔ افلاطون کی ریاست کی پہلی جلد میں اسکی ایک عمدہ مثال موجود ہے۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب پولمان نے ایک اسکول کے آٹھویں درجوں کے لڑکوں سے یہ پوچھا کہ عدل کیا چیز ہے تو

سب جواب دینے سے قاصر رہے۔ لفظی سامحات سے قطع نظر کرکے بھی دیکھئے تو ان بچوں نے جتنی تعریفیں کی ہیں سب ان کے مخصوص انداز میں ان الفاظ سے شروع ہوتی ہیں "عدل اسے کہتے ہیں کہ مثلاً ــــــــ" البتہ ایک نکتہ قابلِ غور ہے، بچوں کے جوابات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس تعلق کا بخوبی احساس ہے جو عدل پسندی اور حق پسندی میں ہوتا ہے۔ یعنی اس مافوق الافراد خارجی عنصر کا وجود دونوں کی خصوصیت ہے۔

ہم میں سے کوئی بھی عدل کی تعریف نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ ہماری سیرت میں بحیثیت ایک آواز کے موجود ہے جو ضمیر کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے، اور جسکا سننا ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ اور جب کوئی اخلاقی مسئلہ پیش آتا ہے تو ہمیں صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ہم اس کا فیصلہ اس دیانت دارانہ جج کی مدد سے کر رہے ہیں یا اپنے اغراض کی جانبدارانہ رائے سے متاثر ہوکر۔ اس لئے اگر کوئی شخص بچوں کا رویہ عین عدل کے ساتھ معلوم کرنا چاہتا ہے تو اُسے پولمان کی طرح لفظی تعریفات سے زیادہ معلومات حاصل نہ ہوگی بلکہ منرو کی طرح واقعی قانونی مسائل میں بچوں کی رائے لینے سے۔ بچے ان معاملات میں اکثر غلطی کرتے ہیں۔ لیکن نوجوان کے شعور میں عین عدل کا احساس زیادہ واضح ہوتا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ منرو کی تحقیقات میں بھی منہاج کی غلطیاں موجود ہیں۔ اُن سے زیادہ سے زیادہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نوجوان کسی معاملہ میں غیر جانبدارانہ حَکَم کی حیثیت سے کیا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ اگر خود انہیں یہ صورت پیش آئے تو ان کا عمل کیا ہوگا۔ بڑا فرق ہے اسمیں کہ انسان اپنی ذاتی اغراض کے ساتھ کسی قانونی مقدمہ میں الجھا ہو اور اسمیں کہ وہ ٹھنڈے دل سے محض ایک قانونی مسئلہ پر غور کر رہا ہو، علاوہ اس کے جب منرو ۵۶۰ لڑکوں اور ۵۷۶ لڑکیوں کے سامنے یہ قصہ بیان کرتا ہے کہ ایک چھوٹی سی لڑکی کی خالہ اسکی پرانی ٹوپی بغیر اس کے علم کے اسکی ایک غریب ہمجولی کو دیدیتی ہے۔ تو اس معاملے کے متعلق رائے دینے کے دو بالکل جداگانہ اصول ہو سکتے ہیں، جسکے انتخاب میں

ایک صورت تو یہ ہے کہ فیاضی اور ایثار کو مدنظر رکھا جائے جو تنگ معنوں میں اخلاقی خوبی ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ قانون کی پابندی پر یعنی املاک کی حفاظت پر زور دیا جائے (منرو نے یہ تصریح کردی ہے کہ امریکہ میں بچوں کو بھی قانونی حقوق حاصل ہیں) ۴۶ فیصدی بچوں نے ایثار کے اصول کو پسند کیا۔ اور ۵۶ فیصدی نے اسکے خلاف رائے دی۔ لیکن اگر موقعہ پڑ جاتا تو ممکن تھا کہ ایثار کے مدعیوں کا طرز عمل کچھ اور ہوتا۔ اسیطرح جو ایثار کے مخالف تھے وہ شاید عملاً ایثار کرتے۔

منرو نے اس مسئلہ کی بھی تحقیق کی ہے کہ بچے سزا کا کیا منشا سمجھتے ہیں۔ وہ بچوں کو ذیل کے دو کام دیتا ہے "تمہیں جو سزائیں دی گئی ہیں ان میں سے کوئی ایسی سزا بیان کرو جو تمہیں منصفانہ معلوم ہوئی ہو اور اسکی وجہ بھی بتاؤ" اور "کوئی ایسی سزا بیان کرو جو تمہیں غیر منصفانہ معلوم ہوئی ہو" اس تحقیق کا نتیجہ یہ ثابت ہوا کہ ۰۰ فیصدی لڑکے سزا کو جرم کا کفارہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اپنے نفس پر تکلیف اٹھا کر وہ اپنے قصور کی تلافی کرتے ہیں۔ ۷ فیصدی سزا کے منصفانہ ہونے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ سزا دینے والا باانصاف ہے۔ ۱۲ فیصدی سزا کو مفید کہتے ہیں لیکن کوئی وجہ نہیں بتاتے۔

اعداد و شمار کے ہم قائل نہیں۔ اس سے انفرادی معاملہ میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ کیونکہ یہاں تو ساری اہمیت فرد کے مجموعی شعور کو حاصل ہوتی ہے۔ اور اسمیں بھی سب سے اہم ضمیر کی اخلاقی حالت ہوتی ہے۔ علاوہ اسکے فرد پر ان خیالات کا بھی اثر پڑتا ہے جو اسکے ماحول میں پھیلے ہوئے ہوں۔ اس لیئے اعداد و شمار سے مدد لینے میں کم سے کم ان عناصر کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے

ہمیں شک نہیں کہ بعض ایسے پیچیدہ معاملات ہوتے ہیں جنمیں بچے اور نوجوان تو کیا بڑے بھی صحیح رائے قائم نہیں کرسکتے۔ لیکن یہاں ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ بچپن [illegible] خالص [illegible] اصول موجود ہوتا ہے اور نوجوانی میں برادر

نمایاں ہو جاتا ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسکے استعمال میں غلطی ہو ۔ اس صوری عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے " دنیا میں عدل کا قانون موجود ہے اور اُسی کا سکہ چلنا چاہیئے " ہم اس عقیدہ کو صوری اس لئے کہتے ہیں کہ یہ محض ایک علمی ضابطہ ہے ۔ جسکا محل استعمال مختلف حالتوں میں مختلف ہوتا ہے ۔ ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ بچوں اور نوجوانوں کے ضمیر میں قانون کی جگہ خالی ہوتی ہے کیونکہ ہمیں قانونی معاملات میں غیر جانبداری کی روش موجود ہے جو عدل کی اور قانون کی جان ہے ۔ یہاں بھی وہی صورت ہے جو عام اخلاق میں ہے ۔ عین عدل عالم بالا میں منڈلاتا ہے ۔ اور واقعی زندگی کے معاملات سے اسے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ یہی اصل میں نوجوانوں کے شعور کی مخصوص ترکیب ہے ۔

(۲)

جب ہم نوجوانوں کا تعلق ثبوتی نظام قانون سے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو مسئلہ کی صورت بالکل بدلجاتی ہے ۔ یہاں قانون سے مُراد ہم قانون فوجداری لیتے ہیں ۔ کیونکہ دیوانی کے معاملات سے نوجوانوں کو بہت کم سابقہ پڑتا ہے ۔ ثبوتی قانون کے دائرہ کے اندر خیال کو منطقی صحت کا پابند رکھنا اور اسکے ماتحت ثبوتی عدل برتنا بجائے خود بھی مشکل چیز ہے ۔ اور جو ماہر فن نہ ہو اسکے لئے اور بھی مشکل ہے ۔

سب سے پہلے تو مروجہ قوانین سے واقفیت کی ضرورت ہے ۔ ہم بے تکلف کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں میں کوئی ایسا نہ ہوگا جس نے جرمنی کے قانون فوجداری کی اصل کتاب پڑھی ہو ۔ بڑوں کو بھی بعض وقت قانون سے واقف نہ ہونے کے سبب سے دقتیں پیش آتی ہیں ۔ مثلاً وہ کون سی حد ہے جس سے آگے بڑھنے میں خلل اندازی امن عامہ کا جرم عائد ہوتا ہے ؟ اگر چور گھر میں گھس آئے تو جب تک جان کا خطرہ نہ ہو حفاظت خود اختیاری کی کیا حد ہے ؟

اسمیں شک نہیں کہ ایسی دقتیں کم پیش آتی ہیں اور عموماً جو چیزیں قانون فوجداری کی رو سے

ممنوع ہیں۔ انہیں اخلاقی قانون کی آواز بھی ناجائز قرار دیتی ہے۔ مثلاً قتل، ڈاکہ، چوری، زنا، آتش زنی، غبن، دغا وغیرہ۔ اگر نوجوانوں سے اس قسم کے افعال سرزد ہوں جو کھلم کھلا ممنوع ہیں تو اس سے محض قانون کی خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ اصول اخلاق کی مخالفت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ان لغزشوں کے نفسیاتی اسباب تلاش کریں۔ اس معاملہ میں ہمیں نوجوانوں کی عدالتوں[1] سے صرف اس حد تک دلچسپی ہوگی جہاں تک ان کے ذریعہ سے نوجوانوں کے جرائم پر روشنی پڑے۔ اور اعداد و شمار معلوم ہوں۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں جرمنی میں اٹھارہ برس سے کم عمر کے نوجوانوں اور بچوں میں سے ۵۵۲۷۰ سزایاب ہوئے۔ اور سنہ ۱۹۱۵ء میں یعنی جنگِ عظیم کے آغاز میں ۶۸۸۴۱۔ ان اعداد سے صحیح نتیجہ نکالنے کے لئے یہ بات پیش نظر رہنا چاہیئے کہ جتنے جرائم ہوتے ہیں سب کا استغاثہ نہیں ہوتا۔ اور جتنے استغاثے دائر ہوتے ہیں سب میں سزا نہیں ہوتی۔ آسانی کے لئے ہم ایک اور شمار بھی پیش کرتے ہیں۔ سنہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک ۱۲ اور ۱۸ برس کے درمیان عمر والے نوجوانوں میں جو قانوناً اپنے افعال کے ذمہ دار اور اپنے جرائم کی سزا کے مستوجب سمجھے جاتے ہیں۔ سزایابی کے اعداد حسب ذیل تھے۔

سنہ ۱۸۹۰ء	فی لاکھ	۶۶۳
سنہ ۱۹۰۰ء	"	۷۴۵
سنہ ۱۹۱۰ء	"	۶۵۹

نوجوانوں کی "لغزشوں" کا نفسیاتی مسئلہ بہت دشوار ہے۔ موجودہ بحث میں ہم انتہائی صورتوں سے قطع نظر کر کے اس مسئلہ کو محدود کر دینگے اگرچہ اسکی پیچیدگی میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ ان شدید جرائم پر غور کرنا ماہرین فن کا کام ہے۔ جو اس معاملہ میں خاص تجربہ

---

[1] جرمنی میں اور یورپ کے اکثر ملکوں میں نوجوان مجرموں کے مقدمات خاص عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں۔ اور انہیں جو سزائیں دی جاتی ہیں ان میں تعزیر نہیں بلکہ تادیب مدنظر ہوتی ہے ۔۱۲

رکھتے ہوں ۔ نفسیات کے نقطۂ نظر سے تو عموماً عادی مجرموں کے مسئلہ سے کہیں زیادہ پیچیدہ ان نوجوانوں کا مسئلہ ہے ۔ جو اب تک طبعی اور نیک زندگی بسر کرتے تھے مگر اب راہ راست سے ہٹ گئے ہیں ۔

ہم ذیل کی صورتوں سے قطع نظر کرتے ہیں ۔

(۱) ایسے نوجوانوں سے جو نفسی امراض میں مبتلا ہیں مثلاً وہ جنھیں مرگی کا عارضہ ہے یا جنکا دماغ ماؤف ہے ۔

(۲) اُن نوجوانوں سے جو اخلاقی پستی (اخلاقی فتور عقل) میں مبتلا ہیں (بعض لوگ اس قسم کی فطری کمزوریوں کو مستقل مرض کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتے)

(۳) اُن سے جنکے قوائے دماغی اسقدر کمزور ہیں کہ وہ اپنے فعل کی بُرائی بھلائی یا اس کے نتائج کے متعلق کوئی ذاتی رائے قائم ہی نہیں کر سکتے ۔

(۴) اُن سے جو غیر معمولی مجرمانہ ماحول میں رہتے ہیں ۔

اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان نوجوانوں میں جو بظاہر جسم اور نفس کے اعتبار سے بالکل صحت کی حالت میں ہوتے ہیں لغزشوں کی محرک کون سی چیز ہوتی ہے ۔ اسکے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ نوجوانوں کی عام ترکیب نفسی پیش نظر رہے ۔ اگر ہم اس مسئلہ کو سمجھ لیں تو شدید جرائم اور نفسی امراض پر خود بخود روشنی پڑیگی ۔

عموماً اس بات کی دو توجیہیں کی جاتی ہیں لیکن جب تک یہ توجیہیں زیادہ گہری نفسیاتی بنیاد پر قائم نہ ہوں ان سے کام نہیں چلتا ۔ محض علامتوں کا مشاہدہ کرنا کافی نہیں بلکہ ان پر مجموعی نفسی زندگی کی نسبت سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے ۔

لغزش کا ایک بڑا سبب یہ قرار دیا جاتا ہے کہ نوجوانوں پر کتب بینی کی دُھن سوار ہوتی ہے اور جو کتابیں انہیں پڑھنے کو ملتی ہیں وہ مخرب اخلاق ہوتی ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ اُن سے جو مجرمانہ افعال سرزد ہوتے ہیں وہ محض ان "من چلے پن" کے واقعات کی نقل ہوتی ہے جنھیں

نوجوان ناولوں میں پڑھتے ہیں۔ یا اُن "سنسنی خیز" تماشوں کی جو وہ تھیٹر یا بائسکوپ میں دیکھتے ہیں۔ اُن کے دل میں یہ امنگ اُٹھتی ہے کہ ایسی دلچسپ چیزوں کو ہم خود حقیقت کا جامہ پہنائیں اور اسطرح قانون فوجداری کی خلاف ورزی واقع ہوتی ہے۔ والٹر ہوفمان نے جو نوجوانوں کی عدالت کے جج تھے ان محرکات کی صحیح حد کو سمجھا ہے۔ اور اسے بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ نوجوانوں نے کسی کتابی قصے کی تقلید میں کوئی جرم کیا ہو"

اور ہیلوگ تو یہاں تک کہتا ہے اس قسم کی کوئی قابلِ اعتبار یا ضابطہ روایت بھی موجود نہیں بلکہ ایسی خبروں کی بنیاد عموماً ملزموں کے یکطرفہ بیان پر ہوتی ہے۔" کارل مارکس کے ناول اور اس قسم کی دوسری سنسنی خیز کتابیں مثلاً "گرجا کے قبرستان میں قتل"۔ "قیدخانہ کی سیر" "رقاصہ امی کی سرگزشت" وغیرہ جنکے نام سے دھوکہ ہوتا ہے کہ بڑے معرکے کے قصے ہونگے محض اس لیئے خطرناک ہیں کہ زندگی کی جو تصویر وہ دکھاتی ہیں اسے نہ ہمارے ماحول سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ ہمارے اخلاقی معیار سے۔ بلکہ بقول ہوفمان کے ان میں اتنی دلچسپی بھی تو نہیں ہوتی کہ غلط اخلاقی اصول کی حمایت کی جائے۔ اس لیئے اُن سے نوجوانوں کو بلا واسطہ جرائم کی ترغیب نہیں ہوتی بلکہ محض بالواسطہ یعنی اسطرح کہ وہ تخیل میں شورش اور بےچینی پیدا کردیتی ہیں اور کمزوری کے لمحوں میں مجرمانہ افعال کے ارتکاب کا باعث ہوتی ہیں۔ مگر نفسیات کے نقطۂ نظر سے ابھی اور کریدنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اگر یہ کتابیں انسان کے خصوصاً نوجوان کے اس خلقی شوق کو پورا نہ کرتیں کہ غیر معمولی، مؤثر اور خطرناک مناظر کی سیر کرے تو نہ وہ لکھی جاتیں اور نہ اس کثرت سے خریدی جاتیں، نفسیاتی پہلو سے خود یہ بات اسقدر اہم نہیں کہ ناول اور بائسکوپ کے تاثرات صحیح زندگی سے مختلف ہوتے ہیں بلکہ اس کی اہمیت اس لیئے بڑھ گئی ہے کہ یہ تاثرات عنفوان

شباب کے طرز زندگی سے بالکل مطابقت رکھتے ہیں۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ یہ شیطانی صورتیں خود نوجوان کے نفس میں موجود ہوتی ہیں، اور اگر وہ ناول وغیرہ کم پڑھتا یا بالکل نہ پڑھتا تب بھی اُن کے پنجے میں ضرور پھنستا۔ کتب بینی اور بائسکوپ کی سیر اس کی طبیعت کی آگ پر تیل کا کام دیتی ہے۔ لیکن خود یہ آگ اسکی پیدا کی ہوئی نہیں ہے۔

یہی صورت اُس دوسری توجیہہ کی ہے جو نوجوانوں کی لغزشوں کے متعلق کی جاتی ہے ان کا سبب لوگ نوجوانوں کی بے ترتیب اور بے قید جبلتوں کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نوجوانوں کی نفسی زندگی بچوں کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں بہت سی نئی جبلتیں بڑھ جاتی ہیں۔ مثلاً شہوت جنسی، اپنے آپ کو منوانے کی امنگ، عیش و عشرت کی خواہش اور اسکے لئے روپے کی طلب۔ اسکے ثبوت میں مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ لڑکوں سے مجرمانہ افعال زیادہ تر عین بلوغ کے زمانہ میں سرزد ہوتے ہیں۔ اِن نئے تغیرات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سی نفسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جنپر نوجوان کو قابو نہیں رہتا۔ ساری نفسی زندگی میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور ہنوز اسکا رفع کرنا نوجوان کے اختیار میں نہیں ہوتا اسطرح اُن سے اضطراری افعال سرزد ہونے لگتے ہیں۔ جنکی تفصیل یہ ہے:۔

بچّے کی نفسی زندگی کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اسکے خیالات اور تصورات کا حرکات اور افعال سے بہت قریبی تعلق ہوتا ہے۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ اپنے اعضاء کو حرکت دیتا رہے ورنہ اسکی دماغی نشوونما رک جائیگی۔ کیونکہ ہر ہر حرکت سے اسکے ذہن میں نئے تصوّرات پیدا ہوتے ہیں۔ اسیطرح ہر تصوّر براہ راست حرکت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اتنا تو عام لوگ بھی جانتے ہیں کہ بچہ جس چیز کو دیکھتا ہے اُسے لینا چاہتا ہے۔ جس چیز سے اُسے دلچسپی پیدا ہو اسکی طرف فوراً ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اس قسم کے جبلّی افعال کے کامیاب ہونے سے جو لذت پہنچتی ہے اسکا اثر لوٹ کر ان افعال کے محرکات پر پڑتا ہے۔ اور اسطرح نفسی راہیں کھل جاتی ہیں بچہ کو جس فعل سے لذت ہو اُسے بار بار کرتا ہے۔ لیکن جس سے الم پہنچے اس سے نفسی زخم

پڑ جاتے ہیں جو آئندہ اس فعل میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ عہدِ طفلی کے ختم ہوتے ہوتے ان رکاوٹوں کی بدولت بچّہ کی سیرت بڑی حد تک سماجی اور اخلاقی معیاروں کے مطابق ہو جاتی ہے۔ مگر بلوغ کے عام زلزلے میں ان رکاوٹوں میں سے بعض غائب ہو جاتی ہیں اس پر طرّہ یہ کہ اس عمر میں جبلّتیں زیادہ شدید اور بالکل نئی قسم کی ہوتی ہیں۔ تصوّر اور حرکت کے درمیان جو روکنے والی کڑیاں ہوتی ہیں وہ بیکار ہو جاتی ہیں اور نوجوان کے افعال بھی تصوّر وحرکت کا کھیل بنجاتے ہیں۔ نوجوان جو اسطرح ابتدائی بچپن کے طرزِ عمل کی طرف رجوع کرتا ہے خود نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے یہ حرکتیں کیونکر سرزد ہوتی ہیں۔ ایرش ولفن کے نزدیک "بچّہ کی بڑی نفسی خصوصیت یہ ہے کہ ہر چیز کی خواہش کرے" ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچہ میں تصرف کی جبلّت ہوتی ہے۔ "بچے جو چوری کرتے ہیں وہ اصل میں ایک ہاتھ کی اضطراری جنبش ہے۔ جسکی محرک حرکت کی خواہش اور قبضہ کی خواہش ہوتی ہے۔" "چنانچہ چوری کے اکثر واقعات کی بنیاد محض اتنی ہوتی ہے کہ بچہ کی قوی خواہش حرکت کو پورا ہونے کا موقع ملتاہے۔" ان باتوں کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آغازِ شباب میں نوجوان بچپن کی حرکتوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ چنانچہ عین بلوغ کے زمانہ میں اسکی طبیعت میں کچھ چوری کے جنون کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر چیز کے جمع کرنے کا بیحد شوق ہوتا ہے۔ گھر سے دور رہنے اور آوارہ پھرنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر اُسکے دل میں آگ لگنے کے تماشے کا قوی تصوّر پیدا ہو تو وہ بے روک ٹوک آتش زنی کے عمل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جن افعال میں نہایت اہتمام اور مستعدی کی ضرورت ہو ان کی توجیہ اسطرح نہیں کی جا سکتی۔ لیکن نوجوانوں کے جرائم میں عموماً یکسانی اور سادگی ہوتی ہے، وہ چاہے جیب کترتے ہوں یا غبن کرتے ہوں ہمیشہ ایک ہی ترکیب سے کام لیتے ہیں۔

بیشک یہ وجہ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن محض اس سے نوجوانوں کی "لغزشوں" کی توجیہ نہیں ہوتی۔ اگر نوجوانوں کے اضطراری افعال تصوّر کے حرکت بن جانے سے پیدا

ہوتے ہیں تو گویا ان افعال کا کوئی خاص محرک نہیں ہوتا - اور وہ نہ صرف دوسروں کے لیئے
بلکہ خود کرنے والے کے لیئے بھی اسیطرح "ناقابل فہم" ہیں، جیسے کوئی "مکانکی مظہر
فطرت - اور اگر ان افعال کی ذمہ داری محض بے ترتیب اور بے قید جبلتوں پر ہے تو اسکے
یہ معنی ہیں کہ نوجوان کا نفس اصل میں کوئی ترکیب نہیں رکھتا - نوجوانوں کے افعال کو بچپن
کی ترکیب نفسی کی تجدید کا نتیجہ قرار دینے کے بعد اسکی ضرورت باقی رہتی ہے کہ خود بچپن
کی ترکیب نفسی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے - پھر یہ کہ نوجوان کے بہت سے افعال
ایسے بھی ہوتے ہیں جنکی توجیہہ بلا واسطہ خود عہد شباب کی مخصوص نفسی کیفیت سے ہو سکتی
ہے - اگر ہم ان باتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلی صورت میں بھی یہ مزید سوال کرنا چاہئے
"کیا سبب ہے کہ ہاتھ کی بیشمار جنبشوں میں سے جنکا امکان ہے یہ مخصوص جنبش واقع ہوتی
ہے؟" "کیا وجہ ہے کہ یہ مخصوص جبلت ابھرتی ہے اور بے روک ٹوک فعل کی صورت اختیار
کرتی ہے؟" دوسرے الفاظ میں ہمیں اس ترکیب نفسی کا پتہ لگانا چاہیئے جسکے مظہر یہ افعال
ہیں جو مجرمانہ کہلاتے ہیں - ظاہر ہے کہ اس ترکیب کے دائرے کے اندر ان پر "مجرمانہ" کا
اطلاق نہیں ہو سکتا بلکہ یہ لقب انہیں اسوقت حاصل ہوتا ہے جب نوجوان عدالت میں آتا
ہے - اور اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکے اس فعل نے اپنے نظام ترکیبی سے باہر نکل کر دوسرے
(خارجی اور داخلی) نظام ترکیبی میں مداخلت کی ہے - اب اگر کوئی اس سے پوچھے "تم
سے یہ حرکت کیونکر ہوئی" تو وہ اس کے جواب دینے سے اور بھی زیادہ معذور ہے. کیونکہ
جب اس بھید کی کنجی اب تک عدالت کے ججوں اور نفسیات شباب کے ماہروں کے ہاتھ نہیں
آئی تو غریب نوجوان کے پاس کہاں سے آئے گی، بجز اس صورت کے کہ اس نے کوئی
فعل جان بوجھ کر کیا ہو - ذرا دیر کیلیئے معاملہ کے دوسرے رخ پر غور کیجئے اور نوجوانوں کی
طرف سے جج سے پوچھیے "یہ نظام قانون کیونکر بن گیا" - یقیناً وہ اسکا جواب اپنی
تمدنی ترکیب کے لحاظ سے دے سکے گا - لیکن نوجوان کی ترکیب نفسی کے مطابق اسے

یہ بات سمجھا دینا بڑا مشکل کام ہے۔ غرض دونوں طرف سے سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی لیکن اگر نوجوان اپنے دل کا حال بیان کرسکتا تو وہ ایک دوسری دنیا کی تصویر دکھاتا جسمیں وہ رہتا ہے اور جو اکثر ہماری باضابطہ واقعی دنیا سے ٹکرا جاتی ہے۔ یہ اب بچوں کی دنیا نہیں بلکہ ایک نیا عالم ہے جسمیں تخیل اور حقیقت مل جل گئے ہیں۔ یہ ایک عالم خواب ہے جو عالم بیداری سے دست و گریبان ہے۔ عموماً یہ اختلاط اور امتزاج کامیاب ہوتا ہے لیکن جہاں بڑوں کی دنیا نے اپنے قانونی اور اخلاقی اصولوں پر نوجوان کی آرزوئے حیات کو محدود کرنا چاہا یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ ان نفسیاتی واقعات کی توضیح کے لئے ہم بعد کی زندگی سے بھی مثالیں لے سکتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک تھیٹر کے تماشہ گر کو اپنے کھیل میں اسقدر انہماک پیدا ہو جائے کہ وہ اُسے بجائے منظر کے حقیقت بنالے۔ فرض کیجئے کہ کھیل میں وہ ایک غدار کو خنجر مارا کرتا ہے۔ ہماری توقع کے خلاف کسی دن وہ ایک شخص کے پیٹ میں سچ مچ خنجر بھونک دیتا ہے۔ یا فرض کیجئے کہ ہم کسی تقریر کی طیاری کر رہے ہیں، اور محل تقریر کا قوی اور واضح تصوّر ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ مگر دوسروں کو تو یہ معلوم نہیں، انہیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ ہم دفعتاً زور سے چلاتے ہوئے اور چشم و ابرو، یا دست و بازو کو جنبش دیتے ہوئے سڑک پر ٹہلنے لگے۔ آخری مثال ایک عاشق زار کی لیجئے۔ فرطِ محبت میں اُسے اپنے محبوب میں وہ باتیں نظر نہیں آتیں جو دوسرے صاف دیکھتے ہیں۔ مثلاً بد نما خد و خال، یا بیمروتی کا کھلا ہوا برتاؤ، ایسی چیزوں کا نام ہم نے التباسِ تراکیب رکھا ہے۔ ان صورتوں میں دو اوضاع نفسی اور اُن سے متعلق دو عالم ایک دوسرے میں الجھ جاتے ہیں۔ پختہ عمر کے لوگ جو طبعی حالت میں ہوں ایسی صورت میں کسی ایک طرف ہو رہتے ہیں۔ مثلاً اگر واقعی اور تخیلی دنیا میں تصادم ہو تو وہ یا تو واقعہ کی زمین پر قدم جما دیتے ہیں۔ یا تخیل کی فضا میں اڑنے لگتے ہیں۔ جو مریض نفسی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ یہ نہیں کرتے۔ اور نوجوان بھی جسکی جبلتوں میں شدید ہیجان اور جسکے تخیل میں تشکیل کی قوی صلاحیت ہوتی ہے اکثر تھوڑی دیر کے لیے اس سے

قاصر رہتا ہے۔

فرض کیجیے کوئی نوجوان اپنے گھر کھانے کی میز پر بیٹھا ہے اور ذرا سی بات پر کانٹے کو پلیٹ پر اس زور سے مارتا ہے کہ وہ دور جا پڑتی ہے۔ کیا یہ بھی اضطراری فعل ہے؟ ہرگز نہیں ممکن ہے کہ وہ نوجوان خود یہ مان لے کہ باہر سے دیکھنے میں وجہِ اشتعال بہت خفیف نظر آتی ہے۔ لیکن اصل وجہ خفیف نہ تھی۔ بلکہ مدتوں کا بخار تھا جو دلمیں بھرا ہوا تھا۔ اسیطرح اگر نوجوان پرائی چیز اٹھالے تو یہ (برخلاف بچہ کے) شاذ و نادر ہی فوری یا اضطراری فعل ہوتا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اس چیز کی خواہش کو وہ مدت سے دلمیں دبائے تھا اور اب اتنی شدید ترغیب پیدا ہوئی کہ اندرونی دنیا تمام قیود کو توڑ کر بیرونی دنیا سے مل گئی۔

اگر اسٹینلے ہال کا طول طویل فرضیہ صحیح ہوتا کہ نوجوان کی ارتقائے نفسی میں انسانی تمدن کے پچھلے دور دوبارہ گزرتے ہیں۔ تو لغزش کی توجیہہ ہم یہ کرتے کہ موجودہ تمدنی دور میں کسی پچھلے دور کی شدید جذبات پرستی، قوی تخیل، کمزور ہئیت اجتماعی گھس آتی ہے۔ لیکن ہمارے فرضیہ میں اسکی ضرورت ہی نہیں۔ نوجوان کی ترکیب نفسی خود اسی کے اندرونی پہلو کے مشاہدے پر موقوف ہے۔

علاوہ نوجوانوں کے عالمِ تخیل اور نام نہاد عالمِ واقعی میں تصادم ہوجانے کے دو مختلف ترکیبوں کے آپسمیں الجھنے کی اور بھی مثالیں ہیں۔ البتہ یہ مثال سب سے زیادہ اہم ہے۔

تخیل پسند طبیعتیں اپنی الگ دنیا میں محصور رہتی ہیں۔ اور ہزاروں رغبتوں اور خواہشوں اور راحت و مسرت کی خیالی تصویروں کا لطف اٹھایا کرتی ہیں۔ ایک دن ایسا آتا ہے کہ بغیر انہیں خود محسوس ہوئے یہ خواب واقعی عمل میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ یہ عمل اور اسکے غیر متوقع نتائج تخیل کی خوشنما نقاب کو چاک کردیتے ہیں۔ اور مسرت و الم کی نظروں سے عالمِ واقعی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس خواب و خیال کی زندگی کو تھیٹر اور مخربِ اخلاق ناول سے اور مدد پہنچتی ہو، لیکن جو لغزشیں واقع ہوتی ہیں انکی ذمہ داری کسی خواب پر بہ حیثیت

خواب کے نہیں بلکہ اسکے موضوع اور آرزوؤں کی نوعیت پر ہے۔ عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان آرزوؤں میں بھی واقعیت پسندی کا ایک قوی عنصر موجود ہوتا ہے۔ آرزو کسی واقعی چیز کی ہوتی ہے۔ مثلاً قبضہ و تصرف کی یا عیش و عشرت کی، یا آزاد ہونے کی یا حکومت کرنے کی۔

اکثر وہ نوجوان جنکا یہاں ذکر ہے نہ کھوئے ہوئے رہتے ہیں اور نہ دنیا سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ان کا قانون کی خلاف ورزی کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا دل عمل کی امنگ اور قوت کی آرزو سے لبریز ہے۔ ممکن ہے کہ ان پر بچپن ہی سے برسوں تک اپنے کسی عزیز یا قریب کا استاد دباؤ رہا ہو جسنے انکی سیرت کو ابھرنے نہیں دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی ظاہری جبر انپر نہ کیا گیا ہو۔ مگر اندرونی روحانی دباؤ اس حد تک ہو کہ بیچارے انیلے نوجوان اس سے کسیطرح نکل نہ سکتے ہوں۔ بہرحال ایسی صورتوں میں دل کی گہرائی میں ایک آرزو پیدا ہوتی ہے۔ آزادی! آزادی! بعض نوجوانوں کے دلمیں یہ کانٹا کھٹکتا رہتا ہے کہ وہ اپنے بھائی بہنوں سے کمتر ہیں۔ یا انہیں لوگ جسمانی نقائص یا بھدے پن یا انوکھے پن کے سبب سے حقیر سمجھتے ہیں۔ کسیکو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ان کے دلمیں کیسے کیسے نشتر چبھ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا ناکردہ کار نفس زخموں سے چور چور ہو جائیگا۔ پھر اسپر طرہ یہ ہے کہ ان زخموں کو ہمیشہ چھپانا اور دبانا پڑتا ہے۔ آخر کار ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ انتہائی اضطراب اور اعصابی کمزوری کی حالت میں باہر سے کوئی چھیڑ ہوتی ہے۔ اور دفعتاً سارے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں۔ نوجوانوں کی لغزشیں محض دیکھنے ہی میں فوری یا اضطراری ہوتی ہیں۔ اصل میں بقول امریکہ والوں کے ان کا مادہ نفس کے تحت شعوری طبقے میں چپکے چپکے پکا کرتا ہے۔ اور جب تک انسان نوجوانوں کے نفس سے تمام وکمال واقف نہ ہو ان محرکات کی نشو ونما کو سمجھ نہیں سکتا۔ جب کوئی نوجوان عدالت میں بیان کرتا ہے کہ میں نے فلاں جرم ایک ایسے دباؤ سے مجبور ہو کر کیا ہے جسے میں سمجھا نہیں سکتا تو اسکا اشارہ ان جذبوں کی طرف ہوتا ہے جنکا غالباً خود اسے بھی پورا شعور نہیں ہوتا۔ اسکے قلب

کی خاموش گہرائیوں سے رفتہ رفتہ ایک ہولناک طوفان اٹھتا ہے جو کسی کے روکے رک نہیں سکتا تھا۔

یہاں ہم ان زمین دوز محرکات کا رنگا رنگ مرقع پیش نہیں کر سکتے۔ کبھی ان کی بنا کسی غالب رفیق کی رقابت پر ہوتی ہے جسکا دھندلا سا احساس دل میں ہو، کبھی جذبۂ انتقام پر، کبھی آزادی کی آرزو پر، کبھی عشق یا شہوت کے ہیجان پر، یہ صورت تقریباً معدوم ہے کہ یہ لغزشیں نفس کی بے ترکیبی یا انتشار سے پیدا ہوں، بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی پوشیدہ ترکیب نفسی جو سماج کی عام مثال سے مختلف ہو۔ "پردہ داری زخم جگر" کی بنا شوں کو توڑ کر نکل آتی ہے۔ جس سے ابتدا میں تو "لذتِ فراغ" حاصل ہوتی ہے۔ مگر جب اسکے واقعی نتائج سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ "درد درون" کے لئے "باعث افزائش" ہو جاتی ہے۔ مثلاً شاعرانہ طبیعت کے لوگوں کا رویہ بعض اوقات دوسروں کی املاک کے بارے میں واقعیت پسند لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ علماء کبھی کبھی اپنے قانونی فرائض کے ادا کرنے میں حیرت انگیز غفلت ظاہر کرتے ہیں۔ سرمستِ عشق خواتین واقعی زندگی کے بعض شعبوں اور اُن کی ذمہ داریوں کو معدوم سمجھنے لگتی ہیں۔ یہ سب باتیں نوجوان میں جسکا آہنگِ زندگی بالغون سے مختلف اور قانونی انضباط سے ناآشنا ہوتا ہے۔ بدرجۂ اولیٰ موجود ہوتے ہیں۔ صاف لفظوں میں پوچھیے تو نوجوان کے نفس میں ابھی تک "میں" کا احساس بہت قوی ہوتا ہے۔ مگر "تم" یا "ہم" کا تقریباً معدوم۔ اسے "آج" کی خبر ہوتی ہے مگر "کل" کی نہیں۔ وہ "فتح" کی لذت سے واقف ہوتا ہے مگر "تسلیم" کی خو سے ناآشنا۔ یہ نہ سمجھیے گا کہ ہمیشہ اور ہر پہلو سے نوجوان کی کمزوری ہے۔ وُلفن نے جو دو قسمیں مجرموں کی قرار دی ہیں اور جو اصل میں سارے انسانوں کی ہیں، یعنی کمزور ارادے والے، اور قوی ارادے والے وہ نوجوانوں میں بھی ہوتی ہیں۔ نظام قانون سے برسرپیکار ہونے میں بعض اوقات عظمت و شجاعت کی شان بھی نظر آتی ہے۔ البتہ ان صفات کا استعمال غلط یعنی سماج کے مخالف ہوتا ہے۔ بلکہ یہاں تک ممکن ہے کہ اِس

مخالفت کی تہ میں "اصلاح عالم" کا اخلاقی فلسفہ ہو۔ مثلاً کارل مور اور اسکے بعد اور بہت سے لوگوں کا معاملہ۔ یہ دوسری بات ہے کہ دنیا سے واقف نہ ہونے اور انسانی محبت میں سرشار ہونے کے سبب سے یہ اصلاح کا خیال محض سودائے خام ہو،

لیکن اگر نوجوان کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو اُن کی یہ بے عہدالیاں نظام قانون کی مخالفت میں نہیں ہوتیں بلکہ قانون کا تو انہیں خیال تک نہیں آتا۔ اگر یہ حرکتیں گھر تک محدود ہوتیں جہاں نظام اخلاق محبت پر مبنی ہوتا ہے تو والدین غالباً درگزر کرتے۔ لیکن چونکہ وہ امن عامہ میں خلل انداز ہوتی ہے اس لیے قانون سے جنگ چھڑ جاتی ہے۔ مقدمے چلتے ہیں، بدنامی ہوتی ہے، سزا تک نوبت پہنچتی ہے۔

ان واقعات کی کثرت دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نوجوانوں پر کوئی ایسی عام مصیبت ہے جو اس عمر کے ساتھ مخصوص ہے اور جسکے سبب سے اُن سے ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں اس لیے اخلاقی اور قانونی سزاؤں سے کام نہیں چلے گا۔ ضرورت اسکی ہے کہ عام تدابیر اختیار کی جائیں۔ یہاں پھر وہی تجویز سامنے آتی ہے کہ نوجوانوں کو علیحدہ ایسی زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے کہ ان جبلتوں اور ہیجانوں کو جو نوجوانوں کی ارتقا کے لیے ضروری ہیں نکاس کا راستہ بھی ملے اور ان سے کوئی ضرر بھی نہ پہنچے۔ سب سے مقدم یہ ہے کہ نوجوانوں کی ایک بیضرر آرزو یعنی لطف اور مسرت کی رعایت ہمیشہ مدنظر رہے۔ کیونکہ بہت سی ناپسندیدہ باتیں وہ اسی چیز کی جستجو میں کرتے ہیں۔ نوجوان اس عمر میں لطف زندگی کی خواہش کسی طرح ترک نہیں کر سکتا۔ اُسے نشاط انگیز احساس حیات اور مسرت افزا احساس کامرانی کی ضرورت ہے۔ اگر وہ ایسے تکلیف دہ اور بدنما ماحول میں رہتا ہے جہاں ایک باترتیب اور بلند زندگی کی گنجائش ہی نہیں ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس ماحول اور اس سماج سے لڑائی ٹھان لیتا ہے۔ بدمعاش اور گنڈے سماجی زندگی کی بربادی کی کوشش اس لیے کیا کرتے ہیں کہ اس زندگی کی مسرتوں میں اُن کا کوئی حصہ نہیں۔ جو شخص انتہائی مصیبت اور

افلاس کی حالت میں رہتا ہے، جو نہ گھر بار رکھتا ہے، نہ پیار کرنے والے، نہ کوئی بلند نصب العین
اُسے کاہے کا ڈر ہے۔ اُسے کیا پروا اگر اس کی زندگی جو پہلے ہی سے برباد ہے اور برباد ہو
سب جانتے ہیں کہ بہت سی عورتیں جو سچی اور گہری محبت کے لطف سے محروم ہوتی ہیں جان بوجھ
کر رسوائی اختیار کرتی ہیں۔ اگر نوجوانوں کو آوارگی سے بچانا ہے تو ایسی صورت پیدا کر
دینا چاہیئے کہ اگر وہ آگے قدم بڑھانا چاہیں تو سوائے قعر مذلت میں گرنے کے اور کوئی راہ نہ ملے
یہ صورت محض ادنی طبقہ کے لوگوں اور غربا ہی کو پیش نہیں آتی بلکہ اونچے طبقوں میں بھی
آوارہ گرد ہوتے ہیں۔ اور وہ مفلس آوارہ گردوں سے کسیطرح بہتر نہیں ہوتے۔ یہ دوسری
بات ہے کہ وہ اپنی آوارگی پر جمالیاتی رنگ چڑھادیں۔ یا ترقی اور آزادی کے من گھڑت
نظریوں کو صفائی میں پیش کریں۔ جو مصیبت اس وحشت زدگی کا باعث ہوتی ہے وہ دونوں
کے لئے یکساں ہے۔ یعنی زندگی کا بے مصرف ہونا، انتہائی کھوکھلاپن، اپنی اوقات سے نفرت
اور ان چیزوں کی وجہ سے آزادی کی آرزو یا "ایک گونہ بیخودی" کی تمنا۔ خود اپنے آپ سے
بھاگنے کی خواہش۔ یہ پرانا قول کہ بعض اوقات جو چیز بظاہر جرم نظر آئے اسکی بنا اصل میں
نہایت شریفانہ جذبات پر ہوتی ہے، نوجوانوں کے اعمال پر بالکل صادق آتا ہے۔ وہ مجرم
اس لیئے بنتے ہیں کہ ان کے لیئے بلندی اور روشنی کا راستہ بند ہوتا ہے۔ اس لیئے سب سے ضروری
چیز یہ ہے کہ اُن میں جو اثباتی عنصر ہے اسے ابھارا جائے۔ اور انہیں موقعہ دیا جائے کہ صحیح
زندگی بسر کر سکیں۔ اگر نوجوانوں کے لیئے ایک سچی، اور پُرمسرت اور آزاد زندگی کا انتظام
کر دیا جائے تو وہ آگے چل کر نئی قوت اور تازہ ارادے کے ساتھ موجودہ سماج میں داخل
ہونگے۔ اور اسکی بندشوں کو قبول کرینگے۔ اسکے بعد اگر انہیں سماج سے کوئی نزاع پیش آئیگی
تو اسکا مقصد تخریب نہیں بلکہ اصلاح ہوگا۔

دو لفظ لڑکیوں کی آوارگی کے متعلق بھی سُن لیجیے۔ اُن کے جرائم کی محرک بھی وہی
چیزیں ہیں جو نوجوان مردوں کو گمراہ کرتی ہیں۔ البتہ یہ فرق ہے کہ ان میں قوت عمل

اور ایجاد کا مادہ کم ہوتا ہے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ لڑکیوں کے جرائم کی کنجی شہوت جنسی ہے۔ لیکن اب اس خیال کی تردید کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خیال اس لئے پیدا ہوا کہ لوگوں نے خارجی افعال کو اصل محرکات سمجھ لیا۔

اس باب میں ہمیں اس مسئلہ سے بہت کم تعلق ہے۔ کیونکہ قانون کی رو سے تو عام طور پر زنا اسوقت قابلِ سزا سمجھا جاتا ہے جب یہ پیشہ بنا لیا جائے۔ لیکن نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس سے پہلے کے مدارج زیادہ اہم ہیں۔ مروجہ نظریہ کی رو سے بدکاری کے دو خاص سبب ہیں ایک تو غیر طبعی ست زیدہ جذبہ شہوت، اور دوسرے افلاس، جس سے سرمایہ دار اپنی ہوس رانی کے لئے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ایلزا فواگٹ لینڈر جس نے لائپزگ کے قریب کلائن موئس ڈورف کے ایک دار الشفقت[1] میں سو لڑکیوں کا امتحان کیا تھا اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی اصل سبب نہیں ہے۔

ان ۱۰۰ لڑکیوں میں سے ۵۹ زنا کی مرتکب ہوئی تھیں (۶ چودہ برس سے کم عمر کی ۱۶ چودہ اور ۱۶ برس کے درمیان۔ اور ۳۷ سولہ برس سے زیادہ عمر کی) ان میں سے اکثر کی بابت کہا جاتا تھا کہ یہ غیر طبعی مزاج رکھتی ہیں۔ ایلزا فواگٹ لینڈر کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ :-

(۱) ہم صحبتی کی بنا شخصی محبت نہ تھی بلکہ محض لاشخصی شہوت۔

(۲) شہوت کی شدت نہ تھی۔ ان میں سے ۹/۱۰ معمول سے بہت کم شہوانی جذبہ رکھتی تھیں

(۳) کسی فائدے کی طمع نہ تھی۔ البتہ "لطف" کی تلاش اور کام سے بچنے کی خواہش سب سے بڑی محرک تھی۔ ایسی مثالیں کم تھیں کہ لڑکیوں کو بلا واسطہ کسی مرد نے

---

[1] جرمنی میں حکومت نے ایسے خیرات خانے قائم کئے ہیں جنمیں ان بچوں کے جنکے وارث مفلس یا شرابی یا جرائم پیشہ ہیں قیام و طعام اور تربیت کا انتظام ہے انہیں دار الشفقت کہتے ہیں۔

بھکایا ہو - بلکہ بھکانے والی زیادہ تر ہجولی تھی - جس نے نمود و آرائش کا شوق پیدا کرنے کی یہ راہ بتائی تھی - پہلا درجہ تحفہ تحائف کا تھا اسکے بعد آہستہ آہستہ زناکاری پیشہ بنگیا -

نمبر ا - کا مطلب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عشق کے جو معنی ہم بیان کر چکے ہیں اُسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ لڑکیاں عشق سے محروم تھیں - اسی لیے ہم صحبتی میں کسی شخص کی قید نہ تھی - علاوہ اسکے ہم صحبتی کی بنیاد اصل میں شہوانی جذبہ نہ تھا - غیر طبعی عنصر یہاں محض یہ ہے کہ ان کے پاس عشق کی سپر نہ تھی اور باوجودیکہ ان کا شہوانی جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا یہ ہم صحبتی پر راضی ہو گئیں - اس لیے اصل محرک محض لطف و مسرت کی آرزو تھی - یعنی یہ خواہش کہ کوئی نازبردار ہو اور ہر طرح کی دلچسپیاں مثلاً ناچ بائسکوپ، آرائش، دعوت وغیرہ فراہم ہوں - اسپر طرّہ یہ کہ اُن کے ماحول میں یہ چیزیں معیوب نہیں سمجھی جاتی تھیں - عام طبقوں میں ناکتخدائی کی عفت کا نصب العین معدوم ہو چکا ہے خود والدین کو اسمیں کوئی بُرائی نظر نہیں آتی کہ اِن کی لڑکیاں غیر مردوں سے راہ و رسم رکھتی ہیں۔

اگر یہ صورت ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ ان طبقوں میں جہاں کوئی اخلاقی نگرانی نہیں ہے لڑکیاں محض اپنے "سطحی مذاق" کے سبب سے تباہ ہو جاتی ہیں - اور میرے خیال میں ہزاروں صورتوں میں یہی ہوتا بھی ہے - رنڈیوں کی طبیعت صرف وہی عورتیں نہیں رکھتیں جنکی شہوانی خواہش کبھی سیر نہیں ہوتی بلکہ وہ سب عورتیں جنھیں کبھی روحانی سیرت اور اسکے فطری فرائض کا احساس نہیں ہوا - کیونکہ انھوں نے اپنے نفس کے ان طبقوں کی کبھی جھلک ہی نہیں دیکھی -

اگرچہ یہاں ہمارا کام تعلیمی تدابیر بتانا نہیں ہے پھر بھی ہم ضمناً اتنا کہے دیتے ہیں کہ اگر لڑکیاں کو قعر مذلت میں گرنے سے بچانا مقصود ہو تو اسکی صورت صرف یہ ہے کہ ان میں زہر کے روحانی تریاق کا احساس پیدا کیا جائے جو خود ان کے قلب میں موجود ہے - ان کی سپر بھی وہی سچا عشق ہے جسکے ساتھ عورت کے دلمیں جذبۂ مادری بھی ہوتا ہے یعنی نطرت کا وہ عظیم الشان انفعالی جوہر جسکی بدولت وہ تخلیقی مادہ کو قبول کر کے اسکی مزید تعمیر کرتی ہے - اور پھر جسم اور روح دونوں کے واسطے سے تولید کا فرض انجام دیتی ہے -

اخلاقی بربادی کی ایک اور صورت بھی ہوتی ہے جو طبع نسوانی کی خالص اور فطری محرکات سے زیادہ قریب ہے۔ اکثر ظاہری حالات کی بنا پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کسی لڑکی کی بے عنوانی کا باعث سطحی مذاق ہے یا یہ گہری آرزو۔ لڑکی کے لیئے یہ لڑکے سے بھی زیادہ روحانی کرب کا باعث ہے کہ کوئی اس سے محبت کرنے والا یا اُسے سمجھنے والا نہ ہو۔ پہلا قدم اس معمولی امید پر مبنی ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص مل گیا ہے جسے وہ اپنا محرم راز، ہمدرد اور دوست بنا سکتی ہے۔ یہ امید اُسے خدا جانے کتنی ناقابلِ برداشت خلشوں اور تنہائی کے صدموں سے نجات دیتی ہے۔ لیکن جب زندگی کا یہ پہلا عقیدہ مسمار ہو جاتا ہے تو اتنی شدید مایوسی ہوتی ہے کہ اسکا نظام بھی تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ اور وہ جان بوجھ کر قعرِ ذلت میں گر جاتی ہے۔

اور یہ تو لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کا انجام ہوتا ہے کہ جب ایک بار پاکدامانی کا احساس جاتا رہا تو پھر وہ لغزشوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں، مجبوریوں کی زنجیر میں جکڑ جاتے ہیں۔ اور کھوئی ہوئی عفت کے ملنے سے ہمیشہ کے لیئے نا امید ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ خودکشی کر لیتے ہیں۔ بعض کی ساری زندگی اسطرح مفلوج ہو جاتی ہے کہ اب اسپر محبت کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ جس قدر کی خاموش آرزو ان کے دلمیں ہوتی ہے ان کی بھی وہ لظاہر سختی سے نفی کرتے ہیں۔ اس سطح کے نیچے انمیں پُرانی انسانیت بلکہ بچپن اور اسکی لازمی خصوصیات محبت اور عقیدت موجود ہوتی ہیں لیکن ان کا ابھارنا ناممکن ہے۔ غرور جو گناہوں تک کی حمایت کو طیار رہتا ہے ہر راہ کو بند کر دیتا ہے۔ ان نامرادوں کی تعمیر زندگی کی پہلی ہی کوشش نے ساری عمارت کو بٹھا دیا ہے۔

پختہ کاروں کو ان مفلوج طبیعت کے لوگوں سے کہنا چاہیئے کہ اب بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ محبت اس جادو کو بھی باطل کر سکتی ہے خواہ وہ کسی عورت کی پاک محبت ہو (گہری سیرت کی عورتیں اپنا فرض ہی یہ سمجھتی ہیں کہ مردوں کو اسطرح نجات دیں) یا وہ محبت جو حسبۃً للہ مصیبت زدہ روح کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اس محبت میں اور بھی گہری مذہبیت

ہوتی ہے اور اسے ہم علیسوی محبت کہتے ہیں۔

مروّجہ قانون کو اس کا یابلیٹ سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ تو نوجوانوں کے لیے ایک المناک حقیقت ہے۔ لیکن جسطرح دنیا میں اس نفسیات سے جسپر ہمارا سماجی نظام اور اسکے اصول مبنی ہیں زیادہ گہری نفسیات موجود ہے اسیطرح عدالتوں کے یکرنگ اور احساس سے خالی قانون سے بلندتر قانون بھی موجود ہے۔ ایسے طریقے دریافت کرنا جنسے نوجوان لاشخصی اور بے مروّت نظام قانونی کے سابقے کے مہلک اثرات سے محفوظ رہیں۔ خود اس نظام کے قائم رکھنے سے زیادہ ضروری ہے۔

جدید علم الجرائم نے اس دُہرے فرض کو عرصے سے محسوس کر لیا ہے۔ لیکن وہ اس مشکل فرض سے اُسوقت تک سبکدوش نہیں ہو سکتا جب تک وہ نفسیات شباب کا زیادہ گہرا مطالعہ نہ کرے۔

باب دہم

نوجوان اور سیاست

نوجوانوں کی سیاسی حالت ہر عہد کے مخصوص تاریخی حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ جس زمانہ میں کسی ریاست کے پیش نظر ایک معیّن سیاسی نصب العین ہو ہمیں برسوں تک ایک ہی حالت رہتی ہے۔ مثلاً ۱۸۱۵ء سے ۱۸۴۵ء تک جرمنی کی "جمعیتہ الشباب"[1] تقریباً ایک خطِ مستقیم پر چلتی رہی۔ بخلاف اسکے ہیجان، انتشار اور تجدید کے دور میں جیسا آجکل ہر روز نقشہ بدلتا رہتا ہے۔ اگر کوئی آج اس کیفیت کو قلمبند کرے تو کل ہمیں تغیر تبدّل کرنا پڑے گا۔ اس لیئے ہم خاص کر کے آجکل کے نوجوانوں کے سیاسی نصب العین کی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہیں۔

اور اگر ہم یہ تفصیل بیان بھی کرنا چاہتے تو صرف اتنا کہدینا کافی تھا کہ وہ تمام بنیادی سیاسی خیالات جو جرمنی میں بڑوں کے ذہن میں ہیں اور ملک میں تفریق اور انتشار پیدا کر رہے ہیں نوجوانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ نوجوانوں کے خیالات اور بھی زیادہ دھندلے دور از کار اور افسوسناک ہیں۔ ہمارا کام تو یہ معلوم کرنا ہے کہ نوجوان ارتقائے نفسی کے اس مخصوص دور میں سیاسی شعبۂ زندگی سے کسطرح پہلے پہل تعلقات قائم کرتا ہے۔ اور اس موقعے پر

---

[1] جرمن یونیورسٹیوں میں جمعیتہ الشباب Burschenschaft کے نام سے طلبار کے حلقے ہوتے ہیں جنمیں صرف اچھے خاندانوں کے نوجوان داخل کیئے جاتے ہیں۔ ان حلقوں میں فنون سپہگری کی مشق کی جاتی ہے اور جراءت و شجاعت کے امتحان کے لیئے مختلف حلقوں کے نوجوان باہم شمشیر زنی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور ہنس ہنس کر زخم کھاتے ہیں۔ جب جرمنی کو کوئی جنگ پیش آئے تو یہ نوجوان سب سے پہلے اپنے ملک پر فدا ہونے کے لیئے طیار رہتے ہیں۔

کون سی نفسی ترکیب عموماً رونما ہوتی ہے۔ البتہ ہم اس باب میں صرف جرمن نوجوانوں کا ذکر کریں گے۔ لاطینی اور انگلو سیکسن نسلوں کے نوجوان جداگانہ مزاج رکھتے ہیں اور ان کے ملکوں کا نظامِ ریاست بھی مختلف ہے۔ اس لیئے ان کا طرزِ عمل اس معاملہ میں بالکل دوسرا ہے۔ جرمن لوگوں کی یہ خصوصیت جوانی ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے کہ انہیں سیاست سے مطلق مَس نہیں ہوتا۔ یقیناً سیاسی شعور کا تاریک ہونا جرمن ذہن کی ایک خلقی صفت ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان میں سیاست سرے سے معدوم ہو بلکہ اسکا احساس اور استعمال غلط اور بیجا ہے۔

سیاسی رجحان کی اصلیت ارادہ حصول قوت ہے۔ قوت سے مُراد وہ جسمانی اور روحانی طاقت ہے جسکی بدولت انسان فطرت اور سماج پر اقتدار حاصل کرتا ہے تاکہ اپنے محبوب مقاصد قدور کو حقیقت کا جامہ پہنا سکے۔ یعنی سیاست کا بنیادی جذبہ حصول قوت کی خواہش ہے۔ جو کوئی قوت کی نفی کرتا ہے وہ سیاست کی نفی کرتا ہے۔ یہ بات قیاس میں آتی ہے کہ بعض افراد یا جماعتیں محبت کے مزاج یا حسن کے رام راج کو اپنا اصول زندگی قرار دیں۔ لیکن اگر وہ اس طرز زندگی کو عام کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بھی اپنی راہ سے رکاوٹوں کو دُور کرنے کے لیئے قوت کی ضرورت ہو گی۔ کم سے کم خیال کی قوت یا محبت کی قوت یا حُسن کی قوت۔ قوت کو ہم زندگی سے خارج نہیں کر سکتے۔ کیونکہ زندگی خود ایک قوت ہے۔ اور زندگی کے ہر مظہر میں کسی نہ کسی حیثیت سے قوت کی جھلک نظر آتی ہے۔

قوت کے اظہار کے مختلف طریقے ہیں جنکی ایک انتہا خالص جسمانی طاقت ہے جسکے ذریعہ سے ہم ظاہری حیثیت سے لوگوں کو مجبور کر سکتے ہیں۔ اور دوسری انتہا ذہنی طاقت ہے جسکی بدولت ہم ترغیب، دلائل وغیرہ سے لوگوں کو قائل معقول کر سکتے ہیں یا ابھار سکتے ہیں۔ عموماً لوگ قوت کے ان دو پہلوؤں یعنی جسمانی اشتداد اور ذہنی دباؤ میں فرق نہیں کرتے۔

جو تمدّن تہذیب کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جائے اسکی بابت ہم یہ کلیہ قائم کر سکتے ہیں کہ خالص جسمانی قوت کبھی کامیاب نہیں ہوتی جب تک اسکی بنا کسی یقین پر نہ ہو۔ کلاؤزے وِتز کا یہ قول

کہ "جنگ محض سیاست کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسمیں کسیقدر مختلف ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں" مخالفانِ جنگ کے لئے قابل غور ہے۔ جنگ بہ حیثیت "آخری دلیل" کے ہمیشہ رہیگی اور اس سے نجات پانا محض ناممکن ہے۔ حالتِ جنگ کی ایک جھلک روزمرہ کی پرامن زندگی تک میں نظر آتی ہے۔ امن عامہ کے حامی ہمیشہ جنگ کے لیے طیار رہتے ہیں۔ اور جب تک گھروں میں قفل ڈالے جاتے ہیں اُسوقت تک شر کی حفاظت بھی کرنا پڑیگی۔

ارادہ حصول قوت جو سیاسی رجحان کی اصل ہے اسکے حامل افراد بھی ہو سکتے ہیں۔ مختلف جماعتیں بھی اور ایک پوری ریاست بھی۔ افراد کی اور جماعتوں کی باہمی رقابت سے ہمیشہ قوت کا تناسب بدلتا رہتا ہے۔ ریاست میں قوت کے دریا سے نہریں کاٹی گئی ہیں یعنی قانون کے مطابق قوت تقسیم کردی گئی ہے اور تقریبًا سارا نظامِ حکومت مستحکم ضوابط میں جکڑا ہوا ہے۔ کل امور داخلہ اور بعض امور خارجہ ان ضابطوں کے ماتحت ہیں۔ جس ملک میں ریاست ہوتی ہے وہاں ریاست کی قوت اور اسکے قوانین ماتحت جماعتوں اور افراد کی حصول قوت کی کوششوں کو کہیں دباتے ہیں، کہیں مدد دیتے ہیں، اور کہیں اُبھار کر مافوق الافراد مقاصد کی بلند سطح پر پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن کسی فرد کا محض یہ خواہش کرنا کہ وہ اپنی (باقدر یا بے قدر) ذات کے لیے قوت حاصل کرے بجائے خود سیاسی رجحان کا ایک کرشمہ ہے۔ اگر حصول قوت کی کوشش سچی فوق الافراد قدور سے وابستہ ہے تو اخلاقی اعتبار سے یہ عزم قوت محض ایک فرد کے استحقاق زندگی یا دعوائے زندگی سے برتر ہے۔ خود زندگی اور آزادی کا وہ حق جو جدید دستور ریاست نے تقریبًا ہر فرد کو دے رکھا ہے ایک محدود دائرہ قوت ہے جو قانونی ضابطوں کی شکل میں مختلف قدر کا حامل ہوتا ہے۔ غرض قوت بجائے خود خلاف اخلاق نہیں۔ البتہ اسکی اخلاقی قدر کا تعین ایک تو اس مقصد پر موقوف ہے جسکے لیے وہ صرف کی جائے اور دوسرے اسکے استعمال کے طریقہ پر۔ یہ دونوں چیزیں اصل وضع میں باہم مشابہت رکھتی ہیں۔ کوئی قوت جو اعلیٰ ذہنی مقصد رکھتی ہے وحشیانہ جبر و تعدی سے کام نہیں لیتی۔ کوئی حق ناحق ذرائع اختیار نہیں کرتا۔

نفسیات کے نقطۂ نظر سے قدر کے مراتب کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے - یہاں تو زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم حصول قوت کے طریقوں کا وہ فرق بتائیں جس نے ہمیشہ کے لیئے سیاست کی دو خاص وضعین معیّن کردی ہیں - ایک طریقہ تو واقعیت پسندانہ مردم شناسی کا ہے جسمیں انسان محض ایک جذبات و محرکات کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے - اور اس سے اسیطرح کا برتاؤ کیا جاتا ہے اسکے قوی ترین محرکات معلوم کیئے جاتے ہیں اور وہ کسی نظام مقاصد کے لیئے خواہ وہ اخلاقی قدر رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو ذریعہ بنا لیا جاتا ہے - گویا یہاں صنعت و حرفت کی تقلید ہوتی ہے جسے محض اس بات سے سروکار ہے کہ کسی خاص غرض کے لیئے بہترین آلہ کون سا ہے - خود اس غرض کا اچھا یا برا ہونا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا - اسی لیئے عین پسند اخلاقیئیں ہمیشہ سے اس مشہور سیاسی اصول کے مخالف رہے ہیں کہ "مقصد ذرائع کو پاک بنا دیتا ہے"

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان جس عین کا تسلط قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اسے خود اسی کی اندرونی قوت سے اثر اور نفوذ پیدا کرنے دے - یہاں عین نہ صرف مقاصد کے لیئے معیار کا کام دیتا ہے بلکہ ذرائع کے لیئے بھی - یہ سیاست محض واقعیت پسندانہ نہیں ہے - یہ انسان کو محض اس نظر سے نہیں دیکھتی کہ وہ بحالتِ موجودہ کیسا ہے - بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ وہ کیسا ہو سکتا ہے اور اُسے کیا ہونا چاہیئے - اسمیں صرف صنعت نہیں ہوتی بلکہ تعلیم بھی ہوتی ہے - اس میں سچائی، عدل اور اصلاح و تہذیب کے اصول سے کام لیا جاتا ہے - اور انسان کے فطری ارادۂ خیر پر اور اس جوش پر اعتماد کیا جاتا ہے جو ایک اعلیٰ نصب العین محض اپنی اندرونی قدر کی بدولت اسکے دلمیں پیدا کر دیتا ہے "کیونکہ ہمیشہ سچا جوش رکھنے والا اس شخص پر غالب آتا ہے جسمیں جوش نہ ہو" (فشتے) پہلے طریقے کو ہم میکیاولی کی سیاست کہہ سکتے ہیں - آج کل اسکی فلسفیانہ بنیاد نظریہ ثبوتیت پر قائم ہے - جسکی رو سے دنیا کے سارے تغیرات یہاں تک کہ انسان اور سماج کے اعمال بھی قانون علت و معلول کے پابند ہیں جس سے سیاسی مقاصد کے حاصل کرنے میں کام لینا ضروری ہے -

دوسرا طریقہ علمی سیاست یا فشٹے کی سیاست ہے۔ اسکی بنیاد فلسفۂ عینیت پر ہے جس کے مطابق انسان مختار ہے۔ یعنی شخصی حیثیت سے ذہنی اعمال کا مرکز اور مبدا رہے۔ اور یہ اعمال اس طرح واقع ہوتے ہیں کہ وہ کسی قدر کے تصور سے اسکی قوت محرکہ کو ابھارتا ہے۔ یہ تقابل بہت پرانا ہے۔ یہانتک کہ افلاطون اور سوفسطائیوں کے زمانے میں موجود تھا۔ اور آج تک دونوں طریقوں میں جنگ ہو رہی ہے۔ فوری کامیابی مکیاولی کی سیاست کو ہوتی ہے۔ لیکن ایک پورا تاریخی دور گزرنے پر علمی سیاست کامیاب نظر آتی ہے۔

اب ہم نوجوان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سیاست کا اصل جذبہ اسکے دلمیں یقیناً موجود ہوتا ہے۔ لیکن بالکل ابتدائی صورت میں۔ اپنے آپ کو منوانے کی کوشش، اپنی کامیابی کی امنگ جنگ وجدل کا رجحان اور ذلت نفس کے احساس سے بیحد متاثر ہونا۔ ان سب کو ہم نوجوانوں کی خصوصیات قرار دے چکے ہیں۔ اور ان سب میں سیاسی جھلک موجود ہے۔ اس کا نفس اب بیدار ہو رہا ہے اور اپنی زندگی کے لئے میدان چاہتا ہے۔ خود اس کے جذبۂ حیات میں حصولِ قوت کا ارادہ مضمر ہے۔ لیکن اسکے پیش نظر ابتدا ہی سے یہ نقیض ہوتی ہے کہ ایک طرف تو اسمیں زندگی کی امنگ اور طاقت کا احساس جوش پر ہے۔ اور دوسری طرف اسکا ذہنی حلقۂ اثر بہت محدود ہے۔ اسکی جسمانی قوت اور اخلاقی بے اثری میں جو تفاوت ہے وہ اسکی ترکیب نفسی کی ارتقا کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ نوجوانوں کے ان جتھوں میں جو آوارہ پھرا کرتے ہیں اور شرارت بلکہ جبر و تشدد سے کام لیا کرتے ہیں اسی غیر مہذب سیاست کا ظہور ہوتا ہے۔ ان میں جنگ و جدل کی جبلت، جو انسان کی فطرت میں ہے موجود ہوتی ہے اور باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈھتی ہے۔ نوجوانوں کی اور آرزوؤں اور جبلتوں کی طرح اسکا بھی کوئی موضوع معین نہیں ہوتا بلکہ جو چیز سامنے آجائے اُسی سے وہ الجھ پڑتے ہیں۔ اس لئے ادنیٰ طبقہ کے نوجوان، جنکی اس فطری کیفیت نفس کو اُن سختیوں سے اور تقویت پہنچتی ہے جو اُن کے طبقہ پر کی جاتی ہیں۔ ہمیشہ اور ہر جگہ انقلابی رجحان رکھتے ہیں۔ امن و امان کے زمانے میں ان کا یہ رجحان دبا دیا

جاتا ہے لیکن اسکا مادہ ہمیشہ یکتا رہتا ہے۔ یہ وحشیانہ تشدد کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتا ہے
اور ذہنی قوت کی شکل میں بھی اونچے طبقوں میں اور کسیقدر مہذب حالت میں یہی چیز
طالبعلموں میں موجود ہوتی ہے۔ جو ہمیشہ سیاسی خورش پیدا کیا کرتے ہیں۔ جب کبھی ریاست
کی قوت سے مقابلہ ہو جائے تو جوانوں کا یہ جذبۂ حیات تنگ معنی میں سیاسی بن جاتا ہے سیاست
کے دونوں طریقوں میں سے جنکا ہم ذکر کر چکے ہیں **مکیاولی** کا طرز نوجوانوں کو پسند نہیں ہے
کیونکہ اسکے لئے ٹھنڈے دل سے مشاہدہ کرنے کی اور واقعیت پسندی کے ساتھ انسانوں کو
پہچاننے کی ضرورت ہے اور نوجوان جنکا قاعدہ ہے کہ یا تو انسان کو آسمان پر چڑھا دیتے
ہیں، یا تحت الثریٰ میں گرا دیتے ہیں، یا تو اسکی سیرت میں محض روشن پہلو کو دیکھتے ہیں یا محض
تاریک پہلو کو، انسانوں کی صحیح شناخت سے معذور ہیں۔ کبھی کبھی نوجوان اپنے آس پاس
کے لوگوں سے بہت سمجھا بوجھا اور کائیاں پن کا برتاؤ کرتے ہیں۔ لیکن وہ کسی دیرپا انتظام
کے پابند نہیں ہوتے۔ بعض نوجوان اس قاعدے سے مستثنے بھی ہوتے ہیں۔ مگر وہ پیدائشی
سیاست داں ہیں۔ اسکی مثال زیادہ تر یہودیوں میں ملے گی جو جلد بالغ ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ
ان کی قوم ہمیشہ حالتِ جنگ میں رہتی ہے اس لیئے ابتدا ہی سے مردم شناسی میں ملکہ رکھتے ہیں
لاسال نے چودہ برس کی عمر میں جو روزنامچہ لکھا ہے اسمیں اس طرزِ طبیعت کی ایک روشن
مثال موجود ہے۔ وہ اپنے ایک ہم عمر کی بابت لکھتا ہے " میں اس سے گفتگو کیا کرتا ہوں اور
اسے اپنے گھر بلایا کرتا ہوں تاکہ اس قسم کی سیرتوں کا مطالعہ کروں " یعنی وہ ابھی سے لوگوں
کی نفسی محرکات کا کھوج لگاتا ہے اور دلمیں یہ پوشیدہ توقع رکھتا ہے کہ اُن کے " کمزور پہلو "
معلوم ہو جائیں گے۔ **لاسال** کے یہاں دونوں سیاسی طریقوں کی باہمی کشمکش بھی پائی جاتی
ہے۔ وہ کہتا ہے " ...... اسیطرح میرے دلمیں دو مخالف جذبوں میں نزاع ہے یہ
دنیا میں چالاکی سے زندگی بسر کروں یا نیکی سے ؟ کیا مجھے یہ چاہیئے کہ ہوا کا رخ دیکھ کر چلوں
بڑے آدمیوں کی خوشامد کروں، سازشیں کر کے فائدہ اٹھاؤں اور اپنی دھاک جماؤں یا یہ کہ

ضدی جمہوریت پسندوں کی طرح سچائی اور نیکی پر ثابت قدم رہوں سوائے امیروں اور امارت کا خاتمہ کرنے کے کسی چیز سے سروکار نہ رکھوں ؟ مگر نہیں ۔ کچھ بھی ہو جائے مجھ میں بزدل اور چاپلوس درباری خوشامدی بننے کی صلاحیت بھی ہو تب بھی میں اسے گوارا نہیں کر سکتا ۔ میں تو قوموں کو آزادی کا پیغام پہنچاؤں گا خواہ اسمیں برباد ہی کیوں نہ ہو جاؤں ۔ میں ستاروں کے نیچے کھڑا ہو کر اس بات پر خدا کی قسم کھاتا ہوں اور مجھ پر لعنت ہے اگر میں کبھی اس قسم کو توڑوں ۔"

اسطرح کسی علین کے لئے جنگ کرنے کی خواہش اکثر نوجوانوں میں خود بخود فطری طور پر پیدا ہوتی ہے ۔ سیاست میں بھی وہی صورت ہوتی ہے جو اخلاقی عینیت میں تھی ۔ کیونکہ سیاسی مقصد محض اخلاقی مقصد کا ایک مخصوص پہلو یا مخصوص مظہر ہے ۔ ان کے یہاں علین گویا واقعیت سے خالی فضا میں منڈلایا کرتا ہے ۔ سیاست میں مفید حصہ لینے کے لئے واقعات کا وسیع علم ہونے کی ضرورت ہے جسکی بنا پر موجودہ اور مطلوبہ صورت حال کا فرق معلوم ہو سکے ۔ اس سے وہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو اندرون ملک اور بیرون ملک سے خوب واقف ہو ۔ اقتصادی اور معاشری حالات کا صحیح اندازہ کر سکے ، مختلف قوموں ، طبقوں اور افراد کی شخصیت اور ذہنیت کا محرم ہو ۔ اور ان سب متحرک چیزوں کا تصور روشن اور واضح " نظام قوت " کی حیثیت سے ہر وقت اسکے ذہن میں رہے ۔ نوجوان کے یہاں انمیں سے کوئی بات تام کو بھی نہیں ہوتی اسکے گرم خون کی گردش سے ایک خیال پیدا ہوتا ہے ۔ اسکو عمل میں لانے کے لئے وہ دل و جان سے کوشش کرتا ہے ۔ اور عالم واقعی یا عالم قدور میں جو چیزیں اسکی مخالف نظر آتی ہیں انکی اسے ذرا بھی پروا نہیں ہوتی ۔ اس لئے سیاست کے جو دستور العمل نوجوان بنایا کرتے ہیں انمیں انتہا پسندی اور مذہبی جنون کا رنگ ہوتا ہے ۔ زندگی کو وہ دور سے عقل اور تخیل کے ذریعہ سے دیکھتے ہیں ۔ اور اسیوقت سمجھ سکتے ہیں جب وہ بالکل سیدھی سادی ہو اور چند عقلی اصطلاحوں میں محصور ہو سکے ۔ اُن کے اخلاقی ارادے اور حوصلے کی قوت ابھی تک خفیف شہادت سے متاثر نہیں ہوتی ۔ اسی لئے وہ انتہا پسند اور اپنے عقیدے کے دلوانے

ہو جاتے ہیں ۔ دوسرے پہلو سے دیکھیے تو ارباب سیاست کی مبن پرستی میں ہمیشہ شباب اور
خام کاری کی جھلک نظر آتی ہے ۔ خیالی دنیا میں مگن رہنا نوجوانوں کی نفسی کیفیت کے خصوصیات
میں سے ہے ۔ کیونکہ ہر خیالی دنیا کی تعمیر میں عقلیت اور تخیل عجیب طرح ملے جلے ہوتے ہیں ۔ جہاں
تک معانی کا تعلق ہے نوجوان عقلیت پسند ہوتے ہیں ۔ کیونکہ وہ کل واقعات سے واقف نہیں
ہوتے اور چند وسیع اور اہم معانی سے سارا کام نکالنا چاہتے ہیں ۔ لیکن اور معاملات میں وہ اسی
شدت سے تخیل پرست ہوتے ہیں ۔ اُن کے نفس میں بیحد قوتِ تعمیر ہوتی ہے ۔ اور وہ ہر چیز کو صورت
پذیر اشکال میں تبدیل کر دیتے ہیں ۔ اس شیخ چلی پن اور عقلیت مآبی کے مجموعے سے وہ آنے
والے زمانہ کی ایک خیالی عمارت بناتے ہیں ۔ جسے وہ سیاسی نصب العین قرار دیکر اسکی پرستش کرتے
ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ہمیں انکے ماحول کے اثر کو بہت دخل ہوتا ہے ۔ خصوصاً ان اشتہاری الفاظ
کو جنکا انکے ماحول میں رواج ہو ۔ اسی اپنے جوشیلے پن اور اثر پذیری کی بدولت وہ آسانی سے
پھنس جاتے ہیں ۔ سیاسی شورش پھیلانے والوں کی یہ مشہور چال ان نوجوانوں پر آسانی سے
کارگر ہوتی ہے کہ وہ انہیں اپنے مقاصد کے ایک حصہ سے جسمیں خاص دلکشی ہو مطلع کرتے ہیں
اور باقی مقاصد کو پوشیدہ رکھتے ہیں ۔

شباب کی ان نفسی خصوصیات کا اثر ایک بات میں نظر آتا ہے جو جرمنی میں خاص طور
پر قابلِ غور ہے ۔ جو لوگ سیاست میں محض خیالی پلاؤ پکاتے ہیں وہ بین الاقوامی ہوا کرتے ہیں
اُن پر اپنے وطن کا بہت کم اثر ہوتا ہے حالانکہ انسان کی جسمانی اور ذہنی زندگی سراسر وطن کی
پابند ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سب سیاسی پارٹیاں اپنے شباب کے زمانہ میں بین الاقوامی ہوتی ہیں
جب تک ان کی ساری کائنات محض چند خیالات ہوتے ہیں اُس وقت تک وہ آسانی سے ملکوں
ملکوں پہنچ جاتے ہیں ۔ حریت ، جمہوریت ، اجتماعیت ، اشتراکیت سب کا ابتدا میں یہی
حال تھا ۔ جب کوئی سیاسی پروگرام واقعیت کی زمین میں جڑ پکڑ لیتا ہے تو عموماً اسمیں
عالمگیر "انسانیت" کا رنگ نہیں رہتا ۔ البتہ جرمنی میں یہ رنگ باقی رہتا ہے ۔ کیونکہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قدم کبھی زمین پر نہیں ٹکتے بلکہ ہم ہوا میں منڈلایا کرتے ہیں۔
کیا اسکا سبب یہ ہے کہ ہماری قوم اب تک جوان ہے؟
ہم نے نوجوانوں کی جو خصوصیات بیان کی ہیں اُن سے یہ بات بھی مطابقت رکھتی ہے کہ سیاست میں وہی چیزیں نوجوانوں کے دل کو لگتی ہیں جنکا تعلق عالمگیر انسانی حقوق اور عالمگیر "انسانیت" سے ہو۔ نوجوان کی شخصیت جو ہنوز اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے مصروف پیکار رہتی ہے اُسے گویا انسانی حقوق کی جنگ جو تین سو سال سے مختلف رنگ میں ہو رہی ہے دوبارہ برپا کرنا پڑتی ہے۔ نوجوان عموماً سیاست کو انفرادی اخلاق کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس داخلیت کے زمانہ میں اُن کے دلمیں فوق الافراد چیزوں یعنی عظیم الشان خارجی قوتوں کا پورا احساس نہیں ہوتا جنکا ہر فرد محتاج اور پابند ہے۔ البتہ آگے چلکر ہمیں اسمیں اتنی ترمیم کرنا پڑے گی کہ نوجوانوں پر دشوار محض یہ امر ہے کہ وہ دوسروں کی خدمت کرنے کے لیے سمجھ بوجھ کر اپنی خواہشات کو محدود کریں ورنہ ایثار اور قربانی میں روحانی ترقی کے احساس سے جوش و خروش اور نشہ کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ان کے لیے نہایت دلکش ہے۔
واقعات کی طرف سے بے پروائی اُن نوجوانوں میں کم ہو جاتی ہے جنھیں اپنی زندگی کے حالات کی بنا پر واقعیت سے روزمرہ تکلیف دہ سابقہ پڑتا ہے۔ مزدوروں کے لڑکوں میں عموماً یہ بات ہوتی ہے (اور جو لوگ افلاس میں مبتلا ہو کر اس طبقے میں نئے نئے داخل ہوئے ہیں انمیں خاص طور سے نمایاں ہوتی ہے) اس لیے ان سیاسی پارٹیوں میں جو اپنے حقوق کے لیے جنگ کر رہی ہیں بہ نسبت انکے جنھیں پہلے سے حقوق حاصل ہیں واقعیت پسند کارکنوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ مزدور جانتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اُسکے سامنے ایک محسوس مقصد ہوتا ہے اگرچہ اُسکے محدود دائرہ زندگی کے اثر سے یہ مقصد بھی محدود ہوتا ہے دوسروں کو فیصلہ کرنے میں اسوجہ سے دقت ہوتی ہے کہ وہ جس ماحول میں رہتے ہیں اُس سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے۔

جرمنی میں جو نوجوان "تحریک شباب" کے سچے رکن ہیں وہ کسی سیاسی پارٹی کے پابند نہیں۔ اپنے اس طرزِ عمل کی تائید میں وہ کہتے ہیں کہ اس عہد کی حکومت بذریعۂ پارلیمنٹ ایک مصنوعی اور غیر نامی چیز ہے اور اس پر بنیے پن کا رنگ غالب ہے۔ ان کے اس خیال سے اور بھی بہت سے لوگ اتفاق کرینگے۔ لیکن اُن کی علیحدگی کا صرف یہی ایک سبب نہیں اصل بات یہ ہے کہ نہ وہ اپنے آپ کو معینہ سیاسی مقاصد کا پابند کرنا چاہتے ہیں، اور نہ کسی بندھے ٹکے کام میں عملی شرکت کرنا۔ کیونکہ جرمنی کی موجودہ پارٹیوں کی حالت کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو لیکن پارٹیوں کا وجود تو اُسوقت تک رہے گا جب تک سیاسی زندگی باقی ہے جو کوئی پارٹیوں کا منکر ہے وہ اصل میں سیاست کا منکر ہے۔ سچ پوچھیے تو تحریک شباب اپنے اس اعلان کے ذریعہ سے خود ایک پارٹی بن گئی ہے۔ البتہ پارلیمنٹ میں اسکے نمایندے نہیں ہیں۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نوجوانوں میں جبلّی طور پر واقعی سیاسی جدوجہد کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ بیشک وہ اس لحاظ سے بڑی سیاسی قوت رکھتے ہیں کہ ان میں ایک نئی ذہنیت کا خمیر موجود ہے جس کے بل پر وہ نئی راہِ عمل نکال سکتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ صلاحیت ہنوز قوت سے فعل میں نہیں آسکتی۔

انہیں وجوہ سے شباب کا زمانہ سیاست کے بڑے مقاصد کو جنکی بنا پختہ کاروں نے ڈالی ہے عمل میں لانے کے لیئے موزوں نہیں ہے۔ نوجوان خود اپنی منزل مقصود معین نہیں کرسکتے۔ البتہ ان میں سچے رہنماؤں کی پیروی کی صلاحیت ہے۔ اور ان کے ساتھ رہ کر وہ بہت کچھ کام کرسکتے ہیں۔ نوجوانوں کے سیاسی مقاصد اکثر قومی تاریخ کے روشن ترین عہد سے اور اُس فرض سے متاثر ہوتے ہیں جو تاریخ نے انکی قوم پر عائد کیا ہے۔ اس بات میں کہ نوجوان اپنی قوم کے ماضی کا اثر مانتے ہیں اور اسکا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھاتے ہیں اور ہمارے پہلے قول میں کہ ان کا خیال اور عمل انتہائی "غیر تاریخی" ہوتا ہے بظاہر تناقض ہے۔ لیکن یہ تناقض محض ظاہری ہے کیونکہ نوجوان جس چیز سے متاثر ہوتے ہیں وہ "مردہ"

اضی نہیں بلکہ "زندہ" حال ہے۔ البتہ اُن کے حال کی جڑیں ماضی سے پیوست ہوتی ہیں اور وہی انکی قوت کا سرمایہ ہے۔ نٹشے کی طرح ہمیں بھی زندہ تاریخ میں اور آثار قدیمہ یا علم الالسنہ کے دفتر پارینہ میں جو قدامت پسندوں کا ملجا و ماویٰ ہے فرق کرنا چاہیئے۔ تاریخ کا ایک ابدی پہلو بھی ہے جو ہر عہد کے لیئے آزادی اور ترقی کی قوت کا خزانہ ہے۔ مگر یہ اصل میں ایک مذہبی نکتہ ہے جسکا یہاں موقعہ نہیں۔

اگر کوئی نوجوانوں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیئے "پھانسنا" چاہتا ہے تو وہ اپنی نطاقتِ ذہنی سے اسے فوراً محسوس کر لیتے ہیں۔ انہیں یہ فقرہ بہت ناگوار ہوتا ہے کہ "مستقبل اسی کے ہاتھ ہے جسکے ہاتھ میں نوجوان ہیں" کیونکہ اکثر ظاہر بین اسکے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ نوجوانوں کو قابو میں لاکر اپنا کام نکالنا چاہیئے۔ کوئی تعجب نہیں کہ ایسی صورت میں نوجوانوں کو جو وحشت "نظام" سے ہوا کرتی ہے وہ دوچند ہو جاتی ہے۔ اور وہ "ترکِ تعلق" پر مائل ہوتے ہیں۔ جو عہدِ شباب کا مخصوص مظہر ہے۔ اور یوں بھی سیاسی احساس میں ایک بہت بڑا "لاعقلی" عنصر ہے۔ جسے سیاست داں جو نوجوانوں پر دلائل کی بوچھار کیا کرتے ہیں نہیں سمجھتے۔ سیاسی عقائد یا تو واقعی حالات کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں یا غیر محسوس اثرات اور قوتوں سے۔ وہ کوئی نظری احکام نہیں ہیں جو دلائل سے ثابت کیئے جاسکیں۔ یوں سمجھیئے کہ جنگ پر آمادہ طبائع کی قوتِ محرکہ نے ایک ضابطہ یا ایک پروگرام کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اسکی بنیاد اصل میں کسی فرد یا کسی جماعت کی مجموعی زندگی یعنی داخلی سیرت، خارجی ماحول اور تقدیری سوانح پر ہوتی ہے۔ سیاسی حقائق کا ہم کوئی ثبوت نہیں دے سکتے۔ کیونکہ دوسرے نظریوں کے مقابلہ میں ان کا تعلق ان کی حالِ ذات سے کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ یہ علمی مسائل نہیں ہیں بلکہ قوت سے بھرے ہوئے خیالات ہیں۔ انہیں محض معلومات نہیں ہوتی بلکہ ارادے بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم مزدوروں کے سیاسی احساس کو محض عقلی دلائل سے نہیں بدل سکتے۔ یہ تو اُسی صورت میں ممکن ہے جب انکی مجموعی زندگی بدلجائے۔ ان کے سیاسی پروگرام کو ان کی مجموعی

حالت سے وہی تعلق ہے جو کسی خیالی عمارت کی دیواروں کو اسکی واقعی بنیاد سے ہو (لیکن یہ واقعی بنیاد جسے کارل مارکس محض اقتصادی حالات تک محدود سمجھتا ہے اصل میں مادی اور ذہنی حالات کا مجموعہ ہے) نظری حقیقت کی عالمانہ تلاش سیاست کی موت ہے۔ پروفیسروں کی سیاست میں منجملہ اور نقائص کے ایک یہ بھی ہے۔

اب ہم ان مقدمات سے نوجوانوں کے معاملہ میں کام لیتے ہیں۔ نوجوان کے سیاسی احساسات وخیالات نہ واقعیت کی بنا پر نشو و نما پاتے ہیں اور نہ اس معیار پر پرکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے نوجوانوں کا سیاست میں کوئی عملی حصہ نہیں ہوتا۔ مگر اس اعتبار سے کہ نوجوان بجائے خود ایک نئی ترکیب نفسی لیکر آتے ہیں جو سیاسی اعمال کے لیے (خواہ وہ مفید ہوں یا مضر) قوتِ محرکہ کا کام دیتی ہے، وہ ایک بہت اہم سیاسی عنصر سمجھے جاتے ہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ ایک دن وہ بڑھ کر پختہ کار جوان بن جائیں گے۔ نوجوان شلر۔ کارل اوگن کے مقابلے میں کوئی سیاسی قوت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن جو چنگاری اُسکے ڈرامے "قزاق" میں دبی ہوئی تھی اور "ڈان کارلوس" میں دہک اٹھی تھی اُس نے آگے چل کر سیاسی حریت پسندی کی شدید آگ بھڑکادی۔ جسکا پروگرام اصل میں ایک نئے طرز زندگی اور نئی سماجی قوت کا پیام تھا۔ آٹو براؤن ابتدا میں تمدنی اجتماعیت کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس نے جنگِ عظیم کے زمانے میں جب اسکی عمر بیس برس کی تھی "ریاست" کے نام سے ایک کتاب تین جلدوں میں لکھنے کا قصد کیا۔ یہ ایک مکمل پروگرام تھا مگر کسی نئی پارٹی کا نہیں بلکہ ایک نئے طرز خیال کا کسی نئے سماجی طبقے کا نہیں بلکہ نوجوانوں کے نئے دور کا۔ آخر کار اس کتاب کو ختم کرنے سے کچھ دن پہلے وہ بھی ایرنسٹ وُرشے اور ہیجم لانگر مارک کی طرح حقیقت کو سمجھ گیا[2] "اب مجھ پر ایک بات اچھی طرح کھل گئی ہے کہ بلند ترین قدر جو انسان کو زندگی میں حاصل ہو سکتی ہے نہ شہرت ہے، نہ راحت، نہ عظمت اور نہ وہ جسے میں اب تک سب سے بڑھ کر سمجھتا تھا یعنی عمل بلکہ محض اتنی بات کہ انسان دوسروں کے لیے ایک نمونہ بن جائے اور محض

اپنے وجود سے دنیا کی اور نوع انسانی کی تشکیل کرے۔ یہی قیصر نے کیا تھا، یہی مسیح نے، یہی سقراط نے، یہی سکندر نے"

اب تک ہم نے سیاست سے وہ فن مُراد لیا ہے جو بتاتا ہے کہ انسان سماج اور ریاست میں کسطرح قوت حاصل کرسکتا ہے مگر سیاست خود ریاست کی ماہیت کے علم، یا سیاسی طرز خیال کو بھی کہتے ہیں جس سے فرد کا تعلق ریاست سے معین ہوتا ہے۔

ریاست کی تعریف کرنا بغیر اسکی تاریخی نشوونما کے کسی درجے یا اسکی کسی خاص صورت کی پابندی کے بہت دُشوار ہے۔ اس لیئے ہم اس سے قطع نظر کرنے پر مجبور ہیں۔ البتہ ایک عام بات ریاست کے متعلق کہی جاسکتی ہے کہ وہ ایک مافوق الافراد موضوع، اور منضبط نظام قوت ہے۔ ریاست میں رہنے کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ اس خارجی قوت سے ہمیشہ نزاع کی جائے بلکہ اصل میں یہ ہیں کہ ہر فرد کے دلمیں ریاست کی روح اجتماعی پیدا کردی جائے۔ یہ روح اجتماعی ایک مافوق الافراد ارادہ ہے جو ہر شخص کے انفرادی ارادے کو مغلوب کرلیتا ہے اور اسطرح اسکی ذات کو وسعت بخشتا ہے۔ افلاطون نے اپنی "ریاست" کے آٹھویں اور نویں حصے میں تفصیل سے بتایا ہے کہ روح اجتماعی فرد کے نفس میں کیونکر رہتی ہے۔ اور اسکی کیا کیا صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اسکے بعد ارسطو۔ فلیبوس۔ مکیاولی اور مانٹیسکیو نے اس مبحث پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ہر سیاسی طرز خیال ایک مافوق الافراد ذہنیت ہے جو فرد کے شعور میں موجود ہوتی ہے۔ اسمیں دونوں پہلو موجود ہیں۔ حصول قوت کی خواہش بھی، اور ایک مافوق الافراد اور منظم مرکز کی اطاعت بھی۔ جس حدتک روح اجتماعی ہم میں موجود ہے اس حد تک ہم محض فرد ہونے، یا کسی ایک جماعت یا محدود اغراض کی انجمن یا پارٹی یا طبقے کا رکن ہونے سے بالا ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ نوجوانوں کو اس ذہنیت سے کیا تعلق ہے اسکا جواب ایک مختصر جملہ میں نہیں دیا جاسکتا۔ سب سے پہلے تو یہ بات قابل توجہ ہے کہ نوجوان اپنی اہم ترین نفسی خصوصیت

یعنی داخلیت پسندی کی بدولت مافوق الافراد نظام کے ماتحت ہوتے ہیں۔ جو کوئی اپنے نفس میں زیادہ مشغول رہتا ہے اور اپنی ذات کے لیے زیادہ مطالبہ کرتا ہے اسکی طبیعت میں شخصی تعلقات کی طرف تو رجحان ہوتا ہے لیکن جو چیزیں اس حد تک مافوق الاشخاص ہوں کہ لاشخصی بن گئی ہوں ان سے اسے دلچسپی نہیں ہوتی۔ خودی کا احساس جسکا مزا اُس نے پہلی بار چکھا ہے کسی خارجی نظام کے آگے سر تسلیم جھکانے سے مانع آتا ہے۔ اس لیے نوجوانوں کا طرز معاشرت ایک طرح کی حرّیت پسندانہ انفرادیت ہے۔ اس رجحان میں اتنی توسیع ضرور ہوتی ہے کہ نوجوان چھوٹے چھوٹے حلقوں میں رہتے ہیں جو شخصی تعلقات پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہر حلقہ اپنی انفرادیت کی حفاظت کرنا چاہتا ہے۔ اور دوسرے حلقوں سے جو اختلافات ہیں ان پر زور دیتا ہے تاکہ خود اسکی خصوصیات جو ابھی اچھی طرح معیّن نہیں کسیقدر نمایاں ہو جائیں۔ جرمنی میں اس انفرادیت کو جو نفی پر مبنی ہوتی ہے قومی خصوصیات سے اور تقویت پہنچی ہے۔

جو شخص نوجوانوں سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ خود انمیں "تنظیم" کا مادہ بالکل نہیں ہوتا۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جماعت کے باہمی رابطہ کے قواعد نرم ہوں لیکن افراد میں بہت گہرے شخصی روحانی تعلقات ہوں۔ لیکن "تنظیم" میں انہیں یہ بات ناگوار ہے کہ بے تکلف زندگی ترک کرنا پڑتی ہے۔ حرکات و سکنات مصنوعی قواعد کی زنجیر میں جکڑ جاتے ہیں اور محدود یکطرفہ مقاصد پر زور دینا پڑتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسکول کی جماعتوں میں اجتماعی روح ہوتی ہے جسکا استعمال کبھی صحیح کیا جاتا ہے کبھی غلط۔ لیکن اسکی بنا گہرے تعلقات زندگی پر ہوتی ہے اور عقلی تنظیم کو اسمیں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جرمنی میں نوجوانوں کی انجمنیں رشک و رقابت کا گھر ہیں۔ جنگِ عظیم سے قبل تحقیقات سے معلوم ہوا تھا کہ جنگی خدمت کی عمر سے پہلے نوجوانوں کو باوجود باجے اور وردی کے شوق کے فوجی زندگی زیادہ دن تک پسند نہیں آتی تھی۔ یہانتک کہ وہ سبھائیں بھی جنھیں خود نوجوان قائم کرتے ہیں بہت کمزور ہوتی ہیں۔ اور زیادہ

دن نہیں چلتیں کیونکہ خود اُن کے سرگروہ اور عہدہ دار بھی پابندی سے کام نہیں کرتے۔ ان میں مباحثوں اور مجادلوں کا طوفان برپا رہتا ہے اور ٹھوس کام بالکل نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے کچھ دن تک اس کھیل میں دلچسپی ہوتی ہے اسکے بعد طبیعت اچاٹ ہوجاتی ہے اور ہر انجمن سستی یا باہمی نزاع کے سبب سے ٹوٹ جاتی ہے۔

یہی نہیں کہ نوجوان اپنی تنظیم خود نہیں کرسکتے بلکہ دوسروں کے لئے بھی بہت دشوار ہے کہ انہیں کسی مافوق الافراد مقاصد رکھنے والی تنظیم میں مربوط کرسکیں۔ بیرونی مداخلت سے اور دقت پیدا ہوتی ہے۔ نوجوانوں پر جہاں باہر سے کوئی بوجھ ڈالا گیا ان کا جبلّی شخصی نزاج کا جذبہ بیدار ہوجاتا ہے۔ لیکن ایک صورت اس سے مستثنےٰ ہے۔ اگر وہ قدر یا مقصد جسکے لئے تنظیم کی جارہی ہے کوئی بلند اور اعلےٰ عین ہے تو نوجوانوں میں اسکے لئے بڑوں سے بھی زیادہ سرگرمی پیدا ہوجاتی ہے۔

اس پرجوش احساس کی خاطر کہ وہ ایک بڑے کام میں شریک ہیں انہیں اپنی انفرادیت کے قربان کرنے میں تامل نہیں ہوتا۔ عارضی طور پر اجتماعی زندگی کے بعض مقاصد بھی ان میں یہ جوش پیدا کرسکتے جیسے کوئی بڑا بلوہ، کسی برادری کا جشن، کوئی رفاہ عام کا کام۔ کوئی نوجوانوں کا جہاد (مثلاً بائسکوپ کے کسی فحش تماشے کے خلاف) لیکن اسطرح کے ہر کام کے دوران ہی میں ہر فرد اور ہر حلقے میں یہ رجحان پیدا ہوجاتا ہے کہ انفرادیت کی طرف رجوع کرے اور کام کے ختم ہونے کے بعد تو یہ لازمی ہے۔

اس عقیدت آفریں عین کی شکل میں ریاست بھی نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچ سکتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ ہر عمر کے لوگوں سے زیادہ قربانی کے لئے طیار رہتے ہیں۔ اور جان تک دینے میں دریغ نہیں کرتے۔ ریاست کا بلاواسطہ مشاہدہ اور تجربہ ان کے لئے ہر مشکل کو آسان کردیتا ہے۔ اسوقت نوجوان کی عین پسندی ان کی انفرادیت پر غالب آجاتی ہے۔ جب تک یہ جوش باقی رہتا ہے نوجوان ریاست کی عام خدمت اور جنگی خدمت کے لئے۔ بچوں دچسپا

طیار رہتا ہے۔ لیکن جہاں یہ دھیما پڑا فوراً کوئی اور عین اسکے دلمیں جگہ کر لیتا ہے۔ مثلاً عالمگیر برادری یا "انسانیت" یا وہ خود اپنے نفس کے شکوک اور وسوسوں میں مبتلا ہو کر رہ جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظیم الشان خارجی قوت جس نے اسے اب تک مسحور کر رکھا تھا اب اپنا طلسم ہٹا دیتی ہے۔

لہذا یہ قول صحیح ہے کہ پیدائشی جرمن ہونا ممکن ہے۔ مگر پیدائشی پُروشی کوئی نہیں ہوتا جرمن قوم میں جو شخصی انفرادیت اور خاندان کی انفرادیت پائی جاتی ہے وہ خلقی ہے اور اسکا تعلق اسکی باطنیت یا مذہبی مشاہدہ نفس اور تہذیب نفس سے ہے۔ پُروشی روح تعلیم و تربیت سے پیدا ہوتی ہے اسکے لیئے نوجوان خود بخود سعی نہیں کرتے۔ علاوہ اسکے فرض یا خدمت کا احساس جو ہر چھوٹے بڑے کام پر یکساں زور دیتا ہے جسقدر ہوش گوش کا طالب ہے وہ نوجوان میں نہیں ہوتا۔ سچی خدمت کے لیئے ضروری ہے کہ انسان میں اعلی درجہ کی اخلاقی پختہ کاری ہو اور وہ تزکیۂ نفس کے ذریعہ سے اپنی انفرادیت کو مافوق الافرادمین کی بلندی پر پہنچا دے۔ اگر وہ پُروشی روح جو جرمنی میں پیدا ہو چکی تھی برباد ہو گئی تو اس کا زندہ کرنا سالہا سال کا کام ہے۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ جرمن کسطرح اپنی خلقی سیرت پر غالب آسکتے ہیں بلکہ ایک حد تک اسکو بدل سکتے ہیں۔ انفرادی حرّیت پسندی کے علمبردار اس قوم میں بارہا پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن فریڈرک اعظم میں جو بات تھی وہ اسکے باپ کی سخت تربیت کی بدولت تھی۔ کانٹ، فشتے، اور ہیگل نے جب اپنی فلسفیانہ بلند پروازیاں شروع کی ہیں اس وقت ان کے پیش نظر یہی بادشاہ تھا اور اسکی ریاست نوجوانوں میں فطری حیثیت سے یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ خود فراموشانہ جوش کے بغیر بھی اپنا روزمرہ کا کام انجام دے سکیں لیکن اگر کوئی دوسرا اس معاملہ میں ان کی مدد کرے تو وہ خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ یوں چاہے وہ کتنی دھواں دھار تقریریں کریں لیکن جب کوئی انہیں ایک مافوق الافراد اخلاقی نظام کا سیدھا راستہ دکھائے تو وہ سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اسطرح وہ اپنے اندرونی

انتشار اور بےچینی سے نجات پاتے ہیں۔ البتہ خود بخود وہ یہ راستہ نہیں ڈھونڈھ سکتے۔

ہمیں چاہیئے کہ اجتماعی زندگی کے فطری اور نامی نظم میں اور "تنظیم" میں فرق کریں۔ تنظیم عام طور پر غیر نامی ہوتی ہے۔ وہ خود بخود پیدا نہیں ہوتی بلکہ پیدا کی جاتی ہے، اسکی وجہ پیدائش اندرونی ضرورت نہیں بلکہ عقلی مصلحت ہے اور اسکی بنیاد جبلت پر نہیں بلکہ انضباط پر ہوتی ہے۔ نوجوان باوجود ہاتھ پیر مارنے کے خاندان کے یعنی فطری اجتماعی نظام کے رشتوں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ علاوہ اسکے وہ اپنے برابر والوں اور اپنے بڑوں سے مکمل ذاتی اور شخصی تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اتحاد ذات کا قائل ہوتا ہے اتحاد اغراض کا نہیں۔ اس لیئے یہ بالکل غلط طریقہ ہے کہ مدرسے کی زندگی کو ریاست یا کسی سرکاری پرگنے کے نمونہ پر ڈھالا جائے۔ مدرسے کی زندگی آج بھی اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اور آئندہ اسمیں مکمل انسانی تعلقات پر روز بروز زیادہ زور دیا جائیگا۔ اگر ہم طلبہ کے لیئے دو چار عہدے مقرر کردیں یا ایک آدہ طریقہ حکومت خود اختیاری کا انمیں رائج کردیں تو اس سے انمیں سیاسی روح نہیں پیدا ہو سکتی یہ تو ایسا ہے جیسے کسی لباس پر چند پھول کاڑھ دیئے جائیں۔ لیکن یہ تو انتہائی بدمذاقی ہے کہ مدرسہ میں حکومت بذریعہ پارلیمنٹ کی نقل کی جائے یا اُسے "پنچایت" بنادیا جائے مدرسے کی ایک جماعت البتہ پنچایت بن سکتی ہے مگر اس صورت میں کہ واقعی اسکے سب اعضا زندگی کے اہم معاملات میں ایک دوسرے کے شریک ہوں۔ شاید پورے مدرسے کے طلبہ میں بھی باوجود اختلاف عمر کے ایسے موقعوں پر پنچایت ہونے کا احساس پیدا ہو سکتا ہے جب وہ مشترکہ مقاصد پر غور کرنے کے لیئے جمع ہوں۔ لیکن مدرسے کی پارلیمنٹ، اسکے انتخابات، اسکے ارکان۔ اسکے باقاعدہ جلسے اور آراء کا شمار یہ سارا طول امل یا تو ایک بےضرر کھیل ہے جسمیں کچھ دن دلچسپی رہتی ہے یا اس بات کی کوشش ہے کہ زیادہ گہری زندگی نہ ہونے کی کچھ سطحی تلافی کردی جائے۔ حالانکہ اس کمی کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی۔ جہاں اُستادوں اور شاگردوں کے تعلقات میں بحث مباحثہ کا رنگ آیا تو سمجھیئے کہ نوجوانوں کی

اصلی " وضع " رخصت ہے خواہ اسمیں تصور کسی کا بھی ہو۔ جس شخص نے پہلی بار مدرسے کی پنچایت کا خیال ظاہر کیا تھا اسکا یہ منشا نہیں تھا بلکہ وہ چاہتا تھا ایک طرح کی برادری بنائے جس میں باہم مکمل تعلقات زندگی موجود ہوں۔ ممکن ہے کہ اس برادری میں تقریروں کی ضرورت پڑے۔ لیکن شکایتی میموریل اور تحقیقاتی کمیشن کی تو کہیں گنجائش نہیں۔ اجتماعی امور بھی اچھی اور بری وضع کے بلکہ یوں کہئیے کہ فطری اور مصنوعی ترکیب کے امتیاز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں مدرسے کی پارلیمنٹ یا مدرسے کی پنچایت کی گنجائش ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ اس مدرسے کی اجتماعی وضع ہی بگڑ گئی ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ہم پھر اصلی سیاست کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس شعبۂ زندگی کا احساس چودہ اور سترہ برس کی عمر کے درمیان بہت کم ہوتا ہے۔ لاؤنے برکن کے " تعلیم مزید" کے مدرسوں میں جو تحقیقات کی ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لڑکے سیدھے مدرسے سے آتے ہیں وہ سیاسی مسائل کے متعلق بہت دھندلے تصوّرات رکھتے ہیں اور بطور خود ان چیزوں میں کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں لیتے۔ یہاں تک کہ مزدوروں کے لڑکے بھی اس عمر میں "محنت" "سرمایہ" اور " غریب وامیر طبقوں کی جنگ " سے واقف نہیں ہوتے۔ اور اگر کچھ جانتے بھی ہیں تو اپنی پارٹی کی سُنی سُنائی باتیں جو عام طور پر دو چار چلتے ہوئے فقروں تک محدود ہوتی ہیں۔ لڑائی سے پہلے متوسط طبقے کے نوجوانوں خصوصاً ہائی اسکولوں کے طالبعلموں، یہاں تک کہ " جمعیت طلبہ " کو بھی سیاسی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا جس سے قوم کی نشو و نما کو بہت ضرر پہنچا۔ اب اس چند برس کے عرصے میں کچھ فرق ہوا ہے۔ لیکن پرانی حالت پوری طرح نہیں بدلی۔ طلبہ کے سیاسی مباحثوں میں آج تک سیاسی احساس کی کمی نظر آتی ہے۔ خصوصاً سیاست خارجہ کی اہمیت اور مضبوط پالیسی اور فیصلہ کن جدوجہد کی ضرورت کو وہ بالکل نہیں سمجھتے۔ ہماری قوم کے موجودہ مصائب کو دیکھتے ہوئے یہ بہت افسوسناک بات ہے۔ لیکن بجائے خود یہی اچھا ہے کہ سیاسی اثرات اور

مباحث تو نہ روکے جائیں لیکن سیاست میں واقعی حصہ لینے کی اجازت طلبہ کو نوجوانی کا زمانہ گزرنے کے بعد یعنی کم ازکم چوبیس برس کی عمر میں دی جائے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نوجوانوں پر ایک خاص عرصے تک مذہبیت کا بوجھ نہ ڈالنا چاہیے۔ ہمارے خیال میں سیاست کے معاملے میں بھی اگر انہیں کچھ مہلت دی جائے تو اچھا ہے۔

یہ اندیشہ بے بنیاد ہے کہ کہیں اسطرح نوجوانوں کی سیاسی قوت بیکار نہ ہو جائے کیونکہ ہر عہد میں نئی نسل سے سب سے بڑا فیض واقعی سیاست کو یہ پہنچ سکتا ہے کہ ایک نیا سیاسی اخلاقی نصب العین قائم ہو جو خاموشی سے نشو و نما پائے اور آہستہ آہستہ سیاسی علم اور سیاسی ارادے سے معمور ہو جائے۔ قبل از وقت جد و جہد کا محض یہ نتیجہ ہوگا کہ نوجوانوں کے جہل مرکب میں اور ترقی ہوگی اور ملک کے فرقہ دار مدبّروں کے لیئے اور دقتیں پیدا ہو جائینگی۔

"افلاطون نے ریاست کے رہنماؤں کے لیئے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ عقل و دانش کے بہت سے مدارج سے گزرنے کے بعد اور آہستہ آہستہ بہت سی مقدس رسوم ادا کرنے کے بعد فوجی طبقے سے حاکموں کے طبقے تک پہنچیں۔ اسکے اس اصول میں ایک دائمی حقیقت پوشیدہ ہے۔ ریاست کی خدمت تو انسان ابتدائے عمر ہی میں کر سکتا ہے۔ لیکن اسکی رہنمائی کے قابل تب ہوتا ہے جب وہ سالہا سال تک ریاست کا مطالعہ کرے، اسکی حقیقت پر غور کرے اور اسکی راہ میں تکلیفیں اٹھائے۔
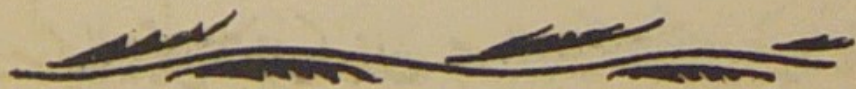
باب یازدہم

نوجوانوں کا تعلق پیشے سے

زمانۂ حال کے لوگوں کے لئے پیشہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اُن میں سے اکثر کا سرمایۂ زندگی یہی ہے۔ یہاں تک کہ فرد کے جو تعلقات اسکے خاندان سے ہوتے ہیں اُن پر بھی اسکے پیشے کا اثر پڑتا ہے۔ جتنی چیزیں پیشے میں داخل نہیں وہ ضمنی شغل سمجھی جاتی ہیں اوران کی اہمیت بھی ضمنی ہے۔ اسی لئے ہم لوگ کہتے ہیں کہ "فلاں شخص عملی زندگی میں داخل ہو گیا"۔ تو ہماری مُراد یہ ہوتی ہے کہ اُس نے اپنے پیشے کا کاروبار شروع کردیا۔ یا کم سے کم اسکا کام سیکھنے لگا۔

پیشوں کی تفریق کوئی بدیہی امر نہیں ہے۔ تمدّنی زندگی ایسی بھی ہوسکتی ہے جسمیں کوئی کام مستقل پیشے کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ بلکہ انسان کی ساری قلبی واردات اور اس کے کل اعمال میں مجموعی احساس زندگی موجود ہو۔ جب تک کھیتی، شکار، جنگ و جدل، مبادلۂ اشیا اور علم و ہنر یہ سب کام ایک ہی شخص کی ذات میں جمع ہوں اسوقت تک یہ کہنا مشکل ہے کہ اسکا خاص شغل یا پیشہ کیا ہے۔ غالباً اب بھی ایک ایسا پیشہ موجود ہے جسمیں زندگی سے غیر منقسم تعلق قائم رہتا ہے اور وہ کاشتکاری ہے۔ اس لئے روسو کا ایک قول ایک حد تک صحیح ہے کہ "حقیقی انسان کسان ہے"

یہ سوال کہ پیشوں کی تفریق کیونکر پیدا ہوئی اور ہر پیشے میں کام کی اسقدر جزوی تقسیم کسطرح عمل میں آئی ہمارے موضوع بحث سے تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ "نئی روشنی کے زمانے تک پیشہ کا مقصد اور اسکی قدر و قیمت

تعین مذہبی پہلو سے ہوا کرتا تھا اور عیسوی تمدن میں (باوجودیکہ اخلاقی اور مذہبی رنگ کے اثر میں کمی بیشی ہوتی رہی) ہر پیشہ اپنے آپ کو ہمیشہ "مملکت الٰہی" یعنی ایک مافوق الافراد نظام منشا میں شریک سمجھتا رہا۔ مگر جب سے جدید زندگی پر دنیاوی رنگ غالب آگیا ہے یہ مذہبی دائرہ سمٹ گیا ہے بلکہ صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ شعور کے تاریک حصے میں پڑ گیا ہے۔ کیونکہ انسان کی زندگی پر پیشے کا جتنا زیادہ تسلّط ہوگا اُسی حد تک اسکا مجموعی تعلق کائنات سے یعنی اسکا مذہب پیشے سے متاثر ہوگا۔ اس لیے انسان کے تصور عالم اور تصور زندگی کے تعین میں پیشے کو گہرا دخل ہونا ضروری ہے۔ اور اسیطرح اگر انسانی معاشرت اس نقطۂ کمال پر پہنچ جائے کہ پیشہ کا انتخاب پوری آزادی سے کیا جا سکے تو اس انتخاب کی بنا یقیناً انسان کے بنیادی اخلاقی اور مذہبی عقائد پر ہوگی۔ اس لیئے نوجوانوں کو جو تعلق پیشے سے ہوتا ہے وہ صرف اقتصادی مسائل کی بحث میں نہیں آتا بلکہ اُن شعبوں سے زیادہ قریب ہے جو زندگی اور کائنات کی مجموعی قدر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی مناسبت سے ہم نے اسکا ذکر اخلاقی بحث کے بعد اور مذہبی بحث سے پہلے کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خود نوجوان کو ان مجموعی تعلقات کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ ارتقائے نفسی کے اس پہلو کو سمجھنے کے لیئے ہمیں یہ بتانا چاہیئے کہ پیشے میں زندگی کے کون کون سے اہم ترین پہلو داخل ہیں جنکا تصور یہ لفظ فوراً ذہن میں پیدا کرتا ہے سب سے پہلے تو ہمیں پیشے کے خارجی اور داخلی معانی میں فرق کرنا چاہیئے۔ خارجی تمدن کے ایک جزو کی حیثیت سے پیشہ ایک معین اور محدود دائرۂ عمل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر پیشہ پر اقتصادی رنگ غالب ہو۔ بلکہ اقتصادی پیشہ (کسب معاش) اسکی ایک جداگانہ قسم ہے۔ ہر پیشے کے لیئے خواہ وہ اقتصادی ہو یا نہ ہو ایک خاص سیاسی، قانونی، معاشرتی اور اخلاقی روش مخصوص ہے جو اُسکے حاملوں میں

لہ یورپ کی تمدنی تاریخ میں اٹھارویں صدی عقلیت کا دور ہے۔ اس زمانے کو "نئی روشنی" کا زمانہ بھی کہتے ہیں۔ ۱۲

پائی جاتی ہے - مجموعی تمدنی زندگی سے پیشے کا یہ تعلق تاریخی اعتبار سے مختلف رہا ہے - ہمیں اس کے متعلق جو کہنا ہے وہ زمانہ حال کے مغربی یورپ کے تمدن خصوصا جرمن تک محدود ہے - جس نقطۂ نظر سے ہم پیشہ اور اسکی اقسام کا مطالعہ کرتے ہیں اُسے تمدنی کہنا چاہیئے لیکن عام طور پر رسم قدیم کے مطابق وہ اجتماعی کہلاتا ہے -

پیشے کی اجتماعیاتی اور نفسیاتی بحث میں فرق کرنا چاہیئے - نفسیاتی بحث کا موضوع وہ نفسی علاقہ ہے جو ایک حال تمدن فرد پیشے سے رکھتا ہے یعنی کسی پیشے کا ارادہ اور احساس اسکے مخصوص حالات کی طرف میلان یا ان سے اجتناب ، اور اندرونی احساس فرض یعنی یہ احساس کہ اسے خدا نے کس مخصوص کام کے لیئے پیدا کیا ہے - نفسیات میں بھی ہمارا مخصوص موضوع نفسیات ارتقا ہے یعنی ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ نوجوان جو نشو ونما کی حالت میں ہے پیشے کی زندگی سے مختلف اوقات میں کیا تعلقات رکھتا ہے -

خارجی حیثیت سے پیشے کے تین اہم پہلو ہوتے ہیں :-

۱ - اسکا دائرہ کارگزاری مجموعی تمدنی زندگی کی نسبت سے جسکا تعین تقسیم محنت و اتحاد عمل کے بہت سے پیچیدہ اصولوں کے ماتحت ہوتا ہے - اسے ہم اُس پیشے کی مخصوص کارگزاری کہہ سکتے ہیں -

۲ - اسکا سیاسی دائرہ اثر یعنی وہ حقوق و فرائض جو اسکے ساتھ وابستہ ہیں اور وہ حیثیت جو اُسے اجتماعی زندگی میں حاصل ہے ، اسے ہم اُس پیشہ کا مرتبہ کہہ سکتے ہیں -

۳ - وہ مالی نفع جو اقتصادی پیشوں میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے لیکن تھوڑا بہت ہر پیشے میں ہونا ضروری اسے ہم اس پیشہ کی آمدنی کہہ سکتے ہیں -

داخلی حیثیت سے پیشے میں پانچ باتیں قابلِ لحاظ ہیں :-

۱ - رجحان طبع جو خلقی اور جبلی ہوتا ہے -

۲ - مقصد جو پیشے کے مذکورہ بالا خارجی پہلوؤں میں سے کسی پر مبنی ہوتا ہے - یعنی

کسی پیشے کے اختیار کرنے میں یا تو وہ مسرت مدنظر ہوتی ہے جو کارگزاری سے یا محض اسکی سعی سے ہوتی ہے۔ یا وہ مرتبہ یا مالی فائدہ جو پیشے کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔

۳- صلاحیت یعنی وہ ذاتی جسمانی، نفسی اور اخلاقی مناسبت جو ایک شخص کو کسی خاص پیشے سے رکھتا ہے قبل اسکے کہ وہ اُسے سیکھے یا عمل میں لائے۔

۴- واقفیت یعنی کسی پیشے کی ماہیت اور اسکے موضوع کا صحیح علم اور اُسکے احساس اور عمل کا صحیح تصور۔ یہ دونوں باتیں انسان کو بغیر پیشے کے شروع کیے بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔

۵- تعلیم یہ کسی شخص میں فطری نہیں ہوتی بلکہ تمدنی زندگی میں حاصل کی جاتی ہے اسکے حاصل کرنے کے بعد انسان پیشے کا کاروبار شروع کر دیتا ہے اور اسطرح اُسکے ساتھ گہرا اور مستقل تعلق قائم کر لیتا ہے۔

جب یہ تعلق قائم ہو جائے تو پیشہ کا منشا پورا ہونے میں طرح طرح کے احساس اور تشکیل، ارادہ اور عمل، کامیابی اور ناکامی کا ظہور ہوتا ہے۔ منجملہ ان سب کے تین باتیں نہایت اہم ہیں۔

۱- پیشے کی خوشی (یا مایوسی)

۲- پیشے کا مخصوص اخلاق۔

۳- پیشے پر مبنی تصورِ عالم۔

اگر ہمیں ذرا دیر کے لیئے عالمِ حقیقی کا علم مل جائے جسکے ذریعہ سے ہم انسان کے اور پیشے کے سارے پیچیدہ تعلقات سے واقف ہو جائیں تو شاید یہ ہو سکے کہ ہم ہر نوجوان کو تمدنی زندگی کے کاروبار میں ٹھیک اس جگہ پر پہنچا دیں جسکی اسمیں صلاحیت ہے۔ اور جسکے لیئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ کسی شخص کے پیشے میں اور اس صلاحیت میں جو اُسے ودیعت کی گئی ہے کبھی پوری مطابقت نہیں ہوتی۔ فرض کیجیے کہ ایک نوجوان نے اپنے پیشے کا صحیح اور مناسب انتخاب کیا ہے پھر بھی ابتدا میں اسکی موروثی

صلاحیتیں جنھوں نے لڑکپن میں ایک محدود دائرہ میں نشو ونما پائی ہے خارجی زندگی کے کسی
پیشے کے لیئے پوری طرح کافی نہیں ہوتیں، فرض کیجئے کہ اُس سے جن پیچیدہ کارگزاریوں
کا مطالبہ کیا جاتا ہے انمیں سے دس کو وہ اچھی طرح انجام دے سکتا ہے تو دو تین بلکہ دس
ہی ایسی بھی ہوں گی جنکی اسمیں استعداد نہیں ہے۔ اور جن میں سے بعض پر تو وہ باوجود
انتہائی محنت کے بھی پورا قابو نہیں پاسکتا۔ ذہین سے ذہین آدمی بھی کہیں نہ کہیں ہتھیار
ڈالدیتا ہے۔ یہ المناک انجام متمدن انسانوں کی تقدیر میں ہے جسمیں کبھی خود ان کا
قصور ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ اسکی مثالیں دنیا میں انقلاب پیدا کرنیوالے کارہائے نمایاں
سے لیکر روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں تک ہر شخص کے پیش نظر ہیں۔

یہی باتیں ان لوگوں کے خلاف بھی کہی جاسکتی ہیں جو پیشے کے انتخاب کے متعلق مشورہ
دینے والی کمیٹیوں سے بڑی بڑی اُمیدیں باندھتے ہیں۔ اس قسم کا مشورہ دینے میں شاذ و
نادر ہی صحیح طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ اصول تو بالکل ہی غلط ہے کہ محض نفسیاتی امتحان
کی بنا پر طبیعت کی مناسبت دیکھ کر مشورہ دیا جائے۔ کیونکہ قطع نظر اس امر کے کہ طبیعت کی
مناسبت اکثر اُسوقت کھلتی ہے جب کام سر پر پڑجائے۔ پیشے کا انتخاب محض نفسیاتی
نقطۂ نظر سے ہو ہی نہیں سکتا۔ اسمیں بعض خارجی پہلو بھی ہوتے ہیں۔ جن سے کسی شخص کا
نفس پوری مطابقت نہیں رکھتا۔ مثلاً اقتصادی عناصر کو انتخاب میں کافی دخل ہے محض
یہ دیکھنا کافی نہیں کہ نوجوان پیشے کی تعلیم میں کتنا روپیہ صرف کرسکتا ہے۔ یہ بھی دیکھنا پڑتا
ہے کہ سماج کو اس پیشے کی کہاں تک ضرورت ہے۔ یا اس پیشے میں کتنی گنجائش ہے
اسی کو مختصر الفاظ میں یوں کہتے ہیں کہ اُس پیشہ میں کیا "توقعات" ہیں۔ علاوہ اقتصادی
مصالح کے اور "نامعلوم" عناصر بھی ہوتے ہیں۔ جنکا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اور فرض
کیجئے کہ مشورہ دینے میں ان سب باتوں کا خیال کرلیا گیا ہے پھر بھی جب تک محض خارجی
مصلحتوں پر انحصار ہے اور تعلیمی مقصد پیش نظر نہیں مشورہ "معنویت" سے خالی رہتا ہے

کو شخص اس امر کی ہوتا چاہیے کہ اسکی سیرت کے جس پہلو کو پیشے سے تعلق ہو اسکی اخلاقی تربیت کی جائے۔ تب جاکر مشورہ نوجوان کے لیے مؤثر ہوتا ہے۔ اور اسکے دلمیں پیشے کے مخصوص اخلاق کی بنیاد پڑتی ہے۔

لیکن یہاں ہمارا کام تعلیمی مسائل سے بحث کرنا نہیں ہے۔ ہمارے لیے سب سے اہم انتخاب پیشہ کا نفسیاتی پہلو ہے۔ بلکہ انتخاب کا موقعہ تو صرف معدودے چند خوش قسمت لوگوں کو ملتا ہے اس لیئے یہ کہنا چاہیئے کہ ہمارا مقصد ان اندرونی اور بیرونی حالات کو معلوم کرنا ہے جنکے اثر سے نوجوان کسی پیشے کو اختیار کرتا ہے۔ بیرونی حالات سے نفسیات کو چشم پوشی نہیں کرنا چاہیئے۔ بعض سماجوں میں پیشہ وراثت پر مبنی ہوتا ہے۔ اب اگر آپ یہ فرض نہ کرلیں کہ ان میں افراد پر انتہائی ظلم اور جبر ہوتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان لوگوں کی ترکیب نفسی خاص طرح کی ہوتی ہے۔ وہ زندگی کو جیسا پاتے ہیں اُسی میں مضبوطی سے جڑ پکڑ لیتے ہیں اور اُسی پر جمے رہتے ہیں نہ ان کی طبیعت میں صورت پذیری کا مادہ ہوتا ہے اور نہ ان کے نفس میں اندرونی حرکت ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی زندگی بھی خاصی معقول ہوتی ہے۔ ان میں بعض مخصوص گہری اخلاقی قدر پائی جاتی ہیں۔ جنمیں سب سے اہم گھربار کی محبت، اور سکون و اطمینان ہے۔ ہمارے تمدن میں بھی اس نفسی ترکیب کے قوی اثرات موجود ہیں۔

لیکن ہمارے زمانے کا عام اصول یہ ہو کہ ہر شخص آزادی سے اپنے لیے کوئی پیشہ منتخب کرے۔ یہ اصل میں آزاد مقابلے اور آزاد معاہدے کی اصول کا ایک جز ہے۔ مگر سچ پوچھیئے تو یہ محض اصول ہی اصول ہے اسکی اصلیت اتنی ہے کہ کسی قانونی دفعہ کی رو سے کوئی شخص ذاتی فیصلہ کے حق سے محروم نہیں ہے۔ لیکن بہت سی قوتیں ایسی ہیں جو اسکی شعوری اور لاشعوری محرکات پر اثر ڈالتی ہیں۔ مثلاً قدامت پسندی جسے حرّیت پسندوں کے عزم ترقی سے وہ نسبت ہو جو کسی بھاری بھرکم چیز کو قوتِ محرکہ سے ہوتی ہے۔ یا خود

اپنی محدود سی آزادی ہی قابلیت یا مالی مقدرت یا دوسروں کے خیالات اور تعصبات کا دباؤ۔ مختصر یہ کہ قانونی آزادی کے یہ معنی نہیں کہ انسان اقتصادی اور سماجی حیثیت سے بھی آزاد ہے۔ یا اسمیں اتنی قوت ہے کہ ساری رکاوٹوں کو دُور کر سکے۔

خدا کا شکر ہے کہ انمیں سے بہت سی قوتیں نوجوانوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں وہ اُن واقعات سے بھی بےخبر ہوتا ہے جو زندگی پر اثر ڈالتے ہیں۔ یہ ناواقفیت مشکلوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے میں صحیح اور واضح علم سے زیادہ مفید ہے۔ نوجوان کا ارتقا کی منزل سے گزر کر کوئی پیشہ اختیار کرنا اور تخیل سے بتدریج واقعیت تک پہنچنا اصل میں ایک ہی چیز ہے۔ اس نقطۂ نظر کے ماتحت ہم اس ارتقا کے تین دور قرار دیتے ہیں۔

۱۔ بچوں کے پیشے کے خواب۔

۲۔ نوجوانوں کے پیشے کے منصوبے۔

۳۔ واقعی تجربات جو نوجوان پیشے کے متعلق پہلے پہل حاصل کرتے ہیں۔

۱۔ بچے جو پیشے کے خواب دیکھتے ہیں ان پر کھیل کا اور نقل کا رنگ غالب ہوتا ہے لیکن ان کھیلوں میں نہ صرف گہرے معنی ہوتے ہیں بلکہ ایک مخفی قوتِ تشکیل بھی جو نہایت گہری اہمیت رکھتی ہے۔ ہمیں شک نہیں کہ بچوں کے بعض پیشوں کے کھیل عہدِ طفلی سے مخصوص ہیں اور ان سے آئندہ ارادے کا پتہ نہیں چلتا۔ بعض پیشے ہر بچے کو متوجہ کرتے ہیں کیونکہ وہ عہدِ طفلی کی جبلی زندگی سے مناسبت رکھتے ہیں یا ان میں آئندہ زندگی کے اہم پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ مثلاً سپاہی یا کوچبان یا سوداگر بننا، عمارت بنانا یا دوسری چیزیں بنانا، شکار یا صیادی، گھوڑے کی سواری، شمشیر زنی اور نشانہ بازی آئندہ زندگی کی عام ضروریات میں سے ہیں اس لیئے اگر بچّے کو ان کا شوق ہو تو ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ وہ آئندہ چلکر ان میں سے کسی چیز کو اپنا پیشہ بنائے گا۔ لڑکیوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ ان کی آئندہ ارتقا کا دائرہ لڑکوں کے مقابلے میں بہت محدود ہوتا ہے۔ انہیں گڑیوں سے، چھوٹے بچوں

سے اٹھانا بچانے سے اور گھر گرہستی کے کھیلوں سے جو شوق ہے وہ خلقی جبلت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ جبلت اگرچہ محدود ہے مگر اپنے مقصد کے جاننے اور حاصل کرنے میں بہت مستحکم ہے۔ دوسرے رجحانات اس فطری صلاحیت پر مشکل سے غالب آتے ہیں۔ اس کھیل میں اصلیت کا رنگ تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے لیکن لڑکی جب ماں، بیوی، یا گھر گرہستی والی بنتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اسمیں یہ اصلی جبلتیں بیدار ہو گئی ہیں۔ اور خود یہ جبلتیں اسکی آئندہ زندگی کا پیش خیمہ ہیں۔

البتہ اگر لڑکے کھیل میں معلم یا واعظ بننے، مشینوں کو کھولنے یا بنانے، حساب کے سوال نکالنے، عدالتی مقدمے طے کرنے یا بیماروں کا علاج کرنے کا مستقل شوق ظاہر کریں تو سمجھنا چاہیئے کہ کوئی خاص بات ہے ایسی صورتوں میں اگر آپ تلاش کیجئے تو کوئی نمونہ ملیگا جسکی وہ پیروی کرتے ہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات خاندانی اثر بچوں میں پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ جب لڑکپن کا زمانہ ختم ہوتا ہے تو اکثر یہی کھیل واقعی مشاغل بن جاتے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیشہ کا رجحان کچھ دن کے لیئے نفسی ارتقا کے ہر پہلو پر غالب آگیا ہے۔ یہ قوت احساس کی نشو و نما کی ایک عجیب مثال ہے۔ ایسے لڑکے اور باتوں کے لحاظ سے بالکل بچے ہوتے ہیں یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ پیشے کو پیشہ سمجھ کر اختیار کرتے ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ذہن خارجی (یعنی تمدن) بچپن ہی سے انسان کی زندگی پر قبضہ کر لیتا ہے۔

۲۔ لیکن عام طور پر شباب کے آغاز کی علامت یہ ہے کہ نوجوان تمدن کے اس شعبہ کی طرف توجہ کرے جو اندرونی یا بیرونی اسباب سے اسکے لیئے خاص طور پر موزوں ہے اب جا کر وہ زندگی کا دستور العمل جسکا ہم نے دوسرے باب میں ذکر کیا ہے تمدن اجتماعی کی ضروریات کے ماتحت ہمیں جگہ لیتا ہے۔ اب نقل کا زمانہ ختم ہوتا ہے اور اصلیت کا احساس شروع ہوتا ہے۔

بینک نوجوان بھی پیشوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ یہ بچے کے کھیل سے زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ نوجوانوں کو جس کام سے شوق ہو وہ آسانی سے اُن کے دل پر مسلط ہوجاتا ہے خواہ انمیں اسکی قابلیت ہو یا نہ ہو۔ ان عام ارتقائی خصوصیات کی مثال شاعر یا تماشہ گر ہونے کی خواہش اور بعض صورتوں میں ماہر موسیقی یا فلسفی ہونے کی آرزو ہے۔ اسکی بعد فوج کی افسری مردانہ کھیلوں کی مہارت اور سیاحی نوجوان لڑکوں کے لئے خاص کشش رکھتی ہے۔ اور لڑکیوں کے لئے رائش گری اور رقاصی۔ ان چیزوں میں زمانے کے رنگ اور فیشن کو بھی دخل ہے۔ لیکن ماہر نفسیات کو نہایت غور سے یہ دیکھنا چاہیئے کہ نوجوانوں کا رجحان کسی پیشہ کی طرف محض ارتقائی دور کی خصوصیات کے سبب سے ہے یا واقعی اسکی ذات کو اس سے گہرا اور مستقل تعلق ہے۔

ان دونوں چیزوں میں تفریق کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ نوجوان اس عمر میں جن چیزوں کو زندگی کے لئے نہایت اہم سمجھتے ہیں اُن میں ابھی تک خواب آسا تخیل اور واقعی ارادہ مخلوط ہوتا ہے۔ بلکہ خصوصاً وہ نوجوان جو ذہنی گہرائی رکھتے ہیں ابھی تک خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں۔ نوجوان جب اپنے پیشے کے متعلق اہم فیصلے کرتے ہیں اُسوقت ان کی نفسی کیفیت فریب نظر اور احساس واقعیت کے بین بین ہوتی ہے۔ جو اس حالت پر اعتراض کرے وہ گویا فطرت پر الزام لگاتا ہے۔ ہمارا کام بحیثیت ماہر نفسیات کے یہ ہے کہ اس نیم تاریک کوٹھری میں روشنی پہنچائیں تاکہ معلوم ہو کہ کن دروازوں سے وہ پہلی کرنیں داخل ہوتی ہیں جو آئندہ زندگی میں شمع ہدایت کا کام دینگی۔

نفسیات کے نقطۂ نظر سے اہم ترین سوال یہ ہے کہ پیشے کا انتخاب چودہ برس کی عمر میں کیا جاتا ہے جو جبریہ تعلیم کے ختم ہونے کا زمانہ ہے، یا اٹھارہ انیس سال کی عمر میں۔ مؤخرالذکر صورت میں نوجوان ثانوی تعلیم ختم کر چکتے ہیں۔ اُن میں ابتدائی تعلیم پانے والوں کے مقابلے میں عام نفسی پختہ کاری زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی عام تعلیم زیادہ وسیع ہوتی ہے

اور اُن کے سامنے انتخاب کے مواقع کثرت سے ہوتے ہیں۔ چودہ سال کی عمر کا نوجوان پیشے کا انتخاب کرتے وقت آدھا بچہ ہوتا ہے۔ نہ اسکی قوتِ حکم اتنی پختہ ہوتی ہے کہ وہ صورتِ حال کا خفیف اندازہ بھی کر سکے اور نہ اسمیں اتنی آزادی ہوتی ہے کہ اپنے مشیروں کی رائے اور انکے دباؤ سے سرتابی کر سکے۔ نفسیات ارتقا کے نقطۂ نظر سے جبری تعلیم کا زمانہ قبل از وقت ختم ہوجاتا ہے۔ اقتصادی اور واقعی حالات کی بنا پر مدرسہ کی عام تعلیم کو عین اُسوقت ختم کرنا پڑتا ہے جب تعلیم کی خاص ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عذر بجائے خود معقول ہو مگر محبانِ تعلیم کی عدالت میں قابلِ قبول نہیں۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ابتدائی تعلیم پائے ہوئے نوجوان کی نفسی حالت پیشے کے انتخاب کے وقت کچھ اور ہوتی ہے۔ اور ثانوی تعلیم پائے ہوئے نوجوان کی کچھ اور۔ ہم پہلے مقدم الذکر کی حالت پر نظر ڈالیں گے۔

ا۔ غریب گھرانوں کے چودہ سال کے لڑکوں کا جسم عموماً اچھی طرح نشو و نما نہیں پاتا باوجود اسکے اگر وہ کسی بڑے شہر خصوصاً برلن میں رہتے ہیں تو وہ بڑی حد تک خودمختار ہو چکے ہیں اور کم سے کم شہری زندگی سے خوب واقف ہوتے ہیں بلکہ اکثر اقتصادی دار و گیر سے بھی آشنا ہوتے ہیں۔ لیکن اس عمر میں ہنوز بلوغ کا آغاز نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکی خاص علامت، یعنی طبیعت کا رجحان مشاہدۂ نفس کی طرف ہونا اور پر آرزو تخیل کی بلند پروازی، ان لوگوں میں کبھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ وہ قبل از وقت دنیا کے دھندوں میں پھنس جاتے ہیں۔ جمالیاتی جذبات پرستی کا دَوران پر بھی تھوڑا بہت ضرور گزرتا ہے۔ مگر ان کی زندگی میں اسکی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفسی نشو و نما میں وہ گہرائی باطنیت اور وسعت نہیں پیدا ہوتی جو بہتر حالات میں ہوسکتی تھی۔ مگر یہ واقعات ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں میں خارجیت پسند زیادہ ہوتے ہیں، اور داخلیت پسند کم اس لیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے بلوغ کے آغاز کی علامتیں دوسری ہیں۔ جب خوشحال گھرانوں

کے نوجوان جمالیاتی خوابوں میں محو اور جذبات پرستی میں مگن ہوتے ہیں (یا اگر وہ بیدار طبیعت والے ہیں تو اپنے کسی محبوب مشغلہ میں ڈوبے رہتے ہیں) اس زمانہ میں فلاکت زدہ نوجوانوں پر عموماً یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ اپنی مصیبتوں کا خاتمہ کردیں اور اقتصادی حیثیت سے آزاد ہوجائیں جسکے معنی آج کل یہ ہیں کہ روپیہ کمائیں، ان کی نفسی آزادی اور ان کا مشاہدہ کائنات یہی ہے کہ اُن کے دلمیں یہ لگن روز بروز بڑھتی جائے اور اُسے "قدرِ حیات" کے احساس سے معمور کردے - حالانکہ امیروں کے لڑکوں کی نشو و نما پر اس چیز کا بہت خفیف اثر پڑتا ہے - اس لیئے غریب گھر کے نوجوان اکثر مجبور ہیں کہ اقتصادی پیشے اختیار کریں اور انتخاب کرتے وقت مالی نفع کو سب سے زیادہ اہم سمجھیں، اگرچہ اُن کے پیش نظر اور باتیں بھی ہوتی ہیں -

لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی کہدینا چاہیئے کہ نوجوانوں کے ارتقا کی اس صورتمیں جب کبھی انہیں آزادی نصیب ہوتی ہے جمالیاتی دور جواب تک رکا ہوا تھا اب ان پر گزرتا ہے - یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ادبی شکل میں ظاہر ہو یعنی کتب بینی یا تھیٹر کے شوق کی صورت اختیار کرے بلکہ ورزشی کھیل، سیاحت کا لپکا، منچلے پن کے کاموں کی جستجو، اور بائسکوپ میں انہماک یہ سب اسی کے مختلف روپ ہیں - بہرحال اس دَور میں ہر نوجوان کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے اپنے کام کے بعد کافی فرصت ملا کرے - اور اکثر یہ جمالیاتی دور بیس برس کی عمر کے بعد اسطرح آتا ہے گویا نوجوان پر بلوغ کا زمانہ جواب تک نہیں گزرا تھا اب گزر رہا ہے -

یہاں تک تو نوجوانوں کی ارتقا کا ایک عام خاکہ تھا - اب ہمیں ایک ایک کرکے پیشے کے داخلی اور خارجی پہلوؤں سے مفصل بحث کرنا چاہیئے جنکا ہم نے ابتدامیں مجمل ذکر کیا تھا - لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے ہم داخلی پہلوؤں پر نظر ڈالیں اور وہ بھی بہ ترتیب معکوس -

ظاہر ہے کہ پیشے کی تعلیم نوجوان ابتدائی جبری مدرسوں سے ساتھ نہیں لاتا - اسے یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ جو پیشے بظاہر آسان معلوم ہوتے ہیں ان تک میں کسقدر معلومات اور مہارت کی ضرورت ہے - خود وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ تھوڑا بہت سیکھنے کی ضرورت ہے اپنے تخیل کی مدد سے

تعلیم کے ناگوار اور دقت طلب پہلوؤں سے چشم پوشی کرتے ہیں، وہ نوجوان جو جلد سازی سیکھتا ہے چاہتا ہے کہ پہلے ہی دن کسی کتاب کی مکمل جلد باندھ لے اور جو لوہاری سیکھتا ہے اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ فوراً لوہے کی چیزیں ڈھالنے لگے۔ بہت سے ایسے ہیں جو کمائی کے شوق میں (جسکی بنا آزادی پر ہے) تعلیم سے بالکل بچنا چاہتے ہیں۔ اور اگر سمجھدار اور ہمدرد دُور اندیش پیش بینی سے کام لے کر انہیں صحیح رائے نہیں دیتے تو وہ ان پیشوں کو ترجیح دیتے ہیں جن میں کچھ سیکھنا نہ پڑے۔ لیکن ایسے تو محنتی اور شوقین طالب علم بھی لغو اور مہمل بات سمجھتے ہیں کہ فلاں پیشے کے سیکھنے میں تین سال لگ جاتے ہیں۔

اس کا سبب اصل میں یہ ہے کہ نوجوان کو پیشہ کے متعلق واقفیت نہیں ہوتی۔ عام طور پر اُس کو سوائے چند مشہور پیشوں کے اور پیشوں کے نام تک نہیں معلوم ہوتے۔ ایک یہی بات اسکے دائرہ انتخاب کو تنگ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اُسے یہ خیال نہیں آتا کہ جن پیشوں کو لوگ کم اختیار کرتے ہیں انہیں کامیابی کی زیادہ اُمید ہے۔ اسکے پیشِ نظر جو پیشہ بھی ہو وہی اسکی آتشِ شوق کو بھڑکانے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے پیشے کے انتخاب کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ نوجوان کسی شخص کو کسی پیشے کا کام کرتے دیکھا کرتا ہو۔ مگر اسکے علاوہ ایک اور راہ ہے جو اتنی سیدھی نہیں۔ نوجوان بلا اپنے اور دوسروں کے علم کے کسی شخص کی ذات سے متاثر ہوتا ہے۔ اور بالواسطہ اسکے پیشے سے بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ اگر ہمیں ایک نفسیاتی قانون بیان کرنے کی اجازت ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نوجوان اُس پیشے کو اختیار کرتا ہے جس سے اُسے نہ بہت دور کا تعلق ہو اور نہ بہت قریب کا۔ پہلی صورت میں اسکی خرابیاں ضرورت سے زیادہ وضاحت سے نظر آتی ہیں۔ اور دوسری صورت میں اُسکا اچھی طرح مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے عموماً لڑکے باپ کے پیشے کو خوشی سے اختیار نہیں کرتے (اور اکثر وہ خود بھی انہیں مشورہ نہیں دیتا) مگر کسی عزیز کے زیادہ تر چچا کے پیشہ کو پسند کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے خود نوجوانوں کی شہادتیں موجود

ہیں جنسے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پیشے کا انتخاب اسطرح کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پیشے سے پوری واقفیت انہیں اسوقت ہوتی جب وہ اسے اختیار کر چکتے ہیں۔ اور اکثر صورتوں میں انھیں سخت مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔

کیونکہ انہیں اب جاکر معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کس پیشہ سے شوق اور مناسبت ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ جب تک کوئی شخص بہت سے پیشوں کو دُور سے دیکھتا ہے اور اُن کی ماہیت سے واقف نہیں وہ نفسیاتی مشاہدے کے ذریعہ اپنی طبیعت کی مناسبت معلوم کرلے درآنحالیکہ لوگ کسی پیشے کو مدتوں کرنے کے بعد بھی اسکا اندازہ نہیں کر سکتے۔ نوجوان کو اسکی مطلق فکر نہیں ہوتی وہ ایسی کھُلی ہوئی باتوں کا بھی لحاظ نہیں کرتا کہ کسی کام کے کرنے کے لیئے اسکی جسمانی قوت کافی نہیں یا اسکی نگاہ کمزور ہے بلکہ جب دوسرے بتاتے ہیں تو اُسے معلوم ہوتا ہے جسمانی مناسبت کی باریکیوں کو صرف طبیب سمجھ سکتا ہے۔ نفسیاتی مناسبت بہت سی داخلی صفات پر مبنی ہے جو تقریباً کبھی اس مخصوص ترکیب اور تکمیل کی حالت میں نہیں پائی جاتیں جنکی موجودہ عجلت پسند اور ترقی یافتہ اقتصادی زندگی کے زمانے میں کسی پیشے میں ضرورت پڑتی ہے۔ پیشے کے لیئے محض دستکاری اور ہنرمندی کافی نہیں بلکہ اخلاقی صفات بھی درکار ہیں۔ جدید عمل نفسیات اسکی کوشش کر رہی ہے کہ نوجوانوں میں کوئی پیشہ شروع کرنے سے قبل جو خلقی استعداد ہوتی ہے اسکی چھان بین کرے۔ لیکن ان چیزوں کی تحقیقات سے کوئی ایسا نتیجہ نہیں نکلتا جو واقعی زندگی میں کارآمد ہو، پھر بھی خوشی کی بات ہے کہ کم سے کم صنعتی کاموں کے لیئے جن جزوی صلاحیتوں کی ضرورت ہے انکی جانچ بہت احتیاط اور خوبی سے کی جاتی ہے۔ ان نفسی صنعتی[1] امتحانوں سے پیشے کے انتخاب

---

[1] علم صنعت نفس (جرمن Psychotechnik) کی تحت میں دو مختلف چیزیں سمجھی جاتی ہیں جو کسی نقطہ پر متحد بھی ہوجاتی ہیں۔ ایک تو عام طبعی اور نفسی تحقیق۔ جسکی غرض یہ ہوتی ہے کہ نفسی قوتوں کو دُخانی یا برقی قوت کی طرح سمجھ کر انہیں ہر اجتماعی اور انفرادی کام میں لگایا جا سکے۔ دوسرے وہ امتحانات

میں بہت مدد دیتی ہے۔ اس لیے انہیں اور ترقی دینا چاہیے۔ البتہ سائنس کے تجربات کے ذریعہ عام ذہانت، یا سیرت یا عقائد کی جانچ کرنا بہت مشتبہ چیز ہے۔

اگرچہ نوجوان اسپر کبھی غور نہیں کرتا کہ اُسے کسی خاص پیشے سے مناسبت ہے یا نہیں پھر بھی لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ جس کام کی طرف اُسکا خلقی رجحان ہو اسکی وہ صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ یہ خیال اس حد تک درست ہے کہ اگر انسان کو کسی کام سے شوق اور رغبت ہو تو اسمیں بہت سی رکاوٹوں پر غالب آنے کی قوت پیدا ہوجاتی ہے اور جو مشکلیں کام کے سیکھنے اور اسکی مشق کرنے میں ہوتی ہیں وہ آسان ہوجاتی ہیں۔ مگر عام عقیدہ تو یہ ہے کہ رغبت اور شوق کے پردے میں طبیعت کی مناسبت کا صحیح احساس پوشیدہ ہوتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اور چیزوں کی طرح پیشے کے معاملے میں بھی رغبت اور صلاحیت میں بہت فرق ہی محض خلقی رجحان بعض اوقات غلط بھی ہوتا ہے۔ البتہ اس سے انسان کی سیرت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہوفمان جو نوجوانوں کی عدالت میں جج ہیں نوجوان ملزموں کی طبیعت سے سرسری واقفیت کے لیئے یہ سوال پوچھا کرتے ہیں "تم کیا بننا چاہتے ہو؟" مگر اصل میں اسکے بعد یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ "کیوں؟" بہت سے نوجوانوں نے اسپر غور ہی نہیں کیا ہوگا۔ انہیں صرف اپنے رجحان طبع کا علم ہوتا ہے اسکے محرک یعنی احساس قدر سے جو لاشعوری حالت میں رجحان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے وہ واقف نہیں ہوتے۔ اگر اتنی کم عمری میں اُن محرکات کا پتہ چل سکے جو نوجوانوں کے دلمیں کسی پیشے کا شوق پیدا کرتے ہیں تو اس بات کا بھی صحیح اندازہ ہوسکے گا کہ انہیں اس پیشے سے کس حد تک مناسبت ہے۔ وہ خلقی رجحان جو نوجوان کو کسی پیشے کی طرف ہوتا ہے صرف اُس صورت میں طبیعت کی مناسبت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۸: — جو طبعی نفسی قوتوں کو محض صنعتی کاموں یعنی مادی اشیاء کی تخلیق میں صرف کرنے کے لیئے کیے جاتے ہیں۔ مقدم الذکر پر اصولی اعتراضات ہوسکتے ہیں مگر مؤخر الذکر پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۲

اور صلاحیت کا معیار ہو سکتا ہے کہ وہ اُس پیشے کو بغیر کسی خارجی مقصد کے محض اُس کام کی خاطر پسند کرتا ہو جو ہمیں انجام دیا جاتا ہے خصوصاً اگر اُسے کام کے نتیجے سے زیادہ سعی عمل سے دلچسپی ہو۔ اگر ایسا ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ اس پیشے کا اصل مرکز اُن کے لئے کشش رکھتا ہی۔ ورنہ عموماً ان کا رجحان اسکے بیرونی دائرے کی طرف ہوتا ہے۔ ہمیں آمدنی کی خواہش شامل ہے جسے ہم نے اکثر پیشوں خصوصاً اقتصادی پیشوں کا عام محرک قرار دیا ہے۔ پیشے سے مسرت اور تسکین جبھی حاصل ہوتی ہے کہ یا تو آمدنی کا خیال ہی نہ ہو یا کم سے کم اسپر انحصار نہ ہو بلکہ اسکے ساتھ تسکین عمل اور کارگزاری کا شوق بھی شامل ہو ورنہ پیشہ محض ایک ذریعہ ہوگا کسی دوسرے مقصد کے حصول کا۔ اسکے علاوہ اور محرکات بھی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ نوجوان کسی پیشے کو اس لیئے اختیار کرے کہ اُسے لوگوں کی نظروں میں عزت حاصل ہے۔ انقلاب سے پہلے جرمنی کے اوسط طبقہ کے لوگ ہمیشہ انہیں پیشوں کو ترجیح نہیں دیتے تھے جن میں سب سے زیادہ آمدنی ہو۔ بلکہ اکثر چھوٹے چھوٹے سرکاری عہدوں کو پسند کرتے تھے کیونکہ ان میں ایک شان سمجھی جاتی تھی اور وردی پہننے کو ملتی تھی۔ مگر ہمیں علاوہ شان اور مرتبہ کے اس بات کو بھی دخل تھا کہ سرکاری نوکری میں آمدنی مستقل اور یقینی ہوتی ہے۔

بعض اوقات اس عمر میں اعلیٰ اخلاقی محرکات بھی نوجوانوں پر اثر ڈالتے ہیں۔ مثلاً کوئی مفید تمدنی کارنمایاں انجام دینے کی خواہش یا نبی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ یا خود اپنے نفس کی تہذیب اور ترقی کا حوصلہ۔ لیکن ہمیں برلن کے تعلیم مزید کے مدرسوں سے جو اعداد و شمار حاصل ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے خیالات نوجوان طلبہ میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہم نے سن بلوغ کی یہ خصوصیت قرار دی ہے کہ نوجوان کو خود اپنے نفس سے بیحد انہماک ہوتا ہے اس لیئے پیشے کی محرک بھی وہ چیزیں ہوتی ہیں جنمیں دوسروں کی خدمت سے زیادہ اپنی ذات کی فلاح مقصود ہو۔ کیرشن اشٹائنر نے تعلیم مزید کے مدرسوں سے متعلق جو اصول قائم کیئے ان میں پیشے کے

خود غرضانہ پہلو سے محرک کا کام لیا ہے کیونکہ اس پہلو کا نوجوانوں کی طبیعت میں قوی ہونا بہت قرین
قیاس ہے۔ لیکن جیسا ہم کہہ چکے ہیں نوجوانوں کی اس "خودی" کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ کبھی یہ
لذت سعی یا ذوق عمل پر مبنی ہوتی ہے، کبھی آمدنی کی توقع پر، کبھی عزت کی خواہش پر، البتہ
یہ ضروری نہیں کہ یہ باتیں نوجوانوں کے شعور میں وضاحت کے ساتھ موجود ہوں وہاں تو بہت سی
محرکات ملی جلی ہوتی ہیں اور خود نوجوان ہرگز اس طرح سے اپنے نفس کا عقلی جائزہ نہیں لے سکتا
وہ تو بس یہ جانتا ہے کہ اُسے فلاں پیشہ پسند ہے اور فلاں ناپسند۔ اس سے بحث نہیں کہ کیوں۔

باہر سے مشاہدہ کرنے والا جو خفیف سی علامتوں پر بھی نظر رکھتا ہے اسکا اندازہ زیادہ
وضاحت سے کر سکتا ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پیشے کے محرکات لڑکیوں میں بہت کمزور اور
یکساں ہوتے ہیں۔ برلن کے تعلیم مزید کے مدرسوں میں جن لڑکیوں سے انتخاب پیشہ کے اسباب
پر مضمون لکھوایا جاتا ہے اُن میں سے اکثر اس تمہید سے شروع کرتی ہیں کہ آج کل ہر شخص کسی نہ
کسی پیشے کا انتخاب کرنے پر مجبور ہے کیونکہ ملک میں اسقدر گرانی ہے۔ پھر وہ عام طور ان پیشوں
کا شوق ظاہر کرتی ہیں جو خاندانی زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔ بعض کنڈر گارٹن کی اُستانی
بننا چاہتی ہیں۔ بعض خیاطی سیکھنا چاہتی ہیں کیونکہ یہ اپنے گھر میں بھی کام آتی ہے۔ خیاطی کا
شوق رکھنے والی لڑکیوں میں سے اکثر اس بات پر زور دیتی ہیں کہ انہیں بچپن میں اپنی گڑیوں
کے سینے کا شوق تھا۔ بعض نے اس پیشے کا انتخاب کسی ہمجولی کی رائے سے کیا ہے۔ ان
سب کی تحریروں میں سے صرف ایک میں خیاطی کو آگے چل کر مستقل پیشہ بنانے کا ارادہ ظاہر
کیا گیا ہے اور ایک میں بنی نوع انسان کی خدمت کا خیال نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ہم ان الفاظ
پر غور کریں جو ان لڑکیوں نے لکھے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ محرکات کے اس تنگ دائرے
میں بھی تنوع کی کافی گنجائش ہے۔ ایک کہتی ہے "میں نے یہ پیشہ اس لئے اختیار کیا ہے کہ
کسی کی دست نگر نہ رہوں"۔ دوسری کا قول ہے "میں نے یہ پیشہ اس لئے اختیار کیا ہے کہ

آگے چل کر اپنے والدین کی مدد کر سکوں"

۴۔ اصل میں نوجوان کو پیشے سے قریبی تعلق اُسوقت پیدا ہوتا ہے جب اُسے خود کام کرنے کے بعد اُسکا تجربہ ہو، عام الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نوجوان اپنے منتخب کیے ہوئے پیشہ کو اتنا ہی زیادہ پسند کرتا ہے جتنا اُسکا مقصد انتخاب پورا ہو۔ یا بہ قول فلسفیوں کے جس حد تک قدر مطلوبہ حاصل ہو۔ بہ خلاف اس کے اگر اس توقع میں ناکامیابی ہو تو پیشے میں رکاوٹیں پیش آتی ہیں جنکا دُور کرنا بہت مشکل ہے۔

اس لیے جائز پیشے کی خوشی بہت اہم چیز ہے۔ کیونکہ پیشے کے اخلاق اور پیشے پر مبنی تصور عالم کی تشکیل اسی پر منحصر ہے۔ ہر نوجوان کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے پیشے سے کچھ کمائے۔ اگر اسکے گھر والے اسکی محنت کا صلہ اسے چھین لیں تو وہ بغیر جانے ہوئے ایک اہم اور زندہ رشتہ کو جو اسکے اور اسکے پیشہ کے درمیان تھا قطع کر دیتے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں اگر ایسے برتاؤ سے نوجوان کجروی اختیار کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی اُن کے لیے بہت خطرناک ہے کہ کم عمری میں وہ کوئی بڑی رقم آسانی سے کما لیں۔ یہاں ہمیں نوجوان کی نفسیات حصول زر پر تفصیلی نظر ڈالنا چاہیے تھا۔ اُسے جو تعلق زر سے ہوتا ہے بہت نتیجہ خیز اور اہم ہے۔ لیکن اس طرز عمل کا نفسیاتی مشاہدہ بہت دشوار ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ زر ایک بے رنگ اور غیر معیّن چیز ہے۔ جس شخص کے پاس ایک بائسکل ہے وہ جانتا ہے کہ اسکے پاس کیا ہے۔ لیکن جسکے پاس سو روپے ہیں اُسے یہ معلوم نہیں یا معلوم ہونے کی ضرورت نہیں۔ سمجھدار آدمی جانتا ہے کہ اس رقم کے بدلے میں وہ اسکی قوتِ خریداری کے دائرہ کے اندر جو چیز چاہے خرید سکتا ہے لیکن اگر وہ اسے عارضی لذتوں میں صرف کر دے تو نہ یہ رقم باقی رہتی ہے اور نہ اسکا کوئی بدل، نوجوان اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ ایک بڑی رقم کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ عموماً وہ حساب نہیں رکھتے لیکن اگر اُن میں سے بعض حساب رکھتے ہوں تو یہ کفایت شعاری کی علامت بھی ہو سکتی ہے اور کنجوسی کی بھی

ہمارے زمانے میں تو اکثر نوجوان روپیہ کا کاروبار کرتے ہیں۔

ماہرین اقتصادیات ہمیں بتاتے ہیں کہ روپیہ تین حیثیتوں سے مفید ہے۔ وہ مبادلے کا وسیلہ ہے، چیزوں کی قدر کا معیار ہے، اور قدر کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے۔ پہلی حیثیت سے وہ نوجوان کو یہ مقدرت دیتا ہے کہ اپنی مرغوب اشیا، خواہ وہ اچھی ہوں یا بُری ہوں خرید سکے۔ دوسری حیثیت سے وہ اُس سے مطالبہ کرتا ہے کہ چیزوں کی قیمت سے (نہ کہ قدر سے) واقفیت رکھتا ہو۔ جو اُسے آہستہ آہستہ تجربہ سے حاصل ہوتی ہے۔ تیسری حیثیت سے وہ کفایت شعاری کا محرک بھی ہوسکتا ہے اور کنجوسی کا بھی،

یہی زر کا بے ہمہ اور باہمہ ہونا وہ چیز ہے جسکے سبب سے سعی کسب اکثر مرض کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ بہت سے نوجوان اپنے کپڑوں کے ساتھ بہت احتیاط برتتے ہیں کیونکہ ان میں استعمال سے جو نقصان پیدا ہوتا ہے وہ ہمیشہ اور بہ آسانی نظر آجاتا ہے۔ لیکن کیا وہ روپے کے معاملہ میں بھی اِتنے ہی محتاط ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ انہیں خبر بھی نہیں کہ یہ کیسے آتا ہے اور کیسے چلا جاتا ہے۔ خصوصاً وہ نوجوان جو بنکوں میں اُمیدواری کرتے ہیں اور چکوں اور بلوں کے مجرم اسرار ہوتے ہیں اکثر روپے کی واقعیت اور اہمیت کو اچھی طرح نہیں سمجھتے اور اُسے دوراز کار اور مجرد چیز سمجھتے ہیں۔ منسر و نے اپنے بہت سے بچّوں سے سوال کرنے کے بعد اپنے خیال میں یہ ثابت کردیا ہے کہ جوں جوں سن بڑھتا جاتا ہے کفایت شعاری کی آمادگی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ جن بچّوں سے سوال کیا گیا اُن میں سے حسب ذیل نے اپنے جیب خرچ میں سے پچاس سینٹ[1] بچانے پر آمادگی ظاہر کی۔

۷ برس کی عمر والوں میں سے ۴۲ فیصدی لڑکوں نے اور ۳۶ فیصدی لڑکیوں نے

۱۱ " " " " ۶۱ " " ۵۸ " "

۱۵ " " " " ۸۳ " " ۶۸ " "

۱۶ " " " " ۸۵ " " ۸۲ " "

---

[1] امریکہ کا سکہ ہے۔ پچاس سنٹ تقریباً ایک روپیہ نو آنے برابر ہوتے ہیں۔ ۱۲

اسطرح سوال کرنے میں غلطی کے امکانات ہیں اُن کی طرف ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں ۔ یہاں کانٹ کا وہ مشہور اعتراض برمحل ہے جو اُس نے ان لوگوں پر کیا تھا جو کسی چیز کے امکان سے اُسکے وجود پر استدلال کرتے ہیں ۔ تنو خیالی اشرفیوں میں اور تنو واقعی اشرفیوں میں بہت فرق ہے ۔ مانا کہ اگر پچاس سینٹ ملنے کا امکان ہو تو میں یہ ارادہ کر لونگا کہ انہیں سے کچھ خرچ نہ کرونگا ۔ لیکن جب یہ رقم ہاتھ میں آگئی تو صورت بالکل بدلجاتی ہے ۔ ممکن ہے کہ اب میرا دل بے اختیار رچاہے کہ اسے فلاں کام میں خرچ کردوں خواہ میری یہ خواہش خلاف عقل ہو ، مگر کیا معلوم مجھ میں اتنی قوت ارادی موجود ہے یا نہیں کہ تیس دن تک اس پچاس سینٹ کو ہاتھ نہ لگاؤں ،

ہم یہاں "نوجوان اور زر" کے مسئلہ پر تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتے ۔ اتنا کہدینا کافی ہے کہ یہ انسان کے صحیح فطری رجحانات میں سے ہے کہ وہ اپنی محنت کے صلے میں روپے کا طالب ہو ۔ اور معاوضے کو مناسب اور کافی سمجھنا علاوہ اپنی اصلی یا فرضی ضروریات کے اسپر بھی موقوف ہے کہ دوسرے لوگ اتنے عرصے میں یا اس سے کم میں کتنا کما لیتے ہیں نوجوان بھی اسی خیال کے ہوتے ہیں اور اکثر اپنے ذہن میں معاوضے کا ایک خیالی معیار بنا لیتے ہیں ۔ اگر انھیں اُمیدواری کے زمانے میں کافی جیب خرچ نہ ملے یا کام شروع کردینے کے بعد معقول اُجرت نہ ملے تو اُن کے دل میں پیشے کی مسرت بہت کم ہوجاتی ہے ۔

لیکن مادی معاوضے کے علاوہ مسرت اور مایوسی کے اور اسباب بھی ہیں ۔ نوجوان عموماً کام کے اوقات کی زیادتی فرصت کی کمی خصوصاً کھانے کے لیے بہت ہی قلیل مہلت ملنے کی شکایت کیا کرتے ہیں ۔ نفسیات کے نقطۂ نظر سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کیونکہ نوجوان کی زندگی بالغوں کی زندگی سے کم مشین نما ہوتی ہے اور انہیں اپنی ذات میں جتنا انہماک ہوتا ہے بالغوں کو نہیں ہوتا ۔ علاوہ اسکے نوجوان اُمیدواروں کو یہ شکایت بھی ہوتی ہے انہیں ادنیٰ اور غیر دلچسپ کام کرنا پڑتے ہیں ۔ وہ خوشی سے اسپر راضی نہیں ہوتے کہ

چپڑاسی گیری یا خدمت گاری کریں یا ٹھیلہ چلائیں۔ اُن سے اس طرح کی خدمت لینا اُن کے اس صحیح احساس کے منافی ہے کہ اُن کا وقت مفید کاموں کے سیکھنے میں صرف ہونا چاہئے۔ اور جو کام اس مقصد سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتا وہ انھیں خلاف شان یا کم سے کم غیر دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح کے خیالات میں بھی مقابلے اور مرتبے کا عنصر اہمیت رکھتا ہے۔ جو چیز بن سیکھے اُمیدوار کے لئے نہایت دلفریب ہوتی ہے اُسی سے "بلند تر رتبے والے" کو نہایت وحشت ہوتی ہے۔ ایرنسٹ لاؤ نے اپنے رسالے "برلن کے نوجوان اور انکا پیشہ" میں اسکی ایک عمدہ مثال بیان کی ہے۔ دفتر میں کام کرنیوالی لڑکیوں نے یکزبان موثر بیان کیا کہ اُن کے پیشے میں سب سے زیادہ اُکتا دینے والی چیز یہ ہے کہ جن خطوں کا جواب دیا جاچکا ہے اُنھیں ترتیب سے رکھا جائے لیکن ایک چپڑاسی جب دفتر میں تبدیل کیا گیا تو اُسے یہی شغل بہت دلچسپ معلوم ہوا۔ لاؤ اس بات کو عام اصول قرار دیکر کہتا ہے "ایک ہی شغل کو جب مختلف مذاق کے لوگ کرتے ہیں تو ہر ایک کا داخلی تعلق اُس کے ساتھ بالکل مختلف ہوا کرتا ہے۔" یہ بھی نفسیاتِ ترکیبی کا ایک اصول ہے۔

قدرتی بات ہے کہ بار بار ناکام ہونے سے پیشے میں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ اس وقت انسان کے دل میں صرف یہی شبہہ نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اس خاص پیشے سے مناسبت رکھتا ہے یا نہیں بلکہ اُسے اپنی ذات پر کسی طرح کا بھروسہ نہیں رہتا۔ اس شک سے اُس کی قوتیں اور پست ہوتی ہیں اور روزافزوں تنزل کا ایک دورساین کر رہ جاتا ہے۔

تعلیم مزید کے مدرسوں کے فارغ شدہ طلبہ نے بہ طور خود جو خیالات ظاہر کئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشے کے ابتدائی تجربوں میں افسر کی شخصیت کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ نوجوان اب تک کام اور کام کرنے والے کی ذات میں اتنا گہرا رابطہ سمجھتا ہے کہ اگر اُسے کام کرنے والے پر عقیدہ نہ رہے تو کام پر عقیدہ رکھنا اُس کے لئے بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں نے ان نوجوانوں کے بیانات پڑھے ہیں اُنھیں بہت کم یہ نظر آتا ہے کہ سکھانے والے

مقدم رکھتے ہوں۔ لیکن اگر یہ صورت ہو تو سیکھنے والے کو فوراً اس کا احساس ہوتا ہے، اور وہ اس کے شکرانے میں دو چند محنت کرنے لگتا ہے۔ زیادہ تر تو یہی شکایت سننے میں آتی ہے کہ نوجوان کو سستی قوت سمجھ کر اُس سے کاروباری اغراض کے لئے کام لیا جاتا ہے۔ ان واقعات کی تہہ میں موجودہ زمانے کی صنعت وحرفت اور تجارت کی پیشہ ورانہ تعلیم کا ایک نہایت مشکل مسئلہ ہے۔ تعلیم مزید کے مدرسے اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے جو "پیشہ کی برادری" اور اس کی تعلیمی روح کے معدوم ہو جانے سے پیدا ہو گئی ہے۔ اب تک صرف بڑے بڑے کارخانوں نے اس راز کو سمجھا ہے کہ آیندہ نسل کو عمدہ تعلیم دینا خود اُن کے کاروبار کے لئے کس درجہ مفید ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض چھوٹے کارخانوں میں بھی ایسے استاد موجود ہیں جنھیں اپنے فرائض کا احساس ہے۔ بس کمی ہے تو شاندار اور مستحکم روایات کی جن کے بغیر تعلیم کی بلند اور پاک روح کسی طرح پنپ نہیں سکتی۔

آخر میں ہم ایک تعلیم مزید کے مدرسے کے پہلے درجے کے طالب علم کی شہادت اُن تجربات کے بارے میں نقل کرتے ہیں جو اُسے پہلے پہل اپنے پیشے میں ہوئے۔ یہاں اس سے زیادہ بحث نہیں کہ وہ صورتِ حال کا صحیح اندازہ کرتا ہے یا غلط بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ وہ اپنے دل میں کیا سمجھتا ہے۔ "آپ پوچھتے ہیں کہ میں نے تجارت کا پیشہ کیوں پسند کیا؟ میں نے تجارتی زندگی کو کچھ اور سمجھا تھا مگر وہ کچھ اور نکلی۔ جب مجھ سے سوال کیا جاتا ہے کہ تم نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا تو مجھے ہمیشہ وہ زمانہ یاد آتا ہے جب میں کسی دوکاندار کے یہاں سودا خریدنے جاتا تھا اور وہاں نوجوانوں اور کام سیکھنے والوں کو مزے میں اِدھر اُدھر ٹہلتے دیکھتا تھا۔ تب میں اپنے دل میں کہا کرتا تھا 'میں بھی تجارت سیکھوں گا'۔ میری یہ خواہش خدا کے حکم سے پوری ہوئی۔ جب میں ابتدائی مدرسے کی تعلیم ختم کر چکا تو میرا دل خوشی اور

کے ختم ہوتے ہی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ جب دوکان کی صفائی ہو چکتی تھی، جو مال باہر سے آنا تھا وہ آ چکتا تھا اور فی الحال کوئی کام کرنے کو نہیں ہوتا تھا تو دوکان دار ساری دوکان کا چکر لگاتا تھا اور اُس وقت ہم لوگوں کو ایسی ایسی گالیاں اور جھڑکیاں سننا پڑتی تھیں جن کا ذکر نہ کرنا ہی مناسب ہے۔ جب بہت دن ہو گئے تو میں نے اپنے والدین کو اطلاع دی اور ایک دن میرے ماں باپ نے آکر دوکاندار سے گفتگو کی۔ میرے باپ بہت سیدھے آدمی ہیں لیکن وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ انہوں نے مجھے دکانداری کا کام سیکھنے کے لئے بھیجا اور یہاں مجھ سے ٹوکری میں سودا منگوایا جاتا تھا۔ ہفتے میں صرف پندرہ مارک ملتے تھے (ستمبر ۱۹۲۲ء) جو روزمرہ کے کرائے کے لئے بھی کافی نہ تھے۔ کھانا مجھے ملتا ہے مگر کپڑے میری ماں کو دھونا پڑتے ہیں۔ جوتے، کپڑے اور اتوار کے خرچ وغیرہ کے لئے مجھے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے۔ چھٹی صرف تین دن ملتی ہے حالانکہ میں آٹھ دن کا مستحق ہوں۔ اب بتائیے کہ میرا سا آدمی اگر باپ ماں یا بہن کو سالگرہ کا تحفہ دینے کے لئے کچھ پس انداز کرنا چاہے تو کیسے کرے اور کہاں سے لائے۔

جب میں اپنا اسکول کا زمانہ یاد کرتا ہوں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے اس زمانے میں تجارت کا کام سیکھنے کی کتنی خوشی تھی اور اب اس سے کتنا رنج ہے۔"

بغیر پیشے کی خوشی کے پیشے کا اخلاق بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایک نصب العین یہ بھی ہے کہ نوجوان پیشے کو اپنی ذات کی بہترین اور آزاد تکمیل کا ذریعہ سمجھے۔ لیکن کیا یہی بلند ترین نصب العین ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی ہم آہنگی تکمیل فرد کے اخلاقی نظریے یعنی انفرادیت اور حریت پسندی کا جوہر ہے لیکن پیشے کے اخلاقی پہلو کی اس سے گہری تعبیر بھی ممکن ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی خارجی مقاصد کے لیے وقف کر دے تو اس سے خود اس کی ذات کی وسعت، قدر اور قوت میں اضافہ

نفس ہے۔ اور جب یہ لاہوتی عنصر جو ابتدا میں "فرض" کی شکل میں رونما ہوتا ہے بلند تر روحانی مراتب کی آرزو بن جاتا ہے تب ہم کہہ سکتے ہیں کہ سچا پیشے کا اخلاق پیدا ہو گیا ہے۔ اس اخلاقی ارادے کے ظاہر ہونے کی اُتنی ہی مختلف صورتیں ہیں جتنی پیشوں کی قسمیں اور شاخیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ نوجوان چودہ برس کی عمر میں جب وہ کوئی پیشہ سیکھنا شروع کرتا ہے یا سترہ برس کی عمر میں جب وہ سیکھ کر فارغ ہوتا ہے ایسے اعلیٰ پیشے کے اخلاق کا مالک نہیں ہوتا۔ اُس کے مقدور میں محض اس اخلاق کی ظاہری صورت یعنی وہ اخلاقی قوت ہوتی ہے جس سے وہ پیشے کی مشکلات پر غالب آسکتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ قوت عمل اخلاقی ارادے یعنی نیک رجحان اور انتخاب مقاصد کے پہلو بہ پہلو اخلاقی سیرت کا ایک اہم اور مستقل عنصر ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نوجوان پیشے کو اختیار کرتے وقت کس حد تک ضبط نفس کی قوت اور مشکلات پر غالب آنے کا عزم رکھتا ہے۔ بقیہ چیزیں یعنی احتیاط اور عمدگی سے کام کرنا، پابندیِ اوقات، انصاف پسندی، ایمانداری، خدمت قوم کی آرزو اور نوع انسانی کی محبت یہ سب کام کرنے سے پیدا ہوتی ہیں اور اُسی حد تک پیدا ہوتی ہیں جس حد تک دل میں ترقی کا عام حوصلہ پہلے سے موجود ہو۔ اس لئے یہ عزم اور حوصلہ نوجوان کے پیشہ ورانہ اخلاق کا اصلی جوہر ہے اور جو شخص اُن کی ارتقائے نفسی کا اندازہ کرنا چاہے اُسے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ چیز موجود ہے یا نہیں۔

اب اگر ہم موجودہ زمانے میں پیشے کی زندگی کی خارجی ترکیب پر غور کریں تو ہم افسوس اور رنج کے ساتھ دیکھیں گے کہ ہر پیشے میں خصوصاً اقتصادی پیداوار کے کاموں میں اس عین لبندی کی کس قدر کم گنجائش ہے۔ یہ شکایت کہ صنعتی کاروبار تخصیص پسندی اور مشین پرستی کے سبب سے روحانیت سے خالی ہو گئی ہیں ایک نغمۂ دلدوز ہے جو ہمارے آہنگ تمدن کے درمیان

کہ صنعتی پیداوار کے اکثر شعبوں میں انسان اور اُس کے کام میں کوئی زندہ اور معنوی کلی رابطہ باقی نہیں رہا ہے محض اس لئے کہ ایک انسان سے کوئی پورا کام نہیں جاتا۔ شیلر کہتا ہے "اجتماعیت پسند اور اشتراکیت پسند نوجوانوں کا کوئی جلسہ ایسا نہیں ہوتا جس میں انتہائی شدت سے یہ فریاد بلند نہ ہوتی ہو کہ اس انسانیت سوز، مشین پرست، غلامی کی زہریلی ہوا میں ہمارا دم گھٹا جاتا ہے۔ ہماری بہترین دولت بلکہ ہماری ساری دولت یعنی ہماری انسانیت اور ہماری جوانی ہمارے ہاتھوں سے نکلی جاتی ہے۔"

اس مسئلے کا جو پہلو اقتصادی اور سماجی اصلاح سے تعلق رکھتا ہے اُس سے یہاں بحث نہیں۔ ہمارے پیش نظر یہاں صرف ان چیزوں کے نفسی اثرات ہیں جو اکثر نوجوان مزدوروں کے لئے نوشتۂ تقدیر کا حکم رکھتے ہیں۔ نوجوان کو ابتدا میں اپنے پیشے سے جو مسرت ہوتی ہے وہ اُس کے حقیقی مقصد کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ محض اس احساس کی بدولت کہ اُس کی بھی کسی کام کے لئے ضرورت ہے جو اسکے بغیر نہیں چل سکتا۔ یہ خارجی دنیا کا داخلیت میں ڈوبا ہوا عکس ہے جو ہر فرد کے نفس میں پڑا کرتا ہے وہی مسرت بخش احساس ہے جو ایک بچہ کو ہوتا ہے، جب کوئی چھوٹا سا کام خاص اُس کے سپرد کیا جائے وہی فخر کا جذبہ ہے جو ایک شریف نسل کے کتے تک میں اُبھرتا ہے جب اُسے اپنے مالک کی تھیلی منہ میں لے کر چلنے کا "حق" دیا جاتا ہے نہ کہ "حکم"۔ اس بات کا اندازہ کہ بالیدگی کے لئے فرائض کا ایک محکم دائرہ کس قدر ضروری ہے نوجوان لڑکیوں کی نشو ونما کے مشاہدے سے بہت اچھی طرح کیا جاسکتا ہے جنھیں اکثر اپنے نفس کا احساس ہی اپنے فرائض کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔

یہ ایک نتیجہ خیز اور دلدوز مشاہدہ ہے کہ ابتدا میں نوجوان انتہائی بے روح کاموں میں بھی مسرت اور بالیدگی سے محروم نہیں رہتا ہے۔ لیکن جب ہر سال ایک ہی رفتار رہتی ہے تو بہار اُمید خزاں سے مبدل ہوجاتی ہے۔ ان تجربات کے ثبوت میں ہم یلزنے زانڈر

ایک سن رسیدہ پارچہ بافی کی مشین چلانے والی اپنی پُرانی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے پیشے کا ذکر کرتی ہے :-

"...... اب میں چاہتی ہوں کہ اُس خوشی کا ذکر کروں جو مجھے اپنے کام سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک بڑی کشش تو آمدنی ہی کے سبب سے ہے۔ اس کام میں اُجرت بہت کافی ملتی ہے لیکن بہت احتیاط کی ضرورت ہے ...... عموماً مزدور خود مشین بنجاتے ہیں اور ہر کام کو مشین کی طرح کرتے ہیں ...... مجھے اپنی مشین سے اُسی قدر محبت ہے جتنی گھر پر اپنے رہنے کے کمرے سے۔ (اس سے پہلے محبت کے انداز سے مشین کا بہت مفصل ذکر ہے جیسے کسی انسان کی سیرت بیان کی جاتی ہے۔) ...... اب مجھے کارخانے میں پندرہ برس ہوگئے ہیں۔ سچ پوچھئے تو پہلے دس سال جن میں میرا کام محض مشین کو گھمانا تھا میں نے بڑی مشکل سے گذارے۔ اس کے بعد کام کی روح فرسا یکسانی مجھ سے کسی طرح برداشت نہ ہوسکی۔ آخری چند سال میں مجھے بہت سے مفید لکچر سننے کا اتفاق ہوا اور تھیٹر جانے کا بہت شوق پیدا ہوگیا۔ شام کو میں جو کچھ دیکھتی یا سنتی تھی اُس پر دن کو غور کیا کرتی تھی۔ اس طرح مجھے آہستہ آہستہ یہ شعور پیدا ہوا کہ میں زندہ ہوں اور زندگی سے مجھے بلند تر مقاصد کے مطالبے کا حق ہے۔ میں نے چاہا کہ کارخانے کو چھوڑ دوں لیکن اُس وقت مجھے یہ جگہ مل گئی جس پر میں اب ہوں اور جس میں مجھے دماغ سے کام لینے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔"

ایک ۱۸ برس کی لڑکی جس کا کام سوت کاتنا ہے لکھتی ہے :-

"ہم اکثر اس پر غور کیا کرتے ہیں کہ یہ سوت کتنے ہاتھوں سے گذر چکا ہے اور ابھی انسان کا لباس بننے سے پہلے کتنے ہاتھوں سے گذرے گا۔" لیکن انصاف کیجئے کہ یہ خیال کتنے دن تک دلچسپی کا باعث ہوسکتا ہے۔

ان تحریروں سے اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ابتدا میں بن سیکھی مزدور بنا

ہیں" "ہم مزدورنیوں کے حلقے میں داخل ہو گئی ہوں اور ہمیشہ مزدورنی بنی رہوں گی"۔ یا "ہم بن سیکھی پیشہ ور مزدورنیاں ہیں"۔ علاوہ اس کے مدارج کا سماجی فرق اور مراتب کا احساس مزدوری پیشہ اور ملازمت پیشہ عورتوں میں خاص طور پر زیادہ ہوتا ہے۔

ان تحریروں میں ہم پیشہ لوگوں سے اچھے تعلقات کا ذکر شاذ و نادر ہوتا ہے۔ عموماً ان لوگوں میں آپس میں گالی گلوچ اور بدسلوکی ہوا کرتی ہے۔ اس کی شکایت صرف لڑکیوں کو نہیں بلکہ لڑکوں کو بھی ہے۔ وینزل ہولیک نے اپنی کتاب "ایک جرمن دست کار مزدور کی زندگی" میں اور ہیئت داں برونو بورگل نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ مزدورنیاں ایک دوسرے کی عصمت و عفت کا بہت سختی سے احتساب کرتی ہیں۔ وہ اپنی ہمجولیوں کی عیب پوشی ہی نہیں بلکہ پردہ دری بھی کرتی ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی ایک مضمون کے خاتمے پر، جو اُس نے اپنی پسند سے "کارخانے میں نیک بننے کی مشکلات" پر لکھا تھا، کہتی ہے "ہمیں کارخانے میں اچھے نمونے کہاں سے ملیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں"۔

ہر پیشہ، خواہ اُس کا انتخاب زیادہ تر اپنی مرضی سے ہوا ہو، انسان کے لئے "نوشتۂ تقدیر" بن جاتا ہے۔ چند سال کے عرصے میں وہ انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور اُس کی سیرت کی تشکیل کرتا ہے کیونکہ یہی ذہن خارجی کا وہ پہلو ہے جس سے فرد کو بہت قریبی تعلق ہوتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اُسی کے رنگ میں ڈوب جاتا ہے۔ پیشہ ہی ہمارا نہیں ہوتا بلکہ ہم بھی پیشے کے ہوتے ہیں۔ اس لئے پیشے کے اثر سے انسان کے تصور کائنات کے بیشتر حصّے کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہی وہ گوشہ ہے جہاں سے انسان دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے۔ لیکن یہ بات ایک مدت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ یہ بہت کم ہوتا ہے کہ نوجوان چودہ برس کی عمر میں اپنے پیشے کا انتخاب کسی تصور کائنات کے ماتحت کرے یا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

امکان ہے کہ ہم پیشے کی نفسیاتی صلاحیت کے اعتبار سے نوجوانوں کی مختلف مثالیں قرار دیں اور ہمارے تعلیم مزید کے مدرسے جن کی تقسیم پیشوں کے اعتبار سے کی گئی ہے اس کے لئے کافی مواد مہیا کرتے ہیں۔ کسی عملی آدمی کی نظر سے وہ فرق پوشیدہ نہیں رہ سکتا جو مختلف نوجوانوں میں یا تو پہلے سے ہوتا ہے یا روزمرہ کے کام کے اثر سے بلکہ اکثر اُن خام اشیار کے اثر سے جنھیں وہ استعمال کرتے ہیں پیدا ہو جاتا ہے (مثلاً لکڑی کا کام کرنے والوں اور مختلف دھاتوں کا کام کرنے والوں کا باہمی فرق) باوجود اس کے ابھی تک نوجوانوں کے پیشے کی مثالوں سے متعلق نفسیاتی تحقیقات بہت ناقص ہے۔ اس مبحث پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں سے اکثر میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے زیادہ اجتماعیات اور اقتصادیات کے نقطۂ نظر سے کام لیا گیا ہے مثلاً کیمٹے مینڈے کی عظیم الشان کتاب میونک کی دیہاتی مزدوریوں پر۔ قابل قدر معلومات یا تو ایلزے زانڈر کی کتاب فن زندگی سے حاصل ہوتی ہے یا اگر اور بارتمان کے جمع کردہ رسائل سے جو "سالہائے ارتقائے نفسی" کے نام سے موسوم ہیں۔ ہم یہاں پیشوں کی تقسیم کی تفصیلی بحث نہیں کر سکتے بلکہ محض نفسیاتِ تخصیصی کے ایک اہم رسالے کا حوالہ دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ پیشے کے پہلو سے قطع نظر کر کے ایلزے زانڈر نے یہ کوشش کی ہے کہ تعلیم مزید کے مدرسوں کی طالبات کی پانچ عام نفسیاتی مثالیں قائم کرے مگر منطقی حیثیت سے اس تقسیم کے ابواب مساوی نہیں ہیں۔ وہ پانچ قسمیں حسب ذیل ہیں:-

۱- وہ لڑکیاں جو ابھی تک بالکل بچہ ہیں۔

۲- وہ جن میں کم سنی میں عورتوں کی خو بو پیدا ہو گئی ہے۔

۳- وہ جو ابھی تک ڈانواں ڈول ہیں (خصوصاً امور خانہ داری کی تعلیم پانے والیاں۔

۴- وہ جن پر جسمانی اثرات بہت زیادہ ہیں۔

۵ - سمجھ دار لڑکیاں جو اپنے پیشہ کا کام دل لگا کر کرتی ہیں۔

آخر الذکر لڑکیوں کی بابت یہ مصنفہ کہتی ہے :-

"سب اپنے پیشے کے کام کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر تندہی اور خوشدلی کے ساتھ کرتی ہیں - وہ جس کارخانہ میں نوکر ہوتی ہیں اسے "ہمارا کارخانہ" کہتی ہیں - ہمیشہ اُسی کی دُھن میں رہتی ہیں اور اپنی فرصت کے اوقات میں سے بھی بخوشی ایک آدھ گھنٹہ اسکے لیے صرف کردیتی ہیں - (ایسی عورتیں کبھی کبھی ماماؤں میں بھی پائی جاتی ہیں - انکی زبان پر "میرا" باورچیخانہ "میرا" آبدارخانہ - اور "میرا" آنگن رہا کرتا ہے) لیکن باوجود کارخانے کی خیرخواہی کے وہ اپنے ذاتی اغراض سے بھی غافل نہیں رہتیں - جب وہ کوئی جگہ تلاش کرتی ہیں تو تنخواہ، کار متعلقہ علحدگی کی پیشگی اطلاع، غرض ہر پہلو کو دیکھ بھال لیتی ہیں - ہمیں شک نہیں کہ وہ ایک حد تک خشک مزاج ہوتی ہیں لیکن انکی زندگی ہرگز دلچسپی سے خالی نہیں ہوتی - وہ تفریح کا شوق بھی رکھتی ہیں، اچھی کتابیں پڑھتی ہیں، سیر کو جاتی ہیں، جب ان کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور انکی تنخواہ بڑھتی ہے تو وہ عزت آبرو کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھاتی ہیں - اکثر وہ سارے خاندان کی پرورش کا بوجھ اپنے سر لے لیتی ہیں - وہ اکثر اس قسم کی کاروباری عورتیں بن جاتی ہیں جو عموماً شادی نہیں کرتیں حالانکہ ان میں خانہ داری اور امومت کی اچھی صلاحیت ہوتی ہے۔"

(۲)

پیشے کا انتخاب جو ۱۸ سے ۲۰ تک کی عمر میں کیا جاتا ہے قدرتی طور پر خارجی اور داخلی حالات کے اعتبار سے اُس انتخاب سے مختلف ہوتا ہے جو شباب کے آغاز میں بلکہ بعض اوقات اس سے پہلے کیا جاتا ہے جسکا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں - خارجی اعتبار سے یہ فرق ہے کہ اس عمر میں اور پیشے اختیار کیے جاتے ہیں اور ان کے مدارج اور ہوتے ہیں اور داخلی اعتبار سے یہ ہے کہ ارتقائے نفسی اور تعلیم کی بدولت زیادہ پختہ کاری پیدا ہو سکتی ہے - مگر پھر بھی وہی پہلو اور وہی خصوصیات جنکا ہم ذکر کر چکے ہیں یہاں بھی نظر آتی ہیں

پہلی بات جس پر نظر پڑتی ہے یہ ہے کہ یہاں بھی آبائی حیثیت پر قائم رہنا اسی طرح بلکہ
اور زیادہ سماجی مدارج پر موقوف ہے ۔ ادنیٰ اور مفلس طبقے کے نوجوان عموماً اپنے ہی دائرے
میں رہنے پر قناعت کرتے ہیں ۔ محض ایسی صورت میں کہ لڑکا مدرسے میں غیر معمولی کامیابی
حاصل کرے اسے اور اسکے والدین کو ترقی کا خیال آتا ہے ۔ پہلے صدیوں تک اسطرح کے لڑکے
پادری بنا کرتے تھے پھر مدرس ہونے لگے اور اب مختلف قسم کے پیشے اختیار کرتے ہیں جن میں
اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہو ۔ یہ یاد رہے کہ ترقی کا جذبہ عام انسانی صفت ہے ۔ نفسیات شباب
میں اسکی اہمیت زیادہ تر اُسوقت ہے جب نوجوان ترقی کی خاطر عرصہ دراز تک تعلیم حاصل
کرنے پر آمادہ ہو اور اسطرح اسکے اس فطری جذبے پر کمسنی ہی میں عقل کی صیقل ہو جائے
اس کے خلاف متمول اور تعلیم یافتہ طبقوں کے نوجوانوں میں تنزل کا جذبہ کبھی نہیں ہوتا یا اور بات
ہے کہ وہ قعرِ تنزل میں گرنے پر مجبور ہوں بلکہ ابتدا ہی سے لڑکوں اور والدین دونوں کے لیئے یہ
بدیہی امر ہے کہ انسان کی پیدائش جس اعلیٰ سماجی طبقے میں ہوئی ہے اُسی بلندی پر اُسے قائم
رہنا چاہیئے ۔ سب جانتے ہیں کہ اسکا نتیجہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ کم لیاقت اور ضعیف الارادہ
لڑکے مدرسے میں اور اس سے بھی زیادہ زندگی کے کھلے میدان میں کوشش کرتے کرتے
ہلاک ہو جاتے ہیں اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔ یہاں ہم نے یہ بات بہ سبیل تذکرہ بیان کردی ہے
لیکن اصل میں نفسیات کو اسکی مفصل تحقیق کرنا چاہیئے کہ کسطرح بعض نوجوان باوجود ہر طرح
کی خارجی امداد کے اس مرتبہ پر قائم نہیں رہ سکتے جو انہیں اپنے خاندان کی بدولت حاصل ہو
آبائی حیثیت پر قائم رہنے کا جذبہ ہائی اسکولوں کے طلبہ میں اسطرح ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تعلیم
اور پیشے کے معاملہ میں بالکل لکیر کے فقیر ہوتے ہیں ۔ اس مسئلہ پر جرمنی کے اہل الرائے کو جتنا
غور کرنا چاہیئے تھا اتنا انہوں نے نہیں کیا ہے ۔ بظاہر قیصر ولیم ثانی نے ۱۸۹۰ء میں جرمنی
کے نوجوانوں کی اس مجبولیت کا صحیح اندازہ کرلیا تھا کہ وہ پیشے کی اقلیم میں نئے ممالک فتح
کرنے اور نو آبادیاں قائم کرنے کے بجائے پامال اور محفوظ راستوں پر چلنے کو پسند کرتے

ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمیں ایک حد تک جرمنی کے "فضیلت مآب" مدرسوں کا تصور ہو۔ جو لوگ انمیں تعلیم
پاتے ہیں انہیں سوائے اسکے کوئی چارہ نہیں کہ یونیورسٹی کے چار شعبوں میں سے کسی میں داخل ہوں
اور انہیں جو کچھ زحمت ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسکو اختیار کریں۔ ان کے علاوہ اب صنعتی
یونیورسٹیاں اور چند اور پیشہ آموز جامعات قائم ہوگئی ہیں۔ جو لوگ مزید تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتے
وہ ٹکنیک کی یا تجارتی کارخانوں کی ملازمت کر لیتے ہیں۔ بشرطیکہ ان حلقوں سے ان کے تعلقات
ہوں۔ لیکن عموماً ہمارے ہائی اسکولوں کے لڑکے "تعلیم کے بار" میں ایسے دب جاتے ہیں کہ کسی کام
کے نہیں رہتے۔ افلاطون کے ایک قول میں ذرا سا تغیر کر کے ہم ان نوجوانوں سے کہہ سکتے ہیں
"تم اپنے پیشہ کا انتخاب نہیں کروگے بلکہ پیشہ تمھارا انتخاب کریگا" ہم نے اس بات کا ذکر یہاں تمدن
کی تنقید کی غرض سے نہیں کیا ہے بلکہ محض ایک نفسیاتی واقعے کی حیثیت سے۔ میں نے اب سے
سات برس پہلے ۱۹۱۷ء میں کہا تھا کہ انٹرنس کا امتحان ایک مشین ہے جو لڑکوں کو یونیورسٹیوں
میں کھینچتی ہے۔ ممکن ہے کہ پچھلے چند سالوں کے سماجی اور اقتصادی انقلاب کے سبب سے
ہمیں کچھ تغیر ہوا ہو۔ لیکن یہ نفسیاتی حقیقت بدستور ہے کہ "تعلیم کا بار" لڑکوں کو کسی کام کا
نہیں رکھتا۔ اسکی بدترین صورت وہ تھی کہ ایک زمانے میں مدرسوں کی معلمی پر لسانیات کے ماہر
قابض تھے اور وہ لڑکوں کو لسانیات کا ماہر بنا دیتے تھے خواہ انہیں آگے چل کر معلمی کرنا ہو یا
وکالت یا پادری کے فرائض انجام دینا ہوں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر لوگ ایسے پیشے
جن سے انہیں مناسبت نہ ہو کیوں اختیار کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ ان کی تعلیم ایک معلومات کے انبار
تک محدود تھی جسے نہ وہ ہضم کر سکتے تھے نہ قابو میں لا سکتے تھے اور نہ اپنے نفس کی تربیت کر سکتے
تھے۔ ایک نوجوان جو ایسے بوجھ میں دبا ہوا اپنے پیشے کا انتخاب کرنے سے معذور رہے۔ اسکے لئے تو بس
ایک راہ کھلی ہے کہ مزید تعلیم حاصل کرتا جائے۔ اور جب وہ دن آتا ہے کہ وہ کوئی عملی کام کرنے پر مجبور
ہوتا ہے تو بے چارہ سخت مصیبت میں پڑ جاتا ہے اور اسے بجز اسکے کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ جدھر

صورت حال پر غور کرے۔[1]

اب ہم تیسری صورت کو لیتے ہیں جو سب سے اچھی ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک نوجوان جس نے ہائی اسکول میں اپنی طبیعت کے مناسب تعلیم پائی ہے واقعی اپنے مشغلۂ زندگی کا انتخاب حسب دلخواہ کر سکتا ہے۔ اور کرنا چاہتا ہے۔ اب اُس کی ارتقائے نفسی کی کیا حالت ہوتی ہے۔ ذہنی صفات میں ہر اعتبار سے وہ عام ابتدائی مدارس کے طلبہ سے بہتر ہے۔ اسکا علم پیشوں کے متعلق زیادہ وسیع ہے اور اسے انکی اندرونی اور بیرونی حالت کا بہتر اندازہ ہے۔ وہ خود اپنی ذات سے یا کم سے کم اپنی کارگزاری کی صلاحیت سے اور اپنی سیرت سے بھی زیادہ واقف ہے کیونکہ وہ مدرسے میں چار پانچ برس مزید تعلیم پا چکا ہے اور جہاں تک اسے موقعہ ملا اس نے ان باتوں پر غور کیا ہے۔ باوجود اسکے وہ ارتقائے نفسی کی جس منزل میں ہے اسکی شعوری کیفیت کا پابند ہے۔ یعنی وہ ابھی تک ان سب چیزوں میں بہت کچھ تخیل، بہت کچھ کمال بینی اور بہت کچھ خود فریبی کی آمیزش کر دیتا ہے۔ جن پیشوں کا اُسے بلا واسطہ علم نہیں ہے اُن کے اندازے میں وہ بقول الیوائس فشر کے ان کی اندرونی قدر سے زیادہ ان کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ خود اُسے بھی اچھی طرح معلوم ہو کہ اُسکے انتخاب کے محرک زیادہ تر وہ جذبات انگیز مواقع ہیں جنکا اُس نے مختلف پیشوں میں مشاہدہ کیا ہے یا عزت

---

[1] ماہرین نفسیات اور ماہرین تعلیمات مدت مدید سے کہہ رہے ہیں کہ پرانے طرز کے ہائی اسکولوں میں اُن لوگوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں جنکا رجحان طبیعت صناعی کی جانب یا صنعت و حرفت اور دوسرے عملی کاموں کی طرف ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ یا تو اسکول کے درس کا علمی رنگ ان پر بالکل نہیں چڑھتا اور وہ کورے رہ جاتے ہیں۔ یا انہیں بچپن ہی سے اس نصاب تعلیم سے جس سے انہیں کوئی مناسبت نہیں سخت اور المناک جنگ کرنا پڑتی ہے۔ اُن کی حالت یہ ہوتی ہے جیسے کوئی پودا اس زمین سے جسمیں وہ نشوونما پاتا ہو مناسب غذا حاصل نہ کر سکے یہ صورت اسقدر عام تو نہیں ہے کہ اسکے لیے جداگانہ مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہو۔ لیکن جو نفسیات نوجوانوں کے رجحان پیشہ کی نشوونما سے بحث کرتی ہو اسے اسپر بھی غور کرنا چاہیے۔ ایمیل اشٹراؤس نے اپنے ناول "دوست اِن" میں اعلیٰ درجے کی نفسیاتی دقت نظر کے ساتھ ایک نازک طبیعت کا نقشہ کھینچا ہے جسکی زندگی کا [illegible]

کا خیال اور ہمت اُس مخصوص کارگزاری کا ذوق جسکی کسی پیشے میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس حجاب کے سبب سے وہ نفس امر سے دور رہتا ہے اور اپنی صلاحیت کے بارے میں دھوکہ کھاجاتا ہے۔

اکثر صورتوں میں پیشے کے انتخاب اور اسکا کام شروع کرنے کے درمیان ۴ برس سے لیکر ۱۰ برس تک کا زمانہ حائل ہوتا ہے جسکے دوران میں اسکے نفس میں مزید تغیرات واقع ہوتے ہیں جو اس عمر کے لیئے مخصوص ہیں،

پہلا امکان تو یہ ہے کہ وہ منزل کو پسند لیکن راہ کو ناپسند کرتا ہو۔ جو میدان بظاہر بہت دلچسپ معلوم ہوتا تھا اسمیں خلاف توقع بہت سے دشوار گزار مقامات ملتے ہیں۔ مثلاً اُسے ادبی تاریخ کے مطالعہ کا شوق تہا لیکن قدیم جرمن زبان پڑھنے کا نہ تھا وہ وکیل یا منصف بننا چاہتا تھا لیکن یہ معلوم نہ تہا کہ رومی قانون سیکھنا پڑے گا۔ اُسے مشین بنانے کی آرزو تھی لیکن ریاضی یا ڈرائنگ میں اُسکا ٹٹو نہیں چلتا۔ مختصر یہ کہ اب اُسے اپنے مرکب کا رُخ بدلنا پڑتا ہے۔ یا اگر اُسمیں اتنی ایمانداری اور قوت نہیں ہے تو ہمیشہ خرلنگ کو منزل پر پہنچانے کی بیہودہ کوشش میں مبتلا رہیگا۔ اسیطرح کی مصیبت ان لوگوں پر ہوتی ہے جنہیں عمل کا اسقدر جوش ہوتا ہے کہ وہ اتنی مدت تک انفعالی حالت میں رہنے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کا دل کہتا ہے زندگی اتنی مختصر ہے کیا تحصیل کا زمانہ کبھی ختم نہ ہوگا؟

اس سے بھی زیادہ عام ایک دوسری صورت ہے جو عام جمالیاتی رجحان یا عام علمی رجحان رکھنے والی طبیعتوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ایک نوجوان یونیورسٹی میں عام تعلیم کے شوق میں آیا ہے۔ اسکول میں بھی اُسے کسی چیز سے خاص مناسبت نہ تھی بلکہ ہر چیز سے مساوی دلچسپی تھی جس سے ہر بارٹ کو دلی خوشی ہوتی۔ اب یونیورسٹی میں کبھی وہ اس مضمون کی طرف ڈھلکتا ہے کبھی اس مضمون کی طرف، اگر کسی مخصوص علم کی تحصیل کی صلاحیت نہ ہو

کبھی دنیات کا اور کبھی یونان و روما کے ادبیات کا۔ غرض عجیب بے اصولی اور تلوّن میں مبتلا رہتا ہے۔ اسکی حالت وِلہیلم مائسٹر کی سی ہوتی ہے وہ اپنی سعی مطلق کی کوئی حد بندی نہیں کر سکتا اس لیئے نہ وہ کبھی کوئی پیشہ اختیار کر سکتا ہے نہ کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ اور نہ کوئی عمل اسکا اندرونی انتشار سے اعصابی ضعف پیدا ہوتا ہے اور اس سے لااُبالی پن جسکے سبب بیچارہ نوجوان بڑی آفتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اب اگر قسمت اچھی ہے تو کسی دوست کا قوی ہاتھ اُسے ان مصیبتوں سے نجات دیتا ہے ورنہ اور کوئی صورت چھٹکارے کی نہیں۔ جن لوگوں پر یہ گذرتی ہے وہ کچھ ایسے گئے گزرے نہیں ہوتے مگر ان کی ارتقائے نفسی کا عمل بہت طویل اور کٹھن ہو جاتا ہے۔

اب ایک تیسری مثال ملاحظہ کیجئے۔ بعض نوجوانوں میں لذات زندگی کی طمع ایک منظم زندگی کی تعمیر کے شوق پر غالب آجاتی ہے۔ خواہ ان کے تعلیم سے جی چرانے کا سبب یہ ہو کہ ان کا رجحان طبیعت حد سے زیادہ وسیع ہے یا حد سے زیادہ تنگ یا ان میں ادراک و تعقل کی کمی ہے۔ بہر صورت انکی قوت عمل اسکے لیئے کافی نہیں ہوتی کہ وہ موجودہ لمحات کو اپنے مستقبل کی خاطر قربان کریں۔ انہیں عورتوں کی صحبت سے، اور شراب و کباب سے وہ مسرت حاصل ہوتی ہے جو غیر یقینی مستقبل سے نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو بہت جلد دنیا سے گزر کر "لازمان" کی سرحد میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کے لیئے مستقبل کبھی آتا ہی نہیں یا اگر آیا بھی تو ان کو اس حالت میں پاتا ہے کہ زندگی سے جی سیر ہے اور عیش پرستی نے جسم اور روح کو کھوکھلا کر دیا ہے۔

ان سب لوگوں کی حالت کا ایک مشترک سبب یہ ہے کہ ایک ترقی یافتہ تمدن میں اُس منزل تک پہنچنے کے لئے جہاں انسان اعلیٰ تمدّنی خدمات انجام دے سکتا ہے بڑے طویل اور دشوار گزار راستوں سے گزرنا ہوتا ہے اور بیشمار شرائط پورے کرنا پڑتے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں

وہ راہ انہوں نے واقعی اپنی پسند سے نہ اختیار کی ہو۔

لیکن تعجب ہے کہ یونیورسٹی کے طالبعلموں کو یہ شکایت کبھی نہیں ہوتی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود پیشوں سے واقفیت رکھنے اور صلاحیت کا اندازہ کرنے کے وہ انتخاب میں غلطی کرتے ہیں۔ ایلوائس فشر نے ایک بار میونک یونیورسٹی میں پانچسو تین لڑکوں سے سوالات کر کے معلوم کیا کہ اُن میں سے تین سو بیس نے اپنی تعلیم کی تین میقاتیں (ٹرم) یعنی ڈیڑھ سال گزار چکنے کے بعد اس بات کا مختتم فیصلہ کیا تھا کہ وہ کون سا پیشہ اختیار کرینگے۔ کلماٹ نے جو اعداد شمار دئے ہیں اُنسے معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی سے پہلے اسکول کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے بیس فیصدی ایک راہ اختیار کرنیکے بعد اسے چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کیا کرتے تھے۔ انمیں ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو جانتے سب کچھ ہیں اور کر کچھ نہیں سکتے، جنھیں ہر بات کا احساس ہوتا ہے مگر قوتِ عمل سے محروم ہیں، دوسرے وہ بے اعتدال آسمان پرداز جو اگر کار زمین پر قناعت کرتے تو کام کے آدمی ہوتے۔ تیسرے وہ کچھوے کی چال چلنے والے جنھیں ہمارے امتحانوں کا غریب پرور نظام آہستہ آہستہ بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔ جہاں وہ زمانہ ماضی کی طرح بےحس و حرکت جمے رہتے ہیں۔

جو قوتیں انسان کو بغیر اندرونی صلاحیت اور مناسبت کے اُبھارتی ہیں انمیں جاہ طلبی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اکثر نوجوانوں کی روح میں یہ جذبہ خناس بنکر سما جاتا ہے۔ وہ کسی اعلیٰ عین کے تابع نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکی تہ میں محض یہ خلش ہوتی ہے کہ انسان دوسروں سے بڑھ جائے اور اپنی خودبینی کی پرورش کرے۔ محض جاہ طلبی سے انسان کبھی کوئی قابل قدر کام انجام نہیں دے سکتا۔ فشٹے نے سچ کہا ہے "جاہ طلبی سے بڑے کاموں کی تحریک نہیں ہوتی بلکہ جب انسان بڑے کام کر چکتا ہے تب اسکے دلمیں عالم علوی کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے جس میں وہ عزت کا طلبگار رہوتا ہے۔" حد سے بڑھی ہوئی جاہ طلبی عہد شباب کی ایک عام بیماری ہے جو قوت محرکہ کو لاحق ہو جاتی ہے۔ آگے چل کر انسان کو اس بات کی زیادہ پروا نہیں رہتی کہ دوسرے لوگ خصوصاً عوام الناس اسکی قدر کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری عزت کی

طلب جو اصل میں نوجوانوں کے عام جذبۂ اثبات خودی کی ایک خاص شکل ہے قدرت کی طرف سے اس لیئے پیدا کی گئی ہے کہ اُس سے ارتقائے نفس کے لیئے محرک کا کام لیا جائے۔

جاہ طلبی کے ساتھ اگر اپنے کام کی سچی محبت شامل نہ ہو تو نوجوان ایک بالواسطہ محرک کا پابند ہو جاتا ہے۔ یہ بات نوجوانوں میں بہ مقابلہ پختہ کار عارفان زندگی کے یوں بھی عام ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ بعض اوقات نوجوان پیشے کا انتخاب اس لیئے کرتے ہیں کہ وہ کسی ایک ذات کے اثر سے مسحور ہو جاتے ہیں اور اُس پیشے کو اُسی کی روشنی میں دیکھتے ہیں اس عملی قیاس کو جس سے نوجوان یہاں کام لیتے ہیں، ہم معمولی منطقی قضیے کی صورت میں یوں کہہ سکتے ہیں "چچا ماکس بڑے اچھے آدمی ہیں۔ وہ کمھار ہیں اس لیئے میں بھی کمھار بنوں گا"، ظاہر ہے کہ یہاں پیشہ کا انتخاب خود اس پیشے کی خاطر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس صورت میں یہ بات اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ یعنی بعض اوقات نوجوان کسی پیشے کو محض اس لیئے اختیار کرتے ہیں کہ ایک ناقابلِ برداشت ماحول سے نجات پائیں یا اُس نفرت کو جو انہیں اپنے کسی بزرگ یا نگراں کے طرز زندگی سے ہے عملاً ظاہر کریں۔ اسطرح کے بالواسطہ محرکات بہت عام ہیں کیونکہ نوجوان خصوصاً جرمنی کے نوجوان یہ تو کم جانتے ہیں کہ وہ کیا چیز چاہتے ہیں مگر یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کیا چیز نہیں چاہتے۔ اس سے کسی قدر مختلف صورت وہ ہے جب وہ کوئی نامرغوب پیشہ اس لیئے اختیار کرتے ہیں کہ مالی اعتبار سے جلد خود مختار ہو جائیں تاکہ اپنے والدین کی مدد کر سکیں یا اپنی معشوقہ کو بیاہ لائیں۔ اب اگر نوجوانوں پیشے کے بارے میں مشورہ دینے والے محض عقلی اصول کو پیش نظر رکھیں گے تو کام نہیں چلے گا۔ مگر چشم بصیرت رکھنے والے کسی شخص کے پیشے کے محرکات سے اسکی پوری سیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

بلاواسطہ محرکات میں سے ایک کسب معاش کی خواہش ہے جو اقتصادی پیشوں کے علاوہ بعض اوقات دوسرے پیشوں میں بھی غالب ہوتی ہے۔ اسی طرح سیاسی اثر اور شان کی آرزو بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے زمانے میں لوگ قانونی پیشوں کو اسی لیئے زیادہ

اختیار کرتے تھے کہ انتشار اور الجھن کی حالت میں یہی چیزیں ان کے انتخاب کی محرک ہوتی تھیں۔ اگرچہ آگے چل کر اُن میں سے اکثر کو خلاف توقع اپنے کام سے بیحد دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن پیشے کا سچا شوق جو دل کی گہرائی میں جگہ کر لیتا ہے وہی ہے جو بقیہ اس کام سے ہو یا جو کسی اعلیٰ اخلاقی نقطۂ نظر مثلاً قوم یا ملک یا بنی نوع انسان کی محبت کے ماتحت ہو۔ ایک اٹھارہ انیس برس کے نوجوان میں جس نے زیادہ دن تک عام تعلیم پائی ہے اسطرح کے اخلاقی نصب العین اور تصور کائنات کا موجود ہونا بالکل ممکن ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ابھی اُسے زرِ خام سے کندن بننے کے لیئے بیشمار مایوسیوں اور بیحد نفس کشی کی آنچ میں تپنا باقی ہے۔ لیکن ذہن خارجی کا اتنا اثر اس عمر میں بھی ہو سکتا ہے کہ نوجوان کو نہ صرف اہم تمدنی جذبات کا شوق ہو بلکہ وہ پیشے کا انتخاب ایک اعلیٰ اخلاقی نصب العین کے ماتحت کرے جو ابھار کر بلند تر سطح پر پہنچانا چاہتا ہے۔

آج کل تحریک شباب میں یہ بھی ایک بہت اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ یہ ابھی حل اس لیئے نہیں ہوا ہے کہ ہر خیالی اخلاقی نصب العین قابل قبول اُسوقت قرار پاتا ہے جب وہ واقعیت کے معیار پر جانچا جا چکا ہو اسکے لیئے یہ ضروری ہے کہ انسان دنیا سے، انسانوں سے، کاموں سے اور فرائض سے واقفیت رکھتا ہو اگر جسطرح کوئی شخص خشکی میں تیر نہیں سکتا اسیطرح جب تک انسان کسی پیشہ کو شروع نہ کر دے تب تک یہ پتہ نہیں چلتا کہ اسکے پیش نظر جو بلند نصب العین ہیں وہ واقعی زندگی کی تشکیل میں کتنا اثر رکھتے ہیں۔ چنانچہ نوجوانوں کے لیئے پیشے کا مسئلہ جسکی طرف وہ اب توجہ کر رہے ہیں۔ ایک ہفتخوان کا حکم رکھتا ہے۔

اتنا ہی اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ نوجوان لڑکیوں کا جنھوں نے عام تعلیم پائی ہے پیشے کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیئے۔ جرمنی میں تحریک نسواں نے اچھی کامیابی حاصل کی ہے لیکن عورتوں کو جو مواقع ملے ہیں اُن سے فائدہ اٹھانے میں وہ ہمارے نزدیک سمجھ سے کام نہیں لیتیں۔ نوجوان لڑکیوں کی فطری انفعالیت میں ایک خطرہ یہ ہے کہ وہ چاہتی ہیں ہمیشہ تعلیم ہی حاصل کرتی رہیں

اگر ممکن ہو تو پھر اسکول میں لوٹ آتی ہیں۔

آجکل بھی بعض ایسی عورتیں موجود ہیں جنمیں سچی نسائیت ہے لیکن اُسی کے ساتھ تمدّنی زندگی کے وسیع دائرے میں کام کرنے کی آرزو بھی ہے۔ انہیں یہ تجربہ مایوس کر دیتا ہے کہ ابھی تک نہ تو انکی اعلیٰ تعلیم کا مناسب انتظام ہے اور نہ کوئی ایسا دائرۂ عمل ہے جو انکی مخصوص صلاحیتوں کے لیئے موزوں ہو۔ علاوہ اس کے ایک اور مشکل یہ ہے کہ گہری طبیعت رکھنے والی نوجوان لڑکیوں کے دلمیں پیشے کے شوق اور نسوانی فرائض کے احساس میں ہمیشہ کش مکش رہتی ہے۔ وہ امور خانہ داری میں مدد دینے کے لیئے مجبور ہی نہیں کی جاتیں بلکہ خود اُن کے رجحان طبیعت اور احساس فرض کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اور یہی رجحان ان کے دلمیں عموماً ایک نئی قوت پیدا کر دیتا ہے جو پیشے کے محدود اور کمزور نصب العین کو آسانی سے مٹا دیتی ہے۔ اس کشمکش کا احساس مردوں کو بہت کم ہوتا ہے اور اسکی نوعیت بھی اُس جنگ سے مختلف ہے جس سے خود انھیں اپنے پیشے میں سابقہ پڑتا ہے کیونکہ عورت کو اپنی جمعیت خاطر قائم رکھنے کی ضرورت مرد سے زیادہ ہے مرد اگر اپنے آپ کو کسی کام میں بالکل محو کر دے تو اسکی شخصیت برباد نہیں جاتی بلکہ اور وسیع اور مستحکم ہو جاتی ہے۔ لیکن عورت اگر واقعی عورت ہے تو اُسکے لیئے لازمی ہے کہ خارجی اشیا سے جو علاقہ قائم کرے اسمیں اپنی ذات کو پوری طرح محسوس کرتی رہے۔ اسمیں جاذبیت کی قوت زیادہ گہری ہے۔ اس لیئے اگر وہ کسی چیز کو جذب نہ کر سکے تو اُسے نقصان پہنچ جاتا ہے۔ محبت کرنے اور ماں بننے کے زمانے میں اسکی اندرونی وحدت کا قائم رہنا اشد ضروری ہے۔ لیکن پھر بھی جہاں اُسے یہ احساس پیدا ہوا کہ ان اعلیٰ فرائض کا ادا کرنا اسکی اندرونی ضروریات زندگی کو پورا نہیں کرتا تو ایک نئے عمل بلوغ کی طرح اسکے دلمیں کائنات سے ایک کلی اور مجموعی تعلق پیدا کرنے کی آرزو اٹھتی ہے جو محض اسطرح پوری ہو سکتی ہے کہ وہ ہمہ گیری کے انداز سے اپنے نفس میں

ہی میں [illegible] کائنات کی حیات کی لے دل میں جو جو د اسکے سینے میں
دھڑکتا ہے جذب کرے - اس لیئے کوئی عورت جو عورت کہلانے کی مستحق ہے کبھی ایسے پیشے میں
خوش نہیں رہ سکتی جسمیں لاشخصی عنصر غالب ہو - وہ اس مصیبت کو بھی اپنے علوئے ہمت سے برداشت
کر سکتی ہے لیکن اسکے احساس زندگی کی جان ایک اور چیز ہے جسمیں وہ اپنی ذات کو دوسرے
کے حوالے کر کے اپنے آپ کو پاتی ہے -

ارتقائے نفسی کے اس دور میں جسکا ہم ذکر کر رہے ہیں پیشے کے رجحان ، پیشے کے
انتخاب اور پیشے کے خارجی اور داخلی عناصر کے باہمی تعلق کے مسائل اتنے ہیں کہ ایک سرسری نظر
میں ہم ان کا احصار نہیں کر سکتے - ہم کہہ چکے ہیں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں نوجوان کی ذات پوری
قوت سے مکمل خارجی تمدن سے ٹکراتی ہے - اس لیئے یہیں پر اہم ترین تمدنی مسائل پیدا ہوتے ہیں
جنکا حل کرنا محض نفسیات کے ذریعہ سے ناممکن ہے - بلکہ یہ وہ نقطہ ہے جہاں نفسی خصوصیات کے
آگے سر تسلیم خم کرنے کا اصول سب سے زیادہ خطرناک ہے - اس لیئے کہ مقصود اصلی محض اس آزاد
ارتقا پذیر اور خود رائے نفس کی حفاظت نہیں ہے جو نوجوان کے پاس ہوتا ہے اور جسے وہ "بچا
بچا کر" رکھتا ہے بلکہ ایک اعلیٰ نفس کا حاصل کرنا جسکے لیئے بقول فشٹے کے " ادنے زندگی " کا
قربان کرنا ضروری ہے - فریڈرش[1] اعظم کی زندگی کو دیکھیے جو منازل اُسے کیوسٹرین سے
رھائنسبرگ تک اور وہاں سے پوٹسڈام تک طے کرنا پڑیں وہ کٹھن اور پُرخطر معلوم ہوتی ہیں -
مگر خدا جرمنی کے نوجوانوں کو ہمیشہ اسی راہ پر چلنے کی توفیق اور قوت دے -

---

[1] فریڈرش اعظم پروشیا کا اولوالعزم بادشاہ تھا جس پر آج تمام جرمنی فخر کرتا ہے - جب وہ شاہزادہ تھا تو اسکے باپ
نے اسکی تربیت نہایت سختی سے کی تھی - ذرا سے قصور پر اُسے سخت سزا دی جاتی تھی - اسی کا اثر تھا کہ جب
اُس نے عنان حکومت ہاتھ میں لی تو فرائض شاہی کی پابندی کا وہ نمونہ دکھایا جس کی تاریخ میں کوئی اور مثال
نہیں ملتی -

باب دوازدہم

نوجوانوں کا علم اور تصورِ کائنات

علم اور تصورِ کائنات دو دائرے ہیں جو ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں لیکن ایک دوسرے پر منطبق نہیں ہوتے۔ علمی تحقیقات کے بعض پہلو ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں تصورِ کائنات سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسیطرح تصورِ کائنات علم یعنی استدلال و معانی کے علاوہ دوسری صورتوں میں بھی ظاہر ہوتا ہے لیکن ان دونوں کے درمیان ایک مشترک خطہ بھی ہے۔ یعنی علمی تصورِ کائنات یا ہمہ گیر علم جو فلسفہ کہلاتا ہے۔

اِس لیئے نفسیاتی حیثیت سے بھی محقق میں، جو ایک محدود شعبے میں علوم مخصوصہ کی سخت قیود کے ساتھ دادِ تحقیق دیتا ہے، اور فلسفی میں جو ساری کائنات کے مکمل اور منتظم علم کی تلاش میں رہتا ہے بڑا فرق ہے۔ محقق تو ممکن ہے علاوہ اپنے علم کے ایک جداگانہ ذاتی تصورِ کائنات رکھتا ہو جو روایات و عقائد پر مبنی ہو۔ لیکن فلسفی کے لیئے ضروری ہے کہ کائنات کا جو کلی تصور اسکے ذہن میں ہے اُسے معانی میں مرتب کرے، تنقید کی روشنی میں جانچے اور اپنے زمانے کے علم سے اسکا مقابلہ کرے۔

یہ دونوں مثالیں عموماً نوجوانی ہی میں پہچانی جاسکتی ہیں۔ البتہ ان دونوں کا فرق اس لیئے کم ہوجاتا ہے کہ نوجوان خیالات کے معاملے بھی انتہا پسند ہے۔ اسکا رجحان اسطرف ہوتا ہے کہ معدودے چند وسیع معانی سے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کا احصاء کرے۔ اگر اسمیں نظری ذوق موجود ہو تو وہ عام طور پر یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز میں سادگی پیدا کردے اور ہر چیز کو عقلی اصول کے تحت میں لے آئے۔ اس لیئے اُسے بمقابلہ ایک پختہ کار آدمی کے یہ فیصلہ کرنے میں زیادہ دقت ہوتی ہے کہ آیا اُسکے خیالات کا محرک خالص علمی رجحان یعنی جزدی مسائل کی بالکل بے غرض اور

نفس امر پر مبنی تحقیقات کا شوق ہے، یا اسکی تہ میں انسان اور کائنات کے زندہ تعلقات ہیں جو علم کے بھیس میں ظاہر ہوئے ہیں۔

(۱)

ہم ابتدا میں پہلی قسم کے، یعنی ثبوتیت پسند، نوجوانوں کا ذکر کریں گے۔ دوسروں، یعنی فلسفیانہ طبیعت والوں، کے ذکر کا سلسلہ، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، مذہبیت کی سرحد تک پہنچتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ علم کی طلب انسان کے دل میں آغاز بلوغ سے قبل پیدا نہیں ہوتی: واقعات کی نظری تحقیق نوع انسانی کے لئے علم الحیات ہی کے نقطۂ نظر سے اتنی اہم ہے کہ کسی طرح ممکن نہیں کہ بچے کی ترکیب نفسی میں طلب علم کی ترکیب جداگانہ اور مستقل حیثیت نہ رکھتی ہو۔ سب جانتے ہیں کہ بچے کی زندگی میں بعض دور ایسے ہوتے ہیں جب اسکا علمی رجحان اور رجحانات سے بالکل علیحدہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں بچہ کے ادراک و خیال کی ارتقا کے متعلق اب تک بہت کم علم ہے۔ اسکے معلوم کرنے کے لئے ان دو باتوں پر اچھی طرح غور کرنا ناگزیر ہے:-

۱- اُن ذہنی تغیرات پر جنکا ہر فعل اور عمل سے پہلے واقع ہونا ایک بدیہی امر ہے۔

۲- اُن سوالات پر جو بچے کیا کرتے ہیں اور جنسے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خیال ابواب[1] کے ماتحت ہوتا ہے اگرچہ ہمیں ابھی تک ترتیب اور تقسیم نہیں ہوتی۔

دونوں صورتوں میں اسکا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہمارا مشاہدہ ان مصنوعی افعال یا سوالات پر مبنی نہ ہو جو بچے معلم کی دیکھا دیکھی کیا کرتے ہیں۔ بلکہ اگر ہمیں غلط نتائج سے بچنا منظور ہے تو ہمیں بچے کی مجموعی کیفیت کے "حیاتیاتی پہلو" کا پابند رہنا چاہیئے۔ مثلاً بچوں کو تصویریں دکھا کر اُن سے اِن تصویروں کی کیفیت پوچھنا نفسیاتی تحقیقات میں بہت

---

[1] ابواب یا Categories وہ عام معانی ہیں جن کے تحت میں انسان موجودات کا ادراک کرتا ہے۔ ۱۲

محدود قدر رکھتا ہے کیونکہ ایک تو چھوٹی عمر کے بچے یہ سمجھتے ہی نہیں کہ تصویر کے موضوع کے "سچے" اور "نفس امر" کے مطابق حالات بیان کرنا کسے کہتے ہیں - دوسرے اشیاء کے بہت سے باہمی علاقے جنکے سمجھنے کی عمل ادراک میں ضرورت ہوتی ہے تصویروں میں ظاہر نہیں ہو سکتے علاوہ اسکے یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ ابواب جنکا مفہوم آگے چلکر مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے بچوں کے ذہن میں بہت غیر معین اور کلی معنی رکھتے ہیں - مثلاً بچے جب پوچھتے ہیں کہ "فلاں چیز ایسی کیوں ہے ؟" تو وہ ایک سوال کے ذریعے سے منطقی سبب، زمانی علت، اور مقصد و منشا تینوں معلوم کرنا چاہتے ہیں - بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں میں اصلی چیز مقصد و منشا ہی ہے کیونکہ بچہ دنیا کے تمام مظاہر کو خواہ وہ بیجان اشیاء ہی کیوں نہ ہوں اُسی ذہنی صورت میں لانا چاہتا ہے جسکا نام ہمنے "سمجھنا" رکھا ہے - مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ نظام اشیاء جسکے ماتحت بچہ اشیاء کو سمجھتا ہوگا اُس سے بھی زیادہ محدود ہے جو بڑوں کے ذہن میں ہوتا ہے کیونکہ اسکی ترکیب نفسی بہت محدود ہے -

ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ نفسیات طفلی کے اِن مسائل کو جنمیں سے اکثر ابھی تک حل نہیں ہوئے ہیں معرض بحث میں لائیں - بس اتنا کہدینا کافی ہے کہ بچہ بھی نظری ذوق رکھتا ہے - وہ پہلے ہی دن سے ایری ایڈنے[1] کی طرح وہ ڈوری بٹنے لگتا ہے جسکی مدد سے انسان واقعات کی بھول بھلیاں میں اپنا راستہ ڈھونڈھ سکتا ہے - اور وہ بھی ہماری طرح خالص نظریۂ علم کے اصول کے خلاف کسی بات کو صحیح مان کر اُسپر عمل کرتا ہے اور اسکے نتائج سے جانچتا ہے کہ جو بات مانی تھی وہ صحیح ہے یا نہیں - اسکے ذہن کی علمی ترکیب مجموعی زندگی میں پیوست ہے - البتہ کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیئے خالص عملی رجحان اس کل سے جدا ہوتا ہے تاکہ دائرۂ علم کو وُسعت دے -

لیکن اس حالت میں بھی بچے اور نوجوان کے نظری رویے میں بنیادی فرق ہے۔

---

[1] Ariadne کریٹ کے بادشاہ کی بیٹی جس نے یونانی سورما تھیسیس کو ایک ڈوری کی مدد سے بھول بھلیاں ...

بچے۔ خصوصاً تین برس سے نو برس تک کی عمر کے بچّے۔ جب بڑوں سے سوالات کرتے ہیں تو اُن کے دلمیں یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ہر بات کا صحیح علم دنیا میں موجود ہے۔ بس صرف جاننے والوں اور پختہ کاروں سے دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کو جو جواب دیدیا جائے اُسے وہ چپ چاپ مان لیتے ہیں۔ ابھی تک جبلّت ادراک بہت کمزور ہے۔ بچّے راہِ علم میں ایک قدم چلکر رک جاتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔ پھر بچوں کا ذوق علم موضوع کے لحاظ سے بھی محدود ہے۔ اُس کا رخ تقریباً ہمیشہ عالم خارجی کی طرف ہوتا ہے۔ عالمِ نفسی اور عالمِ ذہنی سے ہنوز دلچسپی نہیں پیدا ہوئی ہے۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ذوق تحقیق کی یہ ترکیب بچپن کے آخری زمانہ میں زیادہ وسیع ہو جاتی ہے۔ اب صنعتی چیزوں سے بہت دلچسپی ہوتی ہے اور اسی کی مناسبت سے اکثر بلوغ سے قبل ہی علوم فطرت (سائنس) کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ علومِ ذہنی اور تاریخ کا مذاق اس عمر میں صرف ان لڑکوں میں پایا جاتا ہے جنمیں نفسی اور روحانی حیثیت سے زیادہ پختگی آچکی ہو۔ محض قصوں کے پڑھنے یا سُننے کا جو انتہائی شوق سب لڑکوں کو ہوتا ہے وہ ہرگز کسی علمی ذوق کی علامت نہیں ہے۔

بچوں کے طرزِ عمل کے مقابلہ میں نوجوان کا رجحان تحقیق حسب ذیل خصوصیات رکھتا ہے۔

۱۔ نوجوان ہر جواب سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ مزید سوالات کرتا ہے۔ وہ تقابل اور تنقید سے بھی کام لیتا ہے۔

۲۔ ان باتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے مسائل کا نظری احساس پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنی آزاد رائے رکھتا ہے[۱]۔

---

[۱] ظاہر ہے کہ یہ بات صرف تیز نوجوانوں میں پائی جاتی ہے۔ بعض ایسے کند ذہن اور آرام طلب ہوتے ہیں کہ بڑے ہو کر بھی

۲ ۔ نظری ذوق وسیع ہو جاتا ہے اور اب اسکے موضوع میں انسانی امور، یعنی خاص نفسی، تاریخی، سماجی اور تمدنی مسائل بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

اگر اُن مسائل کا دائرہ جنسے نوجوانوں کو دلچسپی ہے زندگی کی عام ضروریات اور عملی مصالح سے زیادہ وسیع ہے تو یہ ایک پُر معنی امر ہے۔ کسی محدود اور معین موضوع کی گہری تحقیق کی طرف طبیعت کا مائل ہونا اس بات کی علامت ہے کہ نوجوان کو اس شعبۂ ذہنی سے خاص مناسبت ہے جو عموماً آئندہ بھی باقی رہتی ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسمیں علمی ذوق اور علمی صلاحیت موجود ہے۔ ذہنی صلاحیت معلوم کرنے کے لیے جو امتحان لیے جاتے ہیں ان کی بنا اس مشاہدے پر ہونا چاہیے نہ کہ اُس مصنوعی اور مجرد "ذہانت کی جانچ" پر جو ترکیب نفسی اور ماحول سے قطع نظر کرکے کی جاتی ہے۔

ہم پہلے باب میں کہہ چکے ہیں کہ نوجوانوں کی طبیعت میں کسی کام کی طرف قوی رجحان ہونا اس بات کی یقینی دلیل نہیں ہے کہ اسمیں کام کی اتنی ہی صلاحیت بھی موجود ہے۔ پھر بھی یہ اہم ترین معیار ہے جس پر ہم جانچ سکتے ہیں کہ یہ نوجوان اس کام کو چلا سکے گا یا نہیں۔ کیونکہ محض صلاحیت بغیر زبردست خیالی قوتوں کی تحریک کے عمل میں منتقل نہیں ہو سکتی۔ یہی قوتیں اس بات کی ضامن ہوتی ہیں کہ پورے استقلال اور محنت سے کام لیا جائیگا۔

لیکن یہ ایک معما ہے جسکے حل کرنے کی ابھی تک کوشش نہیں ہوئی کہ کسی خاص چیز کی تحقیق سے دلچسپی پیدا ہونے کے کیا اسباب ہیں۔

اگر کوئی نوجوان علم الطیور، یا آثار قدیمۂ مصر، یا علم کیمیا کا دیوانہ ہو اور اسکے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ رکھتا ہو تو اسکا سبب ذہنی زندگی کی عام انفرادی ارتقا میں تلاش نہ کرنا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے تمدن کو جسکی بنیاد تمام و کمال علم پر ہے اپنی بقا کے لیے اس قسم کی مخصوص قابلیت رکھنے والی طبائع کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بغیر انتہا طلب تقسیم عمل کے کسی

ہیں جو مجموعی زندگی سے بے تعلق جزدی کاموں کو اپنے ذمہ لے لیتے ہیں اسکا آسان ساجواب تو یہ ہے ، یہ وراثت کا کرشمہ ہے لیکن اس سے بالکل کام نہیں چلتا کیونکہ اول تو یہ جواب معاملے کو عضویات کے سر ڈال دیتا ہے جس سے کسی ذہنی مسئلہ کی توجیہہ نہیں ہوتی دوسرے یوں بھی یہ محض بات کا ٹالنا ہے کیونکہ پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ آخر اُس بزرگ میں جسکی یہ میراث ہے یہ رجحان کہاں سے پیدا ہوا تھا۔

بہر حال اس سے زیادہ مفید اس بات کی جستجو ہے کہ کہیں ابتدائے عمر میں نوجوان پر کوئی ایسی گہری واردات قلبی تو نہیں گذری جسکے اثر سے اس اثر پذیر عمر میں اسکا رجحان ان کاموں کی طرف ہو گیا ہو ممکن ہے کہ بچپن کے کھیل میں یا طفلانہ زندگی کے کسی اور موقعہ پر کوئی دل نشین واقعہ پیش آنے سے ، یا کسی انقلاب آفرین کتاب کے پڑھنے سے یا کسی جیتے جاگتے انسان مثلاً معلم کی صحبت کے اثر سے یہ احساسات وواردات پیدا ہو گئے ہوں - یہ بات سمجھ میں آتی ہے کیونکہ ان چیزوں سے جہاں اور مجموعی اثرات پڑتے ہیں وہاں انسے یہ جزدی اثر بھی پڑ سکتا ہے مشہور محققوں کے حالات زندگی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انہیں سے کسی عنصر سے متاثر ہوئے تھے اور بعض کسی سے - ہم یہاں مثالیں نہیں دینا چاہتے کیونکہ ان کو ہر شخص آسانی سے تلاش کر سکتا ہے ۔ ہمیں تو اس ساری بحث میں صرف ایک بنیادی منہاجی اصول سے دلچسپی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم جس شخص میں کوئی عجیب مخصوص رجحان دیکھیں اس کی پچھلی زندگی پر غور کر کے احساس وعمل کی ان مجموعی حالتوں کا پتہ لگائیں جنمیں سے اب یہ ایک رجحان باقی رہ گیا ہے حالانکہ وہ کلی مقصد جسکا یہ ایک جزو تھا فراموش ہو گیا ہے ۔ مثلاً ممکن ہے کہ طیور سے دلچسپی بچپن کے اس زمانہ کی یادگار ہو جب منجملہ اور باتوں کے چڑیوں کے انڈے تلاش کرنا اور چڑیوں کی آواز سُننا تفریح کا مشغلہ تھا ۔ اور لسانی تحقیق کے شوق کا سرچشمہ طالبعلمی کے دور کی مضمون نگاری ہو جو اسوقت مجموعی حیثیت سے دلچسپ تھی مگر اب محض اسکا ایک جزو رہ گیا ہے جسنے دل میں جڑ پکڑ لی ہے ۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ علم کیمیا

قدیم کیمیا سازی سے نکلا ہے جو زندگی کے لیے زیادہ "اہم" اور زندگی سے زیادہ "قریب" تھی اور علم ریاضی اعداد کے نیم شاعرانہ اور نیم مذہبی باطنی نظریے سے۔ تاریخ کے شوق کی بنیاد اکثر خاندانی واقعات اور خاندانی اثرات پر ہوتی ہے جنھوں نے ایک وسیع اور مستقل صورت اختیار کرلی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی نے اتفاقاً کسی فن میں ایک نئی بات دریافت کرلی جس سے اسکے ذہن پر ایسا گہرا اثر پڑا اور اسکی طبیعت میں ایسا انقلاب ہوا کہ وہ اُسی فن کا ہو رہا۔ ان سب مثالوں کا لب لباب یہ ہے کہ ہر مخصوص رجحان کو کسی نہ کسی وقت میں مجموعی زندگی کے لیے اہمیت حاصل تھی۔

اس بحث سے ہمیں اُن نوجوانوں کے راز کو سمجھنے کی کنجی ہاتھ آگئی ہے جو کمسنی میں ایک چھوٹا سا سائنس کا معمل قائم کرتے ہیں، یا کسی خاص فن سے متعلق کتابوں کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں۔ یا ہر سیر و سیاحت کے موقع پر علمی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں۔ غرض جنھوں نے کسی ایسی چیز کو جو بظاہر زندگی سے دور ہے اپنا مشغلۂ زندگی بنا لیا ہے۔

جن باتوں کا اتنا قوی اثر پڑتا ہے انمیں سے دو سب سے نمایاں ہیں اور عام اہمیت رکھتی ہیں:—

کسی دور کا غالب علمی رجحان۔ اور مدرسہ کی تعلیم کا اثر

ہر تاریخی عہد کی معنوی دنیا اور اسکے علمی مسائل الگ ہوتے ہیں۔ کبھی سائنس کے مباحث پر زیادہ توجہ ہوتی ہے کبھی ذہنی اور تاریخی علوم کے مسائل پر۔ اور ان دونوں دائروں کے اندر اور چھوٹے چھوٹے دائرے بنتے ہیں۔ مثلاً جن لوگوں کی علمی تربیت سنہ ۱۸۶۰ء اور سنہ ۱۸۸۰ء کے درمیان ہوئی ہے وہ ہر چیز کو علم الحیات کے نقطۂ نظر سے دیکھتے اور نظریۂ ارتقا کے معیار پر جانچتے تھے۔ یہاں تک کہ علوم ذہنی والے بھی علم الحیات کی اصطلاحوں سے اپنے مباحث میں کام لیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ علوم کی ترقی اسی پر منحصر ہے۔ سنہ ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ عام ذہنی زندگی کا رخ بدلا۔ اُسوقت سے علوم ذہنی کے بنیادی تصورات ہر چیز پر حاوی ہیں اور ان

کا اثر علوم فطرت (سائنس) میں بھی نمایاں ہے (مثلاً "صورت" کا تصور، یا "اجسام" نامیہ کا تصور) جن ہمعصر فلسفیوں نے زندگی کے حالات لکھے ہیں (اب تک چار ایسی کتابیں شایع ہو چکی ہیں) انہیں سے زیادہ عمر والے اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے غالب رنگ یعنی سائنس کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اب تک بہت سے محققوں کو جدید صنعت و حرفت کی ترقی، جو ایک ناقابل تردید واقعہ ہے، مسحور کر دیتی ہے۔

ایک لحاظ سے مدرسہ وہ نہر ہے جو خاص کر کے اس غرض سے بنائی گئی کہ زمانہ کے اثرات سے نئی نسل کے کشتِ دل کو سیراب کرے۔ مگر مغرب کے اکثر ملکوں میں تعلیم کی بنیاد یونان و روما کے قدیم تمدن کے تاریخی سرمائے پر رکھی گئی ہے۔ یہی وہ نقطہ قرار دیا گیا ہے جس پر فرد کا ذہن داخلی ذہن خارجی سے رگڑ کھا کر چمک اٹھے، ہمیں شک نہیں کہ ذہنی زندگی کا جیسا ڈھلا ہوا نمونہ رومی یونانی تمدن میں نظر آتا ہے کہیں اور نہیں ملتا "اعتذار سقراط" میں نوجوانوں کے لئے جو تعلیمی قدر ہے وہ ہرڈر اور ایکھارٹ کی عظیم الشان تصانیف میں کبھی نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے مقالے ("انسانیت" اور نفسیات بعنوان شباب) میں بتا چکے ہیں کہ اس پختہ کار اور مکمل تمدن میں اور آجکل کے نوجوان کی نفسی کیفیات میں کس حد تک مناسبت ہے۔ یہاں ہم دوبارہ اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتے۔ اصل سوال یہ ہے کہ نوجوان ان غیر زبانوں میں جو تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ ان کے دلمیں گھر کرتی ہے یا نہیں اور اگر کرتی ہے تو کب۔ سچ پوچھیے تو بہت سے طلبہ کو یہ بات حاصل ہی نہیں ہوئی جسکا سبب کبھی پڑھانے والوں کی بے اصولی ہوتی ہے اور کبھی پڑھنے والوں کی خامکاری۔ مگر عجیب بات ہے کہ بعض اوقات برسوں کے بعد اس تعلیم کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ خود مصنف کو عہدِ قدیم کے تمدن کا ذوق پہلے پہل آغاز بلوغ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں، جب دسویں درجہ میں تھا۔ مجھے اتفاقاً سالسٹ سے دلچسپی پیدا ہو گئی جو ایک دوسرے درجہ کا مصنف ہے۔ اب میرے دلمیں تاریخی مذاق پیدا

لگا - آٹو براؤن پر یہ گہرا اثر بہت کمسنی میں پڑ چکا تھا شلائرماخر نے جو بات علمی خطبات کے متعلق کہی ہے ہمیں خفیف سا تصرف کر کے ہم کہہ سکتے ہیں "عہدِ قدیم کے تعلیمی خزانے کو حفاظت کا مستحق قرار دینے کے لیئے محض اتنی ہی بات کافی ہے کہ چند افراد کے لیئے یہ مایۂ حیات بن سکتا ہے۔

یہاں ایک بات پر زور دینا ضروری ہے جسے اکثر لوگوں نے اب تک نہیں سمجھا اور جسکے نظر انداز کرنے سے بڑی خرابیاں پیدا ہوئیں - ہر موضوع علم تعلیمی قدر نہیں رکھتا۔ اسی طرح جو چیز تعلیمی قدر رکھتی ہے اُسکا محض علم ہو جانا کافی نہیں - جن مدرسوں میں قدیم علوم پڑھائے جاتے ہیں انکا بھی اصل مقصد عام تعلیم و تربیت ہونا چاہیئے، نہ کہ کسی خاص زبان و ادب کی معلومات۔ علم محض اور تعلیم کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے میں لوگوں نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں مگر ہمارے خیال میں جس اختصار اور خوبی کے ساتھ ایک لائق خاتون نے اس نکتے کو بیان کیا ہے کسی نے نہیں کیا۔ "تعلیم اس چیز کے جزوِ زندگی بننے کا نام ہے جسے انسان نے قوت ادراک سے حاصل کیا ہو۔" (لطف یہ ہے کہ یہ تعریف ایک امتحان میں کی گئی تھی جسمیں یہ خاتون ناکامیاب ہوئی)

حاصل کلام یہ ہے کہ نفسیاتی حیثیت سے نوجوانوں میں بھی طلب علم اور ذوق تعلیم دو جداگانہ چیزیں ہیں - اُسے خود بھی اس تقابل کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ اس کے لیئے وظائف ذہنی کی اندرونی تقسیم ضروری ہے جو بہت آگے چلکر بڑی ریاضت اور تہذیب نفس کے بعد حاصل ہوتی ہے - نوجوان جب اپنی تعلیم و تربیت آپ کرتا ہے تو اکثر اُسے خود یہ شعور نہیں ہوتا کہ وہ اپنی تعلیم میں مصروف ہے - بلکہ اسمیں تو تحصیل اور توسیع کا ایک جبلّی شوق ہوتا ہے جو غیر منقسم ذہنی زندگی کا جوہر ہے - یہاں جو عمل انتخاب واقع ہوتا ہے اسکا نفسیاتی مشاہدہ بہت دلچسپ ہے - اس اعتبار سے بھی کہ اس سے زمانہ کے عام رنگ کا پتہ چلتا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس سے نوجوان کی سیرت کا اندازہ ہوتا ہے - کبھی اسپر بھی غور کرنا چاہیئے

کہ کون سی کتابیں ایک نوجوان کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کی قوت رکھتی ہیں۔ ہم اسکو
بُرا نہیں سمجھتے کہ نوجوانوں کو کتابوں کا جو ذخیرہ مل جائے اور ہمیں سے جو کتاب اس کے
ہاتھ پڑ جائے خواہ وہ اوسط ہی درجہ کی کیوں نہ ہو اُس سے وہ اپنے ذوق مطالعہ کو تسکین دے،
یہ بھی قدرت کی کارسازی ہے کہ کسی خاص وقت اکسی خاص کتاب میں ایک چنگاری جس پر
دوسروں کی نظر بھی نہیں پڑی تھی نوجوان کے قلب میں معنوی اور ذہنی آگ کو بھڑکا دیتی ہے۔
لیکن ہمیں بھی تھوڑی سی کوشش کرنا چاہیئے کہ مدرسے کے نصاب کے علاوہ جو کتب بینی
نوجوان کرتے ہیں اسکے رخ کو اسطرح پھیریں کہ آسمان تعلیم کے درخشاں ستاروں پر اُن کی
نظر پڑ جائے۔

علم اور تعلیم میں جو فرق ہے اُسی سے ملتا جلتا فرق واقعات کے علمی مشاہدے اور زندگی
کے عملی تجربے میں ہے۔ سب نوجوانوں میں ہر بات کے معلوم کرنے کی اتنی ہوس باقی نہیں
رہتی جتنی بچپن میں ہوتی ہے۔ دلچسپی کا دائرہ نوجوانی میں وسیع ہوتا ہے تو دوسری طرف محدود
بھی ہو جاتا ہے۔ بہت سی باتیں اب بھی قابلِ توجہ نہیں رہتیں کیونکہ اُن سے اندرونی تعمیر اور
تشکیل میں مدد نہیں ملتی۔ اگر نوجوان کو کسی خاص شعبے میں معلومات حاصل کرنے کا بحد شوق ہو
تو یہ نفسیات تحقیقی کی رو سے اس بات کی علامت ہے کہ وہ محققانہ رجحان رکھتا ہے جو ایک خاص
موضوع تک محدود ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نوجوان آگے چل کر
ثبوتیت پسند، یعنی کسی مخصوص علم سے دلچسپی رکھنے والا عالم بنے گا۔

زندگی کا عملی تجربہ دوسری چیز ہے۔ یہ پیشے میں یا سفر میں ہر طرح کے لوگوں سے
ملنے جلنے اور ہر قسم کے حادثات کا مشاہدہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسکے حاصل کرنے کا کوئی خاص
ضابطہ نہیں بلکہ یہ ایک عام ذہنی دولت ہے جو ہر نوجوان کو چار و ناچار جمع کرنا پڑتی ہے۔ کوئی
دن اور کوئی ساعت ایسی نہیں ہوتی کہ اس خزانے میں اضافہ نہ ہو۔ البتہ اس چیز سے فائدہ

دعمل کو واقعی عالمِ واقعی سے زیادہ قریب لے آتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کا تجربہ
کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو لیکن اسکا ان کی ذات پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

نوجوان کبھی خوشی سے اس بات کا اعتراف نہیں کرتا کہ اُسکا تجربہ بہت ناقص ہے۔ یہی
وہ چیز ہے جسمیں ہر بالغ آدمی، خواہ اُسکا ذہن کتنا ہی پست کیوں نہ ہو، اُس سے بڑھا ہوا ہوتا
ہے۔ مگر ہمارا نوجوان اسکا پورا اندازہ نہیں کرسکتا کہ قابلیت، فہمیدگی، فراست وغیرہ اُس
تجربۂ زندگی کا بدل نہیں ہوسکتیں جو آہستہ آہستہ مدتوں میں حاصل ہوتا ہے۔ البتہ اس کا
یہ دعویٰ صحیح ہے کہ محض سن میں زیادہ ہونا عقل میں زیادہ ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ بہ
قول ہربارٹ کا اکثر اسّی سال کے بڈھوں کا تجربہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا جتنا اسّی سال کے
"شیلنڈریان" کا اور عمر کی زیادتی سے انسان اگر تجربہ کار ہوتا ہے تو ڈھیلا اور پست ہمت
بھی ہوجاتا ہے چنانچہ وہ اکثر اپنی کمزوری اور بےعملی کو "تجربے" کے پردے میں چھپانا چاہتا
ہے۔ اس جوش اور ولولے کی کمی کو نوجوان بجا طور پر شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی لئے
اُسے تجربۂ زندگی کے وعظ سے وحشت ہوتی ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک اور بات بھی نوجوانوں کی تائید میں ہے۔ واقعی بڑوں
کے تجربوں سے البتہ نوجوانوں کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا، کیونکہ اس تجربہ کی جسکا ہم یہاں
ذکر کررہے ہیں نوعیت ہی ایسی ہے کہ جب تک انسان اسے خود نہ حاصل کرے اسکی اندرونی
زندگی پر اسکا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر کوئی قابلِ اعتبار شخص جس نے بحرِ منجمد کا مشاہدہ کیا ہے
وہاں کے حالات بیان کرے تو میں انہیں مان لونگا۔ لیکن عشق ومحبت، یا کاروبار، یا اخلاقی
زندگی میں دوسروں کے تجربات میرے کس کام کے۔ یہ ایک عجیب نفسیاتی حقیقت ہے کہ ان
معاملات میں انسان معمولی سے معمولی باتوں کو بھی غیرمعمولی سمجھتا ہے اور کہتا ہے:۔ "ایسی انوکھی
واردات کسی پر آجتک نہ گذری ہوگی" اور اگر احساس کا یہ انداز نہ ہوتا تو یہ باتیں دل کی گہرائی

اے پیر دانشمند، تو کبھی اپنا خشک اور معقول تجربہ نوجوانوں کو تلقین کرنا نہ چھوڑیگا اور تو حق بجانب ہے۔ لیکن نوجوان بھی کبھی اپنے ذاتی تجربے پر کامل بھروسہ کرنے سے باز نہ آئیں گے اور وہ بھی حق بجانب ہیں۔

عام تجربۂ زندگی کا ذکر شوتیت پسند مثال سے وسیع معنی میں فلسفیانہ طبائع کی طرف پہنچنے کے لئے واسطے کا کام دیتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکی نظر علمی تحقیق و تدقیق میں بھی "مسئلۂ زندگی" پر رہتی ہے۔ ان کے ذوق سلیم کے سمجھنے میں نفسیات کو بہت کم دقت پیش آتی ہے۔ کیونکہ بلوغ نام ہی اسکا ہے کہ نفس انسانی بیدار ہو اور اسمیں اپنی زندگی اور کائنات کا شعور پیدا ہو جائے۔ یہاں جتنے مسائل پیش نظر ہوتے ہیں سب کا سلسلہ براہ راست مابعد الطبعیات تک پہنچتا ہے:۔

ولادت اور موت، عشق اور اختلاف جنس، طبیعت کا رجحان اور خارجی فرض کا احساس، اپنی خلقت کا مقصد اور "زندگی کا منشار"

ایسی صورت میں یہ سوال کرنے کے بجائے، کہ نوجوان کو ان چیزوں کے معلوم کرنے کا شوق کیوں ہوتا ہے ہمیں یہ پوچھنے کا زیادہ حق ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی نوجوان نئے واردات قلبی کے اس طوفان میں گھرا ہو اور فلسفی نہ بنجائے۔ اور واقعی اس عمر میں فلسفی بن جانا تقریباً اتنا ہی عام اور ارتقائے نفسی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا شاعر بنجانا۔ اور دونوں صورتوں میں کوئی اعتبار نہیں کہ انمیں فلسفہ یا شاعری کا مخصوص رجحان موجود ہے۔ یا انکا یہ شوق مستقل رہیگا۔ بلکہ بلوغ کا زمانہ ختم ہوتے ہی جوش ٹھنڈا ہو جاتا ہے، اور اکثر لوگ اپنی پچھلی زندگی پر تبصرہ کرتے وقت اسے ایک "ارتقائی بیماری" سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بہت سے نوجوانوں میں فلسفیانہ رجحان کبھی کبھی ظاہر ہوتا ہے مگر اسمیں کوئی جوش نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فطرت نے خود اس نشے میں وہ ترشی بھی پیدا کر دی ہے جو اسے اتار دیتی ہے یعنی خارجی اشیار کی طرف قوی رجحان، دنیا کی نئی اور دلفریب چیزوں کا شوق اور ذوق عمل، جو گویا عہد شباب کا سرمایہ ہوتا ہے۔

البتہ وہ گروہ جسکا نام آجکل "داخلیت پسند" رکھدیا گیا ہے۔ اپنی شخصیت کے اظہار کے لیے علاوہ تنہائی کی تخیل آرائی، جذبات پرستی کے، اکثر فلسفیانہ موشگافی سے بھی کام لیتا ہے ایسی صورت میں بیچارہ ہر وقت ایک محویت کے عالم میں رہتا ہے اور حل نہ ہونے والے عقدے بھوت بنکر اُسکے پیچھے پڑجاتے ہیں اور کانٹے کی طرح دلمیں کھٹکتے رہتے ہیں۔ اس اُدھیڑبُن کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ کیونکہ جس مواد سے وہ کام لیتا ہے وہ بہت کم اور ناقص ہے۔ اس عمر میں اکثر فلسفیانہ غور و فکر کا موضوع "احساس خودی اور مشاہدۂ نفس کا علم باطنی" ہوتا ہے اور جو نظریے قائم کیے جاتے ہیں انکی بنیاد قلبی کیفیت پر اور اکثر افتاد مزاج پر ہوتی ہے۔ ساری زندگی کے وسیع مواد کی ذہنی تہذیب و تربیت سے، جو بے حد مشکل کام ہے، پہلوتہی کی جاتی ہے۔ اس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ ابھی تک یہ مواد پیش نظر نہیں ہوتا اور کچھ یہ کہ اسکے لیے منطقی آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنکے حاصل کرنے میں زحمت زیادہ ہے اور فائدہ کم۔ کیونکہ اس عمر کا فلسفیانہ رجحان تو محض ایک حیاتیاتی وظیفہ ہے جو نفسیات ارتقار کے مظاہر میں سے ہے۔ اس وظیفہ کا مقصد یہ ہے کہ نفس میں استقلال پیدا ہو اور اُسے اپنے وجود کا شعور ہو جائے۔ بظاہر اُن لوگوں کی تصانیف جنھوں نے عملی فلسفۂ زندگی سے بحث کی ہے۔ اس مقصد کو جلد سے جلد حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ایسے فلسفیوں نے جتنی شدت اور تنگ خیالی کے ساتھ محض اپنے ذاتی خیالات و احساسات کا اظہار کیا ہو اتنی ہی زیادہ تسکین نوجوانوں کی جستجوئے نفس اور اثبات نفس کی آرزو کو اُن سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر کہیں انہوں نے اپنے دردِ دل کو ایک ترشے ترشائے نظام معانی کی صورت میں ظاہر کردیا ہے تو جوان فوراً اسکے قائل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا عقیدت کا جذبہ اور تقلید کی آرزو دوچند ہو جاتی ہے۔ نوجوانوں میں فویرباخ، اشٹرنر، اور نیٹشے کے سے کھلے ہوئے داخلیت پسندوں کے مرید کثرت سے ہوتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کے خیالات ایک تو یونہی نوجوانوں کی طبیعت سے مناسبت

Biological function ۵۱

رکھتے ہیں اور دوسرے ان میں موجودہ زمانہ کے جذبات واحساسات نہایت مؤثر اور پرجوش انداز میں ظاہر کیے گئے ہیں شوپن ہاور نے جس کا فلسفہ محض اسکی بدمزاجی کا عکس ہے، اسے معنوی ترتیب کے پردے میں ایسا چھپایا ہے کہ جو لوگ تنقید کے عادی نہیں وہ اسکی نفسیاتی تکمیل اور استحکام کو دیکھ کر پھنس جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ نفی اور انکار میں کمال رکھتا ہے۔ نوجوان نہ اُس کے فلسفہ کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ نٹشے کی روحانی تنہائی اور عظمت کو سمجھ سکتے ہیں۔ مگر ان دونوں کی تصانیف کے سرسری مطالعہ سے نوجوانوں کو جو تھوڑا بہت احساس اتحاد مذاق کا ہوتا ہے اسکی بنا پر یہ انہیں اپنا امام بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ اسطرح کی تقلید روح فلسفہ کے بالکل منافی ہے۔ بات یہ ہے کہ ان دونوں نے اپنے زمانے کے حالات کی بنا پر قدیم خیالات اور قدیم تمدن کی جو مخالفت کی ہے وہ زمانۂ بلوغ کے ایک دائمی نفسی رجحان سے مطابقت رکھتی ہے اشپینگلر کا اثر بھی ان لوگوں پر اسکی سعیِ مردانہ کی تلقین سے اتنا نہیں ہوتا جتنا اسکی نفی اور انکار کے سبب۔ اسی طرح چونکہ اس نے اپنی تصویر کائنات کو رنگ روغن سے مکمل کر کے نظر فریب بنا لیا ہے۔ اس لیے نوجوان جنھیں دوسرے نظریوں سے واقفیت نہیں ہے اسی کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔

لیکن ان فلسفیوں کا ذکر کرنے سے پہلے، جنکی نوجوان تقلید کرتے ہیں ہمیں چاہیے کہ ہم خود نوجوانوں کے مثالی فلسفہ پر نظر ڈالیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا فلسفہ تجربی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ چند عام معانی کو لے لیتے ہیں جنکا مفہوم بھی انہیں معلوم نہیں ہوتا اور ان کی مدد سے جھٹ پٹ ایک خیالی عمارت تعمیر کر لیتے ہیں۔ اس لیے اکثر نوجوانوں کے انداز خیال کی بنیاد عقلیت پسندی پر ہوتی ہے۔ اسمیں اور ان کی نفس کی لاعقلیت، انکی جبلتوں کے انتشار، اُن کے جذبات کے تلون میں عجیب تناقض پایا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کی سیرت کی ترکیب ابھی تک مکمل نہیں ہوئی ہے اور ان کا فلسفہ ہنوز ان کی ذات کا جزو نامی نہیں بنا ہے۔ دوسری طرف ان کی نظر حسیات کی چمک دمک اور خارجی دنیا کی ظاہری نمود سے آزاد نہیں ہوئی ہے۔ جو چیز ظاہری [illegible] سے بھانپی جا سکے اُسی کو وہ شبہات سے بری اور وثوق کے قابل سمجھتے ہیں۔

چنانچہ ایک دوسرا تناقض یہ نظر آتا ہے کہ وہی نوجوان زندگی کی عملی تشکیل اور اخلاقی تنقید
میں انتہائی عین پسند ہوتے ہیں نظری پہلو سے مادیت پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ مگر اس مادیت کو بھی
(کارل مارکس کے ناسمجھ مریدوں کی طرح) ایک قسم کی عین پسندی بنا دیتے ہیں۔ جبکا جوش و
خروش ان کے نظری معتقدات کو جھٹلاتا ہے۔

مگر نوجوانوں کی مابعد الطبعیات کی ایک اور قسم بھی ہے جو سچی واردات قلبی پر مبنی
ہوتی ہے اور جسمیں منطقی ترتیب کم اور آپ بیتی کی تفسیر زیادہ ہوتی ہے۔ اکثر اسکی بنیاد عشق یا
شہوت جنسی کے بھید پر ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات موت حیات کے مسئلے، خدا اور کائنات
یا روح اور مادے کے باہمی تعلق پر بھی ہوتی ہے۔ یہ فلسفیانہ غور و فکر جسپر باطنیت کا رنگ
غالب ہوتا ہے نوجوان کی اصل نفسی کیفیت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ مگر اسکی حقیقت دیکھیے
تو وہی اظہار خودی ہے۔ ہمارا نوجوان جو فلسفے میں شاعری کرتا ہے اصل میں اپنی ذات کا عکس
کائنات کی گہرائیوں میں ڈالتا ہے اور اسے بہت کم یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کائنات
کی نسبت سے سمجھنے کے بجائے کائنات کو اپنی داخلی واردات کی روشنی میں دیکھتا ہے۔

غرض نوجوان کا فلسفیانہ نظریہ چاہے جو کچھ ہو ہر صورت میں اسکے انداز خیال کی
سہولت پسندی اور بے پروائی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کی مروجہ مصطلحات میں
سے نہایت پیچیدہ اور وسیع معانی مثلاً "قوت اور مادہ" "ارتقا" "واردات" "ذہن"
"مشاہدۂ ذات" کو بنے بنائے سکوں کی طرح لیکر اپنے "نظام" کے خزانے میں داخل کر لیتا ہے۔
یہاں بھی وہی حالت ہے جو موسیقی اور شاعری میں تھی۔ نوجوان کی تخلیق دوسروں کے سہارے
پر زیادہ اور اپنے بل بوتے پر کم ہوتی ہے۔ یہ بہت ہی کم ہوتا ہے کہ وہ کسی مسئلے پر گہری نظر
ڈال کر اپنے خیالات کی ایک جداگانہ عمارت کھڑی کر دے۔ اور جب ایسا ہو تو سمجھنا چاہیے کہ
اسمیں فلسفے کی سچی صلاحیت موجود ہے۔ عام طور پر تو نوجوان دوسروں کے خیالات

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ نوجوان تصورِ کائنات کے میدان میں جرأت کے ساتھ پہلا قدم رکھنے کے بعد ارتقائے نفسی کی اس منزل میں داخل ہوتے ہیں جہاں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں فلسفیانہ قابلیت موجود ہے۔ حالانکہ یہ محض دعوکا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں نوجوان عہدِ جدید کے اربابِ فکر مثلاً ڈیکارٹ، کانٹ، لاک، ہیوم کے اثر سے اپنے خیال کی ساری قوت نظریۂ علم کے مسائل میں کھپا دیتے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں انہیں اپنے پرانے مانے اُستاد کے خیالات میں کوئی کمزور پہلو مل جاتا ہے جسمیں خالص منطقی وسائل سے اصلاح ہوسکتی ہو ابتدا میں کسی بات میں معمولی سا اختلاف ہوتا ہے۔ پھر کوئی اور بات نکل آتی ہے یا اسی کا سلسلہ آگے چلتا ہے یہاں تک کہ انکی پہلی کتاب طیار ہوجاتی ہے۔ اور مدت کی آرزو کہ ' ایک بالکل نیا اور خاص اپنا " نظریۂ علم قائم کریں ' پوری ہوتی ہے۔ مگر ممکن ہے کہ یہ ظاہری فلسفیانہ استعداد اصل میں بالکل بیکار ہو۔ ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں کہ خردہ گیری اور تنقید کا مذاق کوئی بری چیز ہے فلسفہ میں بھی اور علوم کی طرح بغیر ہر جزو کی صحت کے کام نہیں چل سکتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ یہ نوجوان نظریۂ علم کی اصل اور اسکے مقصد ہی کو بالکل غلط سمجھے ہیں۔ نظریۂ علم اسطرح قائم نہیں کیا جاتا کہ ہم مجرد قوتِ ادراک سے جو ایک خالی برتن ہے کچھ اصول قائم کردیں۔ اور ان میں منطقی صحت کا خیال رکھیں بلکہ اسکے لیئے ضروری ہے کہ ہم علوم کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں اور اپنے زمانے کے ثبوتی علم پر پورا عبور رکھتے ہوں۔ یہ نظریہ محض بدیہی شعور سے نہیں بن جایا کرتا۔ پچھلے پچیس سال کے بیشمار " خانہ ساز " علمیاتی نظروں سے علمی دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ان میں گویا لوگوں نے الفاظ و معانی کے کھیل سے اپنا دل بہلانے کی کوشش کی ہے۔ انکے دلوں کی گہرائی میں فلسفیانہ مسئلے کا سچا احساس جسکے بغیر قوتِ تخلیق حاصل ہی نہیں ہوسکتی کبھی پیدا نہیں ہوا یا اگر ہوا تھا تو کبھی کا مٹ گیا۔ جب کوئی فلسفی کوئی علمیاتی نظریہ قائم کرتا ہے تو اسکا پہلا ہی تضیہ، جسے وہ دل کڑا کرکے بغیر ثبوت کے مانتا ہے اور جو ارشمیدس کے نقطے کی طرح اسکی ساری عمارت کی بنیاد ہے، ایک طرح کا عقیدہ ہے جسکی اصل مافوق الطبیعی بلکہ مذہبی ہے،

جدید نظریۂ علم نے مافوق الطبعیات کو منسوخ نہیں کیا ہے بلکہ سطح سے ہٹا کر ایک گہرے طبقے میں یعنی دل کی دنیا میں پہنچا دیا ہے جسکی حقیقی معرفت پہلے پہل مسیحی حکیم اغسطین مقدس کو حاصل ہوئی تھی۔

مختصر یہ ہے کہ نوجوان کے فلسفیانہ خیالات تقریباً ہمیشہ دور از کار ہوتے ہیں۔ یا تو یہ احساس زندگی کا مظہر ہوتے ہیں، یا نفسی کیفیات کی تصویر یا محض نمائشی زیور۔ اس خیال کی تصدیق نوجوانوں کے مناظروں کو دیکھنے سے ہوتی ہے جنکا موضوع (خواہ وہ کوئی خالص تکوین وجود کا نظریہ ہو یا کوئی عملی زندگی کا مسئلہ) ہمیشہ فلسفیانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے سب جانتے ہیں کہ نوجوان جب ان مسائل پر بحث شروع کرتے ہیں تو اُسکا سلسلہ گھنٹوں چلتا ہے اور آدھی رات کیا بلکہ صبح کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ یونان کے نوجوانوں کو ایسے مکالموں کا جو شوق تھا وہ محض قومی سیرت پر مبنی نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد شباب کی ایک عام خصوصیت ہے۔ ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ یہ مکالمے بہت جلد "مناظرے" کی شکل اختیار کر لیتے ہیں یعنی بحث کی بنا محض طلب حق کے جذبے پر نہیں رہتی بلکہ خطابت اور نبرد آزمائی کا پہلو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ بحث شروع کرتے وقت واقعی سنجیدگی کے ساتھ کسی اہم مسئلے مثلاً بقائے روح، یا عدل، یا فرض، کی تحقیق منظور ہو۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں بحث کرنے والوں کو غصہ آجاتا ہے۔ کوئی تو ضد کے سبب سے اپنے پہلے قول کے منطقی نتائج کی تائید پر اڑا رہتا ہے۔ حالانکہ خود اسکا علم اور عقیدہ اسکے خلاف ہے۔ کسی کو ہمیں لطف آتا ہے کہ اپنے حریف کو حکیہ دیکر پھانس لے خواہ اسمیں اپنی ذاتی صداقت پسندی کا خون ہوتا ہو۔ کوئی اپنے جذبات کو دلائل کے طور پر پیش کرتا ہے یا ذاتیات کی بحث چھیڑ دیتا ہے۔ رومی نسل کے لوگوں جرمنوں اور یہودیوں میں یہ باتیں مختلف رنگ میں اور مختلف حد تک نظر آتی ہیں لیکن مناظرانہ جنگ کا شوق تمام تعلیمیافتہ نوجوانوں کی مشترکہ خصوصیت معلوم ہوتی ہے اور اس لڑائی میں یہ لوگ ہر قسم کے ذہنی حربے خواہ وہ خالص منطقی ہوں یا نہ ہوں، استعمال کرتے ہیں۔ پختہ مغز

سامعین کے لیے یہ بحث تکلیف دہ بلکہ ناقابل برداشت ہوتی ہے اس لیے کہ جس مسئلے سے بحث شروع ہوئی تھی اسکے حل کرنے میں اس ساری تو تو میں میں سے کوئی مدد نہیں ملتی ۔ نوجوانوں کو جو فائدہ ہوتا ہے وہ سقراطی مکالموں کی طرح خود اس بحث سے نہیں ہوتا بلکہ اس اندرونی حرکت اور بےچینی سے ، جو اسکے بعد باقی رہتی ہے اور دوسرے دن یا کچھ دنوں کے بعد خاموشی سے اپنا اثر ڈالتی ہے۔

نوجوان جو سنجیدہ فلسفیانہ تعلیم یونیورسٹی میں حاصل کرتے ہیں انہیں بھی بعض مخصوص دقتیں اور پیچیدگیاں پیش آتی ہیں انہیں جب بےشمار متضاد اور متناقض خیالات سے سابقہ پڑتا ہے تو پہلے پہل یہ معلوم ہوتا ہے کہ دماغ بالکل منتشر ہوگیا ہے ۔ اور ذہنی نشو و نما کو فائدے کی جگہ نقصان پہنچ رہا ہے ۔ اس مصیبت کی حالت میں نوجوان حفاظت نفس کی لاشعوری نیت سے کسی ایک اُستاد کو منتخب کرتا ہے جسکی ذہنی دولت سے اسکی ذات کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید ہو اور اسی کا ہو رہتا ہے ۔ پھر وہ برسوں تک اُسی کے اثر میں رہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اُسکے طرزِ خیال کو اپنے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش کرلے ۔ بلکہ وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنی مزید حفاظت کی غرض سے دوسروں کے خیالات کو نفرت اور حقارت کے ساتھ دور کر دیتا ہے ۔ اُسے ذرا بھی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ ان کی قدر کا صحیح اندازہ کرے ۔ وہ ان سے دُور ہی رہتا ہے تاکہ شک و شبہ کے سمندر میں ڈوبنے سے بچے ۔ جو لوگ اس منظر کو باہر سے دیکھتے ہیں وہ اسے نوجوان کی نخوت سمجھتے ہیں ۔ لیکن اگر وہ اسپر گہری نفسیاتی نظر ڈالیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ نوجوان ایسا کرنے پر مجبور ہے ۔ اس پہلو تہی میں گویا ایک ذہنی حفاظت یا خود اختیاری کی جبلّت کارفرما ہے ۔ اسطرح ہمیں یہ عجیب تماشا نظر آتا ہے کہ عہدِ جدید کے آزاد فلسفہ اور تصور کائنات میں بھی تقلید پرستی کا دور دورہ ہے ۔ اس سے اس بارے میں اہم نتائج نکالے جا سکتے ہیں کہ زندگی اور تمدن میں فلسفہ کا کیا وظیفہ ہے ۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ہم فلسفہ اور نفسِ انسانی کے پوشیدہ تعلقات کو ایک شعوری اصول کی صورت میں لے آئیں گے تو

کو محض غرض امر کا پابند رکھے۔ تبھی اُسے خود اپنے نفس کی تشکیل اور تعمیر کی قوت حاصل ہو گی۔
علمِ تاریخ میں یہی صورت ہے اور فلسفہ میں اور بھی زیادہ۔ وقتاً فوقتاً نوجوانوں کی ایسی نسلیں بھی پیدا ہوتی ہیں جو سرے سے زندگی کو عقلی نظر سے دیکھنے ہی کی سخت مخالفت کرتی ہیں یہ لوگ جب اپنے بزرگوں کی زندگی پر عقلیت کا بیجا غلبہ دیکھتے ہیں تو وہ اس سے بیزار ہو جاتے ہیں اور ذہنی زندگی کے لیئے دوسری راہیں تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً باطنی وجدان، یا جمالیاتی انتقالِ احساس یا جبلّی اثبات زندگی یا غور و فکر سے خالی عمل، یہ صورت جو اکثر کبھی کبھی افراد میں بغیر کسی عام تحریک کے اثر کے بھی پیدا ہو جاتی ہے، نفسیاتی حیثیت سے مختلف معنی رکھتی ہے۔ اپنی بدترین شکل میں یہ محض ضد ہے یعنی اپنے عجز کو مخالفت کی صورت میں ظاہر کرنا۔ ایک شخص غور و فکر کی زحمت نہیں اٹھانا چاہتا اس لیئے وہ وجدان کی پناہ لیتا ہے جس سے وہ بزعم خود بلا واسطہ اشیا کی حقیقت معلوم کر لیتا ہے۔ ہمیں کوئی تخلیقی قوت نہیں۔ اس طرح کی علم دشمنی ایک تمدنی بیماری ہے۔ آجکل اس قسم کے خیالات پنپ نہیں سکتے اور کچھ دن کے بعد خود بخود مٹ جائیں گے۔

عقلیت کی مخالفت اگر علوم کی موجودہ حالت پر سنجیدگی اور دقتِ نظر کے ساتھ غور کرنے اور اسکے نقائص کو محسوس کرنے کے بعد پیدا ہو تو اسکی حیثیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اُسوقت دراصل نئی نسل کے دلمیں موضوع[1] اور سند[2] کا ایک نیا احساس نمودار ہوتا ہے۔ نفی اور اثبات کی کشمکش کے بعد علم ایک نئی صورت اختیار کرتا ہے جسمیں نہ صرف مباحث اور مسائل مختلف ہوتے ہیں بلکہ اندازِ خیال بھی دوسرا ہوتا ہے۔ ماکس ویبر، جس نے بعض باتوں کے لحاظ سے خود ایک نئی علمی راہ اختیار کی تھی، اپنے فاضلانہ خطبے "علم بہ حیثیت پیشہ" میں علوم

---

[1] موضوع ایک عملیاتی اصطلاح ہے جسکے معنی ہیں وہ چیز یا جسکا علم ہمیں قوتِ ادراک کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔
[2] سند بھی عملیات کی اصطلاح ہے اس سے مُراد ہے وہ چیز جسکی بدولت ہم اپنے علم کو صحیح اور قابلِ وثوق سمجھتے ہیں۔

ذہنی کو بھی مصطلحات اور ذرائع کی بحث تک محدود کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے علمی انقلاب کی کوشش کی جسکے متعلق آجکل خوب بحثیں ہو رہی ہے۔ اس قسم کے علمی انقلاب کی تہ میں ہمیشہ تصورِ کائنات کا اختلاف ہوتا ہے۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی کہ ماکس ویبر کی مخالفت سب سے زیادہ اسٹیفان گیورگے اور اُن کے پیرووں نے کی جو علوم میں ایک جمالیاتی مذہبی علم الاساطیر سے ملتی جلتی ، روح داخل کرنا چاہتے ہیں ، عام الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مجموعی احساس زندگی کے پیہم تقاضے سے ہمیشہ خالص ثبوتی علمی رجحان کی مخالفت ہوا کرتی ہے جو ہر چیز کو واقعات اور اُن کے باہمی علاقوں کی بیرنگ سطح پر لانا چاہتا ہے۔

علم کا وہ تصور جو موجودات کی اصل "زندہ صورتوں" کو سمجھتا ہے اور جسکی حمایت افلاطون ارسطو ، گوئٹے اور ہیگل نے کی ہے ہمیشہ اُس علم سے برسرِ پیکار رہتا ہے جو اشیا کو چھوٹے سے چھوٹے اجزا میں تقسیم کر کے اُن کے باہمی علاقوں کے قوانین دریافت کرتا ہے۔ جو علم زندہ صورتوں پر مبنی ہے اسکے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض یکطرفہ منطقی پہلو تک محدود نہیں ہے بلکہ اسمیں جمالیاتی اور مذہبی عنصر بھی شامل ہے۔ جب کبھی اس علم میں نئے سرے سے جان پڑتی ہے تو ہر طرف "ترکیب" اور "تکمیل" اور خیال کی "قوتِ تشکیل" کا چرچا ہوتا ہے۔

نوجوانوں کو ان چیزوں کا پورا شعور نہیں ہوتا بلکہ محض ایک دھندلا سا احساس اسکی سب سے واضح شکل وہ جبلّی وحشت ہے جو انہیں پرانے مسائل اور پرانے طریقوں سے ہوتی ہے۔ علم جو نئی صورت اختیار کرنے والا ہے اُسکا انہیں ابتدا میں سان گمان بھی نہیں ہوتا لیکن اگر ایک بلند تر نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو علوم مخصوصہ کا فلسفہ کی گود میں واپس آنا علم کے لئے ، جو تمدن کی کل میں ایک نامی جزو ہے ، نئی زندگی کا حکم رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ

شوق پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ خالص نظریۂ علم کا تقاضا جو کچھ بھی نفسیات کے نقطۂ نظر سے تو ذوقِ علم ذہنی زندگی کے کُل میں محض ایک جزوی وظیفے کی حیثیت رکھتا ہے۔ نہ صرف علوم مخصوصہ بلکہ فلسفہ بھی اصل میں زندگی کی واحد اور غیر منقسم گہرائی سے پیدا ہوتا ہے۔

مگر آخر وہ کون سی حقیقت ہے جو فلسفہ اور علوم مخصوصہ کے تغیر پذیر نظریوں کے پردے میں پوشیدہ ہے اور جسکا دریافت کرنا نفسیات شباب کا سب سے اہم فرض ہے۔؟

ہم پہلے کہہ چکے ہیں: ان سارے سطحی تغیرات کا سرچشمہ نئی واردات قلب ہے یعنی اپنی ذات کا اور کائنات کا نیا احساس۔ ہمیں بڑے بڑے مسائل پوشیدہ ہیں خواہ ہم انہیں الفاظ و معانی میں ظاہر کر سکیں یا نہ کر سکیں۔ نوجوان کے دلمیں زندگی کا عظیم الشان معمہ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور جدت کے سبب سے یہ خلش اور گہری ہوتی ہے۔ زندگی سے خود نت نئے مافوق الطبعی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہمیں ابھی تک بہت سی نقیضیں ہیں جو دُور نہیں ہوتیں اور جنکا پہلو بہ پہلو رہنا ناممکن ہے۔ مگر مبدار فیاض نے خود ہمارے اندران مشکلات کا ایک عارضی حل پیدا کر دیا ہے جو اسکی ایک اور بڑی ودیعت یعنی جبلّت سے مشابہ ہے۔ اسکا نام ہے داخلی احساس زندگی۔ یہ مجموعی احساس حیات ایک طرح کا سربستہ فلسفہ ہے جو نوجوانوں بلکہ سب سادہ دلوں کے فلسفیانہ نظریوں کی جڑ ہے۔ یہ نظریے مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں مگر اصل میں یہ سب عملی رجحانات ہیں جو ہنوز قوت سے فعل میں نہیں آئے۔ مثلاً رجائیت اور قنوطیت، جمالیاتی جذبات پرستی اور ذوقِ عمل، رہبانیت اور دنیا طلبی وغیرہ۔ نوجوانی میں احساس شخصیت کی یہ مجموعی کیفیات بہت سے رنگ بدلتی ہیں آہستہ آہستہ بہت دن میں جا کر ان کی مخصوص ترکیب نفسی وضاحت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ فلسفیانہ غور و فکر محض ایک ذریعہ ہے اُس جستجوئے نفس اور تشکیل نفس کا۔ نوجوانوں کو یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ اُن کے فلسفیانہ خیالات خارجی حقیقت پر مبنی ہیں پھر بھی وہ انہیں

ہے۔ نوجوان احساس ذات کے نقطے کو ذہنی دنیا کا مرکز سمجھ لیتے ہیں۔ مگر پختہ کارانہ فلسفہ کا آغاز اُسوقت ہوتا ہے جب انسان اپنے نفس کو مغلوب کر چکا ہو اور اپنی ذات کو بھی زندگی کے عظیم الشان قانون کی محض ایک خاص شکل سمجھنے لگا ہو۔ یہ ایک دور و دراز اور دشوار گزار راہ ہے تاہم نوجوانوں کے بھولے خود ساختہ فلسفیانہ نظریے اسی راہ کے ابتدائی مراحل ہیں۔

اس لیے کہ اُن میں دو چیزیں ایسی ہیں جنکی نبوتی اہمیت میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا نوجوانوں کے تصور کائنات میں اُس نفسی اور ذہنی کیفیت کی پہلی جھلک نظر آتی ہے جو آئندہ نسل میں رونما ہوگی۔ اس اعتبار سے نوجوانوں کے ابتدائی فلسفیانہ خیالات آنے والے دور کا پیش خیمہ ہیں۔ جسمیں زندگی کے گہرے لاشعوری سرچشمے کی آبیاری سے ایک نیا تصور کائنات پیدا ہوگا اور ایک نیا انسان۔ جب تک فلسفے کی بنیاد حکمت الٰہی پر نہیں بلکہ عقل انسانی پر ہے۔ اُسوقت تک خواہ نفس امر پر زور دینے کی کتنی ہی کوشش کی جائے، ادراک و عمل کا ہر نظریہ انسان کی داخلی سیرت کے سانچہ میں ڈھل جائیگا۔

دوسری چیز اس سے بھی زیادہ گہری ہے۔ نفس انسانی کا جو نقطہ تصور کائنات کا مرکز ہے وہی معرفت الٰہی کا سرچشمہ بھی ہے۔ فلسفہ کے حقائق و معارف اصل مذہب تو نہیں لیکن مذہب کی داخلی بنیاد ضرور ہیں۔ نظام عالم کے مقصد و منشا کا احساس، خواہ وہ ہمارا دائمی سرمایۂ حیات ہو یا کبھی کبھی تجلی کی طرح چمک کر ساری کائنات کا بھید ہم پر کھولے، مذہبی واردات کی جڑ ہے۔ اور چونکہ یہی احساس مافوق الطبعیات کا سرچشمہ بھی ہے۔ اس لیے مافوق الطبعیات بھی مذہب ہی پر مبنی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے ذہن میں دو تصور کائنات ہوں ایک مذہبی اور ایک علمی۔ بلکہ جب کبھی علم آخری اور یقینی نتائج تک پہنچتا ہے تو مذہبی وجدان سے علمی تفکر اور علمی تفکر سے مذہبی وجدان پیدا ہوتا ہے۔ وہی ایک چیز ہے، جسمیں اگر ایک عنصر غالب ہے تو مذہب کہلاتی اور اگر دوسرا غالب ہے تو مافوق الطبعیات۔ کوئی مذہب ایسا نہیں جسمیں مافوق الطبعی اجزا نہ ہوں کوئی مافوق الطبعیات ایسی نہیں جسمیں مذہبی اور اساطیری

عنصر نہ ہو۔ ممکن ہے کہ تنقیدی نظر سے دیکھنے والے ایک کے حدود کو دوسرے سے الگ کرنا چاہیں
نتیجہ مشتبہ ہے۔ لیکن نفسیات کے نقطۂ نظر سے یہ ثابت ہے کہ دونوں ذہنی رجحانات میں
چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خصوصاً نفسیات ارتقا میں تصور کائنات کی بحث اُس وقت تک نامکمل
ہے جب تک اسکی مذہبی بنیاد نہ معلوم کرلی جائے۔

نوجوانوں کی مذہبی نشوونما

فلسفۂ مذہب کی بحث میں یہ عجیب مشکل ہی کہ جس چیز کی تلاش اور تحقیقات کی جارہی ہے یعنی مذہب کی ماہیت کا تعین یا اسکی تعریف اُسے معلوم کیئے بغیر بحث کی ابتدا ہی نہیں ہو سکتی اس لیئے کہ بغیر تعریف کے موضوع بحث کی حدبندی ناممکن ہے۔ مذہب کی تعریف میں محض استقراسے یعنی سارے تاریخی مذاہب کا مقابلہ کرکے ان کا اوسط نکالنے سے کام نہیں چلتا بلکہ اسکی ضرورت ہے کہ عقلی اصول اور تجربات دونوں کی مدد سے یہ دیکھا جائے کہ مذہب کی خالص اور سچی ماہیت کیا ہے۔ فلسفۂ مذہب کا کام اُس ازلی ترکیبی قانون کو معلوم کرنا ہے جو مذہب کو (داخلی رجحان کی حیثیت سے اور خارجی تمدنی مظہر کی حیثیت سے) مذہب بناتا ہے۔ مذہب کی اصلی تعریف محض بیانی نہیں بلکہ معیاری ہوگی۔ یعنی صرف یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ مذہب کیا ہے بلکہ یہ طے کرنا پڑیگا کہ مذہب کیا ہونا چاہیئے۔

ان سب چیزوں کو الگ کر دینے کے بعد جو دوسرے ذہنی شعبوں سے ماخوذ ہیں اور مذہب میں محض اصل حقیقت کے علامات و مظاہر کی حیثیت رکھتی ہیں ایک اور بنیادی فلسفیانہ سوال باقی رہتا ہے کہ آیا اصل مذہب کا موضوع، یا تو مدرک کی نسبت سے، کوئی علیحدہ زمان و مکان کے ماوراء وجود ہے یا مذہبی رجحان کائنات کے آخری اور مجموعی منشا کی جستجو میں انہیں معمولی جانی بوجھی چیزوں کی آخری تہ کو ٹٹولنا ہے۔ ان دونوں عقیدوں میں دو باتیں مشترک ہیں ایک تو یہ کہ مذہب کے معاملے میں مدرک کو ایک مافوق الافراد خارجی نظام منشا سے سابقہ پڑتا ہے

جسے دیکھ کر وہ یا تو سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے یا جنگ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب "ذات الٰہی" کی معرفت ساری روح پر چھا جاتی ہے تو وہ اُسے کامل سعادت یا "نجات" بخشتی ہے اور اُسکے منقسم منشائے زندگی کو ایک مجموعی اور مکمل منشائے کائنات کے احساس میں محو کر دیتی ہے۔ ع

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

غرض مذہب کا مقصد ہر صورت میں یہ ہوتا ہے کہ مجموعی منشار تک رسائی ہو۔ مذہب اس کوشش کا نام ہے کہ ہماری روح سطحی منشار کے حدود سے گزر کر زندگی کے با منشار اجزا اور عناصر کو متحد کرے اور ایک جامع نظام منشار ترتیب دے خواہ اسکا مواد اس دنیا میں (یعنی واقعی زندگی کے تعلقات میں) حاصل ہو، یا دوسری دنیا میں (یعنی ترک تعلق میں) لیکن اِن مسائل سے بحث کرنا نفسیات کا کام نہیں ہے۔ ہمیں شک نہیں کہ نفسیات مذہب کا صحیح مفہوم معین کرنا چاہیئے ورنہ کس بنا پر فیصلہ کیا جائیگا کہ فلاں نفسی مظہر مذہب میں داخل ہے۔ لیکن اُسکا رویہ اس معاملے میں بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ وہ تو محض چند داخلی احساسات کو چُن لیتی ہے۔ اور انہیں مذہبیت کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ وہ اسپر مجبور ہے کہ مذہب کے معنی کو حتی الامکان وسعت دے تاکہ اس دائرے میں مذہب سے پہلے کے مدارج اور اسکی غیر ترقی یافتہ حالتیں، مخلوط کیفیتیں اور بگڑی ہوئی صورتیں بھی آجائیں۔ یہ سوال کہ فلاں مذہب کس حد تک بلند یا خالص، یا سچا یا قابلِ قبول ہے فلسفۂ مذہب کے اصولی حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ نفسیات کا تو یہ مقصد ہے کہ گذشتہ نفسی کیفیات کی یاد کو تازہ کرے اور انہیں وضاحت سے بیان کرے۔ اُنہیں سمجھے اور سمجھائے۔ اس لیئے وہ کھوٹے، کھرے اور بیمار، تندرست میں ابتدا ہی سے فرق نہیں کر سکتی بلکہ نفسی زندگی کو جس پیچیدگی اور الجھاؤ کی حالت میں پائے اُسی حالت میں اسکا مشاہدہ کرنے پر مجبور ہے

ہم پہلے باب میں کہہ چکے ہیں کہ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے پوری طرح الگ

نہیں کئے جا سکتے لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ دونوں میں سے ایک پر زور دیا جائے ۔ نفسیات ارتقا میں ناگزیر طور پر زور بیانی اور نہامی طریقے پر ہوتا ہے ۔

نفسیات مذہب کو ایک اور پہلو سے بھی آزادی حاصل ہونا چاہیے ۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو اُس تاریخی اور خارجی مذہب تک محدود نہیں کر سکتی جو کسی تمدنی ماحول میں رائج ہے اور جتنے لوگ اسمیں رہتے ہیں سب کے بے چون وچرا سر تسلیم خم کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے وہ اِس معاملے میں اسوجہ سے اور معذور ہے کہ خود مذہب کے تاریخی ارتقا نے اختلاف مذاہب پیدا کر دیا ہے اور اب بہت سے مذہبی نظام پہلو بہ پہلو موجود ہیں جنمیں سے ہر ایک دین مطلق ہونے کا مدعی ہے ۔ اسی صورت حال کی بنا پر علمی تحقیقات کو " مذہبی واردات کی گوناگونی " کی طرف توجہ ہوئی جسمیں صرف یہی پہلو نہ تھا کہ مختلف مذاہب میں سچی مذہبی روح مختلف حد تک پائی جاتی ہے بلکہ یہ بھی تھا کہ ہر مذہب میں یہ روح اُسکے مخصوص تاریخی ارتقا کی بدولت ایک جداگانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے اور اپنے ماحول کے عام ذہنی نشوو نما کی پابند ہوتی ہے ۔ اسیطرح تاریخ مذہب کو سمجھنے کے لیئے بھی محض " نفسیات عقیدت " کا مطالعہ کافی نہیں بلکہ یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ مذہب کی تعمیر کا خارجی قانون کیا ہے اور خارجی مذہب اور اسکے عقائد و رسوم کا رد عمل نفس کے ادراک و احساس پر کیا ہوتا ہے ۔ اس لیئے ہماری نفسیات ارتقا بھی اسپر قناعت نہیں کر سکتی کہ ہمارے تمدنی حلقوں میں جو مذہبی فرقے یا کلیسا موجود ہیں انہیں کو پیش نظر رکھے بلکہ وہ اپنے زاویۂ نگاہ کو اس حد تک وسعت دینے پر مجبور ہے کہ اسکے اندر وہ مذاہب بھی آجائیں جو ہمارے مسلمہ عقائد اور ہمارے کلیسا سے مختلف ہیں ۔ یعنی شاہراہ ترقی پر ہم سے آگے یا ہم سے پیچھے ہیں ۔

ان باتوں پر غور کرنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ہر وہ احساس منتشر یا تخلیق منتشر کا عمل مذہبی حیثیت رکھتا ہے جسمیں قطعیت کا رنگ پایا جائے خواہ وہ خارجی

مذہب سے واسطہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو ۔ قطعیت سے ، لوگ جسارت سے کام لیکر

مطلقیت بھی کہہ دیتے ہیں۔ ہماری مراد یہ ہے کہ مذہبی واردات کے ذریعہ سے مدرک کو اپنی زندگی اور کائنات کے انتہائی اور اعلیٰ منشار کا احساس ہوتا ہے۔ اسکا فیصلہ، کہ جو انتہائی اور اعلیٰ منشا سمجھا جاتا ہے وہ واقعی ایسا ہے بھی یا نہیں، نفسیات کے امکان سے باہر ہے اُسکے لئے ایسی جرارت نہ کرنے کے لیئے یہی ایک بات کافی ہے کہ ایک ہی شخص اپنی زندگی میں کبھی کسی کو چیز کو قطعی سمجھتا ہے کبھی کسی چیز کو۔ اسطرح کے تغیرات سے ہمیں بحث نہیں ہماری اصطلاح میں ہر وہ احساس قطعی ہے جو زندگی کے کسی ایک شعبہ سے داخلی تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ کل داخلی زندگی اور خارجی نظام عالم کو اُس قدر کی روشنی میں دیکھتا ہو جو اُسوقت مدرک کے نزدیک اعلیٰ قدر ہے۔

اس مخصوص اور بظاہر معیّن رابطے کے، جو مدرک میں اور عالم خارجی کے اعلیٰ اور کلی منشار میں پایا جاتا ہے، دو پہلو ہوتے ہیں۔ اس رابطہ میں ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات کی انتہائی قدر میرے لیئے کیا ہے اور دوسری طرف یہ کہ میری انتہائی قدر کائنات کے لئے کیا ہے۔ شلائرماخر اس بات کو اپنے خاص انداز میں یوں کہتا کہ ہمیں کائنات کا مجموعی عمل میری ذات پر اور میرا (رد) عمل کائنات[1] پر نظر آتا ہے۔ کائنات کے اندر اپنی ذات کی اعلیٰ قدر کا احساس جو مجھے ہو مذہب کا اخلاقی پہلو ہے۔ کوئی اخلاقی نظریہ ایسا نہیں ہو جو خارجی نظام کائنات کے منشار کی تفسیر سے بالکل بے تعلق ہو۔ کائنات کے انتہائی منشار کا احساس جو مجھے اپنی ذات کی نسبت سے ہو مذہب کا مافوق الطبیعی پہلو ہے۔ کوئی مذہبی عقیدہ ایسا نہیں جسکا اثر فرد کے اصول اخلاق پر نہ پڑتا ہو۔ قدر کائنات کے احساس یا اپنی ذاتی قدر کے احساس کے ساتھ ہمیں اُن فرائض کا بھی احساس ہوتا ہے جو نظام کی کائنات کی طرف سے ہماری ذات پر عائد ہوتے ہیں اور ان توقعات کا بھی جو ہم نظام کائنات سے رکھتے ہیں

---

[1] اس بات کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ کائنات اور دنیا خود مذہبی معانی ہیں جن کی نسبت کانٹ سے لیکر آج تک سب کہتے آئے ہیں کہ اگر خالص عقلی معانی کے ذریعے ان کا ادراک کرنے کی کوشش کیجائے تو عجب تناقض پیدا ہوتا ہے۔

زندگی کے مجموعی نظام میں بعض ایسی ہوتی ہیں جو اپنی ماہیت کے لحاظ سے ظہور مختار (یعنی مذہبی واردات) کے مرکز سے قریب ہوتی ہیں۔ ہم ان مافوق الطبیعی مواقع کا ذکر کر چکے ہیں یہ احساس کہ دنیا کی ہر چیز فانی ہے، بڑی سے بڑی قوتیں محدود ہیں یا دنیا کے حوادث اور خود اپنی زندگی کی رفتار اُس نصب العین سے مطابقت نہیں رکھتی جو دل کی گہرائی میں موجود ہے انسان کو براہِ راست مذہب کی سرحد میں پہنچا دیتا ہے۔ علی ہٰذالقیاس سچی اور گہری محبت زندگی کے کسی بڑے مقصد کے لیے سعی پیہم، اور وہ حقیقی مسرت جو فطرت کی عظمت اور حسن کے نظارے سے پیدا ہوتی ہے مذہبی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ہر وہ درد و الم جو انتہائی نجات بخش سعادت نہ حاصل ہونے سے محسوس ہو مذہبی حیثیت سے اتنا ہی اہم ہے جتنا عرفان الٰہی کا پُرسکون احساس یا کائنات کے مجموعی منشا سے مطابق ہونے کا روحانی اطمینان۔ اس نقطۂ نظر سے اصولاً ہر شعبۂ زندگی میں مذہبی احساس کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے۔ اعلیٰ دینی واردات سے لیکر ادنی چیزوں مثلاً بے جان فطرت کے نظارے یا عارضی سے عارضی احساس تک کوئی چیز ایسی نہیں جو مذہب سے بالکل بے تعلق ہو۔ بلکہ یہ ایک اہم نفسیاتی حقیقت ہے کہ بنیادی قدروں میں سے ہر قدر مدرک کی مخصوص ترکیب نفسی کے لحاظ سے مذہبی دائرہ احساس میں داخل ہو سکتی ہے۔ "جہاں تمہارا خزانہ ہے وہیں تمہارا دل ہے۔" کسی شخص کی روحانی سعادت کا مرکز اُسکا پیشہ ہو سکتا ہے بلکہ مال و دولت بھی۔ کسی کو جمالیاتی مشاہدے اور جمالیاتی تخلیق میں انتہائی ذوق و شوق کے لمحے نصیب ہو سکتے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو علم کی جستجو میں محو کر سکتا ہے اور دنیا کی ریاضی ترتیب کے نظریے کو مذہبی عقیدت کی حد تک پہنچا سکتا ہے۔ کوئی ملک اور قوم کو انتہائی قدر سمجھ کر اپنے دل میں جگہ دے سکتا ہے اور انہیں خدا کو پا سکتا ہے۔ نفسیات کے نقطۂ نظر سے یہ سب کچھ ممکن ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی اور شخص خالص اور اعلیٰ مذہب و اخلاق کی بلندی سے ان مذہبی مثالوں پر تنقیدی نظر ڈالے اور ان کے مدارج مقرر کرے۔ مسیح نے خود فرمایا ہے "میرے باپ کے محل میں بہت

سے گھر ہیں"۔

اب ہم مذہبیت کو فرد کی نفسیات ارتقا کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ فرد کے بنیادی احساس میں جو ایک خلقی رکی حیثیت سے مزید تحلیل کا بار نہیں اٹھا سکتا، مذہبیت کی جڑیں موجود ہیں۔ خود احساس زندگی میں جمعیت یا انتشار، سعادت یا محرومی، ذاتِ الٰہی سے قرب یا بُعد، معرفت یا جستجو، کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ لیکن اگر یہ احساس محض داخلی پہلو تک محدود رہیگا، تو مذہبیت دُھندلے اور تاریک جذبات سے آگے نہیں بڑھے گی تاوقتیکہ ارتقا پذیر نفس کے پیش نظر ابتدا ہی سے کوئی مکمل مذہب نہ ہو جو زمان و مکان کے حدود سے نکل کر ذات ایزدی کا سچّا عرفان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ذہن خارجی کا یہ عنصر، یعنی قدیم تاریخی مذہب، بہت سے علامات و مظاہر سے مرکب ہوتا ہے جو دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے ماخوذ ہیں۔ اسمیں علمی نظریے ہوتے ہیں جنمیں ایک حد تک استدلال سے کام لیا جاتا ہے، جمالیاتی علامات ہوتی ہیں جو تخیّل کی مدد سے مافوق الادراک وجود کی جھلک دکھانا چاہتی ہیں اور عبادت کے رسوم و آداب ہوتے ہیں جو انسانی اجتماعی زندگی سے مستعار لیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان چیزوں میں (ذات الٰہی کی نسبت سے) "تقدس" اور مطلقیت کا جلوہ پیدا ہو جاتا ہے جو ان بکھرے ہوئے اجزا کی شیرازہ بندی کرتا ہے اور انہیں عالم ارضی کی قیود سے آزاد کر دیتا ہے۔ یہی چیز ہے جو مذہب میں اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں مابہ الامتیاز ہے۔

جب کسی شخص کے دلمیں مذہبیت کا رجحان بیدار ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اسی خارجی مذہب کے روحانی ماحول میں پاتا ہے۔ اسی سے اسکو سابقہ رہتا ہے خواہ وہ اس سے کچھ لے یا اُسے کچھ دے اسکی تائید کرے یا تردید کرے۔ زیادہ اثر اسکے قریبی ماحول کا پڑتا ہے مثلاً گھر کا، گاؤں کا مدرسے کا یعنی اُس حلقے کا جسمیں وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ غرض مذہبی نشو و نما ہمیشہ اُن ذہنی اثرات کے ماتحت ہوتی ہے جو پہلے سے موجود ہیں۔ ہمارے تمدنی

حلقوں میں مذہب کی قدیم روایات اور جدید تشکیل پر مسیحیت کی حکومت ہے۔ جہانتک ایک واحد، پاک اور برتر خدا پر ایمان لانے کا تعلق ہے یہ مذہب تغیرات سے بری ہے۔ لیکن اسکی مخصوص صورتیں ہر زمانے کے حالات، طرز خیال اور طرز ادا کی پابند ہیں۔ چنانچہ واقعی حیثیت سے دیکھیئے تو مسیحیت کسی ایک چیز کا نام نہیں بلکہ اسمیں خارجی مذہب اور اسکے داخلی احساس کی وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو مغربی ممالک میں (صدیوں سے) ظاہر ہو رہی ہیں کوئی شخص اِن ذہنی قوتوں سے، جو پہلے سے موجود ہیں، بالکل بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ ان کی مخالفت بھی کرتا ہے تو اسکے ثبوتی عقائد اس نفی سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں اس بات کو مدنظر رکھنا نفسیاتی پہلو سے بہت اہم ہے کہ مذہبی واردات قلب کے اظہار کے لیے جتنے طرز ادا اختیار کیے جاتے ہیں وہ سب اس کا کما حقہٗ اظہار کرنے میں تین باتوں کے لحاظ سے قاصر رہتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مذہبی واردات کی پوری تشریح نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ ایک ہی علامت مختلف قسم کے واردات کو ظاہر کر سکتی ہے۔ اور تیسرے یہ کہ بعض دفعہ ایک ہی قسم کے واردات مختلف زمانوں کے ذہنی حالات کے اثر سے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مذہبی واردات اور اسکے طرز ادا میں جو فرق ہوتا ہے اسکی تحلیل بہت مشکل ہے کیونکہ خود نفسیات مذہب میں یہ نقص موجود ہے کہ اُسے ناکافی معانی سے کام لینا پڑتا ہے ہم الفاظ کے ذریعے خود اپنے مذہبی احساس کے اصل مرکز تک نہیں پہنچ سکتے تو بھلا دوسرے خصوصاً ان افراد اور جماعتوں کی مذہبیت کی تحلیل جنکی ترکیب ہم سے بہت مختلف ہی کیونکر کر سکتے ہیں۔

مسئلے کی نوعیت پر نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں اپنی بحث کی ترتیب حسب ذیل رکھنا چاہیئے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دکھانا چاہیئے کہ نوجوان کے مذہبی ارتقاء کو مسیحیت سے کیا تعلق ہے کیونکہ یہی ایک خارجی تاریخی مذہب ہے جو اُسکے قریب کے یا دُور کے ماحول میں پایا جاتا ہے۔ ہم اِسے تنگ معنوں میں مذہبیت کی ارتقا کہتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ہمیں ان مذہبی واردات کی ارتقا کا بھی ذکر کرنا چاہیئے جو مسیحیت کے خارجی (تمدنی) پہلو سے کوئی تعلق

نہیں رکھتے۔ یہ وسیع معنوں میں مذہبی واردات بہت سے شعبہ ہائے زندگی کے واردات کی تہ میں ہوتے ہیں۔ ان کے اثر سے انسان کبھی ان جزدی مظاہرِ حیات کی قدر کو تسلیم کرتا ہے اور کبھی اسکی نفی کرتا ہے، نفی کی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اُس نقطۂ وحدت کی طرف رجوع کرے جہاں زندگی سالم اور غیر منقسم ہوتی ہے، وہ تمام اختلافات سے قطع نظر کر کے اُس اعلےٰ قدر پر زور دے جو تمام قدور کے دُور و دراز نقطۂ اتصال[1] پر واقع ہے۔

ہر شعبۂ زندگی کی سطح کے نیچے منشائے الٰہی کا جلوہ دیکھنا اور اسمیں محو ہو جانا باطنیت (یا تصوف) کہلاتا ہے۔ مسیحیت کی تاریخ میں بھی ہمیں یہ چیز نظر آتی ہے۔ اسکا ابتدائی رجحان ہے کہ روح انسانی اور ذات ایزدی کے درمیان تاریخ اور زندگی کے مختلف ادارات کی بدولت جو حجاب حائل ہو گئے ہیں انہیں دور کر دے۔ اگر وہ ان قدور زندگی کی نفی کر کے اُن سے دور بھاگے یا اُن کے قریب سے دامن کشاں گزر جائے تو لاہوتی تصوف ہے۔ لیکن اگر ان قدور کو مظاہر حقیقت سمجھ کر ان سے ربط ضبط پیدا کرے تو ناسوتی تصوف ہے۔ چونکہ یہ مؤخر الذکر تصوف اندرونی دنیاوی زندگی سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے اس لئے ہم اسے "دنیاوی مذہبیت" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسکی سرحد "تصور کائنات" سے ملتی ہے جسکی نفسیاتی تحلیل پچھلے باب میں کی جا چکی ہے۔ اکثر یہ تصوف اپنے خاص انداز میں علم کا معنوی لباس پہن لیتا ہے اور فلسفے سے مشابہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جمالیاتی طرزِ اد اختیار کرے یا اقتصادی، سیاسی، یا سماجی رنگ میں عملی اخلاقی زندگی کی تشکیل کرے۔

تاریخی مسیحیت میں اور ہمارے ملک کی ان مذہبی جماعتوں میں جو اُس سے الگ ہو کر خدا شناسی کی الگ راہیں نکالتے ہیں جو نسبت ہے اُسے واضح کرنے کے لیے ہم استعارے میں

---

[1] مصنف کا خیال ہے کہ علم، ذوقِ جمال، انسانی محبت غرض تمام قدور اپنے نقطہ کمال پر پہنچ کر ایک ہو جاتے

یوں کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی مذہب زرِ مسکوک ہے اور دوسرے مذاہب زرِ خام ہیں۔ سونے کا
سکہ ایک معینہ صورت رکھتا ہے جو آسانی سے مٹ نہیں سکتی۔ لیکن وہ اکثر گھس جاتا ہے، اور
اسکی وضع پُرانی اور غیر مانوس ہو جاتی ہے۔ زرِ خام بھی اسوقت تک رواج نہیں پا سکتا اور
جمالیاتی قدر حاصل نہیں کر سکتا جب تک اُس پر کوئی ٹھپہ نہ لگے لیکن یہ ٹھپہ نیا ہوتا ہے یا کم سے
کم نیا معلوم ہوتا ہے۔ یہ مذاہب اسی لیئے مقبول ہیں کہ وہ نئے ہیں اور ان میں ہر فرد کو اپنی
شخصیت کی نشو و نما کے لیئے میدان مل جاتا ہے۔

اس باب میں ہم اس سے بحث کریں گے کہ نوجوانوں کو مسیحیت سے کیا تعلق
ہے۔ لیکن چونکہ خود مسیحی مذہب میں یا کم سے کم پروٹسٹنٹ فرقہ میں بہت سے اندرونی اختلافات
ہیں اور خارجی حیثیت سے کسی گروہ پر مذہبی اثر کم ہے کسی پر زیادہ۔ اس لیئے اصل میں ہمیں چاہیئے
تھا کہ ہر مذہبی عقیدے اور ہر سماجی طبقے کے نوجوانوں کا ذکر الگ الگ کرتے۔ جزوی تقسیم کے
طول امل سے بچنے کے لیئے ہم "مذہبی ماحول" کا جو خاکہ کھینچیں گے ہمیں حتی الامکان محض
وہ عام باتیں دکھائیں گے جو سب میں مشترک ہوں۔ ہمارے یہاں کی ترتیب حسب ذیل
ہوگی:-

۱- نوجوانوں کی مذہبی نشو و نما ہلکے مذہبی ماحول میں۔

۲- " " " گہرے مذہبی ماحول میں۔

۳- " " " ایسے ماحول میں جو مذہب یا کم سے کم مسیحی مذہب کی
طرف سے بے پروا یا اسکا مخالف ہو۔

خارجی ذہنی اثرات کے مجموعے یعنی ماحول سے ہم عموماً سماجی طبقہ، گھر اور مدرسہ
مُراد لیں گے۔ پہلی قسم کا مذہبی ماحول زیادہ تر جدید پروٹسٹنٹ مذہب خصوصاً شمالی جرمنی
کے آزاد خیال پروٹسٹنٹ اور کیتھولک عقائد اور صوفیانہ اور میتھوڈسٹ جذبات پرستی
تیسری قسم میں ہم ان سب حلقوں کو داخل کرتے ہیں جو اٹھارویں صدی کی عقلیت اور

اسکے ضمیمے یعنی ثنویت کے اثر سے محض دنیاوی امور سے دلچسپی رکھتے ہیں اور جنکا رجحان اکثر علمی ہوتا ہے جسپر سائنس کا رنگ غالب ہے۔

(۱)

روسو کے زمانہ سے لیکر آج تک لوگوں کے دل سے یہ شبہ نہیں مٹتا ہے کہ آیا بچے میں مذہبی احساس ہوتا ہے یا اسکا یہ رجحان پہلے پہل بلوغ کے دنوں میں ابھرتا ہے۔ مگر اتنا یقینی ہے کہ بچوں میں مذہبی زندگی ہمیشہ زبردستی ہی نہیں پیدا کی جاتی بلکہ کبھی کبھی خود بخود جبلّی طور پر بھی پیدا ہوتی ہے۔ البتہ اسکے ظاہر کرنے کے طریقے میں بچے بڑوں کی تقلید کرتے ہیں اور انکے مذہبی احساسات دوسری چیزوں میں ملے جلے ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی ذہنی زندگی میں ابھی تک اتنی تفریق اور تقسیم نہیں ہوتی جتنی بڑوں کے یہاں ہوتی ہے۔ اگر ہم بیرونی اثرات سے قطع نظر کرکے اُس مذہبیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں جو بچے کی ترکیب نفسی سے مطابقت رکھتی ہے تو ہم مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں۔

ا۔ بچے کا مذہبی رجحان بھی اسکے عام انداز طبیعت کی طرح خود پسندی پر مبنی ہے وہ جو کچھ تھوڑا بہت دیکھتا ہے اپنے چھوٹے سے نفس کی نسبت سے دیکھتا ہے۔ وہ واقعات وحوادث کے کسی بڑے نظام کا ادراک نہیں کرسکتا کیونکہ اسکی زندگی کے لمحے غیر مربوط ہوتے ہیں اور ان میں سے ہم صرف انہیں مذہبی قرار دے سکتے ہیں جنمیں احساس کا رنگ بہت غالب ہو۔ یہاں بھی، اُسیطرح جیسے کہانیوں میں خوف اور مسرت کے جذبات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ بچے کے مذہب کی بنیاد طمع ہے یا بعض صورتوں میں شکرگزاری کا یا خوف کا جذبہ اس موخرالذکر محرک سے نہ ہم چشم پوشی کرسکتے ہیں اور نہ اسکی کوئی تاویل کرسکتے ہیں۔

میسر نے اپنی کتاب میں جو اصل میں اسکی سوانحعمری ہے صاف صاف کہا ہے:

"سچ پوچھیے تو مجھے مذہب میں اپنی سلامتی کی تلاشں تھی۔ میرا بچپن کا مذہب دراصل خوف کا مذہب تھا۔"

۲۔ بچے کے مذہبی تصورات ہر چیز پر انسانی رنگ چڑھا دیتے ہیں۔ جو نیک و بد قوتیں دنیا پر حکومت کرتی ہیں ان کا تخیل بچے اپنے بڑوں میں اچھے اور بُرے لوگوں کو دیکھ کر انھیں کے نمونے پر قائم کرتے ہیں۔ بچے کے ابتدائی مذہبی خیالات پر اپنے باپ کی سیرت کا یا اس برتاؤ کا جو وہ بچے کے ساتھ کرتا ہے بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ باپ کی قوت بچے کو غیر محدود نظر آتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ خدا بھی بس اتنا ہی قوی اور قادر ہے (اس سے یہ نتیجہ نکالنا محض سطحیت پر مبنی ہے کہ یہی باپ کا رعب دل میں راسخ ہو کر مذہب بنجاتا ہے)

۳۔ دنیا کے واقعات بچّے کی نظر میں اِن نیک و بد قوتوں کے اثرات ہیں جو اسکی ذات پر پڑتے ہیں اور ان کی تفسیر وہ سحر پرستی کے عقیدے کے مطابق کرتا ہے۔ بچے کے نزدیک عجائبات اور معجزات ناممکن نہیں ہیں کیونکہ یہ ابھی تک اسکے ذہن نشین نہیں ہوا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ فطرت کے اٹل قوانین کے ماتحت ہوتا ہے۔ وہ اسے مسلمہ امر سمجھتا ہے کہ خدا اور نیک و بد روحیں مافوق الفطرت قوت رکھتی ہیں اور دنیا کے معاملات میں دخل دیتی ہیں البتہ خدا کی قوت میں ایک خاص شان قدسی نظر آتی ہے۔ اُسے اس بات کا پورا اطمینان ہوتا ہے کہ دعا کے ذریعے سے انسان خدا کو اپنا طرفدار بنا سکتا ہے[1]۔

۴۔ بچے کے مذہبی تصورات کے ساتھ ایک نظریۂ اخلاق بھی ہوتا ہے جسکی بنیاد اس عقیدے پر ہوتی ہے کہ خدا نیک، محبت کرنے والا اور عادل ہے یعنی وہ اچھے کاموں کی جزا اور بُرے کاموں کی سزا دیتا ہے۔

یہ ہے بچے کے مذہب کا ایک خاکہ۔ اور ہم پوچھتے ہیں کہ کیا سیدھے سادے لوگوں کے بلکہ

---

[1] اسکی ایک عمدہ مثال وہ واقعہ ہے جو گستاف فرائی ٹاگ نے اپنے بچپن کے حالات میں لکھا ہے۔ اسکی تین برس کی عمر تھی کہ ایک دن اس کے بھائی کے اصطباغ کی رسم ادا ہو رہی تھی وہ قریب کے کمرے میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دعا مانگنا چاہتا تھا۔ دفعتہ اسے اپنے ہاتھ میں ایک شکر کی پڑیا نظر آئی۔ دعا کو چھوڑ چھاڑ کر

بڑے عقلا کے مذہبی عقائد بچوں کے اِن ابتدائی تصورات سے اسقدر بلند ہوتے ہیں کہ اُن کے اور بچوں کے مذہب کا اصل اصول ایک نہیں ہوتا؟

ہم نے بچے کے بنیادی مذہبی رجحان کا جو نقشہ کھینچا ہے اس پر ماحول کے طرز خیال کا بہت اثر پڑتا ہے۔ حال وقال کے دور اور عقلیت کے دور کے بچوں میں، یا اُن بچوں میں جنکی تربیت روحانی اثر میں ہوئی ہے اور ان میں جنکی تربیت میں واقعیت کا اثر غالب ہو بہت فرق ہوتا ہے پہلی قسم کے بچے آسانی سے مذہبی خیالات کو قبول کر لیتے ہیں اور ان کے دل پر ان کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسکی بنا پر لوگ اپنے خیال کے مطابق بچپن میں تعلیم دینے کے خلاف یا موافق فیصلہ کرسکتے ہیں۔ مذہبی روایات بچوں کے دلمیں بہت جلد گھر کر لیتی ہیں۔ خصوصاً یہ بارہا دیکھا گیا ہے کہ توریت کی بعض کہانیاں بچوں کے دل پر اتنا گہرا اثر ڈالتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب انکی خاص دنیا سے مناسبت رکھتی ہے۔ اسٹاربک نے سچ کہا ہے "بچوں کے مذہب کی سب سے بڑی خصوصیت زود اعتقادی ہے۔" اسمیں شک نہیں کہ بچپن میں مذہبی احساس ذہنی زندگی کے مرکز تک نہیں پہنچتا کیونکہ ان کی زندگی تو احساس کے لمحوں کا ایک بے ربط سلسلہ ہے جسمیں کوئی مرکز نہیں ہوتا اور بچے کبھی اپنی زندگی پر غور نہیں کرتے۔ لیکن موروثی مذہبی عقائد شعور کے ایک کونے میں پڑے رہتے ہیں اور آگے چلکر کبھی کبھی آخری عمر میں شخصیت کے مرکز میں پہنچ جاتے ہیں۔ لڑکپن کا زمانہ ختم ہونے وقت مذہبی تاثر بہت کم ہوجاتا ہے۔ تندرستی اور قوتِ جسمانی کے متوالے نوجوانوں کو یہودی اور عیسوی روایات میں نفس کشی اور عاجزی کا پہلو نظر آتا ہے جس سے ان کی طبیعت کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔

جہاں کہیں ماحول نے بچوں میں مذہبی احساس پیدا کر دیا ہے خواہ اسمیں کتنی ہی سرد مہری اور احتیاط سے کام لیا گیا ہو وہاں بلوغ کی ابتدا میں ایک ایسا دور آنا ضروری ہے جسمیں نوجوان کوشش کرتا ہے کہ آبائی اعمال وعقائد سے ذاتی تعلق اور دلچسپی پیدا کرے

یہ کوشش وہ جان بوجھ کے کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہمیں اتنی خاموشی یا تیزی سے کام لیا جائے کہ دوسرے محسوس نہ کر سکیں۔ لیکن یہ دور بن آئے نہیں رہتا۔ چاہے وہ جیسا کہ معمولاً ہوتا ہے مختصر اور عارضی ہی کیوں نہ ہو۔ اُسکے دلمیں ایک مخصوص مذہبی ذوق پیدا ہوتا ہے جسمیں دنیا کی نظری تفسیر کا رجحان بھی ملا جُلا ہوتا ہے۔ بہرحال تھوڑی بہت مذہبی ضرورت اور مذہبی آرزو اسمیں ضرور نظر آتی ہے۔ اور چونکہ یہ چیزیں خود بخود دلمیں پیدا ہوتی ہیں بلکہ ان کے ساتھ شعور اور جستجو کا عنصر شامل ہوتا ہے اس لئے ہم کہتے ہیں کہ نوجوان ان عقائد کو خود اپنی ذات کا جزو بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسکا جی چاہتا ہے کہ قدیم روایات میں اپنے قلبی واردات سے جان ڈالدے خواہ اسطرح کہ ان میں اپنی روحانی حرارت سے اور گرمی پہنچائے یا اسطرح کہ ان پر حرف بہ حرف ایمان لے آئے۔ ممکن ہے کہ یہ کوشش ابتدا ہی میں بالکل ناکام ہو اسکا ذکر ہم آگے کرینگے۔ لیکن بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ انہیں انجیل سے زیادہ گہرا شغف پیدا ہوجاتا ہے۔ جو جسے وہ پہلے پڑھ چکے ہیں انمیں اب انہیں نئے پہلو نظر آنے لگتے ہیں۔ ان کو دفعتہً اُسکے مضامین کی خوبی کا احساس ہوتا ہے جیسے کسی مبتدی کو پیانو بجاتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ "موزارٹ" کے گیتوں میں موسیقیت ہے۔ یہ نوجوانوں کے ابتدائی مذہبی دور کی خصوصیت ہے کہ مذہبی چیزیں جنسے وہ خوب واقف ہیں بالکل نئی نظر آتی ہیں اسکی ایک عمدہ مثال اوڈو ڈیگن فیلڈ کی کتاب "مسیح ہماری طالب علمی کی زندگی میں" ہے۔ ایک چھٹے درجے کا لڑکا جو "تحریکِ شباب" کی انجیل پر عقیدہ رکھنے والے گروہ میں داخل ہوا کہتا ہے "یہاں تو وہ دین کی باتیں جو ہم گرجے میں یا مذہب کے سبق میں سُنا کرتے تھے بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں ہم انہیں سنکر کچھ سوچتے بھی ہیں اور ہمیں گرمی سی معلوم ہونے لگتی ہے" بات یہ ہے کہ خارجی مذہب تو اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ لیکن خود لڑکے کے دلمیں کوئی نئی چیز پیدا ہوگئی ہے۔ وہ اس "نئے احساس" کو بہت گہری اہمیت دیتا ہے۔ اس زمانہ میں نوجوانوں میں واقعی مذہبیت

ہوتی ہے۔ اُس پر گزشتہ (اور موجودہ) شخصیتوں کا اور خاص خاص واقعات کا اثر پڑتا ہے
اگر ہمیں علمی مذاق بھی ہے تو ممکن ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کی زندگی کے مفصل حالات معلوم کرنے
کی کوشش کرے۔ لیکن اہم روایات میں تناقض دیکھ کر اُسے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ وہ جدھر
نظر اٹھاتا ہے اُسے زندگی کا عظیم الشان معمہ نظر آتا ہے۔

اسطرح کے گہرے واردات کا دل پر گزرنا خود اس بات کی علامت ہے کہ ذہنی بلوغ شروع
ہوگیا ہے۔ امریکی ماہر فلسفۂ مذہب اسٹاربک بھی، جو اسٹینلے ہال کی طرح مذہبیت اور عضویاتی
بلوغ کے باہمی تعلق پر بہت زور دیتا ہے، اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ مذہبی احساس
عضویاتی بلوغ سے دو ایک سال پہلے یعنی گیارہ بارہ کی عمر میں پیدا ہوجاتا ہے۔ اس سے پوری
ترکیب نفسی کا رخ بدل جاتا ہے۔ داخلی زندگی اب شروع ہوتی ہے۔ اور اس حالت میں جرمنی
کے پروٹسٹنٹ طبقوں میں لڑکوں کی تصدیق مسیحیت کی رسم ادا ہوتی ہے۔ یہ زمانہ واقعی اس
رسم کے لیے بہت موزوں ہے۔ ہمارے پاس اس بات کی بہت سی شہادتیں ہیں، جنمیں سے
بعض ہم آگے چل کر نقل کرینگے، کہ وہ لڑکے جنکی تصدیق مسیحیت ہونے والی ہے بہت بےچینی
کے ساتھ "برکت پانے" کا انتظار کرتے ہیں۔ ان کا دل مذہبی جوش سے لبریز ہوتا ہے
مگر یہ بھی سچ ہے کہ بہت سے لوگوں کے دلمیں مذہبی انقلاب اس رسم کے ادا ہونے کے
ساتھ شروع ہوتا ہے۔

قدرتی طور پر ان نوجوانوں کی حالت اسکے بالکل برعکس ہوتی ہے جنکے ماحول میں مذہب
محض کاروباری سکے کی طرح چلتا ہے یعنی فقط دینیات کی فرسودہ اصطلاحوں اور ظاہری
عبادت کی رسموں کا دور دورہ ہوتا ہے۔ بہت سے نوجوانوں نے اعتراف کیا ہے کہ سنجیدہ اور
مقدس چیزوں کے ساتھ یہ سطحی برتاؤ دیکھ کر ان کا دل مذہب کی طرف سے پھر گیا بلکہ وہ گمراہ
ہوگئے۔ توحید فی التثلیث تخلیق) شفاعت، قضا و قدر، کفارہ ایسی ایسی اصطلاحیں
اوڑھنا بچھونا بنجائیں تو ان کے گہرے ابدی معانی کون سمجھ سکے گا۔ بقول زالتسمان

کہ جب خدا کا نام موقع بے موقع ہر وقت لیا جائے ، یا اسکے استعمال کی تاکید اسطرح کی جائے جیسے ہاضمہ کی دوا کی تو خدا کی عظمت دل سے آپ ہی کم ہو جائیگی ۔

اس نفسیاتی حقیقت سے کہ گھرے سے گھرے مذہبی علامات بھی صدیوں تک بے پروائی سے استعمال ہونے کے بعد رفتہ رفتہ بےمعنی ہو جاتے ہیں ، کلیسا کو یہ سبق لینا چاہیئے تھا کہ بادہ کہن کو وقتاً فوقتاً نئی بوتلوں میں بھرتا یا کم سے کم ناموں کے بدلنے کو معنی کی تحریف نہ سمجھتا مذہب کو اپنانے کی کوشش اکثر اس لیئے ناکامیاب ہوتی ہے کہ یہ محض ایک بے جان چیز ہو کر رہ گئی ہے ۔

اس پہلے دور کے بعد عموماً دوسرا دور آتا ہے جسمیں نوجوان آبائی مذہب سے بے تعلق ہو جاتے ہیں ۔ اسے ہم شک اور نفی کا دور کہہ سکتے ہیں مگر اسکا آنا ناگزیر ہے ۔ کیونکہ ایک تو ہر نسل کی مذہبی اصطلاحات الگ ہوتی ہیں اور دوسرے ہر فرد اس پر مجبور ہے کہ بطورِ خود خدا کو ڈھونڈے اور اپنے خاص رنگ میں اسکی معرفت حاصل کرے ۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مذہبی عقائد میں اذعانیت[۱] کو دخل دینے میں یہ خطرہ ہے کہ انمیں باطنی مشاہدے اور وجدانی احساس کی شان نہیں رہتی بلکہ وہ محض روایات ، محض روحانی غلامی بنکر رہ جاتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوان ان سرمدی واردات کے لیئے نیا طرزِ ادا اختیار کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے ذاتی احساس کے بل پر جو انہیں بالکل نیا اور اچھوتا معلوم ہوتا ہے خود خارجی مذہب[۲] کے بھی مخالف ہو جاتے ہیں ۔

نوجوانوں کی مذہب سے علیٰحدگی بہت سی صورتیں اختیار کر سکتی ہے ۔ ہم اُن مثالوں کا ذکر کرتے ہیں جو بہت عام ہیں :۔

۱۔ وہ علیٰحدگی جو مذہب سے معجز نمائی کی توقع پوری نہ ہونے کی وجہ سے ہو ۔

---

۱ Dogmatism

۲ خارجی مذہب Objective religion سے مراد ہے مذہب بحیثیت ایک تمدنی شعبہ کے ۔

۲ ۔ وہ جو ذہنی شکوک کی وجہ سے ہو۔

۳ ۔ وہ جو اخلاقی تصور کائنات اور مذہبی احکام میں مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے ہو

ان میں سے ہر صورت پر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مذہبی نشوونما کس راہ پر جاری تھی کہ اُسے ایک مرحلے پر رک جانا پڑا۔

بچے کے تخیل سے زیادہ قریب معجزنمائی کی توقع ہے۔ یہ وہی پُرانی عجائب پرستی ہے جسمیں اب کسی قدر روحانیت اور باطنی واردات سے تھوڑا سا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ نوجوان کو جتنا زیادہ عقیدہ خدا پر اور جتنا زیادہ احساس اسکی قربت کا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ خدا معجزنمائی کی قوت دکھائیگا خصوصاً اس حالت میں جب دل سے نکلی ہوئی دعا کی پوشیدہ قوت اُسے (معاذاللہ) مجبور کردے۔ اِس قسم کے نوجوان اور ان پر کیا موقوف سبھی خام طبع لوگ دعا کی ساحرانہ قوت کے قائل ہیں[۵]۔ اور جب زندگی کے نازک موقعوں پر دعا کا کوئی محسوس اثر نہیں ہوتا تو مذہبی خیالات میں بڑا انقلاب ہو جاتا ہے۔ جن نوجوانوں میں مذہبی جوش کے ساتھ بچپن تخیل بھی ہوتا ہے، خواہ وہ پروٹسٹنٹ خاندان سے کیوں نہ ہوں انکی نظر میں اصطباغ اور دوسرے مذہبی رسوم مافوق الفطرت مظاہر ہیں جنمیں روحانی حُرمت کے علاوہ معجزنمائی کی قوت بھی ہوتی ہے۔ خصوصاً تصدیق مسیحیت کی رسم سے پہلے نوجوانوں کو یہ توقع ہوتی ہے کہ اِس مقدس رسم کے بعد انمیں غیر معمولی تغیّر اور روحانی بلندی پیدا ہو جائے گی لڑکیوں میں یہ توقع لڑکوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ پہلی عشائے ربانی اور پادری

---

[۵] شلائر ماخر نے کیا خوب کہا ہے "یہ وہ قدرتی منازل ہیں جو ہماری رُوح خدا سے صدق دل سے دعا کرتے وقت طے کرتی ہے اور جو مسیح کی رُوح نے گیتھسمان میں خشوع وخضوع سے طے کی تھیں۔ ابتدا میں تو ہم خدا کے سامنے اپنے مقاصد پیش کرتے ہیں۔ بلکہ ہمارے دل میں یہ خیال خام ہوتا ہے کہ ہمارا ارادہ خدا کا ارادہ بن جائیگا۔ لیکن خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ ہم خدا کی مشیت کو اپنا ارادہ بنا لیتے ہیں۔ اور اسی میں ہمارے لئے بڑی برکت ہے۔"

کی دعائے برکت کے بعد انہیں کوئی نامعلوم اور پُراسرار چیز پیدا ہو جائیگی گویا اُن کی سیرت ہی بالکل بدلجائیگی۔ لیکن یہ تبدیلی، یہ قلب ماہیت واقع نہیں ہوتی۔ یا شاید ظاہری مشاغل اور دنیاوی پریشانیوں کے سبب سے دب جاتی ہے۔ پہلے تو نوجوان اپنے آپ کو الزام دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ غور کرتے ہیں تو خرق عادت اور معجزے کے اعتقاد کی بنیادیں تک ہل جاتی ہیں۔ اور چونکہ ان لوگوں کی مذہبیت اسی اعتقاد پر مبنی ہوتی ہے اس لئے اسکے ساتھ ساتھ اور بہت سے عقیدے جو اب تک بہت مضبوط تھے، مسمار ہو جاتے ہیں، اور سوائے بیحد مایوسی، روح فرسا بے اعتقادی اور بے لسی کے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اسطرح دعا اور مذہبی رسوم کی بدولت مذہب سے علیحدگی کی نوبت پہنچتی ہے۔ لیکن اصل میں مذہبی احساس کمزور نہیں ہوتا بلکہ اور قوی ہو جاتا ہے۔ اسکی صحیح نشو و نما کو جاری رکھنے کے لئے نوجوانوں کے بھولے پن اور ظاہر پرستی کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

سنجیدہ اور تنقید پسند طبائع میں جنکا عقلی رجحان بہت قوی ہوتا ہے، مذہبی نشو و نما کی صورت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ یہاں ضروری ہے کہ ذوق علم میں اور منشائے کائنات کے وجدانی عرفان میں تصادم ہو۔ یہ تصادم اتنا ہی شدید ہوتا ہے جتنا اُس زمانے کے عام ذہنی مذاق میں عملی رنگ خصوصاً ثبوتی سائنس کا رنگ غالب ہو۔ ظاہر ہے کہ اہل علم کی حق پسندی، جو سراسر اخلاقی عنصر ہے، معجزات کے تذکروں، مردوں کو زندہ کرنے کے قصوں، خصوصاً بازخاست کے عقیدہ سے آزردہ ہوتی ہے۔ عقل توحید فی التثلیث کے راز کی جستجو میں حیران رہتی ہے۔ یا بہت جلد اس عقیدے کی نقادانہ تردید کردیتی ہے۔ تخلیق عالم کا جو قصہ انجیل میں بیان کیا گیا ہے اسکے سبب سے بہت سے لوگوں کے عقیدے برگشتہ ہو گئے۔ کیا خدا کے وجود کا کوئی ثبوت ہے؟ کیا خدا کے لڑکا ہونا ممکن ہے اور وہ بھی ایک دوشیزہ کے بطن سے؟ کیا مسیح کا مصلوب اور مدفون ہونے کے بعد اپنے حواریوں کے ساتھ ایماؤس جانا ممکن تھا؟ کیا ان سب قصوں کی مستند شہادت موجود ہے، یا انہیں محض اساطیر، محض بچپن مذہبی تخیل کی من گھڑت سمجھنا چاہیئے؟

یہ کشمکش جو یہاں نظر آتی ہے وہی "عقیدے اور علم" کا پُرانا تضاد ہے جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے ۔ ہر ذہنی دَور میں یہ تضاد اس زمانہ کے علمی نظام اور دینی عقائد کے اعتبار سے نئی شکل اختیار کرتا ہے ۔ لیکن اسکی تہ میں ہمیشہ وہی ترکیب ذہنی کا اختلاف ہوتا ہے جسکا دُور کرنا بہت مشکل ہے ۔ آج کل نوجوانوں کو علمی تجربات سے زیادہ سابقہ پڑتا ہے اور مذہبی واردات و احساسات سے کم ۔ اس لیئے وہ عموماً علمی حقائق کو مذہبی "معارف" پر ترجیح دیتے ہیں ۔ خصوصاً حامیانِ مذہب کا یہ نظریہ کہ "حق" دو قسم کا ہوتا ہے تنقید پسند طبائع کو دین اور علم کی طرف سے بدظن کر دیتا ہے ۔ بعض مذہبی اصولوں کی کمزوری کو دیکھ کر ان پر یہ اثر ہوتا ہے کہ مذہب کو چھوڑ بیٹھتے ہیں اور عرصہ تک ، بلکہ بعض اوقات عمر بھر ، اُس سے کوئی سروکار نہیں رکھتے (سوائے اُن تعلقات کے جو غیر محسوس طور پر باقی رہتے ہیں) ان مشکلات کو حل کرنے کا مسئلہ فلسفۂ مذہب کی حد میں آتا ہے اس لیئے ہم اُس سے بحث نہیں کر سکتے ۔ ہوتا یہ ہے کہ یا تو علم عقیدے کو بالکل دبا دیتا ہے یا دونوں کی دائرہ حکومت کی حدود بہت احتیاط کے ساتھ الگ کر دی جاتی ہیں (تنقیدی دینیات) یا تو عقیدہ کسی خاص اصول پر علم کے ماتحت رکھا جاتا ہے (عقلی دینیات) یا علم کو عقیدے کا جزو یا اُسکے تابع قرار دینے پر زور دیا جاتا ہے (فلسفۂ مذہب) یا تو مذہبی عقیدت کے جوش میں عقلِ انسانی کے جہلِ محض کا اعتراف کیا جاتا ہے یا دونوں کے حقائق کا ایک ہم آہنگ نظام مرتب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ غرض ہر صورت میں برسوں کی جستجو اور کشمکش کے بعد یہ نوبت آتی ہے کہ مذہب کو اپنے علم و یقین سے مطابقت اور شکوک و شبہات کے حملوں سے نجات دی جائے

مذہب سے علیحدگی کی تیسری صورت اخلاقی کشمکش پر مبنی ہوتی ہے ۔ یہ اُن لوگوں کو پیش آیا کرتی ہے جنکی ذہنی زندگی میں اخلاقی جوش اور اخلاقی مسائل کے احساس کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ اکثر اس سے پہلے ایک عرصہ تک ان کا دل خوفِ گناہ سے لبریز رہتا ہے ۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ نظامِ عالم کو مکمل اخلاقی نصب العین سے دُور دیکھ کر ان کا دل لرز جاتا ہے ۔ اگر حضرت انسان اِس نصب العین تک پہنچنے سے قاصر ہوتے تو اس خیال سے تسکین ہو جاتی کہ گنہگاری

انکی سرشت میں ہے۔ لیکن غضب تو یہ ہے کہ کائنات کے حوادث بھی اُس اخلاقی معیار پر پورے نہیں اُترتے جن پر انسان انہیں کستا ہے؟ وہ دنیا میں شر کے وجود کو کیوں گوارا کرتا ہے؟ وہ کیوں گنہ گاروں کو پھلنے پھولنے اور نیکوں کو برباد ہونے دیتا ہے؟ اگر یہ دنیا واقعی مسیح کے خدا کی بنائی ہوئی ہوتی تو کتنی مختلف ہوتی؟ غرض وہی پرانا عدل الٰہی کا مسئلہ اِن شبہات کا سرچشمہ ہے۔ سچ پوچھیے تو ایک حد تک یہ شبہات بھی عقلی ہیں۔ اِن کی تہ میں واردات قلبی کی کشمکش ہے یعنی وہ تضاد جو نیکی کے عینی مطالبے اور بدی کی واقعی حکومت میں یا خدا اور شیطان میں پایا جاتا ہے۔ فیلکس ڈان کی زندگی اور اسکی تصانیف پر ابتدائے عمر سے اس الجھن کا اثر پایا جاتا ہے۔ شاہ ٹےیا کا حسرت ناک انجام اسکے لئے گہری واردات قلبی بنگیا تھا وہ کہتا ہے :۔

"اے عادل خدا اگر آسمان پر تیری حکومت ہے تو کیوں شاہ ٹےیا اور اسکی رعایا دشمنوں کے مکروفریب سے برباد ہوگئی۔ آخر یہ کیوں ہوا"؟ جدھر دیکھیے بے گناہوں کی مصیبت کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ نوجوانوں کے دلمیں اِس شبہہ کے پیدا ہونے کا سبب اکثر والدین کے باہمی ناخوشگوار تعلقات ہوتے ہیں۔ للی براؤن کے یہاں بھی یہی صورت تھی اور فیلکس ڈان کے یہاں بھی جسکے دلمیں اس روحانی تکلیف اور ٹےیا کے مسئلے کی الجھن نے مل جل کر گہرا تاثر وجدان پیدا کر دیا تھا۔ ان شکوک سے نرا فلسفہ نجات نہیں دلا سکتا بلکہ اندرونی اخلاقی قوتوں کی مدد سے "مسمار شدہ دنیا" کی از سرِ نو تعمیر ضروری ہے ورنہ وہ اسیطرح شکستہ پڑی رہیگی۔

شک اور کشمکش کی ان تینوں صورتوں میں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماحول کے مذہب سے بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مذہبی ارتقا کا یہ دوسرا دور ممکن ہے کہ بہت ہی مختصر ہو اور دل کے پردے میں چھپا رہے لیکن مستحکم مذہبی شخصیت کی تعمیر اور ذاتی مذہبی عقیدے کی بنا کے لئے نوجوان پر یہ دور گزرنا ضروری ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ ایک ضمنی بات ہے کہ مذہب سے جو کشمکش ہوتی ہے وہ محض مُدرک کی ناسمجھی پر مبنی ہے یا خود خارجی مذہب کے نقائص پر۔ ممکن ہے کہ پہلی خرابی اسطرح رفع ہو کہ مُدرک آہستہ آہستہ پُرانے طرز ادا سے مانوس ہو جائے اور دوسری اس

طرح کہ وہ خود آبائی مذہب میں وسعت اور گہرائی پیدا کرے۔ لیکن صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مذہبی زندگی کی کشتی اِن مشکلات کی بدولت ہمیشہ کے لیئے ریت میں پھنسکر رہ جائے۔ کسی شخص کا مذہبیت سے مطلق بے بہرہ ہونا تو ہمارے نزدیک ایسا ہی ناممکن ہے جیسا کسی کا احساس زندگی سے بالکل خالی ہونا۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کا یہ پہلو شعور کی سطح سے نیچا ہو جائے۔ خاصکر اِس لیئے کہ عہدِ شباب کے ختم ہوتے وقت عام طور پر مذہبی احساس دھیما ہو جاتا ہے۔ لیکن اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ شباب کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے ہی بصیرت اور تعمیر کا دور آتا ہے جسمیں نوجوان کا رجحان اِس طرف ہو جاتا ہے کہ ذاتی واردات قلبی پر مذہبی عقائد کی بنا رکھے۔

قبل اِسکے کہ ہم ان تینوں دوروں کی عام خصوصیات بیان کریں ہم چند مثالوں کے ذریعہ سے اپنے مطلب کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ ہم اُن شہادتوں کو جو نوجوانوں کی خود نوشتہ سوانحعمریوں میں رسم تصدیق مسیحیت کے متعلق ملیں سب سے زیادہ زور دیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کے تذکروں کو ماخذ قرار دینے پر لوگ کیا اعتراضات کرتے ہیں۔ بہت سے اسباب کی بنا پر یہ لوگ سچے حالات بیان کرنے سے معذور ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی پچھلی زندگی پر تبصرہ کرتا ہے تو اُسکے نقطۂ نظر میں پختگی اور جمعیت ہوتی ہے حالانکہ اسی کا نہ ہونا عہدِ شباب کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اِس لیئے ہمیشہ اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ وہ اُن واقعات پر ضرورت سے زیادہ زور دیگا جنکی بدولت اُس نے اِس مصیبت سے نجات پائی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسیقدر اغراق یا کم سے کم خود نمائی سے کام لے، پھر یہ ہے کہ لوگ اپنے شباب کی تصویر میں اکثر شعریت کے سنہرے رنگ سے اور کبھی کبھی دردِ حسرت کی سیاہی سے رنگ آمیزی کر دیا کرتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ کہیں اُن تذکروں کو ترجیح نہ دی جائے جو خاص مذہبی طبیعت کے لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور اس لیے ان سے نوجوانوں کے عام اندازِ طبیعت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

لیکن ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہم اِن شہادتوں کو رد کر دیں تو مذہبی ارتقا کے

نفسی کے معلوم کرنے کا کوئی اور ماخذ نہیں ہے۔ اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے فرد سوالات شائع کرنے کا طریقہ جو امریکہ والوں کو بہت پسند ہے اس سے بھی زیادہ نقائص سے پُر ہے جنکی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہ سوالات گویا پہلے ہی سے چند نہریں بنا دیتے ہیں جنمیں سے مشاہدۂ نفس کے دھارے کو بہنا پڑتا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ سوال کرنے والا فرض کر لیتا ہے کہ نوجوانوں پر اپنی نفسی حالت بخوبی روشن ہے۔ حالانکہ بجز ان سوالات کی مصنوعی روشنی کے وہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ جواب دینے والوں کے انفرادی حالات نہیں معلوم ہوتے جنکے بغیر ان جوابات کو پوری طرح "سمجھنا" ناممکن ہے۔ اس معاملے میں روزنامچوں سے بھی کام نہیں چلتا کیونکہ انمیں الگ الگ واقعات ہوتے ہیں جنمیں تسلسل اور ربط نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ کون ذکی الحس نوجوان ایسا ہوگا جو ایسے پتے پتے کے سوالوں کا صحیح جواب دیگا اور خود نمائی یا تکلف سے کام نہ لے گا۔ اسیطرح منفرق الفاظ بول کر جملے بنوانے سے بھی کام نہیں چلتا۔ اسکے نقائص کو ہم آگے چلکر بیان کرینگے۔ تین بے ربط مذہبی اصطلاحوں کو سنکر جو جی میں آئے کہہ ڈالنے میں اور غور و فکر اور سنجیدگی سے جواب دینے میں بہت فرق ہے۔

غرض وہی ایک ماخذ رہ جاتا ہے، خود نوشتہ سوانحعمریاں۔ ان سے عام طور پر اسکا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کسی نوجوان کی مذہبی نشو و نما پر کن شخصیتوں کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اور یہی سب سے زیادہ قابل توجہ پہلو ہے کیونکہ مذہبی جوش چلتا انسانوں کی صحبت سے پیدا ہوتا کتابوں سے کبھی نہیں ہو سکتا۔

یہ معنی خیز بات ہے کہ بعض خود نوشتہ سوانحعمریوں میں تصدیق مسیحیت کی رسم کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں کہیں ہے وہاں سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نوجوانوں کی نظر میں دعائے تبریک، عشائے ربانی، اور مذہبی وفاداری کی قسم، بہت سنجیدہ اور اہم چیزیں ہیں۔ یہی عقیدہ

رومن کیتھولک فرقے میں مذہبی تصدیق کی رسم بہت کمسنی میں ادا کی جاتی ہے اور اُسوقت تک باطنی احساس ہرگز بیدار نہیں ہو سکتا۔ تاہم بچے عشائے ربانی کو ایک عظیم الشان سرا گہی سمجھ کر بہت گہرے باطنی ہیجان اور احتساب نفس کے ساتھ اس رسم کے لیئے جاتے ہیں۔ شاید اسمیں بھی گہری حکمت اور مصلحت ہے کہ یہ تقدیس و تبریک کی رسم جلد ادا کردی جاتی ہے۔ قبل اسکے کہ عقلِ موشگاف جسکی محدود نظر اسکی عظمت کو سمجھنے سے قاصر ہے بیدار ہو۔ اس معاملے میں خود انسان پر بھروسہ کرنے سے یہی بہتر ہے کہ خدا پر بھروسہ کیا جائے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب آگے چل کر انسان کی روحانی مصیبت میں کوئی دستگیری کرنے والا نہ ہو بڑے خطرات ہیں کیونکہ خود اپنی سیرت کی تعمیر کرنا بے حد دُشوار ہے اور بہت سے لوگوں کی طاقت سے باہر ہے لیکن ان خطّوں میں جہاں راسخ العقیدہ کیتھولک لوگوں کی آبادی ہے کلیسا ہمیشہ انسان کی مدد کرنے کے لیئے موجود ہے اور اسکی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔

فلسفی آڈگسٹ میسر جسکی تربیت کیتھولک عقیدے کے مطابق ہوئی ہے کہتا ہے کہ جب وہ پہلی بار وفات مسیح کے دن تبرک لینے کے لیئے گیا تو اسکا دل مذہبی عقیدت سے لبریز تھا مگر اسی کے ساتھ اخلاقی پیچ و تاب سے بھی خالی نہ تھا" اسوقت مجھے اس قسم کے خیالات ستا رہے تھے کیا میں نے تبرک حسنِ عقیدت سے لیا ہے؟ کیا میرے دلمیں ندامت اور نیکی کا ارادہ کافی ہے! کیا میرا اعتراف گناہ مکمل ہے؟"

کاریٹاس بشوف جو پروٹسٹنٹ مذہب کی پابند تھی اُس پادری کی، جس نے اُسے برکت دی تھی، دل و جان سے معتقد ہو گئی۔ کیونکہ علاوہ اسکی ماں کے، جسکی عظمت کا اب تک اندازہ نہ تھا، یہی شخص اُسکا پہلا روحانی دستگیر تھا۔ اس تعلق خاطر میں تھوڑی سی عشق کی کیفیت بھی اور وہ کشش بھی جو ایک مرد کی اثر آفریں ذہنی قوت میں ایک عورت کے لیئے ہوتی ہے صاف نظر آتی ہے۔" مجھے کامل یقین ہے کہ اُسے میری روحانی ضرورتوں کا علم تھا کیونکہ اُس نے جو کچھ کیا وہ بالکل میرے مناسب حال تھا۔ میں کہہ نہیں سکتی کہ اُس نے مجھے کیسی

مسرت بخشی - خدا جانے وہ کسی کے دل کا حال کیسے جان لیتا ہے - جب وہ اپنی صاف نیلی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو اسکی نظر دل کے پردوں کے اندر پہنچ جاتی ہے - اور انسان کو اس کی مرضی پر چلنا پڑتا ہے -

مالوڈا افان میسن بگ کی سیرت میں جوشِ عقیدت کے ساتھ شک کا مادہ ہے جو عقلی بھی ہے اور اخلاقی بھی - اسکی مذہبی خود رائی یہ خبر دیتی ہے کہ وہ آگے چلکر مذہب کا ایک آزاد نصب العین قائم کریگی - اُسے کسی شفیع اور نجات دہندہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی - اُسے یقین ہے کہ وہ بلا واسطہ خدا تک پہنچ سکتی ہے - تاہم اُسے اس عقیدے پر ابھی تک اتنا بھروسا نہیں ہے کہ وہ مذہبی وفاداری کی قسم نہ کھاتی اور عشائے ربانی میں شریک نہ ہوتی ، وہ کہتی ہے "ہمارے اُستاد نے ہم لوگوں کو حکم دیا کہ اپنے عقائد کا تحریری بیان پیش کریں - میں نے اپنے عقائد جہاں تک ہوسکا ، دیانتداری کے ساتھ ظاہر کیے - لیکن آخری لمحہ میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ سب کچھ بتا دیتی - میں اُس سے کیونکر کہہ سکتی تھی کہ میرے دل کی گہرائی میں ایک آواز ان باتوں میں سے اکثر کی تردید کرتی تھی جو اُس نے اسقدر محنت سے ہمیں سکھائی تھیں اور میں باوجود عقیدت مندی اور دیانت داری کے ، صدق دل سے کلیسا میں شامل ہونے پر ، اُن کسانوں کے بچوں سے بھی کم راضی تھی جنکی بحسی سے وہ نالاں تھا - لیکن مجھے یہ آسرا تھا کہ عین وقت پر خداوند تعالیٰ سینٹ پال کی طرح مجھے بھی مضبوط عقیدہ عطا کریگا جس سے میں اب تک محروم تھی . . . .

سنیچر کے دن ہم سب اپنے عزیزوں کے ساتھ گرجے میں گئے تاکہ عشائے ربانی کے وقت حاضر رہیں جسمیں میری بہن کو اور مجھے تصدیق مسیحیت کے بعد ہی عمر بھر میں پہلی بار شریک ہونا تھا - میرے لئے یہی اس رسم کا سب سے اہم اور پُر اسرار حصہ تھا - مجھ سے میرے شک کا دیو سوال پر سوال کر رہا تھا کہ آخر شراب اور روٹی کیسے مسیح کا خون بنجاتی ہے - مجھے اسکا بخوبی احساس تھا کہ ان باتوں کی کرید نہیں کرنا چاہیے - اور معجزہ اُسی وقت تک باقی رہتا ہے جب تک انسان

شک کی جگہ عقیدے سے کام ہے۔ میں بہت سکون کے ساتھ اس رسم کی طیاریوں کو دیکھتی رہی لیکن جب پادری نے یہ کلمے دُہرائے "جو کوئی بغیر استحقاق کے یہ روٹی کھائے یا یہ شراب پیے اُس سے قیامت کے دن بازپرس ہوگی" اسوقت مجھ پر سخت خوف طاری ہوگیا۔ جب اُس نے اسکے بعد سب حاضرین سے پوچھا کہ کیا تم میں سے ہر شخص اپنے گناہوں پر نادم ہے۔ اور اپنے آقا کے دسترخوان پر اس اُمید کے ساتھ جاتا ہے کہ اسکے خون کی بدولت نجات حاصل کر لیگا تو سب نے جواب دیا "ہاں" لیکن میں ایسی بدحواس ہوئی کہ یہ لفظ میری زبان سے نہ نکلا۔ میرے تمام بدن میں رعشہ تھا اور میرا دل عذاب دوزخ میں گرفتار تھا۔ ہم سب گرجے سے چلے آئے۔ میری آنکھوں میں سارا واقعہ خواب کی طرح پھر رہا تھا۔ میری ماں اور بہنیں مطمئن اور خوش تھیں شام کو ویسی ہی باتیں ہو رہی تھیں جیسی روز ہوا کرتی تھیں۔ نہ اس واقعہ کا ذکر تھا جو آج ہوا اور نہ اسکا جو کل ہونے والا تھا۔ کسی کو اسکی پروا نہیں معلوم ہوتی تھی کہ کل بڑے سخت امتحان کا دن ہے جسمیں روز ابد تک کے لیے ہماری قسمتوں کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ مگر میرا یہ حال تھا کہ اُس بوجھ سے، جو میرے سر ڈالدیا گیا تھا، ہلاک ہوئی جاتی تھی۔ میں اپنے دل سے پوچھ رہی تھی کہ کیا میں یہ روٹی کھانے اور یہ شراب پینے کی مستحق ہوں! کیا میرا عقیدہ اتنا مضبوط ہے جتنا کلیسا چاہتا ہے؟ بار بار میرے لب تک یہ الفاظ آتے تھے "نہیں۔ نہیں۔ میں ہرگز اسکی مستحق نہیں ہوں۔ مجھے دنیا سے محبت ہے اور سورج سے، زمین سے، پھولوں سے، سیر و تفریح سے، جوانی سے، حُسن سے۔ میں اُس راز سے واقف نہیں جو خدا کے خاص بندوں پر کھلا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے اندر دو روحیں کیوں ہیں۔ ایک شریف، نیک اور سعادتمند، دوسری مردود ازل، اور خوار ابد......

(اب عشائے ربانی کا وقت اور "فیصلے کی ساعت" آ گئی ہے۔)

مجھے یہ توقع تھی کہ اب اصلیت کا بھید، موت میں زندگی کا راز، نورِ الٰہی کا جلوہ میری آنکھوں کو نظر آئیگا۔ میں نے اپنے اُستاد کے ہاتھ سے روٹی لے لی اور یہ الفاظ سُنے

"لو اور کھاؤ یہ میرا جسم ہے جو تم پر قربان ہوتا ہے تاکہ تمھارے گناہ بخش دیے جائیں" میرے لب شراب کے پیالے تک گئے اور میرے کان میں یہ آواز آئی "یہ میرا خون ہے جو بہایا جاتا ہے بہتوں کی شفاعت کے لئے" لیکن میرے اندر کوئی انقلاب نہیں ہوا۔ مجھ پر کوئی بھید نہیں کھلا۔ وہاں خدا کہیں نہ تھا کہ مجھے آسمانی سلطنت میں خاصانِ خدا کے زمرے میں داخل ہونے کی دعوت دیتا۔

میں ہمیشہ کے لئے مردود اور مقہور ہو گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں وہاں سے گھر تک کیسے آئی، اُس روز کی مصیبت سے کسطرح جاں بر ہوئی، اپنے دلی رنج کو اپنے والدین سے چھپانے میں کیونکر کامیاب ہوئی۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ میری ننھی چھوٹی بھانجیوں کی معصوم آنکھیں مجھ سے کہہ رہی تھیں "اے فرشتہ مردود تو ہماری جنت میں کیوں آئی"۔

فیلکس ڈان کے مذہبی احساس کی ابتدا حسنِ فطرت کے ذوق سے ہوئی۔ اسکے اور مذہبی تاریخ کے مطالعہ سے اسے تقویت پہنچی۔ اسکی نظر میں مذاہب مختلف امتوں کی سیرت کے اعلیٰ مظاہر ہیں۔ اپنے اُستاد نوتھارڈ کی اچھی مگر تاویلات پر مبنی تعلیم سے اسکی تسکین نہیں ہوئی بارھویں ہی سال میں اسکے دلمیں شکوک پیدا ہو گئے۔ اُس سے عدل الٰہی اور کفارہ گناہ کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ عرصہ کے بعد جب اُسے مدرسہ میں اُس سے بہت چھوٹے غریب بچوں کے ساتھ ساتھ تصدیق مسیحیت کی تعلیم دی گئی اور اُس نے دیکھا کہ ہر چیز محض زبانی یاد کرادی جاتی ہے تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ مذہبی وفاداری کی قسم نہیں کھا سکتا۔ اُس نے اپنی اس کشمکش کا ذکر دو بڑے پادریوں سے کیا۔ ایک نے تو اُسے بید لگانے کی دھمکی دی اور دوسرے نے اُس کا عقیدہ بدلنے کی ناکامیاب کوشش کے بعد صلاح دی کہ وہ کم سے کم اپنے خیالات کو پوشیدہ رکھے ورنہ پبلک کا غصہ بھڑک اٹھے گا۔ "دیکھو ہمیں اس رسوائی سے بچاؤ۔ خدا کا نام لے کر عشائے ربانی کی رسم میں چلے جاؤ۔ یہ تو تم خود کہتے ہو کہ تم خدا کے، مسئلہ اختیار کرے، اور

دلمیں پروٹسٹنٹ کلیسا کا جو احترام تھا وہ مٹ گیا اور اس نے اپنا الگ راستہ اختیار کیا یعنی اُس نے قدیم دیوتا اوڈن کی پرستش شروع کی۔

اسیطرح للی براؤن کی گہری مذہبی کشمکش کو ماحول نے بیرحمی سے کچل ڈالا۔ وہ کلیسا کی تعلیم پر ایمان لانے سے معذور تھی۔ کم سنی ہی میں اُس سے اور اسکے یہاں کے پادری سے نزاع شروع ہوگئی۔ پادری للی براؤن کی سیرت اور اسکے خیالات سے سخت بیزار تھا اور یہ بھی اسکی شخصیت کو عیوب سے بری نہیں سمجھتی تھی۔ **شیلے** کے جمالیاتی وجودی تصوف سے وہ بہت متاثر تھی کیونکہ اس عقیدے کو عہد شباب کی نفسی کیفیت سے خاص مناسبت ہے:۔

"اس اندرونی کشمکش کی حالت میں راتوں کو جاگ کر میں سوچا کرتی تھی کہ مجھے کس راہ پر چلنا چاہیے اور بڑی مصیبت سے ایک ایک پتھر جمع کرکے میں نے اپنے مذہب کا گرجا تعمیر کیا۔ جب میرا کام تکمیل کو پہنچا اور میرا قصد مصمم ہوگیا کہ چاہے جو کچھ ہو میں سوائے اپنے ذاتی عقیدے کے کسی اور عقیدے کو ہرگز قبول نہ کروں گی تو میرا دل مسرت کی گرمجوشی سے لبریز ہوگیا۔ ۱۸۷۹ء میں بڑے دن کے زمانے میں پادری **ایبرہارڈ** کے پاس جاکر میں نے کہدیا کہ میں گرجے کی قربانگاہ میں جاکر وحی و تنزیل کے عقیدے کا اعتراف نہیں کرسکتی۔ اس لیے آج مجھے تبرک کی رسم سے معذور رکھیے۔"

اسکے بعد اُس نے پادری کے سامنے اپنے عقائد بیان کیے جسمیں اُس نے اپنے نقطۂ نظر اور مسیحی تعلیم کے فرق کو وضاحت کے ساتھ ظاہر کیا۔ پادری بہت خفا ہوا۔ لیکن اس نے لڑکی کے والدین سے اسکا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اسی زمانہ میں اس سے اور اسکے باپ سے بڑا جھگڑا ہوا جسمیں ایک حد تک لڑکی قصوروار تھی۔ باپ نے طیش میں آکر اُسے مارا پیٹا۔ اسکی ہمت پست ہوگئی اور اس نے چاروناچار پادری کے حکم کی تعمیل کی۔ گرجا میں بڑی دھوم دھام سے جشن ہوا اور اس نے کھوئے انداز میں "ہاں" کہدیا۔ لیکن اسکا شیشۂ دل چکنا چور ہوگیا۔ صرف اپنے اتالیق کی خاموش ہمدردی کے سبب سے اُسے اتنا آسرا تھا کہ اس مصیبت میں ایک شخص

اس کا ہمدرد ہے۔

وہ لوگ جنھیں مذہبی تسکین حاصل ہو چکی ہے ان سرگشتہ جستجو نوجوانوں کو جو چاہیں کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلمیں بھی ذہنی قدور ہوتی ہیں۔ البتہ جس مذہبیت کا لوگ ان سے مطالبہ کرتے ہیں اور جسکی ایک حد تک انہیں خود آرزو ہوتی ہے اسمیں اور ان قدور میں کشمکش رہتی ہے۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ دوسری روحانی قوتوں میں اور مسیحی تعلیم میں مقابلہ ہے۔ اس جنگ میں یقیناً بڑے آلام و مصائب کا سامنا ہے۔ لیکن بغیر ان مصیبتوں کو جھیلے ہوئے آدمی انسان نہیں بنتا۔ اُسے شکوک و شبہات سے محفوظ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُسے اپنی سیرت کی تشکیل نہیں کرنے دیتے۔ ہم نے جو مثالیں دی ہیں اُن میں سے بعض پچھلے قرون کی اور اُن لوگوں کی ہیں جنھوں نے آگے چل کر نئے مسلک اختیار کیئے۔ لیکن آج بھی اور معمولی نوجوانوں میں بھی وہی بات موجود ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ اسکے اظہار میں وہ زور اور وہ اُپج نہیں پائی جاتی۔ ہم ایک نارمل اسکول کے سکسٹھ طالب علم کے روزنامچے میں سے ایک ٹکڑا نقل کرتے ہیں جسمیں مذہبی شبہات اور مذہب سے علیحدگی کا مثالی رُجحان نظر آتا ہے۔

تصدیق مسیحیت کے زمانے سے میرے دلمیں ایک تحریک پیدا ہوئی اور میں نے مسیحی عقائد کا مطالعہ شروع کیا۔ یہاں تک کہ میں خدا کا قائل ہوگیا۔ میرے ذہن میں اس کا تصور ایک بلند و برتر روح کی حیثیت سے تھا۔ باوجود بہت سی دقتوں کے مجھے اپنے عقائد کی طرف سے خاصا اطمینان تھا۔ لیکن میرے قلب کی گہرائی میں اب تک بےچینی باقی تھی مجھے اُمید تھی کہ آہستہ آہستہ میرا عقیدہ راسخ ہو جائیگا اور مجھے سکون قلب نصیب ہو جائے گا کیونکہ میں اپنے خیال میں صحیح راستہ پر تھا۔ جب میری عمر پندرہ سال کی تھی تو دفعتہً میری طبیعت میں بڑا انقلاب ہوگیا۔ میرے جتنے عقیدے تھے سب مسمار ہو گئے۔ کیونکہ جغرافیہ

اور ہئیت کی مختلف کتابیں پڑھنے کے بعد میں نے ان پر اپنے تصوّر کائنات کی بنیاد رکھی - اب مجھے معلوم ہوا کہ میرے پُرانے عقائد بے حقیقت تھے - یہ ساری عمارت ایکدم سے بیٹھ گئی - جب میں نے وحدت فطرت کے تصور کائنات کی کتاب عقائد پڑھی جو سائینس کے محقق اور عالم ہیکل نے لکھی تھی تو مجھے معلوم ہوا کہ اور لوگ بھی میرے ہمخیال ہیں - اس کتاب میں مجھے وہ سب چیزیں یکجا مل گئیں جو میں نے برسوں میں ایک ایک کر کے جمع کی تھیں - جب کبھی میں سفر میں زمین کو دیکھتا ہوں، یا آسمان پر نظر ڈالتا ہوں، یا پانی کی سیر کرتا ہوں یا جانوروں کے مشاہدے اور پودوں کی تحقیق میں مصروف ہوتا ہوں تو میرا دل عقیدت کے پاک جذبے سے لبریز ہو جاتا ہے اور مجھے فطرت کے محدود ہونے کا اندازہ ہوتا ہے - وہاں میری روح گرجے کی ٹھنڈی اور دھندلی دیواروں میں مقید نہیں ہوتی - اسطرح مشاہدۂ فطرت میں ڈوب جانا میری عبادت ہے جس سے مجھے قوت، ہمت، اور خالص باطنی مسرت حاصل ہوتی ہے -"

ایک دوسرا نارمل اسکول کا طالب علم زیادہ تر اخلاقی پہلو سے مسیحیت کی ذاتی تاویل کر کے اُس پر عقلی اخلاقی رنگ چڑھانا چاہتا ہے - وہ ایک دوست کو لکھتا ہے:-

"میرے خیال میں مذہب کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو آج کل کا کلیسائی عقیدہ جسکی تعلیم یہ پادری اور مُلّا صدیوں سے دے رہے ہیں - یعنی ایک علیم و بصیر خدا پر، بہشت پر، حیات بعد الممات پر، بزرگانِ دین پر، اور بہت سی اور اچھی اچھی چیزوں پر ایمان لانا - دوسری صورت جسکا میں بھی قائل ہوں یہ ہے کہ مذہب کے معنی، صرف نوع انسان سے محبت کرنا، اُن کی مدد اور خدمت کرنا سمجھے جائیں - یہی سچا مسیحی مذہب ہے - اور یہی مسیح کا مطمحِ نظر ہے میرے لیئے اُن باتوں کو تسلیم کرنا ناممکن ہے جنھیں واعظ انجیل کے حوالے سے بیان کرتے ہیں - یہ باتیں بچوں کو بہلانے کے لیئے ہیں نہ کہ عقلمند لوگوں کے لیئے جو حقیقت سے واقف ہیں - مثلاً اسکا صحیح علم رکھتے ہیں کہ زمین کی اور انسان کی نشوونما کیونکر ہوئی -"

مذہبی ارتقاء کا تیسرا دور اُسوقت سے جب جاب شروع ہوتا ہے جب دوسرے دور

کے شکوک اور ہیجانات کی بنا پر نوجوان اپنے ایک مستقل ذاتی عقیدے کی تشکیل کرنے لگیں۔ اس ارتقار کی رفتار اور اسکے ظاہر ہونے کی صورتیں اسقدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہم ان کا کوئی اصول نہیں قائم کر سکتے۔ یہ بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اس موقع پر اور مفصل شہادتیں پیش کی جائیں۔ اگر ہم صرف عام امکانات سے بحث کریں تو تیسرے دور کی تین صورتیں قرار دے سکتے ہیں:۔

۱۔ مذہب سے بالکل بے پروا اور مذہبی احساس سے بالکل خالی ہو جانا۔

۲۔ تاریخی مسیحی مذہب کو ترک کر کے کوئی جداگانہ شخصی عقیدہ اختیار کرنا۔

۳۔ مسیحی مذہب پر از سر نو ایمان لانا یا تو اس طرح کہ قدیم عقائد حرف بہ حرف قبول کر لیے جائیں یا اسطرح کہ انہیں سے بعض کا انتخاب کیا جائے اور وہ ذاتی درایت اور تاویل کے ذریعے سے اپنا لیے جائیں۔

پہلی صورت اگر کبھی خالص نظر آئے تو وہ نفسی زندگی کی سطحیت کی علامت ہے۔ اُس حالت میں زندگی محض مادیات اور حسیات کی پابند ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور ذہنی حرکت معدوم ہو جاتی ہے۔ لیکن اکثر یہ لامذہبی دیکھنے ہی کی ہوتی ہے۔ جو چیز مٹ گئی ہے وہ صرف شعوری مذہبی احساس تھا جسے لوگ ہمیشہ سے مذہب کہتے چلے آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اب بھی کسی شخص میں کوئی ذہنی رجحان اسقدر قوی ہو کہ وہ صرف مذہب سے مشابہت ہی نہیں بلکہ ایسی مطلقیت رکھتا ہو کہ اسکی ذات کے لیے واقعی عقیدہ زندگی اور منشائے حیات بن جائے اس قسم کی مثالوں پر، جو اصل میں دوسری صورت سے ملتی جلتی ہیں، ہم اس باب کے آخر میں نظر ڈالیں گے۔ یہاں تو ہم صرف اُن صورتوں سے بحث کرنا چاہتے ہیں جنمیں صریحی طور پر مذہبی عقائد کی تجدید اور از سر نو تعمیر ہوتی ہے۔ اور وہ بھی مسیحیت کے دائرے کے اندر رہ کر۔

یہ تینوں صورتیں جنکا ہم نے ذکر کیا ہے زمانۂ بلوغ کے اختتام کے وقت رونما ہوتی ہیں۔ ان کا واقع ہونا اِس بات کی علامت ہے کہ نوجوان نے ارتقائے نفسی میں ارتقائے

نفس، تہذیب نفس اور تکمیل نفس کے ایک اہم مرحلے کو طے کر لیا ہے۔ اب جو کیفیت پیدا ہوئی ہے وہ عموماً ایک مقابلتہً مستحکم بنیاد کی حیثیت سے آئندہ زندگی میں باقی رہتی ہے۔ غالباً ہمیشہ یہ فرضیہ غور کرنے کے بعد صحیح ثابت ہوگا کہ اس زمانہ کے بعد نفسی زندگی میں کوئی چیز جو بالکل نئی ہو پیدا نہیں ہوتی بلکہ انہیں رجحانات میں سے، جو بیس برس کی عمر میں بیدار ہو چکے تھے، بعض زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اور بعض جواب تک پیش پیش تھے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ پھر بھی ہم اس معاملے میں کوئی قطعی رائے دینے کی جسارت نہیں کرتے گیر ہارڈ بوہنے اس تیسرے دور کو "ترکیب نفسی کی تہذیب کا زمانہ" کہتا ہے اور اسطرح عمدگی کے ساتھ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانے میں انسان کو ذہنی زندگی کے ان پہلوؤں سے سابقہ پڑتا ہے جو بلا واسطہ مذہبی تو نہیں کہے جا سکتے لیکن مذہبی اہمیت ضرور رکھتے ہیں

اس زمانہ میں چاہے جو عقائد اور خیالات پیدا ہوں انمیں باوجود ان گوناگوں اختلافات کے ایک بات مشترک ہوتی ہے اور وہ اس بات کا احساس ہے کہ "یہ حقیقت میری ذاتی ہے" اس زمانے میں نہ تو قدیم روایات بے چون وچرا تسلیم کی جاتی ہیں اور نہ محض شک، نزاع، تجربے اور جستجو پر اکتفا کی جاتی ہے بلکہ چند محقق اور مسلم عقیدے قائم ہو جاتے ہیں۔ اب ان نوجوانوں کی زبان پر "میرا خدا" "میرا مسیح" "میرا ایمان" رہا کرتا ہے۔ اور اس احساس ملکیت اس پہلے وثوق سے وہ سعادت نصیب ہوتی ہے جو سوائے سکون قلب اور جمعیت خاطر کے کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ البتہ ایک بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک تھوڑی سی بے اعتمادی باقی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ نوجوان اپنے عقائد کو اپنے مخالفین سے چھپاتا ہے اور اسمیں تعصب اور تنگ نظری ہوتی ہے۔ مذاہب میں جو عجیب رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی عارضی اظہار کی صورتوں کو بھی تمام دنیا کے لئے واجب العمل سمجھیں اسکی جڑ یہی نفسیاتی کیفیت ہے جسے ایک قسم کی حفظ ماتقدم کی جبلت سمجھنا چاہیئے۔ یہ خواہش تو سب کو ہوتی ہے اور ہونا چاہیئے کہ اپنی سعادت میں دوسروں کو بھی شریک کریں۔ لیکن اسے

پورا کرنے کے لیئے بجائے محبت کے تلوار یا آگ سے کام لینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہیں بلکہ اپنے خدا کو مدد کا محتاج سمجھتے ہیں۔ جو لوگ منفی مذہبی عقیدہ رکھتے ہیں انہیں بھی ایک طرح کے مذہبی تعصب کا جوش پایا جاتا ہے۔ مختلف مذاہب نے خدا کے جو تصورات قائم کیئے ہیں اُن سب میں ایک ہی واحد، غیر متغیر، مشترک ذات کو دیکھنا ایسی دولت ہے جو انتہائی مذہبی پختگی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

اگر کسی نوجوان نے مذہبی احساس کا ٹوٹا ہوا رشتہ مسیحیت سے جوڑ لیا ہے تو اب وہ انجیل کو اور ہی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ پُرانی علامات میں اپنی واردات قلبی سے جان ڈال دیتا ہے۔ وہ الفاظ کے پردے میں ان معانی کا مشاہدہ کرتا ہے جو کبھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ پہلے دور میں جس چیز کی تلاش تھی وہ اب ملتی ہے۔

ارتقائے نفسی کا چوتھا درجہ یعنی خود پختہ زندگی ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اسکے آغاز کے ساتھ مذہب کے معاملے میں بلکہ ہر چیز میں آہستہ آہستہ سکون اور جمعیت خاطر حاصل ہونے لگتی ہے۔ گہری مذہبی طبیعت رکھنے والوں میں بھی مذہبی احساس کا وہ جوش اور ہیجان نہیں رہتا مگر یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اب مذہبی زندگی میں ہمیشہ کے لیئے توازن قائم ہو گیا۔ تقریباً ہر شخص کی زندگی میں آگے چل کر نئے طوفان اٹھتے ہیں جو کبھی تو طوفان خیز شباب کے بچے کھچے ہوتے ہیں اور کبھی نئے انقلاب کا پیش خیمہ بنکر آتے ہیں۔ ارتقائے نفسی کی پوری تکمیل کسی شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ اسرارِ الٰہی سے ہمارے راز و نیاز ہمیشہ جاری رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بڑھاپے میں بھی، جب عموماً کوئی نئے محرکات پیدا نہیں ہوتے، مذہب کے ایسے گہرے حقائق و معارف نظر آتے ہیں جو کبھی خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ مذہب وہ دائمی تان ہے جو ہماری عملی زندگی کے ہر سُر کے ساتھ بدلتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ وہ دائمی حرکت ہے جو ہماری تغیر پذیر زندگی اور ذاتِ الٰہی کے باہمی رابطہ سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی ذات میں کوئی تغیر نہیں ہوتا لیکن ہمیں وہ کبھی قریب نظر آتا ہے کبھی دُور، کبھی اس رنگ میں

کبھی اُس رنگ میں۔ اسطرح جو تصوّر خدا کا ہمارے ذہن میں ہے اُسمیں تبدیلی اور نشوونما ہوا کرتی ہے۔ مگر یہ تصوّر خواہ کسی رنگ میں ہو محض اُس شاہدِ حقیقی کے جمال کا عکس ہے جسکے حقیقی نور کا جلوہ کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

(۲)

جب نوجوان کا مذہبی ماحول شمالی جرمنی کے آزاد پروٹسٹنٹ مذہب کا سا نہ ہو جس میں دین کا رنگ ہلکا ہے اور دنیا کا گہرا، تو اسکی مذہبی نشوونما کسیقدر مختلف ہوتی ہے۔ جن حلقوں میں مذہبی زندگی ہمیشہ افراد کے شعور اور تمدّن کے نصب العین میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے اُن میں مذہبی ارتقار اور مذہبی تعلیم کی حالت ایسی نہیں ہوتی جیسی ہماری کھلائی ہوئی "اتوار کی مذہبیت" کی ہے جو اٹھارہیں اور انیسویں صدی کی "نئی روشنی" کی تحریک کے حملوں سے بچ رہی ہے۔ ہم یہ عام اصول قرار دے سکتے ہیں کہ جس ماحول میں مذہب کا گہرا اثر ہوگا وہاں نوجوانوں میں بھی ویسا ہی مذہبی جوش پیدا ہوجائیگا بشرطیکہ کوئی اور ذہنی تحریکیں موجود نہ ہوں جن سے یہ ظاہر ہو کہ مذہبی احساس کا موضوع روحانیت کی دوسری صورتیں بھی ہوسکتی ہیں۔

یہ مذہبی جوش جسے ہم لوگ اپنے نقطۂ نظر سے مذہبی تشدّد کہا کرتے ہیں۔ تاریخ میں مختلف صورتوں سے ظاہر ہوا ہے ایک حد تک کلیسائی مذہب میں بھی ہے لیکن زیادہ تر اُن فرقوں میں جو اسی اپنے تشدّد کی وجہ سے کلیسا سے علیحدہ ہوئے۔ ہم چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں جو ہمارے تمدّنی ماحول میں بھی پائی جاتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ کلیسائی عقیدہ جو بندھے ٹکے اصولوں کا یعنی تاریخی مذہب کا پابند ہے۔ نوجوانوں کے دلمیں مخالفت کے جذبات کو اُبھارتا ہے۔ تاریخی روایات کا احترام اس عمر میں پیدا نہیں ہوتا۔ بنی بنائی چیز نوجوانوں کی نفسی زندگی سے جو ابھی تک ہیجان کی حالت میں ہے مناسبت نہیں رکھتی۔ پابندی اور تقلید سے استحکام تو بیشک حاصل ہوتا ہے لیکن ذاتی نشوونما

کے لیئے کوئی میدان نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوان کم سے کم یہ کوشش ضرور کرتے ہیں کہ کسی ایسے فرقے میں شامل ہو جائیں جسمیں زیادہ آزادی ہو خصوصاً اُس حالت میں جب ماحول کے اثر سے اُن کا مذہبی احساس زیادہ گہرا ہو چکا ہو۔ لیکن اسکے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ کسی پر دہریت کا رنگ غالب آجاتا ہے، کوئی محض اعتباریت میں پھنسکر رہ جاتا ہے، کوئی ایک نیا عقیدہ اسی قطعیت کے ساتھ اختیار کرتا ہے جو پرانے عقیدے میں تھی اور اسمیں اتنا ہی تشدد ہوتا ہے جتنا اُس ذہنی ماحول میں تھا۔ نئے عقائد اختیار کرنے والوں میں اکثر پرانے عقیدوں کا گہرا اثر باقی رہتا ہے۔ جو علمائے دین مذہب سے فلسفے کی طرف رجوع کرتے ہیں اُن کے تشکیک اور نفی میں بھی مذہبی عقیدت کی جھلک نظر آتی ہے۔

پرانے کلیسائی مذہب میں زیادہ زور عقائد پر دیا جاتا ہے۔ لیکن اخلاقی احکام میں بھی اُسی تشدد سے کام لیا جاتا ہے۔ اول تو نوجوانوں کے لیئے اس اخلاقی ضابطہ کا حکمی ادرا دعائی لہجہ ہی ناقابلِ برداشت ہے دوسرے عہدِ شباب کی وضع نفسی جو اخلاقی معیار اپنے ساتھ لاتی ہے وہ اس سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ پھر ایک یہ دقت ہے کہ مذہبی اخلاق میں ہمیشہ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ انسان جو نیک کام کرتا ہے اسمیں خدا کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے۔ حالانکہ توفیق الٰہی کا احساس ایک ایسی چیز ہے جسمیں اور مذہبی احساسات سے کم اسکی گنجائش ہے کہ حکماً پیدا کیا جا سکے۔ نوجوانوں کو عموماً یہ سوال کرنے کا شوق ہوتا ہے:۔

"اے میرے پاک اور شعلہ مزاج دل

کیا یہ سب کچھ تو نے خود نہیں کیا ہے؟"

چنانچہ اس معاملے میں بھی عالی منش نوجوانوں کو ضد پیدا ہو جاتی ہے جو بات اُن کے سامنے قطعی اصول کے طور پر پیش کی جائے اسکی وہ مخالفت کرتے ہیں اور جو محض ایک خیال کی حیثیت سے ظاہر کردی جائے اسکی نہیں کرتے۔

مذہبی تشدد کی تیسری صورت یعنی بپٹیزم اور میتھوڈزم کا ذکر ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ کرینگے۔ یہ کہنا تو غلط ہے کہ ان فرقوں کی مذہبیت محض جذبات پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ جس مافوق لطبعی باطنی سلسلے سے یہ عقائد ابتدا میں نکلے تھے انمیں سے اب صرف ایک ہلکی سی روحانیت باقی رہ گئی ہے، جسے جذباتی زندگی کی نزاکتوں سے زیادہ تعلق ہے اور نظری تعلیم یا اخلاقی اثرات سے کم، نوجوان کلیسائی عقائد کو چھوڑ کر ان عقائد کو اسقدر خاموشی سے اختیار کرتے ہیں کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔ ہم یہ عام اصول قرار دے سکتے ہیں کہ چونکہ یہ عقائد جنمیں انفرادیت پر بہت زور دیا جاتا ہے اور اکثر کلیسا کی سخت مخالفت کی جاتی ہے، مشاہدۂ نفس اور تحلیل نفس کی خاص طور پر تلقین کرتے ہیں اس لیے نوجوانوں کو ان سے بہ نسبت قدیم مذہبی یا اخلاقی اذعانیت کے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ ان حلقوں کی بدولت ہمیں نوجوانوں اور بچوں کی مذہبی زندگی کے بہت مکمل نقشے ملے ہیں۔

لیکن ہمیں اس معاملہ میں حتی الامکان اُن باتوں سے قطع نظر کرنا چاہیے جو عارضی اور مقامی اسباب پر مبنی ہیں۔ اسکے بعد ایک چیز رہ جاتی ہے جو نہ صرف اس قسم کی مذہبی نشوونما میں بلکہ ہر عہد کے اخلاقی تصوّف میں بھی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلمیں بظاہر مذہبی بیداری دفعتہً پیدا ہوتی ہے اور اُن کے عقائد آناً فاناً بدل جاتے ہیں یہاں تک کہ اس انقلاب کا صحیح منٹ اور دقیقہ تک معین کیا جا سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ اُن کا احساس زندگی اور اُن کی سیرت کا سب سے گہرا طبقہ دنیاداری اور ظاہر پرستی کی سطح کو توڑ کر اُبھر آتا ہے۔ اکثر اس انقلاب میں اس انعام الٰہی کے لیے زہد و ریاضت، نفس کشی، تصفیۂ قلب اور مشاہدۂ نفس کے ذریعے سے طیاری کی جاتی ہے۔ لیکن مذہبی عقیدت اسے ہمیشہ خدا کی کارسازی سے تعبیر کرتی ہے جسکا ظہور مذہبی بیداری میں تو قلب کے اندر سے خود بخود ہوتا ہے اور تبدیل عقائد میں ماحول کے بیرونی اثرات پر مبنی ہوتا ہے خواہ یہ اثرات ایک شخص کے ہوں یا پوری جماعت کے۔

ان جیمبزوں کی تحقیق حسب تفصیل سے امریکہ کے ماہرین نفسیات ولیم جیمبس، اسٹینلے ہال اور خصوصاً اسٹاربک نے کی ہے کسی نے نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ شمالی امریکہ میں کسی کلیسا کے نہ ہونے اور آزاد فرقوں کے دَور دورے کے سبب سے وہاں کی مذہبی زندگی میں ان نفسیاتی مشاہدوں کے لیے جرمنی کے مقابلے میں کہیں زیادہ مواد مِل سکتا ہے۔

اسٹاربک نے فرد سوالات کے ذریعے جسکا امریکہ میں بہت رواج ہے ۱۲۶۵ اشخاص (۱۰۱۱ مردوں اور ۲۵۴ عورتوں) کے بیانات حاصل کیے ہیں تاکہ اسکا پتہ چلائے کہ لوگ عموماً کس عمر میں اپنے عقائد بدلا کرتے ہیں۔ لیکن ان بیانات سے ان مذہبی حلقوں کے متعلق کافی معلومات حاصل نہیں ہوتی جن سے ان اشخاص کا تعلق ہے۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ جوابوں سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس کلیسا (فرقے) کو لوگ ترجیح دیتے ہیں۔ البتہ میتھوڈسٹ لوگوں کی تعداد کسیقدر زیادہ ہے" تبدیل عقائد کی اصطلاح اسٹاربک کے یہاں وسیع معنی رکھتی ہے جسمیں ہر قسم کی نفسی مذہبی نشو ونما شامل ہے۔

اسکی تحقیق کے خاص خاص نتائج یہ ہیں۔ عقائد عموماً دس اور پچیس سال کی عمر کے درمیان تبدیل کیے جاتے ہیں۔ لڑکیاں زیادہ تر تیرہ اور سولہ سال کے درمیان اور اسکے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے عقائد بدلتی ہیں اور لڑکے زیادہ تر سولہ سال کی عمر میں اور اس سے کم بارہ یا اٹھارہ انیس سال کے بین بین۔ اسٹاربک نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ زمانہ جسمانی بلوغ سے فوراً پہلے یا اسکے فوراً بعد ہوتا ہے۔ اسکی بنا پر اس کا خیال ہے کہ شہوت جنسی کی نشو ونما اور مذہبی نشو ونما میں ضرور کوئی تعلق ہے۔ مگر اسٹینلے ہال کا دعویٰ ہے کہ اسے اس تحقیق میں اولیت کا فخر حاصل ہے۔ وہ بارہ پہلوؤں سے مذہبی زندگی کا تعلق شہوت جنسی اور عشق سے ثابت کرتا ہے۔ اسکے نزدیک جس عمر میں ان جذبات کی نشو ونما کے واقعات کثرت سے نظر آتے ہیں اسی عمر میں تبدیل عقائد کی مثالیں بھی زیادہ ملتی ہیں۔

"تبدیل عقائد" کی تمہید اسٹاربک نے ذیل کی چیزوں کو قرار دیا ہے جنکا اُس نے

بغیر کسی ترتیب کے ذکر کر دیا ہے :-

خوف اور دوسرے استیثاری محرّکات ، ایثاری اور اخلاقی نصب العین ۔ ضمیر

کی ملامت اور گناہ کا احساس ، مذہبی تعلیم کی تائید ، نمونہ اور تقلید ، سماجی دباؤ وغیرہ وغیرہ

اسکے خیال میں اس تبدیلی کے بعد انسان کی شخصیت بلند تر اور اُسکا نفس وسیع تر ہو جاتا ہے

اور اسکے دلمیں تجدید زندگی کا احساس پیدا ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس انقلاب سیرت کی

طیّاری تحت الشعور میں پہلے سے ہونا ضروری ہے ۔ مگر اسٹاربک بے تامّل عضویاتی

نقطۂ نظر سے نئے اعصابی خلیوں کی تعمیر کو اسکی علت قرار دیتا ہے ۔ مذہبی بیداری کی

تمہید اسکے خیال میں عموماً ان دو چیزوں میں سے ایک ہوتی ہے " طوفان و زلزلہ " (یعنی

عملی اور اخلاقی کشمکش) اور نظری شکوک ۔

افسوس ہے کہ اسٹاربک نے کہیں بھی کسی شخص کی فوری مذہبی بیداری اور

تبدیل عقائد کا کوئی مسلسل بیان خود اسکی زبانی نقل نہیں کیا ہے ۔ بلکہ اس نے ان کی

شہادتوں کو اپنے سوالات کے جوابوں کی حیثیت سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے لکھا ہے ۔ مگر

ہم چند شہادتیں نقل کرتے ہیں جو مثالی اہمیت رکھتی ہیں تاکہ ان واقعات کا کچھ اندازہ ہو سکے

" مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے گناہ بخشدیے گئے اور عمر بھر میں پہلی بار مجھے " نماز جماعت "

میں سچی خوشی حاصل ہوئی ۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ مجھ میں اور جماعت کے ارکان میں جن سے

میں گفتگو کر رہا تھا کوئی چیز مشترک ہے مجھے اُن سے گفتگو کرنے میں بہت لطف آتا تھا

اور یہ احساس کہ اب خدا کے نزدیک میں بے گناہ ہوں " (ایک پندرہ سال کی عمر کا لڑکا)

——— " مجھے چار برس سے یہ آرزو تھی کہ سچی مسیحیہ بن جاؤں لیکن یہ اطمینان نہیں ہوتا

تھا کہ میرے گناہ بخش دیے گئے ہیں ۔ ایک دن صبح کے وقت جب میں اپنے کمرے میں بیٹھی

پڑھ رہی تھی ایسا معلوم ہوا کہ دفعتہً مجھے تسکین قلب حاصل ہوگئی - میرا دل مسرت سے معمور ہوگیا" (تیرہ سال کی لڑکی) ——— "میں اپنی تبدیل مذہب کا کوئی سبب نہیں بتا سکتا - میں مسیحی بننا چاہتا تھا اور اپنے گناہوں کے بخشے جانے کی دعا کرتا تھا مگر میں نے کسی سے اسکا ذکر نہیں کیا تھا - دفعتہً تسکین قلب اور عفو گناہ کے احساس نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسی لمحے سے میری مذہبی زندگی شروع ہوئی ہے - یہ بات بغیر میری فکر اور کوشش کے خود بخود پیدا ہوگئی (چودہ برس کا لڑکا)

جو طریقہ یہاں اختیار کیا گیا ہے اور جو اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں اُن میں امریکی رنگ اسقدر جھلکتا ہے کہ ہم بے سوچے سمجھے ان مثالوں سے اپنے ملک کے نوجوانوں کے نفسیاتی مطالعے میں کام نہیں لے سکتے - ہمارا مدت تک یہ خیال تھا کہ یہ چیزیں امریکہ کے مخصوص طرز زندگی کا نتیجہ ہیں اور ہمارے یہاں ان سے مشابہت رکھنے والی زیادہ سے زیادہ چند مثالیں تجدید زندگی اور بخشش کا فوری احساس پیدا ہونے کی میتھوڈیٹ اور ...... حلقوں میں ملتی ہے - بلکہ وہ بھی ان حلقوں کی مذہبی اجتماعی زندگی کے اثر سے کوشش کر کے پیدا کی جاتی ہیں -

اسمیں شبہ نہیں میتھوڈیسٹ لوگوں میں جو طریقے تعزیر نفس (   )
کے اور جو فن روحانی ریاضت . بیعت اور مذہبی بیداری کا جاری ہے اسکا اثر کے حلقے کے نوجوان پر خاص طور پر گہرا پڑتا ہے - پھر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی - آخر کیا وجہ ہے کہ ان فرقوں میں تو نوجوانوں کے عقائد میں شدید اور فوری انقلابات واقع ہوتے ہیں اور کلیسائی مذہبوں میں اُن کی مذہبی نشو و نما خاموش اور مسلسل ہوتی ہے - اس فرق کی توجیہ ہم یہ کرتے تھے کہ کلیسائی مذاہب میں آج کل مذہبی احساس معتدل ، پُرسکون اور منظم ہوگیا ہے - اور آزاد فرقوں میں دینی حرارت اور اُپج زیادہ ہے جسکا آتش فشاں مادہ دفعتہً پھوٹ نکلتا ہے اور نفسی زندگی میں زلزلہ ڈالدیتا ہے - مگر آہستہ آہستہ ہم اس نتیجے پر

پہنچے کہ مذہبی زندگی کی اندرونی نشوونما کو محض اجتماعی ماحول کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں۔
بےشک باضابطہ کلیسائی مذہب میں جو ایک "دستور اساسی" پر مبنی ہوتا ہے مذہبی جوش
ان فرقوں سے کم ہوتا ہے جنکا مقصد ہی یہ ہے کہ ان کے ارکان ایک دوسرے کے مذہبی
جذبات کو اُبھار دیں اور اس بنا پر مقدم الذکر ماحول میں خاموش مذہبی ارتقا کا اور مؤخرالذکر
میں شدید انقلابات اور فوری تبدیل عقائد کا زیادہ موقع ہے۔ لیکن مخصوص موقع کا ہونا
کسی چیز کے وقوع کے لیے کافی نہیں۔ اگر ان انقلابات کی بنا خود نفس کی ترکیب اور اس کے
طرز ارتقا پر نہ ہوتی تو یہ آزاد فرقوں میں بھی رونما نہ ہوتے،

اس لیے ہمیں اسطرف توجہ ہوئی کہ جہاں اس قسم کے انقلابات پیدا کرنے کی باضابطہ
کوشش نہیں ہوتی وہاں بھی انہیں تلاش کریں، اور اس تلاش سے یہ پتہ چلا کہ یہ باتیں
ہر تمدنی ماحول میں کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ یہ واقعات
ہمیشہ ایسی صورت اختیار کریں جسے لوگ مذہبی سمجھیں بلکہ نفسیاتی حیثیت سے اُن میں یہی خاص
دلچسپی ہے کہ وہ خالص دنیاوی معاملات میں یعنی "دنیاوی مذہبیت" کی شکل میں ظاہر ہوتے
ہیں۔ اس حیثیت سے اُن کی اہمیت اور وسیع ہو جاتی ہے کیونکہ اب وہ نوجوانوں کی عام
نفسی ارتقا کے مظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ اسٹاربک نے بھی اپنی کتاب کے گیارہویں
اور بارہویں باب میں اس قسم کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ماہر نفسیات کا یہ کام ہے کہ وہ
ان مذہبی انقلابات کو خاص طور پر ہر ایسے ماحول میں تلاش کرے جو بظاہر مذہبی اثر سے
خالی ہے۔ یہ تجدید زندگی کا احساس خود احساس کرنے والے کی نظر میں بھی مخصوص مذہبی
حیثیت نہیں رکھتا۔ بعض اخلاقی بیداریاں ایسی ہیں جنھیں لوگ یا تو مذہبی نہیں کہتے۔ یا اگر کہتے
ہیں تو بہت وسیع معنی میں۔ روسو کے دل پر دینسنیس جاتے وقت جو واردات گذری وہ
اصل میں اسی قسم کا ایک انقلاب تھا۔ فرشتے کا "عین" کا تخیل بھی، جس سے اسکے خیال میں
دنیا کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا، اسی قسم کی ایک واردات قلبی تھی۔ ہمارے زمانے میں جو

"تحریک شباب" کے بنیادی اصول بھی آگے چلکر مذہبی بیداری ثابت ہوں گے۔ یہی مذہبی
بیداری جمالیات کے ایک نئے احساس کی، ایک علمی نظریے کی، اجتماعیت پسندی کی، ترک
بادہ نوشی کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ یہ سب باتیں میتھوڈسٹ عقائد سے جسقدر بے تعلق ہوں
اُسیقدر وہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ہم ان سے اُس مذہبی نشو و
نما کے سلسلے میں بحث کرینگے جو شعوری مذہبیت سے خالی ماحول میں واقع ہوتی ہے اور جسے
لوگ مذہبی سمجھتے ہی نہیں (باب چہاردہم)

یہاں ہم اس تیسری قسم پر محض ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

(۳)

نوجوانوں کی مذہبی نشوونما پر اس ماحول کا اثر دیکھنے کے لیے جو لامذہبانہ کہلاتا ہے لیکن
اصل میں مسیحی مذہب کا مخالف یا اُس سے بے تعلق ہوتا ہے ہم اُن حلقوں کا انتخاب کرتے ہیں
جنمیں فلسفیانہ آزادخیالی بلکہ بے دینی کی حکومت ہے یا بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ نتے
زندگی سے بالکل بے خبر ہو کر یا مذہب سے بے تعلق ہو کر تو کوئی انسان نہیں رہ سکتا۔ بہرحال
یہاں مذہب سے بے تعلق ہونے کے معنی صرف مسیحیت اور اسکے لاہوتی تصور کائنات سے
واسطہ نہ رکھنے کے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ امکان باقی رہتا ہے کہ انسان زندگی کی آخری
قدور کو کسی اور جگہ تلاش کرے۔

مذہب سے سب سے زیادہ بعید نطرت پسندانہ تصور کائنات معلوم ہوتا ہے جسے ہم
مادیت کہتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ مادیت ہے کیا چیز۔

اس لفظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں: مادیت بہ حیثیت عملی اصول کے۔ اور مادیت بحیثیت
ایک نظریے کے۔ مقدم الذکر معنی میں مادیت گویا حسی لذات پر مبنی اور ذہنی قدور سے خالی
زندگی کا نام ہے۔

طرز زندگی ایک قسم کا عقیدہ بھی بن سکتا ہے جیسا لوتھر کے مختصر اور چبھتے ہوئے فقرے

سے ظاہر ہوتا ہے "شکمِ باطل، خدائے باطل" جس زمانہ میں اقتصاد کا مرکز زر ہو سمیں ممکن ہے کہ
لذت پرستی کی قائمقام طمعِ زر ہو۔ ایسی حالت میں دولت پرستی کا تصورِ کائنات پیدا ہوتا ہے
اس تصورِ کائنات کو سرمایہ داری کا لازمی نتیجہ سمجھنا تو بغض پر مبنی ہے لیکن اس سے انکار نہیں
ہو سکتا کہ جو سرمایہ داری، محبت، روحانیت اور گہرے احساسات سے خالی ہوگی اسمیں
آسانی سے یہ خرابی پیدا ہو جائے گی بلکہ جو اقتصادی نظام بھی خود غرضی پر مبنی ہوگا اُس میں
کبھی نہ کبھی یہ رجحان پیدا ہو جائیگا۔ یہ رجحان اس قسم کے تمدن کے سرمایہ داروں اور
مزدوروں میں یکساں نظر آتا ہے۔ دونوں حسّی لذات اور صنعتی افادات کے شیدا ہوتے ہیں
اور کبھی اپنے دل سے یہ سوال نہیں کرتے کہ زندگی کا کوئی اور مقصد بھی ہے یا نہیں۔ لیکن دونوں
میں زیادہ قصوروار وہ لوگ ہیں جنھیں کم سے کم مالی اعتبار سے یہ آزادی حاصل ہے کہ بہتر اور
بلند تر زندگی بسر کر سکیں۔

مادیت بہ حیثیت ایک نظریے کے بالکل دوسری چیز ہے۔ یہ سائنس کے طرزِ خیال کے
یکطرفہ اثر سے پیدا ہوتی ہے۔ سائنس کی حکومت لوگوں پر اس لیئے ہوتی ہے کہ اس کا نقطۂ
آغاز وہ چیزیں ہیں جنکا تجربہ حواس سے ہو سکتا ہے اور وہ اپنے اصول صحت کے ثبوت
میں صنعتی کامیابیوں کو پیش کرتا ہے جو انہیں اصول کی بنا پر حاصل ہوئی ہیں۔ یہ تصورِ کائنات
خواہ کتنا ہی بے مایہ ہو بہر حال اسکا مرکز ایک طرح کا علم ہے اس لیئے مادیت بھی اصل میں ایک
طرح کا ذہنی مشرب ہے۔ یہ علم پرستی "نئی روشنی" کی یادگار ہے جس نے انگلستان اور
فرانس میں آہستہ آہستہ ثبوتیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ثبوتیت کا نصب العین یہ
ہے کہ واقعات کا علم اور علت و معلول کا علم حاصل کرے۔ لیکن نئی روشنی کی طرح اسمیں ابتداہی
سے ایک عملی رجحان بھی ہے۔ علم کے ذریعے سے انسان نہ صرف فطرت پر تصرف اور حکومت
کرنا چاہتا ہے (اقتصادی صنعت) بلکہ سماج پر بھی (سماجی صنعت) اور ان طبعی، نفسی
اور سماجی واقعات کے علم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ سماج اور افراد دونوں کو انتہائی راحت

نصیب ہوگی۔

اسطرح کی ثبوتیت کا اثر پچھلی صدی کے وسط سے جرمنی پر پڑ رہا ہے۔ خصوصاً انقلاب پسند اجتماعیاتی نظریوں کی شکل میں۔ علاوہ اسکے کوئی ۱۵۰ سال سے ثبوتیت سے بعض ایسے نتائج نکالے جاتے ہیں جنکا اثر مذہب اور تصور کائنات پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق تمدنی ارتقا اصل میں ثبوتی اور مفید علم کی نشو ونما کا نام ہے۔ ثبوتیت کے فلسفۂ تاریخ کا نچوڑ مشہور ادوار ثلاثہ کا قانون ہے جسکی رو سے ذہنی ارتقا کا آغاز مذہبی اساطیری طرز خیال سے ہوتا ہے، اسکے بعد مافوق الطبعیات کا زمانہ آتا ہے۔ اور آخر میں ثبوتی تجربی علم کی حکومت اور علوم مخصوصہ کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ثبوتیت کے نقطۂ نظر سے انسانی سماج کی فلاح کا بس یہی ایک ذریعہ ہے کہ انمیں علوم کی روشنی پھیلائی جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نظریۂ ثبوتیت کا خیال تاریخ کے متعلق کیا ہے۔ اس کی رو سے مذہب ایک متروک نقطۂ نظر ہے کیونکہ اُسے فرضی لاہوتی دنیا سے سروکار ہے۔ وہ خود پیچیدہ مافوق الطبعی اصطلاحات ومعانی کے کہرے میں گھرا ہوا ہے اور سماجی زندگی کے واقعی حالات سے جو فطرت کے قوانین پر مبنی ہیں بے خبر ہے۔

یورپ خصوصاً جرمنی میں پچھلی نصف صدی میں (سنہ ۱۸۷۰ء تا سنہ ۱۹۲۰ء) صنعتی مزدوروں کے تصور کائنات پر زیادہ تر مارکس کے فلسفہ کا اثر رہا ہے۔ جسکا فلسفۂ تاریخ ہیگل کی منطق پر مبنی ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اسمیں دو اور ذہنی تحریکیں بھی شامل ہیں۔ ثبوتیت اور مادیت۔ مزدوروں کی مادیت ایک خاص قسم کی ہوتی ہے۔ اسمیں مادی طرز زندگی کا اتنا دخل نہیں جتنا اُس طرز خیال کا جسکا مرکز سماج کی اقتصادی زندگی کے واقعات ہیں۔ جنکی توجیہ سائنس یعنی عوام پسند مادہ وقوت کے نظریے اور ڈاروِن اور ہیکل کے نظریۂ ارتقاء کی رو سے کی جاتی ہے۔ یہ خیالات ثبوتیت سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ . . . .

. . . . اسی لئے یہ لوگ "علمی" اجتماعیت پسندی کے بلکہ مطلق

علم کی برکات کے اِس قدر قائل ہیں۔

اس تاریخی سلسلے کو جاننا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ پچاس سال سے جرمن پروٹسٹنٹ مزدوروں کی ذہنی ترکیب کی بنیاد اسی پر ہے اگرچہ وہ خود اس سے واقف نہیں ہیں۔ خود اُن لوگوں کو جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، اپنے طرزِ خیال کے تاریخی ماخذ کا علم نہیں ہوتا تو بیچارے مزدوروں کو کیا ہوگا۔ یہ اثرات روزمرہ کی ذہنی زندگی کی فضا میں ہوتے ہیں جسمیں انسان سانس لیتا ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مزدور، جسکی زندگی اقتصادی اعمال سے، آج کل کی مشینوں کی پیداوار اور اسکی علمی بنیاد سے وابستہ ہے، قدرتی طور پر یہ طرزِ خیال اختیار کرتا ہے۔ لیکن اگر مجموعی تمدّنی زندگی بدل جائے تو اسکے خیالات بھی بدل سکتے ہیں۔ اس لیئے یہ کہنا مبالغہ ہے کہ مزدور کی بے دینی کا سبب محض مارکس کی مادیت اور اسکی علم پرستی ہے جو اجتماعیاتی نبوتیت کے ساتھ مِل جل گئی ہے۔ اسی نفسیاتِ شباب کی تحقیق کے سلسلے میں یہ پتہ چلتا ہے کہ اسکی ایک اور اہم وجہ بھی ہے۔

گیونتھر ڈین جسنے بہت اہتمام سے اس بات کی تحقیقات کی ہے کہ مزدوروں کو خصوصاً نوجوان مزدوروں کو، مذہب اور کلیسا سے کیا تعلق ہے۔ اپنی کتاب "بڑے شہروں کے نوجوان" میں کہتا ہے:۔

"محقق کو جس بات سے، سب سے زیادہ حیرت اور افسوس ہوتا ہے، وہ ان لوگوں کی مذہب اور کلیسا سے نفرت ہے اور نہ ان کا آزاد خیالی کا یا علم پرستی کا عقیدہ جو کبھی کبھی کسی ذہین مزدور میں پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں تو بیرونی اثرات پر مبنی ہیں اور کلیسا سے نفرت کرنے والوں یا آزاد خیالوں کی تعداد اجتماعیت پسند (سوشلسٹ) اخباروں اور کتابوں کے پڑھنے والوں کی کمی بیشی کے تناسب سے گھٹا بڑھا کرتی ہے۔ حیرت اور افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ یہ لوگ مذہب اور کلیسا سے دست بردار ہو گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ بے تعلقی مزدور کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ انہیں خدا سے کوئی سروکار نہیں۔ مذہبی باتیں اُن کی

زندگی سے مفقود ہوگئی ہیں۔ وہ انہیں سمجھتے تک نہیں۔ اصل میں یہ بے تعلقی اور بے پروائی مزدور کی مذہبی زندگی کے مسئلے کا مخصوص اور اہم پہلو ہے .... بیشک مزدوروں میں بھی بعض لوگ ایسے ہیں جو تحقیق اور تلاش سے کام لیتے ہیں، فاؤسٹ کے خیالات سے واقف ہیں، اور بڑی کشمکش کے بعد مسیحی مذہب کو ترک کرتے ہیں اور اپنا الگ فلسفہ تعمیر کرتے ہیں لیکن ایسے لوگ معدودے چند ہیں۔ عام لوگوں کی مذہب سے علیحدگی ایک وحشیانہ انقلاب کی صورت میں ہوئی۔ دفعتہً مذہب اور کلیسا کا اثر ان کی زندگی سے ہٹ گیا۔ اور یہ معلوم ہوا کہ بغیر ان چیزوں کے بھی کام چل جاتا ہے۔ مجھے کہیں ایسی مثالیں نہیں ملیں کہ بچپن کے مذہبی تصورات کو ترک کرنے میں لوگوں کو تکلیف یا دقت محسوس ہوئی ہو۔"

اسکی سب سے بڑی وجہ ڈین کے نزدیک زندگی کا وہ ماحول ہے جسمیں مزدور رہتا ہے "مذہب اقتصادی حالات کی گاڑی کے پہیوں میں پس گیا اور اس دن سے آج تک اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا۔" اسمیں شک نہیں کہ یہ توجیہہ، جو خود مارکس کے رنگ میں ہے مزدوروں کی حالت کے لیے صحیح ہے۔ کیونکہ مارکس نے ایک تاریخی عہد کی، یعنی خود اپنے زمانے کی تفسیر صحیح کی ہے۔ لیکن اس سلسلے کی بہت سی نفسی کڑیاں غائب ہیں جنھیں نفسیات شباب ہی ڈھونڈ سکتی ہے۔

پہلی بات تو ظاہر ہے کہ نوجوان مزدور کو، وہ ذہنی ماحول جسمیں وہ آج کل نشو و نما پاتا ہے، مذہب اور کلیسا سے نفرت دلاتا ہے۔ خود گیونتھر ڈین نے اپنی نئی کتاب "نوجوان مزدوروں کے مذہبی خیالات" میں اسکی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ اس نے ہمیں آج کل کی عام سیاسی حالت اور کلیسا کی سیاسی حالت بھی دکھائی ہے۔ مزدوروں پر صرف اسی خیال کا اثر نہیں کہ خدا اور مذہب محض امیروں کا ڈھکوسلا ہے بلکہ اس کا بھی ہے موجودہ پروٹسٹنٹ کلیسا کو امیروں کی قوم پرستی اور شاہ پسندی سے بہت گہرا تعلق ہے یعنی اصل میں اسکی بنیاد سیاسی مصالح پر اور ذی مقدرت طبقے کے مجموعی طرز زندگی پر ہے۔

لیکن اور اہم چیز بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ نفسیات ارتقا کی ایک حقیقت ہے کہ باطنی مذہبی زندگی کی نشو و نما کے لیئے خاموشی اور جمعیت خاطر کی ضرورت ہے۔ اگر مزدور پیشہ نوجوانوں کو بھی وہی سکون و اطمینان نصیب ہو جو خوشحال طبقے کے نوجوانوں کو ہوتا ہے تو اُن میں بھی غالباً ایک خاص قسم کی مذہبیت پیدا ہو جائیگی۔ بجائے اسکے وہ بچپن سے واقعی زندگی کی کشمکش میں ڈھکیل دیے جاتے ہیں۔ اُن کی قوت احساس اور تخیل کی بلند پروازی کو نشو و نما کا موقع نہیں ملتا۔ ان کا غنچۂ نفس اگر کبھی کھلا بھی تو ذرا دیر کے لیئے تھوڑا سا کھلتا ہے اور کھلتے ہی مرجھا جاتا ہے۔ خدا کو کمسنی میں ڈھونڈھنے اور پانے کے لیے انسان کو تھوڑی دیر خلوت میں تصور اور فکر کا بھی موقع ملنا چاہیئے۔ لیکن کیا اس بچے کو، جو چودہ برس کی عمر میں روحانیت سے خالی کسب معاش کے دہندوں میں جھونک دیا جائے ہے کبھی چین سے روحانی پختگی حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ بہت سی باتیں دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہیں۔ آگے چلکر یہ کمی پوری نہیں ہو سکتی۔ نفسی بلوغ اندر سے اُبھرتا ہے مگر باہر سے کچل دیا جاتا ہے۔ لیکن ہم ابھی دکھائیں گے کہ اسکے باوجود بھی ان کے نفس میں مذہبی احساس کی جھلک نظر آتی ہے۔

ابھی تو ہمیں اس تیسری چیز کا ذکر کرنا ہے جس سے کمسنی میں مذہبی جذبات کچھ دب جانے کی توجیہ ہوتی ہے۔ مزدور پیشہ نوجوانوں کے ماحول میں عموماً ایسے جاں نواز اور جاں بخش اشخاص نہیں ہوتے جو محبت اور ہمدردی کے ساتھ اُسکے نفس کی خبر گری کریں۔ حالانکہ مذہبی زندگی میں کتابوں سے یا درس سے اُتنا فیض نہیں پہنچتا جتنا مذہبی آدمیوں کی صحبت میں رہنے سے، جو نوجوانوں کے سربستہ غنچۂ نفس اور اسکی طفلانہ جستجو کو سمجھیں اور اسکی مدد کریں۔ ایسے لوگ جو نوجوانوں کی روح کو بیدار کر سکیں موجود تو ہیں مگر جسطرح سب کہیں یہ برگزیدہ افراد کم ہوتے ہیں، یہاں بھی کم ہیں۔ یہ سنکر دل پر بڑا اثر پڑتا ہے کہ ہامبرگ کے بندرگاہ کے آوارہ گرد لوگ جو "گنڈے" کہے جاتے ہیں پادری

کلیمنس شلٹسے کو "ہمارا پادری" کہتے تھے اور بڑے شوق سے اُن کے پاس برکت لینے کے لئے آتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں اثر پذیری کی کوئی راہ ضرور کھلی تھی۔ نوجوانوں کے نفس کے گہرے بھید مارکس کے تصوّر کائنات کی سطحی عقلیت سے وُسعت اور روحانی دولت میں بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن "پیام الہٰی" کا دنیا میں موجود ہونا کافی نہیں اس کی تبلیغ بھی ضروری ہے۔ اور تبلیغ محض درس دینے یا وعظ کہنے سے بڑھ کر ہے، اس کے لیے ضرورت ہے کہ انسان خود ایک بلند شخصیت، اور دوسروں کے دلمیں بلند جذبات و خیالات کو اُبھارنے کی قوت رکھتا ہو۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ جرمنی کے بڑے شہروں میں مزدور پیشہ نوجوانوں کی مذہبی زندگی کی کیا حالت ہے گیونتھر ڈین کی طرح محض کلیسا اور کلیسائی مسیحیت سے اُن کا تعلق دریافت کرنا کافی نہیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو اُن کے عملی رویّے سے یہ پتہ چلانا چاہیئے کہ ان کے قلب میں وہ نقطہ کہاں واقع ہے جہاں زندگی کی انتہائی اور اعلیٰ قدر کا احساس موجود ہے۔ کیونکہ باضابطہ مذہب میں اور بے ضابطہ ذاتی عقائد میں، جنپر انسان نے خود بھی کبھی غور نہیں کیا ہے، بہت فرق ہے۔

البتہ مزدور پیشہ نوجوانوں کا جو خیال کلیسا اور مذہب مسیحی کے متعلق ہے اُس کا گیونتھر ڈین اور ایرنسٹ لاؤ کی مشترک تحقیقات سے اچھا خاصا اندازہ ہوجاتا ہے۔ حالانکہ جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا ہے وہ قابل اعتراض ہے۔ اس تحقیقات کا مواد وہ مضامین ہیں جو تعلیم مزید کے مدرسوں کے طلبہ سے اسطرح لکھوائے گئے ہیں کہ انہیں تین بے جوڑ لفظ دیدیے گئے جنمیں آسانی سے ربط پیدا کیا جا سکے (مثلاً خدا۔ مدد۔ موت؛ خدا۔ نماز۔ فطرت، خدا۔ حریت۔ وطن)۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسطرح نوجوانوں کا شعور ایک خاص سمت موڑ دیا جاتا ہے حالانکہ شاید فطری طور پر وہ یہ رُخ اختیار نہ کرتا۔ اور یوں بھی مدرسے میں طلبہ جو مضمون لکھتے ہیں انمیں بہت سی "فرمائشی" چیزیں ہوتی ہیں، بہت سی سُنی سُنائی

باتیں، بہت کچھ بناوٹ۔ کوئی شخص بھی حکم پاتے ہی بیٹھ کر اپنے سچے مذہبی خیالات قلمبند نہیں کرسکتا تو پھر نوجوان سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے۔ خود ڈین کو بھی اپنے طریقے کے غلط ہونے کا کسی قدر احساس ہے۔ اُس نے بہت سے بیانات اس لیئے نظر انداز کردیے ہیں کہ اُن میں مکتبی مشق، ادبی ٹکسالی عبارت یا بلند پروازی اور تصنع کا رنگ بہت غالب ہے۔ تاہم ان ۰۰ ۲۴ مضامین سے کچھ نہ کچھ مفید معلومات ضرور حاصل ہوتی ہے۔

پہلی بات تو اُن سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ نوجوان بہت بڑی حد تک اُن خیالات کے پابند ہوتے ہیں جو وہ روزمرّہ سنتے ہیں۔ کیونکہ ان کی رائے اپنی رائے نہیں ہوتی بلکہ وہ جو فرد دروں کی ہونا چاہیئے۔ اس لیئے وہ مذہب مسیحی کو اور ہر لاہوتی عقیدے کو اُمرا کا عقیدہ سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ مذہب کے اس حد تک منکر نہیں ہیں جتنا ڈین نے انہیں اپنی کتاب "بڑے شہروں کے نوجوان" کی مذکورہ بالا عبارت میں ظاہر کیا ہے۔ بیشک ان لوگوں کے دل سے مذہبی احساس جاتا رہا ہے لیکن اس تاریخی قوت کا بہت کچھ اثر اب بھی باقی ہے۔ یہ اثرات زیادہ تر اُن مذہبی رسوم سے متعلق ہیں جو ہر فرد کی زندگی کے اہم مواقع پر ادا کی جاتی ہیں۔ اصطباغ، تبریک، نکاح، تجہیز و تکفین، ان رسوم کا قائل ہونا صرف لڑکیوں تک محدود نہیں ہے۔ البتہ انہیں ان چیزوں میں لڑکوں سے زیادہ انہماک ہوتا ہے۔ اسکی جو توجیہ ڈین نے کی ہے، کہ لڑکیاں زیادہ قدامت پسند ہوتی ہیں اور اُن میں آزادی سے غور کرنے کا مادّہ کم ہے، وہ صحیح نہیں۔ اس توجیہ میں عقلیت کا عنصر ضرورت سے زیادہ ہے عورتوں کی فطرت ہی میں مذہبیت کا عنصر زیادہ ہے کیونکہ ان کا نفس غیر منقسم ہوتا ہے اور وہ "عقلیت" پر جسکا اثر عوام پر بھی برائے نام ہی ہے آنکھ بند کرکے ایمان نہیں لاتیں۔

نوجوان لڑکوں میں مسیحی تصورِ کائنات کا جو کچھ اثر باقی رہ گیا ہے وہ ایک حد تک اٹھارویں صدی کے "نئی روشنی" کے خیالات سے مشابہ ہے۔ اُن کے دلمیں خدا، کائنات اور اخلاقی نظام عالم کے وہ پھیکے اور بے رنگ تصورات ہیں جو عوام پسند فلسفہ

نے قائم کیے ہیں۔ اسکے علاوہ جو اثر ہے وہ آج کے سائنس کی روشن خیالی کا ہے جسکا تصور کائنات بالکل ناسوتی ہے۔ ڈارون، ہیکل اور دوسرے ثبوتیین حقیقت کے پیام بر بلکہ اکثر سچ مچ کے پیغمبر سمجھے جاتے ہیں۔ فطرت خدا بنادی گئی ہے۔ اسے محض ایک تخریبی قوت نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس خاکستر میں جو مذہبیت کی چنگاری ہے اُسے دیکھنا چاہیئے۔ یعنی کائنات اور اسکے قوانین کا احترام۔

دوسری تخریبی قوت کی بھی یہی صورت ہے۔ لوگوں کا عقیدہ دنیا کی بے انصافی فطرت کی بیرحمیوں، جنگِ عظیم کی ہولناک مصیبتوں اور دعا کی بے اثری کی بدولت برباد ہوگیا ہے مگر ہمارے خیال میں عدل خداوندی کے مسئلے میں اسقدر انہماک بھی گہرے مذہبی احساس پر مبنی ہے۔ کیا یہ مذہبیت نہیں ہے کہ انسان کے ذہن میں خدا کا تصور اس تصور سے بدرجہا بلند ہے جو دنیا کو سرسری اور سطحی نظر سے دیکھنے کے بعد قائم ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ خدا کے بے انصاف ہونے سے تو اُسکا نہ ہونا ہی اچھا ہے؟ کیا انکار و نفی کے اس جوش و خروش میں مایوس شدہ مذہبی آرزو کی جھلک نظر نہیں آتی؟

ان مشکلات پر غالب نہ آسکنے کا ایک سبب تو جذبات کی بے مائگی ہے اور دوسرا یہ ہے کہ نوجوانوں کی روح اِس تصوّر کائنات کی جنگ میں تنہا ہوتی ہے اور کوئی اسے سہارا دینے والا نہیں ہوتا۔ اسکی سیدھی سادی طبیعت جسکے ادراک و احساس کا دارومدار محض واقعی زندگی اور تنازع للبقا پر ہے اس مہم کو سر نہیں کر سکتی۔ وہ خدا سے ہر مصیبت میں خصوصاً اس سخت ترین مصیبت میں بلا واسطہ مدد کی توقع رکھتا ہے۔ یہ لامذہبی نہیں ہے بلکہ اسکی محرّک سچی مذہبیت ہے۔ لیکن یہ ایک سیدھا سادہ مذہب ہے جسمیں انجیل کی اس آیت کے لفظی اور ظاہری معنی لیئے جاتے ہیں "مصیبت میں مجھے پکار۔ میں آکر تجھے نجات دونگا" اور جن لوگوں کی زندگی کا نصب العین اقتصادی فارغ البالی اور تھوڑی بہت جسّی لذتیں رہ گئی ہوں ان کا مذہب اس سے آگے بڑھ بھی نہیں سکتا جب تک کوئی ایسی تدبیر نہ کی جائے

کہ ان کے گہرے روحانی چشمے ابلنے لگیں۔

ایک نوجوان صاف صاف لکھتا ہے "بہت سے لوگ مذہب کے قائل ہیں۔ ہمارے بڑوں میں سے بعض اسکے عادی ہوگئے ہیں۔ میری چچی بھی ان لوگوں میں سے ہے جو دل سے مذہبی احکام کو مانتے ہیں۔ لیکن اسکی حالت بھی کچھ ہم سے بہتر نہیں۔ پھر بتائیے کہ ایسے اس سے کیا مل جاتا ہے؟ ایک اور نوجوان اس سے بھی زیادہ کھلے الفاظ میں اپنے خیالات ظاہر کرتا ہے جنمیں ثبوتی تصوّر کائنات کی جھلک بھی نظر آتی ہے " مذہب تاریک رات ہے۔ علم طاقت ہے۔ . . . . . خدا پر عقیدہ رکھنا لوگوں کی حماقت ہے . . . . خدا کا جمہ زر ہے۔" ظاہر ہے کہ نوجوان مزدور جنکے اس قسم کے خیالات ہوتے ہیں۔ پادریوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہیں دعویٰ تو ہے دینداری کی تعلیم دینے کا اور کام کرتے ہیں تنخواہ لے کر۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے سچی مذہبیت زندگی کی انتہائی قدر اور اس کے آخری منشا کے احساس، اور اس روحانی دولت کو اپنا سرمایۂ حیات بنانے کا نام ہے۔ جو شخص مذہبی روایات کو آنکھ بند کرکے قبول کرلیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مذہب مجھے مل گیا۔ حالانکہ وہ اس سے محروم ہے۔ موجودہ زمانہ کے مزدوروں میں، خواہ وہ سن رسیدہ ہوں یا نوجوان، دنیا داری کا احساس بہت قوی ہوتا ہے یا دوسرے الفاظ میں ان کا عزم حیات اور عزم بیکار ظاہری چیزوں میں اتنا الجھا رہتا ہے کہ انہیں مشاہدۂ نفس کا موقع ہی نہیں ملتا ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ اگر انسان اسی دنیا کو صفائے باطن اور قلب سلیم کے ساتھ دیکھے تو اسے عجب پُر اسرار اور دلکش نظارے دکھائی دیں گے۔

اس لیئے ہمیں انہیں ظاہری چیزوں میں وہ نقطے تلاش کرنے چاہئیں جو ہمارے بڑے شہروں کے صنعتی مزدوروں کی مذہبیت کا مرکز ہیں۔ یہ وہی نقطے ہیں جہاں کونمٹ، گوئیو، اور فوئیے کو بھی باوجود اپنی ثبوتیت پسندی کے مذہب کی جھلک نظر آتی ہے۔

فرق اتنا ہے کہ مزدوروں کے یہاں ان عقائد میں سادگی اور زور زیادہ ہے۔

ان لوگوں کی مذہبیت کا ایک مرکز تو سماجی طبقوں کی تفریق اور ان کی باہمی جنگ کا احساس ہے وہ سمجھتے ہیں کہ سب مزدور، مادرِ گیتی کے فرزند، ایک ہی رشتے میں مربوط ہیں۔ کیونکہ سب مصیبت میں ہیں اور سب کو دوش بدوش لڑکر "پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا" حاصل کرنا ہے۔ ان مقاصد پر عقیدہ رکھنا، ان کا احترام کرنا، ان کے لیے اپنی زندگی وقف کرنا بھی ایک مذہب کی شان رکھتا ہے۔ خواہ یہ بات کتنی ہی عجیب معلوم ہو، اور خواہ وہ لوگ جو روحانیت کے بلند تر مدارج پر پہنچ چکے ہیں، کچھ بھی کہیں مارکس کی ساری تحریک اور مزدوروں کے طبقے کا سارا لڑائی کا پروگرام ایک مذہب ہے۔ یہ اُن کے لیے "عقیدہ زندگی" ہے، اُمیدِ نجات ہے، بلکہ اسمیں ایک طرح کا دوزخ اور جنت کا عقیدہ بھی موجود ہے۔ منچلے اور ذہین نوجوان مزدوروں میں یہ بات خاص طور پر پائی جاتی ہے۔

ایڈل ہائی پوپ، جو آسٹریا میں اشتراکی جمہوریت کی تحریک کی رہنما ہیں، اپنی کتاب "ایک مزدورنی کی نوجوانی کے حالات" میں جو اصل میں خود ان کی سوانحعمری ہے لکھتی ہیں:- "اگرچہ اشتراکی جمہوری پارٹی کے اخباروں میں مذہب کی مخالفت نہیں ہوتی تھی پھر بھی میں مذہبی عقائد سے آزاد ہو گئی تھی۔ یہ بات ایک دم سے نہیں ہوئی بلکہ رفتہ رفتہ۔ مجھے خدا پر اور عالم آخرت پر عقیدہ نہیں رہا تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ شاید ان باتوں کی کچھ حقیقت ہو" یہ "شاید کچھ ہو" کی خلش جو اسکے دل کو بے چین رکھتی تھی نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایسے واقعات کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت ہے۔ لیکن جب اُسے دنیا کی بے انصافی کا احساس پیدا ہوتا ہے تو یہ "شاید کچھ ہو" کی الجھن دب جاتی ہے۔

اب ساری عقیدت کا مرکز وہ چیز ہے جو اب تک اُمید دلاتی ہے اور ترقی کا راستہ دکھاتی رہے "اپنا اخبار میں ہر ہفتہ خود جاکر لایا کرتی تھی۔ جب میں پہلی بار اخبا

کی دکان میں داخل ہوئی تو یہ معلوم ہوا جیسے کسی مقدس مقام پر قدم رکھ رہی ہوں" ۔۔۔

"جب میں اخبار لینے جایا کرتی تھی تو ہمیشہ وہ کیفیت ہوتی تھی جو کسی مذہبی تہوار کے دن ہوتی ہے اُس دن میں اپنا بہترین جوڑا پہنکر جاتی تھی جیسے پہلے گرجے جایا کرتی تھی"۔ بظاہر یہ سب دنیاداری ہے۔ لیکن اسمیں مذہبی جوش موجود ہے۔ اسمیں بھی "حکومت الٰہی" کی جھلک نظر آتی ہے۔ اُس طرح نہیں جیسے وہ قیامت کے دن "بادلوں کے اوپر" جلوہ افروز ہوگا بلکہ اس طرح جیسے وہ خوش عقیدہ کاروباری آدمی کو محسوس شکل میں اپنے قریب نظر آتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ عقیدہ مزدوروں کو اپنے نصب العین میں نظر آسکتا ہے اگر ان کی نظر محض کسب معاش اور مادی فائدے تک محدود نہ ہو۔ اور اس مادی شکل میں بھی مذہبی آرزو کی ایک چنگاری دبی ہوئی ہوتی ہے یعنی یہ عقیدہ کہ انسانوں کو ایک بہتر اور برتر زندگی نصیب ہوگی۔

اسمیں شک نہیں کہ پہلے زمانہ کے مزدوروں کے لیئے خارجی تاریخی مذہب کا اختیار کرلینا زیادہ سہل تھا۔ اُن پر جدید دور کے اصلی اور نقلی علم کا بہت کم اثر تھا۔ وہ اب تک انجیل کو گھریلو کتاب سمجھ کر پڑھا کرتے تھے۔ اور اُس سے تسکین حاصل کرتے تھے جسکی تصویر نیک نفس کارل فشر نے اپنی کتاب "ایک مزدور کی زندگی کی یادگار باتیں" میں کھینچی ہے۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ آرزو اور عقیدت پھر پیدا ہو رہی ہے۔ مذہبی اشتراکیت اور اشتمالیت کی ایک بڑی لہر اٹھی ہے اور دنیا میں پھیلنا چاہتی ہے۔ اسمیں سب سے اہم اور معنی خیز وہ مذہبی باطنی عقیدت ہے جو اشتراکی نوجوانوں کو پیداوار کی قوتوں اور محنت سے پیدا ہو رہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہیگل کی منطق کے مطابق مارکس کا مادیت پرست عقیدہ بدل کر ہر چیز میں الوہیت یا روحانیت تسلیم کرے گا۔ کم سے کم مزدور پیشہ نوجوانوں کے بعض حلقوں کے دیکھنے سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے اور اُن کے پیش نظر آنے والے دورِ سعادت کی ویسی ہی خوشنما اور روشن تصویریں ہیں جیسی پرانے مسیحیوں کے ذہن میں تھیں۔ نفسِ انسانی کے مبصر کو یہ سلیقہ ہونا چاہیئے کہ وہ نئے باجوں میں قدیم ازلی راگوں کو سُن لے اور ضد اور مخالفت کے ہجوم میں

دلی لگاؤ کو پہچان لے۔ کیونکہ انسان کے گہرے خیالات وجذبات ہمیشہ وہی رہتے ہیں۔ البتہ ان کا طرزِ اظہار خارجی زندگی کے اثرات کا اور مختلف زمانوں اور شخصوں کی انفرادی حالت کا پابند ہوتا ہے۔

"نئی روشنی" کے زمانہ سے دورِ جدید کا انسان اپنے آپ کو دنیادار، مادرِ گیتی کا فرزند، اور بعض اوقات قریب قریب حیوان سمجھتا ہے۔ یہی دنیا اسکی رنج وراحت کا سرچشمہ ہے۔ یہیں اسکے دلمیں اس چیز کی آرزو پیدا ہوتی ہے جو زندگی کے ماورا ہے۔ اور یہیں وہ نور وظلمت کی لڑائی لڑتا ہے جس کا بیج خود اس کے دل میں ہے۔ سرگشتۂ جستجو انسان اس لڑائی میں اپنے خدا کو بھی ساتھ رکھتا ہے۔ اسکا خدا (یعنی خدا کا وہ تصور جو اسکے دل میں ہے) اسکے ساتھ ساتھ نشو ونما پاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار کسی دن وہ جمالی شان میں نیکی کا خدا بنکر ظاہر ہوتا ہے اور اسکی ساری زندگی کو منور کر دیتا ہے۔

اب ہم دنیاوی ناسوتی مذہبیت کی سرحد میں پہنچ گئے ہیں۔ گوناگوں شکلوں میں نورِ ایزدی کی شعاعیں اور چنگاریاں ہماری روحوں تک پہنچتی ہیں۔ وہ خود عالمِ لاہوت کی بلندی پر جلوہ افروز ہے۔ لیکن ستم زدہ انسان چٹانوں میں ادھر اُدھر بھٹکتے اور قعرِ کوہ میں جھانکتے پھرتے ہیں۔ سالہا سال تک حیرت اور شک کی وادیوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یا فاؤسٹ کی طرح بتدریج لاکھوں برس کے تزکیۂ نفس کے بعد معرفت ویقین کے مرتبے پر پہنچتے ہیں۔

اگر ہم مذہب کو داخلی احساس کے پہلو سے یعنی مذہبیت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جیسا کہ ہمیں نفسیاتی بحث میں کرنا چاہیے تو ہمیں اسکا دائرہ دنیا کے بڑے مذاہب تک محدود رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہر کشمکش جو انتہائی قدور حاصل کرنے کے لیے کی جائے یعنی انسان کی ساری ذہنی نشو ونما مذہبی رنگ رکھتی ہے۔ اسکی تشکیل ذات، اسکی کوشش کہ وہ راز دریافت کرے جسکی بدولت زندگی اپنا انتہائی مقصد ومنشا حاصل کرتی ہے اصل

میں ایک مذہبی عمل ہے بلکہ شاید خدا کا نور ہمارے نفس میں اسطرح بڑھتا اور پھیلتا ہے اسطرح ہم نفسیات ارتقا کے آخری نقطہ پر پہنچ گئے ہیں: سب سے پہلے ہم نے دیکھا تھا کہ نوجوان ٹنک اور بے چین تخیل کی مدد سے ڈرتے ڈرتے، اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا دنیا میں داخل ہوتا ہے یا اطمینان سے زندگی پر قبضہ کرلیتا ہے۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب محض حقیقت کا خوشنما عکس تھا۔ ہر نفسی ذہنی ارتقا کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان میں وہ چیز نشو و نما پائے جسکی بدولت اسے مجموعی منشا کا احساس اور مادی چیزوں میں منشا پیدا کرنے کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اسے مذہب کہتے ہیں اور ایسے تو معدودے چند ہی ہیں جنھیں اس بات کا خفیف سا اندازہ بھی ہو کہ ان کی ساری ذہنی زندگی کا مرکز یہی ہے۔ آدمی جب تک خدا کو نہ پہچانے انسان بن ہی نہیں سکتا۔ یہ مذہبی احساس کسی شخص کی ارتقائے نفسی میں ایک ہلکی سی لے کی طرح ساتھ رہتا ہے، کسی کے یہاں زلزلے اور طوفان اٹھاتا ہے نئی زندگی اور قلندرانہ وجد و حال پیدا کرتا ہے۔ کسی کے دلمیں اسطرح رہتا ہے کہ اسے اس کی گہرائی یا اصلیت کا شعور بھی نہیں ہوتا۔ لیکن ہر صورت میں ساری ذہنی زندگی کا آغاز و انجام یہی ہے۔

یعنی نوجوانوں کی ارتقائے نفسی منفرق اور منتشر مظاہر کا نام نہیں ہے بلکہ ایک مرکزی منشا کی آرزو اور جستجو کا۔ مذہب کے تاریخی معنی کے تنگ دائرے سے نکل کر دیکھیے تو اس مرکز کے وجود کا محسوس کرنا اور اسکی تلاش میں سرگرداں رہنا بھی مذہبی عمل ہے۔ ہر عقیدۂ زندگی ہر احساس قدر اور ہر اخلاقی فیصلہ بلکہ خود بنیادی احساس حیات نور ایزدی کا ایک جلوہ ہے جو ہمارے نفس میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کا عکس جو ہمارے نفس سے نکل کر دنیا کو منور کرتا ہے۔

باب چہاردہم

نوجوانوں کے احساس زندگی کی مثالیں

"واردات قلبیہ" کا لفظ ہمارے یہاں بہت مقبول ہے اور بے سوچے سمجھے استعمال کرنے سے رفتہ رفتہ بے معنی سا ہو گیا ہے۔ (اس لیئے اسکے معنی کا تعین ضروری ہے) نفسیات ارتقا میں قلبی واردات اُن چیزوں کو کہتے ہیں جو ذہن داخلی کی تعمیر کی محرک ہوتی ہیں، جنسے نفس پر انقلاب انگیز اثر پڑتا ہے یا جمعیت خاطر حاصل ہوتی ہے، جو ہماری ساری زندگی پر چھا جاتی ہیں۔ اور ہماری اخلاقی سیرت کی تشکیل کرتی ہیں۔ انسان میں جتنی زیادہ صلاحیت قلبی واردات سے متاثر ہونے کی ہو اتنا ہی زیادہ اُسکے نفس میں صورت پذیری کا مادہ ہوتا ہے۔ جن چیزوں سے اُس پر یہ واردات گزرتی ہے انہیں کے ذریعہ وہ خود یا کوئی دوسرا اسکی تربیت کر سکتا ہے۔

مختلف افراد کی ارتقائے نفس میں روانی کے اعتبار سے بہت فرق ہوتا ہے۔ بعضوں کے نفس میں قلبی واردات کی جستجو اور ان کی تاثیر آہستہ آہستہ تقریباً بغیر محسوس کیئے ہوئے نشوونما پاتی ہے اور بعضوں کے یہاں دفعتہً ایک انقلاب کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔ یہی دوسری صورت ہے جو ہمیں مذہبی زندگی (محدود معنی) میں "بیداری" اور تبدیل "عقاید" کی شکل میں نظر آتی ہے۔ یہاں ہم اس واردات کی دنیاوی صورت سے بحث کریں گے۔ اسے لوگ اکثر مذہبیت سے بے تعلق سمجھتے ہیں لیکن اصل میں اسمیں ہمیشہ مذہبی رنگ ہوتا ہے۔ یہ وہی عہد جدید کی دنیاوی مذہبیت ہے جسے ہم نے "ناسوتی باطنیت" کہا ہے۔ اسمیں دنیاوی واردات کے انتہائی منشا یعنی اُس کے ازلی و ابدی عنصر کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یوں تو ان واردات میں وہ سب چیزیں شامل ہیں جو ہمارے نفس پر گہرا اثر کرتی ہیں۔ لیکن ہمیں یہاں محض ان

کے اُس جزو سے سروکار ہے جو نفس کی ارتقا میں اور اسکی اخلاقی سیرت کی تعبیر میں مدد دیتا ہے

جب اِس واردات سے خود اپنے فرائض اور اپنے عمل کے مقصد پر بھی روشنی پڑتی ہے تو یہ شعوری اخلاقی رنگ رکھتی ہے ۔ لیکن یہ صورت ہمیشہ نہیں ہوتی بلکہ اور دوسری صورتیں بھی ہوتی ہیں ۔ اگر اس واردات یا الہام کے ساتھ یہ احساس ہو کہ یہ کسی مافوق الافراد وجود کی طرف سے ہے تو وہ مذہبی واردات ہے جسے لوگ حکم قضا یا غیبی واردات سمجھتے ہیں ۔ اور چونکہ یہ ذاتی ارادے اور ذاتی فرائض کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے اس لئے اخلاقی حیثیت بھی رکھتی ہے ۔ لیکن دوسرے شعبہ ہائے زندگی اور ذہنی رجحانات کے سلسلے میں بھی اس طرح کی واردات گزرتی ہے ۔ بشرطیکہ وہ اِتنی گہری ہو کہ قطعیت کی صفت رکھتی ہو ۔

کبھی کبھی انسان کو دفعۃً اپنے پیشے میں یہ شان نظر آتی ہے چاہے وہ معاشی زندگی میں کتنا ہی ڈوبا ہوا ہو ۔ اسیطرح بعض اوقات فطرت یا آرٹ کے مشاہدے سے انسان پر اس قسم کی گہری واردات گذرتی ہے ۔ عشق کو بلکہ شہوانی عشق کو بھی مافوق الطبیعات سے جو تعلق ہے اسے ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں ۔ سچا اور گہرا عشق ہمیشہ الہامی کیفیت رکھتا ہے ریاست ، سماج اور قانون بھی جب وہ اخلاقی عین کی حیثیت رکھتے ہوں ، ہمیں واردات کے رنگ میں محسوس ہو سکتے ہیں ۔

ان سب چیزوں میں باطنیت اور تصوف کی جھلک پائی جاتی ہے ۔ کیونکہ یہ وہ راز و نیاز ہیں جو انسان کے اور اسکے خدا کے درمیان ہوتے ہیں ۔ وہ راستے ہیں جن سے وہ اوجِ معرفت پر پہنچتا ہے ۔ نوجوانوں کے ان نفسی تغیرات و انقلابات میں وہ سب صفتیں موجود ہوتی ہیں جنھیں ہم نے مذہبی باطنیت کی خصوصیات قرار دیا ہے ۔

اسٹاربک کے نزدیک تبدیل عقائد نوجوانوں کی ارتقا کا مجموعی نتیجہ ہے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ واردات قلب کا وہ لمحہ ہے جو ارتقائے نفسی پر سب سے گہرا اور مفید اثر ڈالتا ہے ۔ اس لمحے کے لئے پہلے سے طیاری ہوتی ہے ۔ اسکی آرزو کی

جاتی ہے بلکہ اس کے لئے کوششیں کی جاتی ہیں - وہ عظیم الشان تاریخی تحریک جو نشاۃ ثانیہ اور تجدید مسیحیت کہلاتی ہے نہ محض مغربی اقوام کی روحانی نشوونما کی تکمیل کا نتیجہ تھی اور نہ خارجی اثرات کا - بلکہ بقول کونراڈ بردِاخ کے نئی زندگی کی آرزو صدیوں سے چلی آتی تھی جسکی بدولت دفعتہً فنونِ لطیفہ میں بہار کا رنگ اُبل پڑا ، ذوقِ جمال کی کلیاں کھل گئیں اور ہر طرف حسن و جوانی کی عطر بیز ہوائیں چلنے لگیں اس کے بعد زندگی کے اور گہرے طبقوں سے نئے مذہبی احساس کے چشمے پھوٹ نکلے جنسے ایک جرمنی کے باشندے **لوتھر** کے خلوص اور روحانی قوت کی بدولت دلوں کی کھیتی سیراب ہوگئی -

سنجیدہ اور گہری طبیعت کے نوجوانوں میں اسطرح کی فوری بیداری اور اُپج اکثر نظر آتی ہے - ہم چار چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو نوجوانوں کی اس حالت میں اور باطنی مذہبیت میں مشترک ہیں - فرق اتنا ہے کہ یہاں یہ چیزیں نوجوانوں کی معمولی نفسی نشوونما کا جزو ہیں اور وہاں ان کی حیثیت غیر معمولی انقلاب اور تجدید کی ہوتی ہے -

۱- نوجوانوں کی گہری اور طوفان خیز ارتقائے نفسی میں ایک الہامی کیفیت محسوس ہوتی ہے - " دل پر خود بخود اثر ہوتا ہے " " نفس کی گہرائیاں تک ہل جاتی ہیں " اس زلزلے کا محرک یا تو کوئی اہم واقعہ ہوتا ہے جسکا اثر ساری زندگی پر پڑتا ہے یا کوئی شخصیت جو اس معاملے میں اتنی اہمیت رکھتی ہے - نوجوان اپنی بصیرت اندوزی کو عموماً کسی ایک شخص کی ذات سے منسوب کرتے ہیں - وہی انہیں بیدار کرتا ہے اور وہی انہیں نجات دیتا ہے - اور عجیب بات یہ ہے کہ اُس سے یہ وابستگی کسی خاص موقعہ پر کسی خاص وقت سے شروع ہوتی ہے - نوجوانوں کا عشق جو اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے محض تخئیل کی بلند پروازی نہیں ہے بلکہ مافوق الطبیعی اور اخلاقی اہمیت رکھتا ہے - آنکھیں کھل جاتی ہیں دل بھر آتا ہے - وہی سقراط والی برقی لہر رگ وپے میں دوڑ جاتی ہے -

۲- انسان کے دل پر جو اثر پڑتا ہے اسمیں تجدید زندگی کی شان ہوتی ہے - اس

واردات کے بعد ہر شخص "بالکل دوسرا" "بالکل نیا" آدمی بنجاتا ہے دُنیا اُسے بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اس سے بڑھ کر خود اسکی اندرونی زندگی میں کایا پلیٹ ہو جاتی ہے۔ اسپر عجب طرح کی بیخودی چھا جاتی ہے۔ ایک پہلو سے تو یہ وجد ہے یعنی نفس کا اپنے آپ سے گزر کر خدا کی جانب بڑھنا اور دوسرے پہلو سے کیف معرفت ہے یعنی خدا کے نور کا تنگنائے نفس میں جلوہ افروز ہونا۔ اب یہ حقیقت کھلتی ہے کہ باطنی زندگی اور ذہنی دنیا کے بہت سے مدارج ہیں اور انسان نے ان میں سے ایک اور درجہ طے کیا ہے۔ اسے انسان یا تو عجز و نیاز سے خدا کی دین سمجھتا ہے یا فخر و ناز سے اپنی روحانی سعی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ لیکن اگسٹین ہو یا فشٹے دونوں حیرت اور مسرت کی نظروں سے اس نئے جلوے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی لمحے سے نئی زندگی شمار کی جاتی ہے۔ اس سے پہلے جو کچھ تھا سب دل سے مٹا اور بھلا دیا جاتا ہے۔

۳۔ اس مشاہدے کی ایک اور عجیب خصوصیت یہ ہے کہ یہ قید صورت سے آزاد ہوتا ہے۔ جسطرح اہلِ طریقت اس چیز کو جو انہیں وجد میں لاتی ہے تشبیہ اور استعارے کے ذریعے سے سمجھاتے ہیں اور اُسے ایک معین اور واضح معروض بنانے کی بیفائدہ کوشش کرتے ہیں وہی صورت یہاں بھی پیش آتی ہے۔ اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ وہ کیا چیز ہے جو انسان کو اس مبارک لمحے میں حاصل ہوتی ہے تو بہترین انشا پردازوں کی کھینچی ہوئی تصویروں سے بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اتنا البتہ یقینی ہے کہ یہ کوئی بڑی دولت ہے جس سے انسان کو عجیب روحانی بلندی حاصل ہوتی ہے۔ چشم بصیرت سے دیکھنے والا اسکی تصدیق ان نوجوانوں کی صورت دیکھ کر کر سکتا ہے جن کی نظر ایک پُراسرار چمک کے ساتھ اندر کے طرف جھکی ہوئی یا سامنے کی طرف عالم مرئی کے ماورا کسی روشن تر چیز پر بلکہ خود روشنی کے سرچشمے پر گڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ نوجوانوں کی زندگی میں بڑا انقلاب ہو گیا ہے جس کی نہ کوئی نظیر ہے نہ کوئی انتہا۔ لیکن کوئی موضوع لفظ کوئی معین خیال ذہن میں پیدا

نہیں ہوتا۔ محض ایک روحانی جلوہ ہے جسے انسان ایک زبان کیا ہزار زبانوں سے بھی بیان نہیں کر سکتا اس کیفیت کا کوئی خاص نام رکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔

۴۔ ایک اور خصوصیت نوجوانوں کی مذہبی واردات کی یہ ہے کہ وہ مل جل کر چھوٹے چھوٹے فرقے بنا لیتے ہیں۔ ان ذاتی احساسات میں جو ہر شخص کو بلاواسطہ ہوتے ہیں وہی معدودے چند لوگ شریک ہو سکتے ہیں جنہیں بہت قریبی تعلقات ہوں۔ اگر یہ حلقہ بڑھ جائے تو وہ خالص روحانیت باقی نہیں رہ سکتی۔ اس قسم کی مذہبی بیداری جتنی زیادہ باہمی تاثیر و تاثر پر مبنی ہو اتنی ہی زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ چھوٹے چھوٹے حلقے ہوں جنکے ارکان آپس میں گہرے روحانی تعلقات رکھتے ہوں۔ ان حلقوں کا دروازہ باہر والوں کے لیئے جو محرم اسرار نہیں ہیں بند ہوتا ہے۔ تنظیم کا کیا ذکر ہے مقاصد کا تعین تک ان چیزوں کی حرمت کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ ابھی تک مذہبی جوش سرچشمے سے اُبلتا ہے اور دریا کی طرح بہتا ہے۔ اس میں سے نہریں کاٹنا نہ ممکن ہے اور نہ مناسب ہے۔

نوجوانوں کا اسطرح سے ایک بار بلکہ کئی بار نیا جنم لینا ارتقائے نفسی کی ایک مثال ہے لیکن بعض مخصوص صورتوں میں یہ مثال بہت عام ہو جاتی ہے۔ دوسری مثال خاموش نشو و نما، ذہن خارجی سے تدریجی مطابقت، خود روارتقا کی ہے۔ تیسری مثال وہ تہذیب نفس ہے جو بالقصد، استقلال، محنت اور اطمینان کی ساتھ کی جاتی ہے۔ اور بغیر طوفان خیز انقلابات کے تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اگر دوسری صورت کے ساتھ ساتھ تعلیم کا رجحان موجود ہے جو تشکیل جبلت کی حیثیت سے واردات میں انتخاب اور تصرف سے کام لیتا ہے تو نوجوان کی نشو و نما اس اندرونی ارتقا کے ذریعہ سے ہوتی ہے جسکا نام ارسطو نے جوہر قابل رکھا ہے اور جو صدہا برس سے ارتقا کی واحد صورت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ذہنی دنیا میں علاوہ "ارتقائے نامی" کے بڑھنے اور پنپنے کی اور صورتیں بھی ہیں۔ بلکہ اصل میں تمدنی زندگی کے ماحول میں تشکیل نفس اور تعلیم کی "جبلت" شعوری "ارادہ" بن جاتی ہے۔ اور یہ ارادہ علم و ادب اور تہذیب و تمدن میں سے اُن چیزوں کو اختیار کرتا ہے

جو انسان کی اندرونی صلاحیت سے مناسبت رکھتی ہوں۔ یہی وہ جمالیاتی تشکیل نفس ہے جسے ہم "ذاتی تعلیم" کہتے ہیں۔ اسکے تین اہم عناصر ہیں۔

۱۔ انفرادیت (اپنی طبیعت کے مخصوص رجحان کو تلاش کر کے اسے تعلیم کا مرکز بنانا)

۲۔ جامعیت (ذہنی قوتوں کو حتی الامکان وسعت دینا)

۳۔ جمعیت (ساری ذہنی قوتوں میں وحدت اور ہم آہنگی پیدا کرنا)۔

تیسری مثال اور دوسری مثال کا فرق ظاہر ہے۔ دوسری مثال کے تحت میں تو وہ لوگ آتے ہیں جو اپنے نفس کی جمالیاتی تشکیل کرتے ہیں۔ یعنی اپنے جوہرِ قابل کو خود بخود نشوونما پانے دیتے ہیں اور اگر دخل دیتے ہیں تو صرف اتنا کہ اسکی راہ میں آسانیاں پیدا کریں۔ برخلاف اسکے تیسری مثال ان لوگوں کی ہے جنکے نفس میں اندرونی قوتِ تشکیل کم ہوتی ہے۔ اور انہیں سختی کے ساتھ تربیت نفس کرنا پڑتی ہے۔ ان میں ہمیں سیاسی رجحان اپنی اصلی شکل میں یعنی ضبطِ نفس اور سیاست نفس کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ان کا طرزِ ارتقا ہی مختلف نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی طرز بھی مختلف ہوتا ہے۔ اور ہماری زبان میں رواقیت اور مسیحیت کے اثر سے اخلاق کا لفظ صرف اسی معنی میں استعمال بھی ہوتا ہے۔ جرمنی میں اس اخلاق کے نمائندے کانٹ اور فختے ہیں۔ جیسے جمالیاتی تشکیل نفس کے نظریۂ اخلاق کے نمائندے ہمبولٹ اور شلر ہیں۔

اب ہم پہلی مثال کی طرف رجوع کرتے ہیں اور موجودہ بحث میں ہمیں زیادہ تر اسی سے سروکار ہے۔ ہمیں مذہبی اثر بہت قوی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کی ارتقائے نفسی میں دفعتہً تغیر ہوتا ہے اور آناً فاناً ان کی چشم بصیرت کھل جاتی ہے۔ جس سے انہیں احساس ہوتا ہوتا ہے کہ انہیں غیب سے ہدایت ہوئی ہے۔ انہیں یکبیک احساس ہوتا ہے کہ کسی نے انکی طبیعت میں کایا پلٹ کر دی۔ کوئی قوت انہیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے، کسی چیز نے اُن کے جذبات میں تلاطم برپا کر دیا ہے۔ واقعی حیثیت سے دیکھیے تو ہر شخص کی ارتقائے نفسی میں یہ

تینوں صورتیں ملی جلی ہوتی ہیں۔ البتہ ان کے تناسب میں فرق ہوتا ہے۔ جمالیاتی تشکیل نفس کرنے والوں پر بعض اوقات وجد کا عالم طاری ہوتا ہے۔ روانی انداز طبیعت رکھنے والے بھی کبھی کبھی اس بلندی پر پہنچتے ہیں کہ انہوں نے جو چیز سعی و محنت سے حاصل کی ہے اسکا احساس دفعتہً نعمت الٰہی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اسیطرح جن لوگوں کی طبیعت میں فوری انقلابات ہوتے ہیں انھیں بھی تجدید زندگی کے لیئے اخلاقی تربیت اور ضبط نفس سے کام لینا پڑتا ہے اور اپنے آپ کو ہدایت غیبی کے قابل بنانا پڑتا ہے۔

جمالیاتی طبیعت کے لوگوں میں اندرونی تشکیل کی جو صلاحیت اور عارضی ادبی اور تمدنی اثرات سے متاثر ہونے کا جو مادہ ہوتا ہے وہ اخلاقی اور مذہبی طبیعت کے لوگوں میں نہیں ہوتا۔ یہاں ہم یہ فیصلہ کرنا نہیں چاہتے کہ مدارج قدر میں دونوں میں سے کون افضل ہے۔ پھر بھی ہمیں کیگر گارڈ کے اس قول سے اتفاق ہے کہ جمالیاتی طرز زندگی میں پابندی اور ذمہ داری مفقود ہوتی ہے۔ قصور یا گناہ کا احساس عموماً نہیں ہوتا۔ اسکا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ زندگی پر عام حریت پسندی اور انفرادی لذت پرستی کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ مگر دوسری قسم کے لوگوں میں یہ خرابی ہے کہ وہ تنگ خیال ہوتے ہیں اور تمدنی اور ذہنی زندگی کی بہت سی نعمتوں سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ بعض اوقات جیتی جاگتی دنیا میں رہ کر بھی اُس سے اتنے بے تعلق ہو جاتے ہیں کہ ان کی زندگی ایک جزیرے یا خانقاہ کے مانند ہو جاتی ہے۔ اُن میں بے نفسی کے ساتھ خدمت کرنے، اپنی زندگی کو دوسروں کے لیئے وقف کر دینے کا مادہ تو ہوتا ہے لیکن اُن کی زندگی میں ہمہ گیر کشادگی یعنی وہ چیز نہیں ہوتی جسے شلر "جمالیاتی اثر پذیری" کہتا ہے۔

زندگی کے یہ تینوں طرز یعنی جمالیاتی شورش تخیل، مذہبی انقلاب اور اخلاقی ضبط نفس ایک خاص ترکیب کے ساتھ ملے جلے ہوئے ہمارے ملک کی موجودہ تحریک شباب میں نظر آتے ہیں۔ ہمیں اسمیں علاوہ اُس رنگارنگی اور تلوّن کے جو ارتقائے نفسی کی خصوصیت ہے گہری روحانیت کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اسکی تفسیر مختلف پہلوؤں سے کی جاسکتی ہے۔ اس سے

پہلے بھی ہم مختلف موقعوں پر ضمناً چند جزدیات کا ذکر کر چکے ہیں۔ اب ہم اس مسئلے کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں اسمیں تاریخی اثرات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے پہلا اثر تو اس انفرادی سیلاب آزادی کی آخری لہر کا ہے، جو "نئی روشنی" اور انقلاب فرانس کے زمانہ سے ہماری سماج میں اٹھ رہا ہے۔ پہلے اس سے متوسط طبقے کے لوگ متاثر ہوئے، پھر مزدور، پھر عورتیں، اب نوجوانوں کی باری ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو تحریک شباب میں انتہائی انفرادیت کا رنگ غالب ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ اُن میں اخلاقی خود مختاری کا خیال پیدا ہو رہا ہے یعنی اب وہ اخلاقی اعمال میں آزادی اور شخصی ذمہ داری چاہتے ہیں اور بیرونی نگرانی اور تعلیمی دباؤ کے مخالف ہیں۔ اُن کی انفرادیت بڑھ کر انفرادی تہذیب بلکہ انفرادیت پرستی بنگئی ہے۔ ان حلقوں میں ہر رکن کو اجازت ہے کہ اپنے مخصوص رجحانات کو آزادی سے نشو و نما پانے دے بلکہ اسکی قدر جماعت کے لیئے یہی ہے کہ اسکی شخصیت کھری اور بے میل ہو اور اسکی دنیا الگ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ عجیب تضاد ہے کہ ہمارے نوجوان اس انفرادیت سے محفوظ ہیں جو ہر شخص کو علحدہ زندگی بسر کرنے اور کافی بالذات ہونے کی تعلیم دیتی ہے۔ یہی بات ان میں اور عہد قدیم کی انفرادی تحریکوں میں مابہ الامتیاز ہے۔ ان لوگوں کا "اجتماعی احساس" کا قائل ہونا بالکل نئی چیز ہے لیکن اس سے غیر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ان میں عالمگیر محبت کا مادّہ ہے۔ یا تنظیم اور ملکی خدمت کی صلاحیت ہے ان کے "اجتماعی احساس" میں زیادہ زور "احساس یا واردات" پر ہے۔ اسکا مفہوم سمجھنے میں اس بحث کے بعد جو ہم کر چکے ہیں غلطی کا امکان نہیں ہے۔ تحریکِ شباب کی سب سے اہم واردات یہی اجتماعی احساس کا پیدا ہونا ہے۔ نوجوان ایک دوسرے کی شخصیت کو سمجھتے ہیں بلکہ ساتھ رہنے سے یہ حقیقت ان پر خود بخود منکشف ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کو بیدار کرتے ہیں۔ یہ بتانا کہ انھیں ایک دوسرے میں کیا چیز نظر آتی ہے سہل بھی ہے اور دشوار بھی ہے۔ سہل اس لیئے کہ ظاہر ہے انہیں ایک دوسرے کی جوانی، روحانی دولت زندہ دلی، پاک نفسی، حسن پرستی اور گہری مذہبیت نظر آتی ہے۔ اور دشوار اس لیئے کہ

زندگی کے جس دریائے ذخار کا یہ مشاہدہ کرتے ہیں اس کا پورا نقشہ الفاظ میں نہیں کھینچا جا سکتا
تحریک شباب والے اسکی کوشش بھی نہیں کرتے۔ ان کا نہ کوئی لائحہ عمل ہے اور نہ وہ بنانا
چاہتے ہیں۔ وہ اپنے منشائے حیات کو نہ معین کر سکتے ہیں اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی عدم تعین
یہی غیر محدود آزادی، یہی بے قید روانی اُن کی زندگی کی خصوصیت ہے۔ البتہ اُن کے
نصب العین میں تھوڑی بہت وضاحت تقابل سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی اس تضاد سے جو
اُن کی زندگی میں اور ہمارے پختہ کار تمدن کی مقید اور مرتب زندگی میں ہے۔ یہ تمدن
نوجوانوں کے نزدیک بالکل بیجان، بحس و حرکت اور فرسودہ ہے۔ اسی کی مخالفت سے
تحریک شباب زندہ ہے۔ اور چند دن کے بعد جب دونوں متضاد زندگیوں میں امتزاج
پیدا ہو جائیگا تو اس تحریک کا یا کم سے کم اسکی موجودہ صورت کا خاتمہ ہو جائیگا۔

ہم اس تحریک کے بعید مختلف عناصر پر تفصیلی نظر نہیں ڈالنا چاہتے ہم تو صرف ایک بات
معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کون چیز ہے جو ان سب نوجوانوں کو، قومیت پسندوں سے لے کر
اشتمالیت پسندوں تک، دولتمندوں سے لے کر بے نواؤں تک، لامذہبوں سے لے کر
راسخ الاعتقادوں تک، ایک رشتۂ اتحاد میں مربوط کرتی ہے، جسکی بدولت باوجود تمام
اختلافات کے ان کا اصل اصول ایک ہی ہے۔ یہ چیز بیداری ہے یعنی تجدید زندگی کا احساس
نئی جیتی جاگتی روح کا نفوذ۔ نوجوانوں کا وجد اور جوش و خروش ایک نیا سرمایۂ اخلاق بنگیا
ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے اسکی بیشمار مختلف صورتیں ہیں۔ کہیں امن و امان کی حمایت
کہیں قومیت پرستی، کہیں جنگ و جدل، کہیں انتہا پسندی اور تخریب، لیکن ان سب کی تہ
میں ایک ہی قوت ہے۔ ہماری تہذیب کے بحس و حرکت اور یک طرفہ نظام کے اندر سے ایک
نئی زندگی کے منظم اور غیر مقید چشمے کا پھوٹ نکلنا، اور یہ قوت نہ جمالیاتی ہے، نہ سیاسی نہ
اقتصادی اور سماجی بلکہ حقیقی معنی میں اخلاقی اور مذہبی۔ اس کی اہمیت اس لیے اور بڑھ گئی ہے

ہیں اور کر کے رہیں گی ۔ اسی لیئے یہ نوجوان جب سب کے سامنے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کی طرف گوشۂ چشم سے دیکھتے ہیں اور خفیہ اشاروں میں علیک سلیک کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں ۔ اسی لیئے یہ عقیدتمندی کے ساتھ نئے زمانے کا ، نئی قوم کا اور نئی ریاست کا انتظار کرتے ہیں ۔ ضروری نہیں کہ یہ انتظار سیاسی رنگ کا ہو یہ اکثر نوجوانوں کے ذہن میں بہت وسیع بلکہ ہمہ گیر معنی رکھتا ہے سب نوجوان اپنے اس جوش آرزو کو مذہبی بھی نہیں سمجھتے پھر بھی تعداد کے لحاظ سے تحریک شباب میں مذہبی عنصر غالب ہے ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ زمانۂ بلوغ کی ایک خصوصیت جو ہر دور میں کم وبیش موجود ہوتی ہے ہمارے عہد میں اتنی قوی ہے کہ بڑی سماجی اور تمدنی تحریک بن گئی ہے اس لیئے ظاہر ہے کہ یہ بیداری مذہبی ہے اور جہاں کہیں اسے کلیسائی یا آزاد مذہبیت سے تعلق نہیں ہے وہاں یہ ناسوتی باطنیت یعنی دنیاوی مذہبیت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جس کا سرچشمہ زندگی کی اتھاہ گہرائیاں ہیں ۔

اگر یہ بنیادی نظریہ صحیح ہے تو اب ہم اس قسم کی ارتقائے نفسی کی اُن صورتوں پر بھی نظر ڈال سکتے ہیں جو اتنی نمایاں نہیں ہوتیں ۔ ان کا اظہار اسطرح ہوتا ہے کہ نوجوانی کے زمانے میں بعض واردات کا ہم پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے ۔ اور انکی بدولت ہم زندگی اور کائنات کو ایک نئی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں ۔

یہ الہامات کبھی کبھی بغیر کسی جوش وخروش کے چُپ چاپ ہمارے دلمیں اُترتے ہیں ۔ ان کے محرک محض خارجی واقعات ہرگز نہیں ہوسکتے ۔ جب تک ہمارے نفس میں اثر پذیری کی ایک خاص کیفیت نہ ہو ۔ نفس پر یہ اثرات خاص لمحوں میں پڑتے ہیں جب انسان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ اُس کی آئندہ نفسی اور ذہنی زندگی میں کیا تبدیلی ہو رہی ہے ۔ ان کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ نفسی زندگی میں زلزلے آتے ہیں ۔ بڑے بڑے انقلاب ہو جاتے ہیں اور انسان کو چار وناچار رفتار زندگی کا رُخ بالکل بدلنا پڑتا ہے ۔

لوگوں نے اب تک ان ارتقائی مظاہر کو نہیں سمجھا ۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اُس کے

لوحِ دل پر بچپن اور نوجوانی کے زمانے کی بعض تصویریں اسطرح نقش ہوگئی ہیں کہ مٹ نہیں سکتیں اصل میں یہ انہیں شاندار گھڑیوں کی خاموش یادگاریں ہیں۔ ہر شخص جو اپنی سوانعمری لکھتا ہے، بے جانے ہوئے، حافظے کی اس قوتِ انتخاب سے کام لیتا ہے۔ ہم فیلکس ڈان کی زندگی سے کئی مثالیں پیش کر چکے ہیں اور بہت سی اور پیش کر سکتے ہیں۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ تھیوڈر فونٹانے کے ذہن میں اس موقع کی، جب وہ سوینے منڈے میں داخل ہوا تھا، صرف ایک تصویر رہ گئی جو نہ بجائے خود کوئی اہمیت رکھتی ہے اور نہ دوسروں کی نظر میں؟ گاڑی ایک لکڑی کے پل پر سے گزر رہی ہے؛ اسکے نیچے پانی کی تاریک سطح ہے اور دریائی گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ڈانٹے نے بیٹریس کو نو برس کی عمر میں دیکھا تھا۔ وہ خود اس واقعے کو اپنے سوانح میں اپنی جسمانی اور نفسی زندگی کے فوری انقلاب سے تعبیر کرتا ہے۔ دنیا جانتی ہے ان الہامی لمحوں میں جس ہجر نصیب محبت کی آگ اسکے دلمیں روشن ہوئی اسکی بدولت کیا شاہکار پیدا ہوئے مشہور نقاش اینسلم فوئر باخ اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے:۔

"آج مجھے ڈیویل ڈورف کی شام یاد آرہی ہے۔ موسم خوشگوار تھا، ہوا فرحت بخش تھی، جھاڑیوں میں بلبلیں بہار کے گیت گارہی تھیں۔ شام ہورہی تھی اور میں کھڑکی کھولے ہوئے بیٹھا تھا۔ باہر سے چنار کے پتوں کی سرسراہٹ کی آواز آرہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں ہوا سے جھکی ہوئی عجب انداز سے ناچ رہی تھیں اور بادل آسمان پر تیزی سے گزر رہے تھے۔ گھنے سائے کی طرح تاریک میدان دور تک پھیلا ہوا تھا جسمیں چھوٹی چھوٹی نہروں کا جال بچھا تھا۔ اس گھڑی میں مشاہدۂ نفس میں ڈوب گیا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ دنیا اتنی حسین ہے کہ اسمیں رہ کر ماتھے پر شکن ڈالنا ناشکری ہے:"

زندگی میں آگے چل کر بھی ایسے اثر آفریں لمحے گذرتے ہیں اور اسوقت بھی اُن سے نئی زندگی کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ لیکن نوجوانی میں ان کی شان ہی اور ہوتی ہے۔ اس زمانے میں محض پُرانی زندگی کی تجدید نہیں ہوتی بلکہ نئی زندگی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی انسان آنکھ کھول کر

اپنے حقیقی وجود کو دیکھتا ہے اور اُسکا غنچۂ نفس کھل جاتا ہے مذہبی پہلو سے کہا جا سکتا ہے کہ خدائے حی وقیوم انسان کی جیتی جاگتی روح کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

(۲)

مختلف نوجوانوں میں نشوونما کی روانی کے اعتبار سے جو اختلافات ہوتے ہیں انہیں ہم آسانی سے چند مثالیں قائم کرکے ظاہر کرسکتے ہیں لیکن ان کی شخصیت جتنی مختلف صورتیں اختیار کرسکتی ہے اُن سب کا بیان کرنا گویا ایک بحرِ بیکراں کی شناوری ہے۔ اگر ہم اپنے موضوع بحث کو دیکھتے ہوئے شخصیت کے اظہار کی صرف اُن صورتوں سے بحث کریں جو عہدِ شباب سے مخصوص ہیں اور آگے چلکر غائب ہوجاتی ہیں تو ان کا بھی احاطہ نہیں ہوسکتا۔ بہرحال ہم صرف خاص خاص صورتوں کا ذکر کرینگے۔ اور اُن میں بھی سیرت و اعمال کی جزئیات سے قطع نظر کرکے محض اُس ابتدائی حالت کو دکھائیں گے جب یہ خلقی رجحانات ایک مجموعی احساس زندگی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور انسان ہنوز اپنی شخصیت کا شعور نہیں رکھتا اور نہ اسکی اخلاقی تربیت کی کوشش کرتا ہے۔

نفسیات ترکیبی میں ہم کو اس غلطی سے محفوظ رہنا چاہیئے کہ انسانی شخصیت کی تقسیم پُرانے اصول کے مطابق ادراک، احساس، اور ارادے کے لحاظ سے کریں۔ احساس زندگی کی اصطلاح لفظی پہلو سے محض احساسات تک محدود معلوم ہوتی ہے لیکن اصل میں اس سے مُراد مجموعی نفسی کیفیت ہے۔ یہ تینوں مذکورہ بالا عناصر الگ الگ کبھی نہیں پائے جاتے بلکہ ہر فرد کے نفس میں ملے جلے ہوتے ہیں اور ان کی باہمی ترکیب کی نوعیت ہی پر شخصیتوں کے اختلافات کا دارومدار ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرد کی ترکیب نفسی اس تعلق پر مبنی ہے جو وہ مختلف قدروں سے رکھتا ہے۔ یعنی اُس رابطے پر جو اسمیں اور ذہن خارجی میں ہوتا ہے۔ اُس فاعلی اور انفعالی رشتے پر جو اُسے منشائے کائنات کا پابند کرتا ہے۔

جسطرح ایک ہی راگ مختلف سروں میں، مختلف رفتار اور مختلف زیروبم کے ساتھ گایا جاسکتا ہے اسیطرح انسان کی شخصیت مختلف حالتوں اور کیفیتوں میں ظاہر ہوسکتی ہے۔ مثلاً

چاروں مزاج جنھیں نفسیات ہمیشہ سے مانتی چلی آئی ہے اُن میں سے ہر ایک مختلف قسم کے ذہنی
رجحانات کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مزاج کو انسان کی مخصوص ذہنی صلاحیتوں سے کوئی تعلق
نہیں اس سے تو محض اسکی نفسی کیفیات کی روانی اور اُن کے عام رنگ کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں ہم
اس قسم کے تین متضاد جوڑے دکھاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں ایک سرا مثبت ہے اور ایک
منفی۔ ظاہر ہے کہ مثبت پہلو اختیار کرنا ہر فرد، خصوصاً ہر نوجوان، کی نفسی زندگی میں زیادہ وضاحت
اور وُسعت پیدا کرتا ہے۔

۱۔ نفسی کیفیات کی روانی اور حرکت کے اختلاف سے بعض لوگوں کی طبیعت ساکن
ہوتی ہے اور بعض کی بے چین۔ اگر کسی کا بلوغ کا زمانہ بھی شدید ہیجان کے بغیر گزر جائے تو یہ اس
بات کی علامت ہے کہ اسکی نفسی زندگی میں حرکت وُسعت اور گہرائی کی بہت کمی ہے۔ اور جو کہیں
اسکے ساتھ جسمانی سُستی اور بھدّا پن بھی شامل ہو جو اس زمانہ میں اکثر ہوتا ہے تو اس شخص سے کسی کو
دلچسپی اور انس نہیں ہوتا۔ اس لیئے وہ بیچارہ کس مپرسی میں رہتا ہے اور یہ اسکی ارتقائے نفسی کے
لیئے اور مضر ہے۔ لیکن اصل میں یہ ضروری نہیں کہ اسمیں نشوونما کی قابلیت ہی نہ ہو۔ بہت ممکن ہے
کہ اس نوجوان میں قابل قدر صفات موجود ہوں۔ جذبات کے طوفان اور غور و فکر کی الجھن سے محفوظ
رہنا بجائے خود نفسی ارتقا کی راہ کو ہموار کرنے کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے شخص کو اپنے آپ سے
کم لڑنا پڑتا ہے۔ اور اگر حالات موافق ہوں تو وہ آسانی سے اپنی سیرت کی تشکیل کر سکتا ہے۔ دیہات
کے اور غریب طبقے کے نوجوانوں میں عموماً بلوغ کے زمانہ میں اتنا نمایاں فرق نہیں معلوم ہوتا جتنا
ان نوجوانوں میں جنھیں ابتدائے عصرِ جدید کی ذہنی زندگی کے تضاد سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا
ہے کہ ساکن طبیعت والوں کے قلب کی گہرائی میں کوئی جوہر موجود ہو جو ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر خود ان لوگوں
کو بھی اپنے باطنی جوہر کی خبر نہیں ہے تو وہ بالکل "خوابیدہ" رہتا ہے۔ مگر ممکن ہے کہ آگے چل کر
یہ جوہر دفعتہً بیدار ہو جائے۔ ایسی صورت میں اسکی نشوونما بڑی آسانی سے ہوتی ہے کیونکہ وہ
ابتدائے عمر میں بلوغ کے خطرات سے محفوظ رہا ہے۔ نوجوان لڑکیوں میں بہت سی ایسی "سایہ پرور"

طبائع ہوتی ہیں جو بغیر جذبات پرستی کے چپ چاپ اپنا روزمرہ کا کام کیا کرتی ہیں۔ وہ خیال اور رومان کی نامحدود فضا میں بلند پردازی نہیں کرتیں لیکن مستعدی فرض شناسی، اطمینان اور یقین کے ساتھ بغیر کسی شبہ یا الجھن کے اپنی راہ چلتی ہیں اور ایک دن وہ سارے خاندان کا سہارا بنجاتی ہیں، ظاہری حیثیت سے بھی اور باطنی حیثیت سے بھی۔ اور یوں تو وسیع اور شاعرانہ طبیعت کی لڑکیوں میں ایک حد تک نباتات کی سی لاشعوری کیفیت ہوتی ہے یہاں تک کہ انکے دلمیں جذبۂ محبت بیدار ہوتا ہے یا دوسرے کی محبت آکر انہیں بیدار کرتی ہے۔ اس پرانی کہانی "کانٹوں کا گلاب" یا "سوتی شہزادی" کا مطلب اصل میں یہی ہے۔ لڑکیاں اکثر موسم بہار کی راتوں کی طرح ٹھنڈی اور پُر سکون ہوتی ہیں۔ لیکن محبت کے سورج سے اُن کے دل کی کلی کھل جاتی ہے اور اسکی خوشبو مشام جان کو معطر کردیتی ہے۔

لیکن بچپن طبیعت والوں پر کچھ اور گزرتی ہے۔ اُن کے دریائے نفس کی موجیں اٹھتی اور گرتی رہتی ہیں۔ ان میں مدوجزر آتا رہتا ہے۔ کوئی شخص ہمیشہ جوش کی حالت میں نہیں رہ سکتا۔ اس لیئے اس قسم کی طبیعتوں میں خطرناک تلوّن پایا جاتا ہے۔ کبھی انبساط کی کیفیت اور کبھی انقباض کی۔ نازک موقعوں پر بڑھتے بڑھتے تشنج کی سی حالت ہو جاتی ہے۔ بظاہر یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان لوگوں کی نفسی زندگی قدورے مالامال ہے۔ اکثر صورتوں میں واقعی ایسا ہی ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ظاہری زورِ طبیعت سے ذہنی سرمایہ کا اندازہ کرنے میں دھوکا ہوتا ہے بہت سی ایسی مثالیں ہیں کہ جو لوگ بلوغ کے زمانہ میں ہونہار معلوم ہوتے تھے آگے چل کر کچھ نہ نکلے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نفس میں جتنی قوت تھی وہ پھول آنے میں صرف ہوگئی۔ پھل کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ یا نفسیات کی زبان میں یوں کہیئے کہ بلوغ کے زمانہ میں جسقدر جوش اور بے چینی ہوگی اسی قدر اپنے نفس کے سمجھنے اور اپنی سیرت کی تشکیل میں دقت پیش آئے گی۔ اگر سمندر میں طوفان ہو تو بہت سے ایسے لوگ فنا ہو جاتے ہیں جو سکون کی حالت میں اپنی کشتی پار لگا دیتے۔

۲۔ جسطرح سکون یا بے چینی ہر قسم کی ذہنی سیرت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں اُسی

طرح بعض لوگوں میں بلوغ کے زمانے میں ہر چیز کے اثرات قبول کرنے کا مادّہ ہوتا ہے وہ ہرڈر یا رومانی شعرا کی طرح عالمگیر احساس رکھتے ہیں۔ وہ ہر خارجی نغمے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سے انکی سیرت کی ظاہری یا باطنی تشکیل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ وہ ہر چیز کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ہر بات کو سمجھتے ہیں، ہر رنگ میں رہتے ہیں۔ ہر مسئلے پر غور کرتے ہیں لیکن ان کی طبیعت کا کوئی مرکز نہیں ہوتا۔ وہ اپنے گوناگوں احساسات کے سمندر میں بے پتوار کشتی کی طرح بہتے رہتے ہیں۔

برخلاف اسکے بعض لوگ اپنی واردات قلبی کی تشکیل کرتے ہیں، پہلے اپنے نفس کے اندر، اسکے بعد خارجی اعمال کی صورت میں خواہ وہ علمی ہوں، یا جمالیاتی یا اقتصادی یا سیاسی۔ یہ فاعلانہ طبیعت والے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اپنے نفس کی تشکیل کرنے والے اور خارجی امور کی تشکیل کرنے والے۔ یہ دونوں اثر آفریں ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے گروہ کا دائرہ اثر خود اپنا نفس ہے اور دوسرے کا خارجی دنیا۔ اس بات کا فیصلہ کہ دونوں میں کون انسانی عظمت کے لحاظ سے برتر ہے۔ ہر شخص اپنے تصور کائنات کے مطابق کرتا ہے۔ غالباً یہ فرق صرف ظاہری ہے اور اصل میں نہ بغیر داخلی تشکیل کے خارجی تشکیل ممکن ہے اور نہ تشکیل نفس اسوقت تک مکمل ہوتی ہے جب تک خارجی عمل کے لئے کم سے کم ایک بار کوشش نہ کی جائے۔ کیونکہ سچ پوچھیے تو تشکیل نفس بھی ایک معروض (Object) چاہتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ معروض باہر نہیں بلکہ اندر ہوتا ہے۔

ایک اور فرق یہ ہے کہ بعض لوگوں میں خودی زیادہ ہوتی ہے اور بعض میں بے خودی پہلی قسم کے لوگ ہر چیز میں اپنے آپ کو دیکھتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ کام میں اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ اس خود فراموشی کا اچھا یا بُرا ہونا کام کی قدر پر موقوف ہے۔

ان تینوں باتوں کے لحاظ سے نفسیات شباب نوجوانوں کو ایک عجیب حالت میں پاتی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ نوجوان ارتقائے نفس کی جس منزل میں ہوتے ہیں اُسکا تقاضا یہ ہے

کہ ان میں اثر پذیری زیادہ ہو اور اثر آفرینی کم، تشکیل نفس کی قوت زیادہ ہو اور تشکیل معروض کی کم، خودی زیادہ ہو، اور بے خودی کم، لیکن بعض اوقات ارتقائے نفس کے بسبب انفعالی وظائف ظاہری فاعلیت کے پردے میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے حقیقت یہ ہے کہ نوجوان شعر کہنے میں محض اپنے تخیل کا لطف اٹھاتا ہے، اپنی ذات کا مشاہدہ، اور اپنی سیرت کی تشکیل کرتا ہے، تصنیف و تالیف میں وہ صرف تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اگر وہ دفتر کے دفتر بھی لکھ ڈالے تو ان کا ماحصل یہی ہے کہ وہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھے اور اپنا نقطۂ نظر قائم کرے۔ اسکی سماجی، سیاسی اور کاروباری جدوجہد اصل میں اپنے نفس کی تربیت ہے آہستہ آہستہ بہت دن کے بعد یہ ظاہری تخلیق حقیقی تخلیق بنتی ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جو شخص سیکھنے میں بھی تخلیقی عمل سے کام لیتا ہے اُسے آگے چل کر تخلیق میں آسانی ہوتی ہے۔

لڑکیوں کا اس معاملے میں عجیب حال ہوتا ہے۔ جب وہ بالغ ہوتی ہیں تو انہیں اپنی جنس کی نفسی خصوصیات کا بالکل علم نہیں ہوتا۔ اکثر وہ ابتدا میں اچھی خاصی تخلیقی قوت رکھتی ہیں اور مردوں سے بازی لے جاتی ہیں کیونکہ ابتدا میں انکی نشوونما کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اُن کے دل میں کوئی مقصد ہو جو مرد کے مقاصد سے مختلف ہو مثلاً تہذیب نفس کا خیال یا مردوں سے مقابلہ کرنے کا خیال۔ لیکن صورت یہ ہے کہ نوجوان عورت کا ذہن زیادہ سے زیادہ بیس سال کی عمر تک پہنچکر افسوسناک انحطاط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُسکی روح کی گہرائی سے ایک نئی چیز نمودار ہوتی ہے اور اسکی پہلی سچی محبت کے ساتھ رفتہ رفتہ اسکی ساری زندگی پر چھا جاتی ہے۔ اب اگر وہ کوئی تخلیقی کام کرتی ہے تو اس ایک شخص کے لیئے جس سے اُسے محبت ہے حالانکہ وہ اپنے کام میں بالکل محو ہو جاتا ہے یا اگر اسکی تخلیق کو عورت سے تعلق ہوتا ہے تو کل جنس نسواتی سے یعنی "ابدی جوہر انوثیت" سے نوجوان عورت شاید خود بھی یہ محسوس نہیں کرتی کہ اُسمیں جو کچھ تخلیقی مادہ باقی ہے وہ اس واقعی محبت سے وابستہ ہے بلکہ صرف یہی محبت تخلیق کی قوت رکھتی ہے۔ وہ اب خارجی اشیاء کی تشکیل نہیں کرتی بلکہ صرف اپنے محبوب کے نفس کو اور اُسی کے ساتھ خود اپنے

نفس کو اور آگے چلکر بچوں کے نفس کو سنوارتی ہے - یہی سرمایہ محبت خواہ وہ مایوس محبت ہی کیوں نہ ہو، اُسے یہ قوت بخشتا ہے کہ وہ ان صفات کو حاصل کرے جو اُسے آگے چل کر دوسروں میں پیدا کرنا ہے - کیونکہ عورت کی قسمت ہی میں یہ ہے کہ اسکی تخلیق نفوس کے ذریعہ سے اور نفوس کے اندر ہوا کرے جیسے خود اُسکے وجود کے اندر فطرت کی تخلیق بچوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو اسکے خون اور اسکی روح سے بنتے ہیں -

اگر مرد یہ سمجھیں کہ عورتوں کا واقعی حصّہ زندگی میں خود اُن کے حصّے سے کمتر ہے تو یہ انکی تنگ نظری ہے - لیکن عورتوں کی نشو ونما ہمیشہ صحیح طریقے پر نہیں ہوتی - بعض اوقات ابتدائے عمر میں ہمیں کجروی پیدا ہو جاتی ہے - اس دور میں بعض لڑکیوں کو کام سے بہ حیثیت کام کے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جو اُن کی جنس کی خصوصیات کے خلاف ہے - یہ کبھی حقیقی معنی میں عورت نہیں بن سکتیں - بعض ایسی بھی ہیں کہ عارضی طور پر حقیقی ہدایت کی طرف جھکتی ہیں لیکن اگر وہ کسی وجہ سے، مردوں سے دل شکستہ ہو جائیں تو اپنی اگلی نفسی کیفیت کی طرف رجوع کرتی ہیں - ایسی صورت میں وہ جو کچھ بھی کرتی ہیں کام کی خاطر نہیں کرتیں بلکہ مردوں کی ضد میں، خارجی حیثیت سے ان کا طرز عمل وہی ہوتا ہے جو مردوں کا لیکن اُن کے دلمیں جو غصہ ہوتا ہے وہ مردوں میں بہت کم پایا جاتا ہے - شاید ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ کوئی مرد اپنی تخلیق کی بنا عورتوں کی مخالفت پر رکھے - کیونکہ مردوں کے دلمیں باوجود تمام مایوسیوں کے بھی ابدی جوہر انوثیت کا تصور رہتا ہے -

۴ - تضاد کی جن دو صورتوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں اُن سے کہیں زیادہ اہم اور گہرا وہ تضاد ہے جو شگفتہ مزاج اور دل گرفتہ لوگوں میں ہوتا ہے - اگرچہ اسکی بنا اس رویّے پر ہوتی ہے جو انسان قدر کائنات کے متعلق رکھتا ہو پھر بھی یہ فرق طبیعت کے جوہر کے لحاظ سے نہیں بلکہ محض عارضی کیفیت کے لحاظ سے ہوتا ہے اسمیں شک نہیں کہ شگفتہ مزاجی اور دل گرفتگی مذہبی احساس سے تعلق رکھتی ہے جو شخصیت کا مرکز ہے لیکن کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں کیفیتیں

ہمیشہ مرکزی گہرائی رکھتی ہوں بلکہ عموماً ان سے محض واردات قلبی کا عام رنگ ظاہر ہوتا ہے۔

اگر دل گرفتگی کسی شخص کی ساری زندگی پر چھا جائے، خواہ اُس نے ابھی شخصی تصوّر زندگی کی صورت اختیار نہ کی ہو بلکہ محض ایک لے کی طرح نغمۂ حیات میں پنہاں ہو، تو وہ افسردگی کہلاتی ہے۔ بعض نوجوان ایسے بھی ہوتے ہیں جنکی افسردگی بیماری کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اُن کے سارے احساسات پر حزن وملال کی تاریکی چھائی رہتی ہے یہانتک کہ اُن پر بھی جو بجائے خود مسرت بخش ہیں، اُنہیں ہر چیز میں موت کا سنّاٹا نظر آتا ہے۔ ہر چیز کانٹا بنکر اُن کے دل میں کھٹکتی ہے۔ عموماً اسکے ساتھ ہی اُن کا دست عمل شل ہو جاتا ہے۔ گویا یہاں زندگی انسان کے قابو میں نہیں رہتی بلکہ انسان زندگی کے قابو میں آجاتا ہے۔ وہ زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ زندگی اُسے بسر کرتی ہے۔ یہ زندگی نفس کو ایسا شکنجہ میں کستی ہے کہ اُسکے درد کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ خوشی پنپنے ہی نہیں پاتی۔ بن کھلے مرجھا جاتی ہے۔ ارتقائے نفس کے دوران میں جوں جوں انسان کی شخصیت کے مرکز میں یہ افسردگی کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے وہ انکار و نفی میں مبتلا ہوتا جاتا ہے۔ یعنی نفی ذات اور نفی کائنات کی طرف مائل ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ آخر وہ ہر قدر کو بے حقیقت سمجھنے لگتا ہے۔

جذبات پرستی اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ ہمیں بھی المناک احساسات کا غلبہ ہوتا ہے لیکن جذبات پرست آدمی کو درد و الم میں ایک طرح کا لطف آتا ہے۔ اسکی نفسی کیفیت میں ایک ثبوتی پہلو بھی ہوتا ہے یعنی زندگی کا احساس۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو ایک عجیب طرح کی منحوس سعادت حاصل ہوتی ہے۔ اُسے آنسوؤں سے تسکین ہوتی ہے بلکہ انتہائی مسرت۔ اسی لئے افسردہ مزاج لوگوں کی طرف سے ہر وقت خودکشی کا اندیشہ رہتا ہے۔ لیکن جذبات پرست کبھی خودکشی نہیں کرتے۔ افسردگی عہد شباب میں اکثر نمودار ہوتی ہے لیکن ہمیشہ مرض کی صورت میں۔ برخلاف اسکے جذبات پرستی زمانۂ بلوغ کی طبعی (Normal) حالت بلکہ خصوصیت ہے۔ کیونکہ اکثر نوجوانوں کو جب پہلے پہل احساس اور درد کی لذت

حاصل ہوتی ہے تو اتنے خوش ہوتے ہیں کہ بالکل اسی میں محو ہو جاتے ہیں۔ زندگی میں جتنی چیزیں ہیں سب میں راحت والم مخلوط ہوتے ہیں۔ اور انسان اپنے مذاق کے مطابق دونوں میں سے ایک کو اختیار کر سکتا ہے، موسم بہار، جذبۂ عشق، شورش آرزو، کشمکش حیات ان سب چیزوں میں سے اگر ہم ثبوتی عنصر کو اخذ نہ کریں بلکہ محض ناپائداری کے دردناک پہلو کو پیش نظر رکھیں تو ان سے لذت اور درد کا دُہرا لطف حاصل ہوتا ہے۔ تاریخ کے بعض دَور ایسے ہوتے ہیں جب لوگ ان دوگونہ جذبات میں مگن رہتے ہیں۔ یہی لوگ بادۂ مسرت میں سرشار ہونے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب اس دوگونہ لطف اندوزی کا موضوع گذری ہوتی چیزیں ہوتی ہیں تو یہ رومان پرستی کہلاتی ہے۔ رومانی طبیعت کے نوجوان انھیں چیزوں سے محبت رکھتے ہیں جو فنا ہو گئیں یا فنا ہونے والی ہیں۔ جس شخص نے ان طبائع کا مشاہدہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ ان میں انتہائی داخلیت کا رنگ ہوتا ہے۔ کیونکہ ساری واردات قلبی میں سے یہ لوگ انہیں متضاد احساسات کو چنکر نکال لیتے ہیں جیسے کوئی چھلکے میں سے مغز کو نکال لیتا ہو۔ انکا درد والم ہی اُنکے لئے راحت و مسرت ہے۔ یہ طرز احساس خارجی موضوع سے اسقدر بے تعلق ہوتا ہے کہ اسمیں گہرائی بھی نہیں ہوتی۔ یہ زمانہ ارتقا کی ایک بیماری ہے جو اپنے وقت پر خود بخود جاتی رہتی ہے۔ اسکی مثال یہ ہے کہ انسان جب کوئی گولہ پھینکنا چاہتا ہے تو پہلے اسے ہاتھ میں لیکر تولتا ہے آہستہ سے اُچھال کر جھیلتا ہے اسکے بعد پوری طاقت سے پھینکتا ہے۔

اسطرف افسردگی اور جذبات پرستی میں جو فرق ہوتا ہے وہی اس طرف شگفتہ مزاجی اور شگفتہ خاطری میں ہوتا ہے۔ ایک خوشدلی جسمانی اور روحانی صحت کے سبب سے ہوتی ہے جسکے ساتھ گہرائی اور لذت درد بھی جمع ہو سکتی ہے۔ مگر وہ سطحی شگفتگی بالکل مختلف چیز ہے جو نہ تو انسان کی اندرونی سیرت پر مبنی ہوتی ہے اور نہ بیرونی حالات زندگی پر بلکہ محض مزاجی کیفیت پر۔ یہ کیفیت حاصل کرنے کے لئے انسان "غم غلط کرنے" کے بہانے اپنے آپ سے بھاگتا ہے اور ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتا ہے جہاں وہ ساری ذمہ داریوں اور پابندیوں سے آزاد ہو جائے

وہ دوستوں کی صحبت میں رہتا ہے، تماشوں میں جاتا ہے، سیر کیا کرتا ہے۔ یہ شگفتگی ان لوگوں میں ہوتی ہے جو تتلی کی طرح ہر پھول کو چکھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ نوجوان میں یہ بے تپی ہمیشہ باقی رہے تو اسکے لیئے ہر دم نئی دلچسپیاں فراہم کرتے رہیئے۔ کبھی سیر و تفریح، کبھی محفل نغمہ و سرود، کبھی سفر، کبھی صحبت احباب، کبھی ناچ رنگ۔

احساس زندگی کے یہ دونوں رنگ دو مختلف قسم کی عورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ کہاں وہ شگفتگی جو ایک نوجوان خاتون کے قلب کی گہرائیوں سے نکل کر روز روشن کی طرح پھیلتی ہے اور کہاں لڑکیوں کی خوشی جو محض کھیل کود، ہنسی مذاق تک محدود ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں چیزیں فطرت کی عطیہ ہوں لیکن ان کا گھر فطرت کے مختلف طبقوں میں ہے۔ ایک میں پریاں رہتی ہیں اور دوسری میں دیویاں۔

ممکن ہے کہ مجموعی احساس زندگی کا اثر تصور کائنات پر پڑے لیکن یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے۔ شگفتہ مزاج لوگ ہمیشہ رجائی (Optimist) نہیں ہوتے۔ اور نہ دل گرفتہ اشخاص ہمیشہ قنوطی (Pessimist) ہوتے ہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ ایک شخص جو داخلی حیثیت سے دل گرفتہ ہو اپنی طبیعت کے خلاف رجائی تصور کائنات اختیار کرے اور اسی طرح ایک شگفتہ مزاج آدمی قنوطیت پسند ہو جائے۔ احساس کے مثبت یا منفی رنگ کا اثر مجموعی ذہنیت پر ضرور پڑتا ہے لیکن یہ اثر تصور زندگی اور تصور کائنات کا متن نہیں ہوتا بلکہ محض حاشیہ۔

اب ہم ان ذہنی رجحانات کا ذکر کرتے ہیں جنکا شمار احساسات زندگی کی ذیل میں محض اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ ارتقائے نفسی کے ابتدائی دورہ میں وہ شعوری حیثیت نہیں رکھتے بلکہ دھندلے سے ہوتے ہیں۔ ابھی تک ان میں ان رابطوں کا رنگ کم ہوتا ہے جو نفس انسانی اور خارجی تمدن کے درمیان ہوتے ہیں۔ اور احساس خودی کی صورتوں کا رنگ زیادہ ہوتا ہے۔ ہم نہایت اختصار کے ساتھ اس قسم کی آٹھ خاص خاص صورتیں بیان کرتے ہیں اور ان بے شمار مثالوں (Types) سے قطع نظر کرتے ہیں جو ان صورتوں کی افراط و تفریط سے، انکی

باہمی ترکیب سے، اور ان پر مخصوص تاریخی حالات کا اثر پڑنے سے پیدا ہوتی ہیں۔

۱۔ جو لوگ ذہنی زندگی کی سب سے پہلی منزل میں ہوتے ہیں انکی زندگی کا مرکز جسمانی احساس ہوتا ہے۔ ان میں اب تک خالص فطری عنصر قوی ہوتا ہے۔ ان کی راحت والم کا دار و مدار اُس خون پر ہے جو ان کی رگوں میں دوڑتا ہے اُنکا احساس حیات اسی خون کی گردش پر منحصر ہے۔ عہدِ جدید کے فلسفیوں، نٹشے، برگسان، زیمل، اور شلر کے نزدیک اس احساس حیات میں ایک مخصوص نوع قدور کار فرما ہے جنھیں وہ حیاتی قدور کہتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھئے تو ان احساسات میں جتنا حصّہ ذہنی قدور کا ہے وہ دوسری انواع قدور سے ماخوذ ہے جسمانی کیف شباب میں ایک عنصر چھپا ہوتا ہے یعنی عشق کا، زیادہ تر اپنی ذات کے عشق کا ایک عنصر طاقت اور قوت کے احساس کا ہے جو صحتِ جسمانی پر مبنی ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ایک عنصر مذہبیت اور باطنیت کا:

"کون کہہ سکتا ہے،

کہ وہ خون کی ماہیت سے واقف ہے۔

سب جسم ایک ہیں،

جسم ایک ہی ہے،

آسمانی خون میں،

عاشق و معشوق تیرتے ہیں،

کاش سارا سمندر خون بن جائے،

اور سارے پہاڑ گوشت بن جائیں،

عشائے ربانی کبھی ختم نہیں ہوتی،

محبت کو کبھی سیری نہیں ہوتی،

نوجوان جو احساس جسم سے پر ہوتے ہیں اپنے جسم میں روح اور ذہن کو بھی محسوس کرتے

ہیں مگر کوئی کم کوئی زیادہ۔ سب سے کم ذہنی عنصر اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو ہمیشہ کھیل اور ورزش میں مصروف رہتے ہیں۔ اپنی جسمانی طاقت کے زعم میں وہ ہر لطیف چیز کو حقیر سمجھتے ہیں تاہم ناچ میں، دشت نوردی میں اور تیراکی میں بھی ایک روحانی عنصر ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو یہ احساس بہت آہستہ آہستہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی فطرت سے وابستہ ہے تندرست عورتوں میں روح اور جسم کا اتحاد تمام احساسات کی تہ میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ نوجوانوں کا صحیح اور قوی جسم انہیں احساس قوت بخشتا ہے لیکن اسی کے ساتھ جسم کا غلام بن جانا، جنسی شہوت کے پنجے میں اسیر ہوجانا، اور وہ گھٹن جو روحانیت سے خالی شہوت میں پائی جاتی ہے اُن کے لیئے بہت تکلیف دہ ہے۔

۲۔ غالباً نوجوانوں میں جو مثال (Type) سب سے زیادہ نظر آتی ہے وہ جمالیاتی جذبات پرستی ہے۔ ان لوگوں میں بھی جو آگے چل کر کوئی اور وضع نفسی اختیار کرتے ہیں جوانی میں جمالیاتی جوش کا ایک دور ضرور گزرتا ہے۔ یہ وہ ذہنی بہار ہے جو گہری طبیعت اور وسیع تخیل رکھنے والوں کے لیئے ارتقائی ضرورت کا حکم رکھتی ہے۔ اس تخیل کی پُراسرار روشنی تمام دنیا میں پھیلتی ہے، ہر چیز میں جان ڈالدیتی ہے۔ سارے عالم کو محبت کے ساتھ اپنے دلمیں کھینچ لیتی ہے اور اس تصویر میں رُوح پھونکنے کے بعد اُسے پھر لوٹا دیتی ہے۔ تمام کائنات ایک حسن کا سمندر، ایک ہم آہنگی اور روحانی برتری کا نظام بن جاتی ہے۔ اُسکے تمام حصوں میں باہم مناسبت ہے اور وہ محبت کے ساتھ ہم آغوش ہیں۔

اگر میں سارے سنسار میں اکیلا ہوتا

تو مجھے چٹانوں میں بھی چشم تخیل سے روحیں نظر آتیں۔

اسطرح نفس کی تخیلی بلند پروازی سے جمالیاتی ہمہ اوست یا ہمہ ”ز اوست“ کا تصور کائنات پیدا ہوتا ہے۔ اس چیز سے نوجوانوں کو بڑی روحانی تکالیف پیش آتی ہیں جنھوں نے آجکل خاص اہمیت اختیار کرلی ہے۔ افلاطون کی ”دعوت“ میں، جو نوجوانوں کی آسمانی کتاب ہے

بہ خیال سب سے پہلے صورت پذیر ہوا ہے کہ تمام مظاہر قدرت ایک عکس یا مثال یا پردہ ہیں حسن محض کا یعنی عین کا جو اعتدال اور ترتیب کا منبع ہے۔ ہر دور میں جب نفسی زندگی میں شباب کی حرکت ہوتی ہے لوگ ان ابدی علامات کو اختیار کرتے ہیں۔ اسکی مثالیں نشاۃ ثانیہ کا دور طوفان و ہیجان کا دور اور رومانی دور ہیں۔ آخری جمالیاتی لہر ۱۹۰۰ء میں آئی تھی جب شیکسپیری اور گیورڈانو برونو کے خیالات کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن جرمن نوجوان کے لیے اس احساس زندگی کی ابدی علامت آوارہ وطن نغمہ سنج حسن نوجوان ہولڈرلین کی ذات ہے جس نے جرمن اور یونانی رومانی خیالات کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اسکی مناجاتیں اور اسکا ہائی پیرین نوجوانوں کے جمالیاتی جوش کا خالص ترین مظہر ہے۔ ان کے اندر انسان کو نوجوان کے نفس کا مدوجزر نظر آتا ہے یعنی وہ کشمکش جو سعادت بخش وجد اور دل شکن واماندگی، لذت اور درد، انس اور وحشت میں ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کا ریاست کا نصب العین حسن کی آسمانی حکومت ہے۔

اس وضع زندگی میں ہمیشہ فطرت کی گہری محبت پائی جاتی ہے۔ لیکن اسکا اصل مرکز عشق ہے ان دونوں میں سے جو چیز غالب ہو اسکے لحاظ سے نوجوان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ فطرت سے روحانی محبت رکھنے والے اور عشق پرست، لیکن اصل میں یہ دونوں چیزیں ملی ہوئی ہوتی ہیں کیونکہ ان نوجوانوں کا عشق عالمگیر ہوتا ہے۔ جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ معلوم نہیں کہ ان لوگوں کی ہمہ گیر محبت کا ابتدائی موضوع حسن فطرت ہوتا ہے اور اسکے بعد انسانی حسن کی باری آتی ہے۔ یا اسکے برعکس حیاتی طبیعت سے منشاء ان لوگوں کی طبیعت بھی ہوتی ہے جنمیں عشق کے ساتھ شہوت ملی ہوتی ہے اور دونوں کے درمیان وہ فاصلہ باقی نہیں رہتا جو ابتدا میں تھا۔ ان کے یہاں جسمانی محبت سراپا روحانی عشق بن جاتی ہے۔ اور اس کے جوش و خروش کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔

نوجوانوں کی اس قسم کا نام ہم ہولڈرلین کی مثال [illegible] رکھ سکتے ہیں

نوجوانوں کے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ اس حالت کو جو بظاہر روحانی ہے مگر اصل میں غیر ذمہ داری اور حفظِ نفس پر مبنی ہے چھوڑیں اور واقعی زندگی کی طرف رجوع کریں۔

خاکسار مصنف نے اپنی سیرت میں یہ تبدیلی سختی سے احتسابِ نفس کرکے پیدا کی ہے۔ مجھے اس طرز زندگی سے اکیس برس کی عمر میں یوں نجات حاصل ہوئی کہ میں نے اسکی اندرونی کشمکش کا اور اسکے اصول و قوانین کا محققانہ نظر سے مطالعہ کیا۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بصیرت بھی حاصل ہوئی کہ نہ صرف جمالیاتی طرز زندگی بلکہ ہر یک طرفہ طرز زندگی کو کہیں نہ کہیں پہنچ کر تباہی کا سامنا ہوگا۔ لیکن پھر بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اپنی طبیعت کے ہولڈرلین والے رجحان کو قابو میں کرلیا ہے۔

۲۔ اُن نوجوانوں کی نفسی حالت کچھ اور ہی ہوتی ہے جنھیں نظری مسائل پر غور کرنے کا شوق ہے۔ ان کو کبھی آزادانہ احساس کا موقع نہیں ملتا۔ کیونکہ وہ نہایت غور اور توجہ سے ہر چیز کی اصلیت اور ماہیت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسطرح واردات کو خیالات اور جذبات کو مسائل بنا دینے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اندرونی زندگی رک جاتی ہے۔ ان میں سے بعض تو خیر اتنا بھی کرتے ہیں کہ اپنے جذبات کے ہیجان کا محققانہ مشاہدہ کرکے اسمیں سکون پیدا کریں۔ لیکن کثر ایسے ہوتے ہیں جنھیں قوتِ عمل بالکل نہیں ہوتی۔ ان کا سرمایہ حیات محض منطقی تحلیل سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ اُسے ایک مسئلہ بنالیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس موشگافی کے لئے ابھی انکے پاس مواد نہیں ہوتا۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ جب وہ یہ عظیم الشان معمہ کہ "زندگی کا منشا کیا ہے" حل کرلیں گے تب جاکر انہیں کوئی مقصدِ حیات ہاتھ آئے گا۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ وہ رفتہ رفتہ بے مقصدی اور بے عقیدگی میں گرفتار ہو جائیں گے کیونکہ یہ اسکا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ بیفائدہ خیال آرائی بھی زمانہ بلوغ کی ایک خصوصیت ہے۔ لیکن اگر یہ حد سے زیادہ بڑھ جائے تو ایک مرض کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ یعنی خیال اختیاری نہیں بلکہ جبری ہوجاتا ہے یہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ شہوت

کے مسئلے کو، موت کے مسئلے کو اور خود اپنی ذاتی زندگی کے مسئلے کو بجائے ارادے اور عمل کرنے کے محض غور و فکر کے ذریعہ حل کریں۔ بعض ایسے بھی ہیں جنھیں اگر کوئی اہم معاملہ پیش آجائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ دن رات غور کرتے رہنے سے وہ طے ہو جائیگا۔ آج کل نوجوانوں نے خود نوجوانی کی ماہیت کو ایک مسئلہ بنا لیا ہے۔ وہ بیچارے اسی فکر میں ہلاک ہوئے جاتے ہیں اور کوئی کام مستعدی سے نہیں کر سکتے ہیں۔ کبھی وہ خود غور و فکر کی قوت یعنی خیال پر غور کرنے لگتے ہیں اسکا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ تشکیک میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور بڑھتے بڑھتے انکار قدر تک نوبت پہنچتی ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا ہونا جمالیاتی طرز زندگی سے نجات ملنے سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ کیونکہ جمالیاتی جذبات پرستوں کو تو صرف جذبات کے سیلاب اور تخیل کی مطلق العنانی سے پیچھا چھڑانا ہے۔ لیکن نظری غور و فکر کے گرفتاروں کے یہاں خود سرمایۂ زندگی یعنے خیال میں گھن لگ گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں سوائے عمل کے کوئی چیز نجات دینے والی نہیں۔

۴۔ اب ہم ان انفعالی مثالوں سے فاعلی مثالوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کی ترکیب بہت سادہ ہے اور ان کے سمجھنے میں نہ خود ان نوجوانوں کو پیچیدگی محسوس ہوتی ہے اور نہ ماہرین نفسیات کو دقت پیش آتی ہے۔ خصوصاً جن لوگوں کو اپنے پیشے سے دلچسپی ہے یا کمانے کا شوق ہے اُن کے متعلق تو گیارہویں باب کی بحث کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں یہ لوگ عموماً اپنی سیدھی راہ چلتے رہتے ہیں اور انہیں نہ تخیل کے گورکھ دھندوں سے سابقہ پڑتا ہے نہ جداگانہ نفسی مصائب سے۔ انہیں تو زیادہ تر "ترقی" کی فکر رہتی ہے۔ وہ اپنے لئے کوئی "جگہ" ڈھونڈھتے ہیں جسکے معنی آج کل کی معاشی زندگی میں محض اس پیشے کے ہیں جسمیں کام بھی خوشگوار ہو اور آمدنی بھی معقول ہو، لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس کا ایک گہرا پہلو بھی ہے۔ نوجوان وہ "جگہ" ڈھونڈھتا ہے جس سے اُسے مناسبت ہے۔ وہ مقام جہاں قدم جما کر وہ زندگی کی مہم کو سر کر سکے۔ اسمیں شک نہیں کہ ان لوگوں کو بھی مایوسیاں

ہوتی ہیں۔ لیکن اس سے انکی قوت عمل دست یاچہ نہیں ہونے پاتی کیونکہ نہ یہ جمالیاتی طبیعت کے لوگ ہیں نہ نظری طبیعت کے، اُن کے لیئے جو خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ کہیں وہ امریکیت کا شکار ہو کر زندگی کی تمام چیزوں کو محض کاروبار، منافع اور "ترقی" کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھنے لگیں۔ ان کا شیطان روپیہ اور کاروبار ہے۔ اگر وہ ان کو پوری طرح قبضے میں لے آئے تو سمجھیئے کہ معنوی زندگی کا خاتمہ ہے۔ اور عہدِ جدید کے معاشی نظام نے انھیں اور اُن کی انسانیت کو نگل لیا ہے۔

۵۔ ان سے زیادہ وسیع دائرہ زندگی اُن لوگوں کا ہے جو ذوق عمل رکھتے ہیں، ان لوگوں کا مطمح نظر روپیہ کمانا نہیں ہے بلکہ یا تو کام کرنا یا حکومت کرنا۔ اگر پہلی چیز غالب ہو تو یہ لوگ اس صحیح اور مفید قسم سے تعلق رکھتے ہیں جسکا مقصد اپنے تمدن کی خدمت کر کے اپنی زندگی کو بامعنی بنانا ہے۔ انہیں محض اسی چیز سے تسکین ہوتی ہے۔ لیکن نوجوانوں میں ذوقِ عمل کے ساتھ ایک قوی داخلی عنصر بھی ہوتا ہے۔ وہ عمل اور تخلیق کے ذریعہ سے اپنی ذات کا احساس بھی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شہرت کے طالب ہوتے ہیں اور کبھی کبھی اُن کے عمل کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ لوگوں نے ان کی حقیقی قدر نہیں پہچانی ہے۔ وہ اپنے دلمیں بڑے بڑے منصوبے گانٹھا کرتے ہیں۔ سکندر جیسے بیس سال کی عمر میں یہ شکایت تھی کہ اس سے کوئی کام ایسا نہیں ہوا جو ابدالآباد تک باقی رہے۔ ایک مثال ہے جو ہر زمانہ میں پائی جاتی ہے۔ جو نوجوان قائدانہ طبیعت رکھتے ہیں، یا اپنے طبقے کی طرف سے دوسرے طبقوں سے جنگ کرتے ہیں یا دنیا کو نجات دلانے کے مدعی ہیں، وہ سب اسی قسم میں داخل ہیں ذوق عمل رکھنے والے لوگ دنیا کا سفر کرنے، نئے ملک دریافت کرنے، نئی انجمنیں وغیرہ قائم کرنے کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ وہ وطن اور خاندان کے رشتے کے پابند نہیں ہوتے۔ اُن کے دل میں نامحدود کائنات کی کشش کارفرما ہوتی ہے۔ اور یہ اُن کے لیے خطرناک چیز ہے۔ کیونکہ نوجوانوں میں یہ مادہ نہیں ہوتا کہ اپنی قوت کا صحیح اندازہ کریں۔ اس عمر میں بڑے

منصوبے بڑے کاموں کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ انسان کو ابھی یہ خبر نہیں ہوتی کہ کسی تجویز کے پورا کرنے میں کیا کیا دقتیں حائل ہو سکتی ہیں اور ارادہ بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اصل چیز وہ عملی شرائط ہیں جو اسے پورا کرنے کے لیئے ضروری ہیں۔ یعنی محنت استقلال اور قابلیت، یہ سچ ہے کہ بڑے بڑے ارادے ارتقائے نفسی کے لیئے اچھی علامت ہے۔ لیکن ارادے میں اور اسے پورا کرنے میں بہت فرق ہے۔ انسان میں پختگی اسوقت آتی ہے جب بے نفسی اور ان تھک محنت کے ساتھ روزمرہ کا کام کرتا ہے۔ اگر نوجوانوں کے احساسِ زندگی میں بے جا عزت طلبی غالب ہے تو علاوہ ناکامیابی کے خطرے کے اسکا بھی ڈر ہے کہ وہ ادنے اور ناجائز وسائل استعمال کریگا۔ بہت سے لوگوں کا جوہر قابل اس خبط میں برباد ہو گیا "کہ جسطرح بھی ہو مجھے ترقی کرنا چاہیئے"۔ افلاطون نے گورگیاس میں ایک سیاسی آدمی کی دردناک تصویر کھینچی ہے جو قوت کے پیچھے دیوانہ ہے۔ اور دکھایا ہے کہ اسکے دلمیں کیسے کیسے زخم اور کیسے کیسے ناسور ہیں۔

۶۔ نوجوانوں میں اس قسم کے لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں جنکے دل انسانی ہمدردی اور محبت کے جذبے سے لبریز ہوں۔ یہ سچ ہے کہ بعض ایسے نوجوان موجود ہیں جنھیں بچپن کے بعد بھی اپنے خاندان سے انس رہتا ہے۔ بظاہر بعض لڑکیاں اپنی زندگی باپ کی خدمت میں صرف کر دیتی ہیں۔ اور بعض لڑکے عمر بھر ماں کے قدموں میں رہتے ہیں لیکن یہ بات ہمیشہ سچے انس کی دلیل نہیں بلکہ بعض صورتوں میں محض جمود پر مبنی ہوتی ہے۔ ابھی تک ان لوگوں کے دل پر انس و محبت نے قبضہ نہیں کیا ہے۔ نوجوانوں میں اس رجحان کے کم ہونے کا بڑا سبب تو یہی ہے کہ وہ خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اس لیئے انکی ساری توجہ خود اپنے نفس کی طرف ہوتی ہے۔ بلکہ انہیں اپنے آپ سے محبت ہوتی ہے۔ مگر وہ اوّ ہی محبت ہے جسمیں انسان کو دوسروں کی تکلیف سے تکیف ہو۔ اسکا تقاضا یہ ہے کہ وہ دردمندوں [illegible] طبیعت کا اصلی رجحان انس و محبت ہے

نوجوان عورتوں میں یہ مادّہ نوجوان مردوں سے زیادہ ہوتا ہے - اور واقعات شاہد ہیں کہ نوجوان لڑکیاں جو کمسنی میں کسی سماجی کام میں لگادی جاتی ہیں دل وجان سے اسے انجام دینے کی کوشش کرتی ہیں - بلکہ اپنے آپ کو اسکے پیچھے مٹادیتی ہیں - اسی لیئے انہیں اس عمر میں ایسے کاموں کے لیئے وقف کرنا مناسب نہیں - اپنی زندگی وہی شخص دوسروں کو دے سکتا ہے جو خود اخلاقی قدور سے مالامال ہو - دوسروں کی مصیبت میں وہی ہاتھ بٹا سکتا ہے جو خود مصیبتیں برداشت کرکے پختہ کار ہو چکا ہو - لیکن اس قوت کی داغ بیل نوجوان عورتوں بلکہ بعض اوقات چھوٹی لڑکیوں تک کے دل میں پڑجاتی ہے - تھیوڈور فونٹانے کے ایک قصہ میں ایک خاموش لڑکی آرم گارڈ خوش ادا اور ذہین میلوزینا کے پیچھے چھپی ہوئی کھڑی ہے - جب اس سے سوال کیا جاتا ہے کہ وہ ایلزبیتھ کو ملکہ مانتی ہے یا خوبصورت اور دلفریب میری اسٹوارٹ کو تو وہ دونوں میں سے کسی کی حمایت نہیں کرتی اور کہتی ہے :-

"مجھے تھیورنگن کی ایلزبیتھ انگلستان کی ایلزبیتھ سے زیادہ پیاری ہے - دوسروں کی خدمت کرنا اور بھوکوں کو روٹی کھلانا ہی سب سے بڑی خوشی ہے - میں چاہتی ہوں کہ میں یہ نعمت حاصل کروں لیکن انسان خود کچھ حاصل نہیں کرسکتا - جو کچھ ہے خدا کی دین ہے -"

ایسی لڑکی میں یہ آثار پائے جاتے ہیں کہ آگے چل کر نسوانی عظمت کی مالک ہوگی -

۷ - انس اور محبت والوں کا رشتہ زندگی دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے

ان کی پابندیاں محض ذاتی ہیں - جن لوگوں کے دلمیں اخلاقی جوش ہوتا ہے اُن کی حالت دوسری ہے - ہم ایسے نوجوانوں کا ذکر کر چکے ہیں - اخلاقی عفت کا عزم ان کی زندگی کا مرکز ہوتا ہے - خود پاک باطن ہونے اور دوسروں کو پاک باطن بنانے کی آرزو اُن کے قلب کو گرماتی اور ان کی روح کو تڑپاتی ہے - ممکن ہے کہ یہ قوت اپنی ضد سے یعنی گناہ کی ہوس ، اپنی ذاتی کمزوری کے احساس اور نصب العین کے حصول میں عاجز رہنے سے پیدا ہوئی ہو - ایسی صورت میں ان لوگوں کے دلمیں سوائے اخلاقی تکمیل کی دُھن اور نیکی کے جوش کے کچھ نہیں ہوتا - اگرچہ یہ مثال نوجوانوں

میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے لیکن اسکا ایک عام نام رکھا جا سکتا ہے یعنی فشٹے کی مثال۔
کیونکہ ان تمام صورتوں کی اہم ترین خصوصیت وہ اخلاقی ارادہ ہے جو دنیا کی تمام رکاوٹوں پر غالب
آتا ہے۔ اور جتنی دقتیں اسکی راہ میں ہوں اتنا ہی قوی ہوتا جاتا ہے۔ فشٹے نے کہا ہے "دنیا میرے
ادائے فرض کا سامان ہے" اسکے مقابلے میں نوجوان نیٹشے کے الفاظ کو دیکھیے جو اسی زمانے میں
اخلاقی مصلح بننا چاہتا تھا۔ "دنیا کا وجود اگر بامعنی کہا جا سکتا ہے تو محض جمالیاتی منظر کی حیثیت
سے"۔ پیدائشی مصلح کے نفس کا مرکزی جذبہ احساس اختیار ہوتا ہے "تو مختار ہے اس لئے
تو مکلف ہے" اور تجھ پر اخلاقی احکام کی تکلیف اس لئے عائد کی گئی ہے کہ تو خود دل سے انکی
تائید کرتا ہے۔ اخلاقی اصلاح کا جذبہ اگر سچا ہے تو سب سے پہلے اپنی اصلاح کی طرف توجہ
ہوتی ہے۔ اسکا اظہار ضبطِ نفس، ترک لذات اور مشق پرہیزگاری، تہذیب باطن اور
تشکیل سیرت سے ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں نوجوان کے یہاں اخلاقی تشدد کی صورت اختیار
کرتی ہیں۔ جسمیں کسی کمزوری کسی عذر، کسی سمجھوتے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر اصلاح
کا جوش مصلحانہ انداز میں تمام بنی نوع کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔ یہاں بھی وہی انتہا
پسندی نظر آتی ہے۔ نوجوان چاہتا ہے کہ دنیا کو نیکی پر مجبور کرے، اگر ضرورت ہو تو تلوار اور
سولی کی مدد سے۔ جوش جوانی کبھی کبھی آگ کی طرح بھڑک اٹھتا ہے اور دنیا اور انسانوں کی
تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ نوجوان کو ضد ہوتی ہے۔ "یا تو سب کچھ ہو یا کچھ نہ ہو" اگر
یہ جذبۂ اصلاح اتنا قوی نہ ہو تو وہ محض اپنے نفس تک محدود رہتا ہے۔ اور نوجوان اپنی زندگی
کا بڑا مقصد اپنی اصلاح کو سمجھ کر تزکیۂ نفس اور تکمیل سیرت کی کوشش کرتے ہیں۔ نوجوان
آٹو براون جس نے مارسل کیو کی لڑائی میں جرمنی کی خاطر جان دی۔ اپنے روزنامچے
کے عنوان پر یہ ماٹو لکھتا ہے:-

"میرا عقیدہ
اتنا مضبوط اور مستحکم ہے کہ کسی دیندار کا نہ ہوگا۔

مجھے اپنے ضمیر پر عقیدہ ہے۔

مجھے اپنے فرائض پر عقیدہ ہے۔

مجھے اپنے کام پر عقیدہ ہے۔

۸۔ اب ہم مذہبی مثال (ٹائپ) کے قریب آ گئے ہیں۔ اسکی بیشمار صورتوں میں سے ہم صرف ایک کا ذکر کریں گے جو عہدِ شباب کے لیے مخصوص ہے۔ کیونکہ زمانۂ بلوغ کی واردات قلبی سے اِسے خاص تعلق ہے یعنی لاہوتی یا طفیت جن نوجوانوں پر یہ رجحان غالب ہوتا ہے وہ بھی جمالیاتی جذبات پرستوں کی طرح عالمِ واقعی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جمالیات والے مشہودات و مصورات کے شیدا ہیں۔ اور باطن پسندوں کو ہر چیز سے جو صورت پذیر اور محدود ہو وحشت ہوتی ہے۔ وہ عالم امکان کی کثرت سے نجات پاکر ابدی وحدت کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو چیز وحدت میں خلل ڈالتی ہے خواہ وہ تصور ہو، یا تعین، یا صورت یا حد، اُن لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ ان کے نزدیک جوہر کائنات صورت سے بری ہے اس لیے ادراک و تعین سے بھی بری ہے۔ نوجوان باطن پسند اس کشمکش میں گرفتار رہتا ہے کہ خود اس کے نفس میں فساد و انتشار ہے۔ اور اُسکا نصب العین وحدت ہے۔ دیکھنے میں تو یہ وحدت اسکے قلب کی گہرائی سے قریب ہے لیکن جب وہ اسکی جستجو کرتا ہے تو ناکام رہتا ہے۔ کیونکہ اسکی خودی ایک طرف تو ذات ایزدی میں فنا ہو جانا چاہتی ہے۔ اور دوسری طرف ایک حد تک اپنی بقا کی بھی کوشش کرتی ہے اور خدا سے لڑ جھگڑ کر اپنے وجود کو تسلیم کرانا چاہتی ہے۔ جو شخص ان باطن پسندوں سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ اُن میں کتنی خود پرستی ہوتی ہے۔ یہ لوگ جتنی زیادہ دنیا کی حقیقت اور قدر کی نفی کرتے ہیں اتنے ہی زیادہ اپنے نفس کے پابند ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ خدا کی نامحدود ذات کو اس چھوٹے سے نقطہ میں محدود کر لیں۔ ع

این خیال ست و محال ست و جنوں

محبت رکھتے ہیں کیونکہ انہیں ان سب میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ لیکن لاہوتی باطنیت والے ایسے زاہد خشک ہوتے ہیں کہ اُن کی صورت دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ وہ سوائے ذات ایزدی کے جسے وہ دنیا کی چیزوں سے بے حد دُور سمجھتے ہیں کسی چیز کو اپنے دلمیں جگہ دینا نہیں چاہتے۔ علم اُن کے نزدیک بے حقیقت چیز ہے سوائے اُس علم کے جس سے نامحدود ذات کی معرفت حاصل ہو۔ عمل انکی نظر میں ہیچ ہے، حسن و تناسب ان کی نظر میں ہیچ ہے۔ سیاست و معاشرت کے معاملے میں وہ نراجی ہوتے ہیں۔ افراد سے اُن کا تعلق حاکمانہ بلکہ ظالمانہ ہوتا ہے جوں جوں انکی توجّہ اپنی ذات پر مجتمع ہوتی جاتی ہے ان کے دلمیں "خوف کائنات" یعنی تنہائی اور بیکسی کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ وہ خدا کو ڈھونڈتے ہیں لیکن خدا بھی اُن سے چھپتا ہے۔ اس سے ایک قدم آگے وہ منزل ہے جہاں انسان اپنے آپ کو سراسر خدا سمجھنے لگتا ہے، جہاں اسے اپنے نفس کی ناپاک چیزوں میں بھی خدائی کی شان نظر آتی ہے۔ بلکہ اسکو یقین ہوجاتا ہے کہ خدا کی ذات تمام و کمال اسکے نفس کے اندر محدود ہے۔

ان واردات کو شہوت جنسی سے جو گہرا تعلق ہے اُسے نہ بھولنا چاہیئے۔ بعض اوقات ان لوگوں کو اس تعلق کا علم نہیں ہوتا لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ شہوانی جبلتوں کو بھی مذہبی چیز سمجھ کر ان کی پابندی کرتے ہیں۔ خصوصاً نوجوانوں میں شہوانی باطنیت اکثر پائی جاتی ہے۔ ان کا احساس تنہائی خالص نفسی نہیں ہوتا بلکہ اسمیں شہوت جنسی بھی شامل ہے جس سے کبھی سیری نہیں ہوتی اس لئے اسکے پنجے سے نجات بھی نہیں مل سکتی۔ یہ چیز بڑھتے بڑھتے عجیب قسم کا مافوق الطبیعی رنگ اختیار کرلیتی ہے جسکی بدولت نوجوان کے ذہن میں طرح طرح کے خوفناک تصورات آتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ اسقدر ظالم ہوجاتے ہیں کہ جانداروں کو اذیت دینے میں انہیں خونخوارانہ لذت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ انکے خیال میں خون راز زندگی کو حل کردیتا ہے۔ ان میں سے بعض کا دل بے اختیار بہیمیت کی طرف

کھنچتا ہے اور احساس نفس میں سب سے دلچسپ چیز ان کے لیئے اُس خدائی اور بہیمی عنصر کا تضاد ہے جو انسان میں موجود ہے ۔ اس لیئے کہ اپنے آئینۂ نفس میں انسانوں کو خود اپنی ہی صورت نظر آتی ہے ۔ ان لوگوں کی آنکھوں سے اُن جانوروں کی سی کم نگاہی ٹپکتی ہے جو دن کی روشنی کی تاب نہیں لا سکتے ۔ اُن کے نفس کی تاریکی میں خدا کا پاک اور برتر جلوہ نظر نہیں آتا ۔ حالانکہ ناسوتی باطنیت والوں کو وہ سورج کی طرح زندگی کی ہر شے میں چمکتا ہوا نظر آتا ہے :-

"اے خوش نصیب آنکھو
تم نے جو کچھ دیکھا
وہ چاہے کچھ بھی ہو
مگر کتنا خوبصورت تھا ۔"

نوجوانوں کا احساس تنہائی باطنیت پسندانہ مشاہدۂ نفس میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے ۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر وہ ابتدا سے یہ رنگ اختیار نہ کریں تو انکا غنچۂ نفس مرجھا کر رہ جائے ۔ اُن کے احساس زندگی میں ہمیشہ اتار چڑھاؤ رہتا ہے ۔ کبھی موت کا سکون ، کبھی زندگی کا جوش ، کبھی تشنجی کیفیت ، کبھی مردنی کی حالت ۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس عدم پرستی کا نتیجہ کوئی مفید عمل ، کوئی نمایاں کام ہو ۔ یہ صورت پیدا بھی ہوئی تو دم بھر کے لیئے ہوتی ہے اور کائنات کے منکر نوجوان باطنیت پسند پھر اپنی داخلی زندگی کی شامت میں گرفتار ہو جاتے ہیں ۔ انھیں اُن دوسرے باطنیت پسندوں کی سی کامیابی حاصل نہیں ہوتی جو دنیا کو اختیار کرتے ہیں ، اسکا مقابلہ کرتے ہیں ۔ اور اس پر غالب آتے ہیں جنکا نعرۂ جنگ یہ ہوتا ہے :

میرا دل بے چین ہے ۔ اے خدا اسے تسکین دے اپنے آغوش میں ۔

ہم نے وہ بحث ختم کردی ہے جو دوسرے باب کے آخر میں شروع کی تھی۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ نوجوانوں پر ذہن خارجی (تمدن) اور ذہن عینی (ابدی قدور) کے سابقے سے جو واردات گزرتی ہے اُسے بیان کریں۔

یہ ایک رنگارنگ طلسم ہے سعی اور مزاحمت، اثر پذیری اور اثر آفرینی، کامیابی اور مایوسی کا۔ سب سے زیادہ دشوار نوجوان کے لیئے یہ ہے کہ وہ اپنی نفسی زندگی کو ان ذہنی قوتوں کی کشاکش میں برباد اور منتشر نہ ہونے دے، بلکہ خارجی تمدّن کے مقابلے میں ایک اندرونی مرکز بنائے تاکہ زندگی کا مقصد اور منشا جو متفرق شاخوں میں جو تقسیم ہو گیا ہے اسکی ذات کے اندر جمع ہو کر وحدت آسا نظام منشا بنجائے۔ کسی شخص کے لیئے شخصیت بننے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ وہ خارجی تمدّن کی منازل کو طے کرے۔ اسطرح کہ مکمل اور سچے تمدّن کا عین اسکا دلیل راہ ہو۔ لیکن اس معرکے میں سب کو فتح نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ وہ مرکز نہیں پائے جسے ہم نے مذہبی اور اخلاقی قرار دیا ہے۔ یہ لوگ اندرونی دوئی، بے تہی اور خامی کی تکلیفیں سہتے ہیں۔ آگے چل کر زندگی کے جن طوفانوں سے انہیں سابقہ پڑتا ہے وہ ان کے لیئے خطرناک ہوتے ہیں کیونکہ ان کی کشتی میں لنگر نہیں ہوتا۔ اس لیئے انکی زندگی کی آئندہ نشوونما میں بلوغ کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور اگر انجام بخیر ہو تو جو خامی عہد شباب میں باقی تھی وہ آگے چل کر دور ہو جاتی ہے۔

لیکن وہ لوگ بھی جنھیں ایک مستحکم مرکز مل گیا ہے آئندہ زندگی میں تزکیۂ نفس کے نئے مدارج طے کرتے رہتے ہیں۔ اُن کیلیئے بھی زندگی ایک جنگ ہے۔ پختہ کار مرد اور عورت یہ معرکے جھیلتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں میں طفلی اور شباب کا اثر باقی رہتا ہے۔ مختلف لوگ اپنی نفسی زندگی کے اس پہلو کو مختلف طرح سے محسوس کرتے ہیں۔ ایک انتہا پر وہ لوگ ہیں جو شکر کرتے ہیں کہ انہوں نے اس دور کے تکلیف دہ طوفانوں سے نجات پائی۔ دوسری پر وہ لوگ جو فخر کرتے ہیں کہ مردانہ پختہ کاری کے زمانہ میں بھی ان میں وہی عین پسندی باقی

ہے جو جوانی کے خوشنما اور پاک عہد میں تھی۔ باقی لوگوں کے احساسات ان دونوں انتہائی صورتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

بعض ایسے لوگ بھی جن سے جوانی میں لغزشیں اور خطائیں سرزد نہیں ہوئیں پھر بھی اس دور کے ختم ہونے پر خوش ہوتے ہیں کہ دائمی بے چینی اور درد انگیز آرزو سے پیچھا چھوٹا۔ ہولڈرلین جسے اپنی جوانی کی رنگین بہار کے بعد، وہ تابستان جسکا یہ تمنائی تھا، صحت دماغ کی حالت میں دیکھنا نصیب نہیں ہوا اپنی نظم "شام کے تخیلات" میں جوانی کی مصیبت سے بچنے کی آرزو ظاہر کرتا ہے۔

آ اے نیند جلد آ۔ کیونکہ دل کی بیشمار حسرتیں چین نہیں لینے دیتیں۔

لیکن اے جوانی ایک دن تیرا بھی خاتمہ ہے۔

اے بے چینی اور خواب کے زمانے ایک دن تو بھی نہ رہے گا

اسکے بعد کہولت کا دور ہے جسمیں خوشی اور سکون نصیب ہوتا ہے۔

اور یہ ہے بھی بہت خطرناک کہ انسان جوانی میں ایسا محو ہو جائے گویا اب کوئی اور دور قانون ارتقا کے ماتحت آنے والا نہیں ہے۔ جو شخص ہمیشہ جوان رہنا چاہتا ہے وہ جان بوجھ کر اندھا بنتا ہے۔ شلائرماخر نے، جو ہمبولٹ کی طرح سن و سال کی قید سے آزاد تھا، اپنی زندگی میں ایسا مذہبی سوز و گداز پیدا کر لیا تھا کہ عمر کے مختلف زمانوں کے آپسمیں گھل مل جانے سے اسکا احساس زندگی تقریباً لازمانی بنگیا تھا۔ جوانی کی بہتری اسمیں ہے کہ پختہ کار بڑھاپا اسکا رہنما ہو۔ اس لیے اگر کوئی نوجوان وہ صفات پہلے ہی سے حاصل کرے جو بڑھاپے کی بدولت انسان میں پیدا ہوتی ہیں تو اُسکے شباب کو چار چاند لگ جاتے ہیں ....
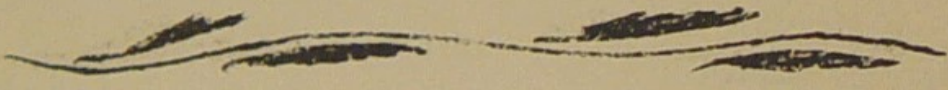
اس پیوند سے دُہرے دُہرے فائدے ہوتے ہیں۔ جوانی میں بڑھاپے کا تجربہ جوانی کی حفاظت کرتا ہے اور بڑھاپے میں جوانی کا جوش بڑھاپے کی کمزوری سے بچاتا ہے۔"

لیکن نوجوانوں سے اس سلیقہ زندگی کی توقع رکھنا بیکار ہے کیونکہ یہ اُن کے

امکان سے باہر ہے۔ سن و سال کی قید سے آزادی اُس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو بڑھاپے میں اطمینان سے اپنی گزری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتا ہے اس نوجوان کو میسّر نہیں آتی جو ہزاروں آرزوئیں لیے ہوئے آنے والے زمانہ کی راہ دیکھ رہا ہے۔ البتہ اس قول میں ایک گہری حقیقت پنہاں ہے جو غور کرنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ نوجوانی انسان کو صرف حقوق نہیں دیتی بلکہ اُس پر فرائض بھی عائد کرتی ہے۔ نوجوان کسی چیز کا پابند نہ ہو مگر خود اسکے مستقبل کی پابندی کیا کم ہے۔ زندگی کامیابی کی راہیں دکھاتی ہے مگر اسی شخص کو جسکا دل پاک اور بازو مستعد ہے۔ اگر کوئی چاہتا ہے کہ بہارِ شباب کی اُمیدوں کے بعد خزانِ شیب کی مایوسیاں نصیب نہ ہوں تو اُسے جوانی ہی میں ان الفاظ کو شمعِ راہ بنانا چاہیئے

زندگی ہمیں جو اُمید دلائے
اُسے پورا کرنا خود ہمارا کام ہے

فرہنگ

الف

ابدی جوہرِ انوثیت The Eternal Faminine, Das Ewigweibliche

— جرمن شاعر گوئٹے کے نزدیک محبت اور درد کا جذبہ کائنات کی ہر شے میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا جیتا جاگتا نمونہ عورت کی ذات ہے۔

اثر ۔ آرٹ کی اصطلاح میں وہ کیفیت ہے جو حسین چیزوں کو دیکھ کر دل پر گذرتی ہے۔ Impression -

اجتماعی ۔ کسی جماعت یعنی سماج (سوسائٹی) سے متعلق ۔ Collective -

احساس ۔ Feeling -

اختناق الرحم ۔ مشہور اعصابی مرض Hysteria -

ادا ۔ اثر (جمالیاتی کیفیت) کا اظہار جو صناع اپنی صنعت میں کرتا ہے Expression -

ادا پرستی ۔ یہ نظریہ کہ صناع کو کسی چیز کی تصویر بنانے میں اصل موضوع کی مطابقت کی ضرورت نہیں بلکہ اُس چیز کے مشاہدے سے جو جذبات دل میں پیدا ہوں اُن کا اظہار جس شکل میں ہو سکے کرنا چاہیے۔ Expressionism -

ادراک ۔ پہچاننا، جاننا Cognition -

اذعانیت ۔ کسی عقیدے کو بے دلیل ماننا اور منوانا Dogmatism -

ارادہ ۔ Will Volition -

ارتقا ۔ کسی نوع کا معینہ قانون کے مطابق ترقی کرنا Evolution -

اساطیر ۔ مذہبی یا فلسفیانہ حقائق جو دیوتاؤں وغیرہ کو کہانیوں کے پیرائے میں ۔ Myths -

بیان کئے جائیں۔

استقرا۔ بہت سی مثالوں کے مشاہدے کی بنا پر کوئی کلیہ قائم کرنا Induction -

استیثار۔ اپنی اغراض کو دوسروں کی اغراض پر ترجیح دینا Egoison -

اسٹینلے ہال۔ امریکہ کا ایک مشہور ماہر نفسیات Stanley Hall -

اصول موضوعہ۔ ہر فن کے ابتدائی اصول جنھیں عقل بلا ثبوت کے مانتی ہے Axioms -

اعتباریت۔ یہ عقیدہ کہ عالم گیر روحانی اور اخلاقی اصول دائمی نہیں ہوتے Relationism -

بلکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔

اعیان۔ (عین کی جمع) افلاطون کے فلسفے میں عالم مثال میں اشیاء کے مکمل نمونے Ideas -

ہیں جن کے ناقص چربے عالم ظاہر کی اشیاء میں نظر آتے ہیں۔ اخلاقی تصورات

مثلاً عدل، خیر وغیرہ افلاطون کے نزدیک اعیان کی حیثیت سے عالم مثال

میں مستقل وجود رکھتے ہیں۔

اغسطین مقدس۔ عہد قدیم کے ایک مسیحی عالم دین اور صوفی St: Augustine -

اقتصادی۔ علم اقتصاد یا معاشیات سے متعلق Economic -

اقل مزاحمت۔ طبیعی مسئلہ ہے کہ ہر چیز اس خط میں حرکت کرتی Least Resistance -

ہے جس میں مزاحمت سب سے کم ہو۔

امتزاج۔ دو چیزوں کا گھل مل جانا Fusion -

انا۔ میں۔ نفس انسانی Self -

انتقال احساس۔ کسی بے جان چیز کے دیکھنے Pathetic Fallacy -

سے جو احساس اپنے دل میں ہو اُس کا وجود اُس چیز میں فرض کرنا۔

انحراف۔ کسی جذبے یا ذہنی قوت کا غلط راہ اختیار کرنا Perversion -

انفرادیت۔ فرد کو جماعت کے مقابلے میں زیادہ اہم سمجھنا Individualism -

انفعالی - Passive -

ایثار - اپنی اغراض کو دوسروں کی خاطر قربان کرنا Altruism -

ب

بلوہر - جرمنی کا ایک ماہر نفسیات جو بہیمانہ شہوانی محبت کو بہت مفید اور قابل قدر چیز سمجھتا ہے۔ Bluher -

بھولا - تکلف اور تصنع سے بری۔ Naive -

بیتھوون - جرمنی کا ایک مشہور مغنی اور نغمہ ساز (Composer) Beethoven -

پ

پروشی - جرمنی کی ریاست پروشیا کا رہنے والا - پروشیا کی رعایا تنظیم اور انضباط کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ Prussian -

ت

تجربہ - Experience -

تجرید - کسی چیز کو آس پاس کی چیزوں سے جدا کر کے دیکھنا Abstraction -

تحت شعوری - ہمارے نفس کی وہ کیفیتیں جن کا ہمیں محض ایک دھندلا سا احساس ہوتا ہے۔ Subconscious -

تحلیل نفسی - وہ فن جس میں نفسی امراض کے اسباب اور اُن کے علاج سے بحث کی جاتی ہے - اس کا بانی آسٹریا کا نفسی طبیب فرونڈ ہے - وہ کہتا ہے کہ اعصابی اور نفسی امراض جذبۂ شہوت اور Psycho-analysis -

جذبۂ اقتدار کے روکے اور دبائے جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک ان امراض کا علاج یہ ہے کہ یا تو رُکی ہوئی آرزوؤں کو نکلنے کی راہ دی جائے یا یہ اعلیٰ جذبات میں منتقل کر دی جائیں۔

Specialisation - تخصیص پسندی - یہ اصول کہ ہر کام کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنا اور ہر حصہ ایک خاص شخص کے سپرد کرنا چاہیے۔

Imagination - تخئیل } تخیل۔ }

Reminiscence - تذکرہ - کسی بھولی ہوئی بات کو یاد کرنا

Organisation, Structure - ترکیب - ساخت، وہ چیز جو کئی اجزا سے مرکب ہو اور کوئی خاص منشا رکھتی ہو۔

Anatomy - تشریح - وہ فن جس میں جسم انسانی کے مختلف اعضا اور ان کے وظائف سے بحث کی جاتی ہے۔

Judgement - تصدیق۔

Weltanschauung } {یہ جرمن لفظ انگریزی میں بھی مستعمل ہے۔ - تصورِ کائنات - انسان کا عقیدہ کائنات کی حقیقت اور اُس کے مقصد کے متعلق۔

Contrast - تضاد - دو چیزوں کا مقابلہ جو ایک دوسرے کی ضد ہوں

Struggle for Existence - تنازع للبقا - وہ کشمکش اور جد و جہد جو کسی ذی روح کو اپنی زندگی قائم رکھنے کے لئے کرنا پڑتی ہے۔

Contradiction - تناقض - کسی شخص کے قول میں دو باتوں کا جمع ہونا جو ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔

Succession - توالی - ایک چیز کا دوسری چیز کے بعد ظاہر ہونا یا واقع ہونا

ث

ثبوتیت - یہ عقیدہ کہ ہم صرف منفرد اشیاء کا علم حس اور تجربے کے ذریعے سے Positivism -
حاصل کرسکتے ہیں۔ کائنات کی مجموعی حیثیت کا کوئی قطعی نظریہ قائم نہیں
کرسکتے۔ اسلئے علم صرف علوم مخصوصہ (Special Sciences)
کا نام ہے فلسفہ کوئی چیز نہیں۔

ج

جبلّی - وہ احساس یا عملی رجحان جو انسان اور حیوان میں خلقی طور پر ہوتا ہے Instinctive -
جبلی کہلاتا ہے مثلاً مہلک اور تکلیف دہ چیزوں سے بچنا ایک جبلت یا
جبلی رجحان ہے۔

جذبات۔ Emotions

جذبات پرست - جذبات سے زیادہ متاثر ہونے والا اور اُن کے اظہار Sentimental -
میں تصنع اور مبالغہ کرنے والا۔

جُـزو یا جُز Part

جمالیات - وہ فن جس میں حسن وجمال کی ماہیت سے اور فنون لطیفہ کی حقیقت Aesthetics.
سے بحث کی جاتی ہے۔

جنسی - جذبۂ شہوت سے متعلق Sexual -

جنسی معکوسیت - مردوں میں عورتوں کی یا عورتوں میں Sexual inversion -
مردوں کی جنسی خصوصیات ہونا۔

جوہر - وہ چیز جو مستقل وجود رکھتی ہے اور تغیر سے بری ہے۔ Substance -

خ

خارجی۔ (ملاحظہ ہو داخلی) Objective-

خلیئے۔ وہ چھوٹے چھوٹے اجزا جس سے انسان کا جسم مرکب ہے Cells.

خواب آسا۔ ایسا دھندلا جیسے خواب میں دیکھی ہوئی بات Dreamlike-

د

داخلی۔ نفسیات کی اصطلاح میں "داخل" انسان کے نفس کو کہتے ہیں اور Subjective-
"خارج" ان تمام چیزوں کو جو نفس کے باہر ہیں۔

دوئی آسا (تخیل)۔ وہ تخیل جس میں دو جداگانہ رنگ ہوں جو واقعی اور خیالی Dualistic-
دنیا میں فرق کرتا ہو۔

ذ

ذہن خارجی۔ جرمن فلسفی ہیگل کہتا ہے کہ تمدن کے مختلف شعبے Objective Mind-
مثلاً علم، آرٹ وغیرہ انسان کے ذہن سے پیدا ہوئے ہیں گویا انسان
کے ذہن نے ایک مستقل خارجی وجود حاصل کر لیا ہے اس لئے وہ
اس تمدن کو ذہن خارجی کہتا ہے۔

ر

رواقیت۔ ایک فلسفیانہ عقیدہ جو یونان میں سقراط کے بعد رائج ہوا۔ اس Stoicism-
کی رو سے سوائے نیکی کے کوئی چیز قابل قدر نہیں خصوصاً جذبہ اور جوش
بے کار بلکہ مضر چیز ہے۔

ز

زماں، زمانہ۔ Time

س

سیرت۔ Character

ش

شارلوٹے بیوہلر۔ ایک جرمن مصنفہ جس نے لڑکوں اور لڑکیوں کی نفسی کیفیات پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ Charlotte Bühler

شلر۔ جرمنی کا مشہور شاعر جو گوئٹے کا ہمعصر تھا۔ Schiller

شوپین۔ پولینڈ کا ایک مشہور مغنی اور نغمہ ساز (Composer) Chopin

شیلر۔ موجودہ زمانے کا مشہور جرمن فلسفی Scheller

ع

عرض۔ وہ چیز جو کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی بلکہ کسی دوسری چیز کے ساتھ عارضی طور پر پائی جاتی ہے۔ Accident

عزم للحیاۃ۔ زندہ رہنے کی خلقی آرزو Will to Live

عزم للقوۃ۔ Will to Power

عشائے ربانی۔ کلیسا کی رسم جس میں نماز کے بعد لوگ تبرک کے طور پر شراب اور روٹی تناول کرتے ہیں۔ Lord's Supper

عضویات۔ وہ فن جس میں جسم انسانی کے مختلف اعضا اور ان کے وظائف سے بحث کی جاتی ہے۔ Anatomy

علت۔ Cause

علم الاساطیر۔ (دیکھو اساطیر) Mythology-

علم النفس۔ نفسیات Psychology-

علمیات۔ (ملاحظہ ہو نظریۂ علم) Epistemology-

علوم ذہنی۔ وہ علوم جن میں انسانی نفس اور انسانی سماج کی حقیقت Art, Humanities -
اور نشو و نما سے بحث کی جائے۔

عین۔ (دیکھو اعیان)

غ

غنائی شاعری۔ وہ نظمیں جو اس غرض سے لکھی جاتی ہیں کہ لوگ Lyric poetry -
انھیں گا سکیں مثلاً غزلیں گیت۔

ف

فرای ٹاگ۔ مشہور ناول نویس جو سوئستان (سوئٹزرلینڈ) کے جرمن حصے کا Freitag -
رہنے والا تھا۔

فرضیہ۔ کوئی کلیہ جسے علمی تحقیق میں اس نظر سے فرض کر لیں کہ اگر اس کے Hypothesis -
نتائج معقول ہوں گے تو اسے قبول کر لیں گے ورنہ رد کر دیں گے۔

فشتے۔ مشہور جرمن فلسفی جو کانٹ کا شاگرد تھا۔ اصل میں جرمن عینیت (Idealism) کا Fichte -
بانی یہی شخص تھا۔

فون ٹانے۔ جرمنی کا ایک رومانی (جذبات پرست) شاعر Fontane -

ق

قدر۔ جب ہم کسی شے یا فعل کو اس اعتبار سے جانچیں کہ اسے انسان کے نشائے Value -

تخلیق کے پورا کرنے میں کس حد تک اہمیت ہے تو یہ اہمیت قدر
کہلاتی ہے۔ اور خود اس شے یا فعل کو بھی قدر کہتے ہیں۔

قصصی شاعری۔ وہ نظمیں جن میں قصے خصوصاً قدیم زمانے کے سورماؤں۔ Epic poetry
کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔

قضیہ (جمع قضایا) منطق کی اصطلاح میں اس جملے کو کہتے ہیں جس میں ۔ Proposition
کوئی حقیقت بیان کی جائے۔

قطعیت۔ قطعی ہونا، حتمی ہونا۔ Finality-

ک

کافی بالذات۔ وہ چیز جو اپنی تکمیل اور نشو و نما کے لئے دوسری ۔ Self-sufficient
چیزوں کی محتاج نہ ہو۔

کمال بینی۔ کسی چیز کو تخیل کی مدد سے اس کی مکمل صورت میں دیکھنا ۔ Idealization
یہ حسن ظن کی انتہائی منزل ہے۔

کنڈر گارٹن۔ لفظی معنی بچوں کا باغ۔ اس سے مراد وہ طریقہ تعلیم ۔ Kindergarten
ہے جس میں بچوں کو مفید کھیلوں کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔

گ

گریگ۔ ناروے کا ایک مشہور مغنّی اور نغمہ ساز (composer) ۔ Grieg-

گوئٹے۔ جرمنی کا سب سے بڑا فلسفی شاعر (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء) ۔ Goethe-

ل

لاشعوری ۔ وہ کیفیت جو ہمارے نفس میں موجود ہو مگر ہمیں اس کی خبر نہ ہو لاشعوری کہلاتی ہے۔ Unconscious

لاہوتیت ۔ حقیقتِ مطلق یا خدا کو زمان و مکان کے ماورا سمجھنا۔ Doctrine of Transcendence -

لوتھر ۔ مارٹن لوتھر مشہور مصلح جس نے پروٹسٹینٹ مذہب کی بنا ڈالی ۔ Martin Luther

م

ماحول ۔ وہ مادی اور ذہنی فضا جس میں انسان رہتا ہے جو ملک، آب وہوا، خاندان، سوسائٹی، تمدنی حالت وغیرہ سے ملکر بنتی ہے۔ Environment -

مادیت ۔ سوائے مادے کے کسی چیز کے وجود کو نہ ماننا۔ Materialism -

مافوق الافراد ۔ وہ چیزیں جو افراد کی پابند نہیں بلکہ اُنکے بعد بھی باقی رہتی ہیں مثلاً قوم یا تمدن مافوق الافراد کہلاتے ہیں۔ Superindividual -

مافوق الطبیعیات ۔ وہ علم جس میں اشیار کی حقیقت سے اور کائنات کے آغاز و انجام اور مقصد سے بحث کی جاتی ہے۔ Metaphysics -

مثال ۔ ان صفات کا مجموعہ جو کسی نوع یا جنس میں مشترک ہیں۔ Type -

مثالی ۔ ان صفات کا ظاہر کرنے والا جو کسی نوع یا جنس میں مشترک ہیں مثلاً سیتاجی کا جو کیرکیٹر رامائن میں دکھایا گیا ہے وہ باعصمت عورتوں کا مثالی کیرکیٹر ہے۔ Typical -

محرک ۔ Motive -

مُدرِک - ادراک کرنے والا - انسان کا نفس بہ حیثیت فاعل کے' موضوع
Subject -

مُدرَک - وہ چیز جس کا ادراک کیا جائے' معروض
Object -

مشاہدہ -
Observation -

مطلقیت - تعینات اور حدود سے بری ہونا۔ شک اور شبہے سے پاک ہونا۔
Absoluteness -

مظہر - وہ چیز جو ظاہر ہو - کوئی نفسی کیفیت یا مادی شے۔
Phenomenon -

معروض - جو چیز نفس کے سامنے پیش کی جائے یعنی جس کا ادراک یا احساس ہو
Object -

معلول -
Effect -

معنی - وہ عام مفہوم جو ایک نوع کے تمام افراد کی مشترکہ خصوصیات پر حاوی
Concept -
ہو مثلاً لفظ انسان کا جو مفہوم ہمارے ذہن میں ہے وہ ایک "معنی"
ہے جو تمام انسانوں کی مشترکہ خصوصیات پر حاوی ہے۔

مکان -
Space -

مکانکی - وہ چیز جو قوت اور حرکت کے طبیعی قانون کے مطابق چلتی ہو
Mechanical -
مگر اس میں نشو ونما کی صلاحیت نہ ہو۔

مکیاولی - نشاۃ ثانیہ کے زمانے کا اطالوی مدبر جس نے فلسفۂ سیاست
Machiavelli -
پر The Prince کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔

منفرد - اپنی ہستی الگ رکھنے والا۔
Individual -

منہاج - وہ طریقہ جو علمی بحثوں میں اختیار کیا جائے۔
Method -

مہیّج - وہ چیز جو جذبات کو ہیجان میں لائے - وہ چیز جو حواس خمسہ میں سے
Stimulus -
کسی حس پر اثر ڈالے۔

میتھوڈسٹ - چند خاص فرقوں میں سے کسی کا رکن جو پروٹسٹنٹ مذہب
Methodist -
میں پیدا ہو گئے ہیں۔

ن

ناسوتیت - حقیقت مطلق یا خدا کو اسی دنیا میں موجود سمجھنا۔ - Doctrine of Immanence

نامی - نمو کی قابلیت رکھنے والا۔ ایسا جسم جو خود بخود بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے مثلاً کوئی پودا یا کوئی جانور۔ - Organic

نشاۃ ثانیہ - لفظی معنی دوبارہ پیدا ہونا۔ یورپ کی ذہنی تاریخ میں پندرھویں صدی کا آخری اور سولھویں صدی کا ابتدائی زمانہ نشاۃ ثانیہ کہلاتا ہے کیونکہ اس زمانے میں قدیم یونانی تمدن کے اثر سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ - Renaissance

نصب العین - وہ بلند مقصد جو انسان کے پیش نظر ہو۔ - Ideal

نظام نفسی - نفس کی عام حالت۔ مختلف نفسی قوتوں کا باہمی تعلق۔ - Mental Organisation

نظریۂ علم - فلسفے کا وہ شعبہ جو علم کی حقیقت اور ماہیت سے بحث کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ نفس انسانی علم کیسے حاصل کرتا ہے اور حصول علم کی حد کہاں پر ہے۔ اسے علمیات بھی کہتے ہیں۔ - Theory of Knowledge / Epistemology

نفسیات ارتقا - نفسیات کی وہ قسم جس میں نوع انسانی یا اس کے کسی خاص طبقے کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما سے بحث کی جاتی ہے۔ - Psychology of Evolution

نفسیات تمیزی یا تفریقی - نفسیات کی وہ قسم - Differential Psychology

جس میں نفس انسانی کے کسی مخصوص پہلو سے یا کسی خاص طبقے کی
نفسیاتی حالت سے بحث کی جاتی ہے۔

نیتشے۔ جرمنی کا مشہور فلسفی جس کا فلسفہ اثبات خودی اور ارادۃ للقوۃ پر مبنی ہے Nietsche -

و

واردات۔ وہ کیفیت جو انسان کے نفس پر گذرتی ہے Inner Experience -

واقعیت پسندی۔ یہ عقیدہ کہ اشیا ہمارے نفس کے باہر ایک مستقل وجود رکھتی Realism -
ہیں اور اُن کی حقیقت وہی ہے جس کا ہمیں حواس کے ذریعے سے
ادراک ہوتا ہے۔

والن اشٹائن۔ سترھویں صدی کا ایک جرمن سپہ سالار جس کی Wallenstein -
تصویر شلر نے اپنے ناٹک والن اشٹائن میں کھینچی ہے۔

وائننگر Weininger
ویونکن Wyneken
} یہ دونوں جرمنی کے ماہرین تعلیم ہیں جو ہمجنسانہ عشق کو بڑی مفید تعلیمی قوت سمجھتے ہیں۔

وحدت آسا (تخیل)۔ وہ تخیل جس میں ایک ہی رنگ ہو جو واقعی اور خیالی Monistic -
دنیا میں کوئی فرق نہ کرتا ہو۔

وجدان۔ وہ لطیف باطنی حس جس کے ذریعے سے انسان روحانی حقائق Intuition -
کا ادراک حاصل کرتا ہے۔

وظیفہ۔ کسی چیز کا خاص کام جس کے لئے وہ وضع کی گئی ہے۔ Function -

ولہیلم مائسٹر۔ گوئٹے کا مشہور ناول جس میں اُس نے زیادہ تر Wilhelm Meister -
اپنی زندگی کے واقعات بیان کئے ہیں۔

ہ

ہرمان اور ڈوروتھیا۔ گوئٹے کا ایک منظوم فسانہ Herrman and Dorothea -

ہے جو سادگی اور سلاست کے اعتبار سے قدیم یونانی شاعری کا نمونہ ہے۔

ہولڈرلین ۔ جرمنی کا ایک رومانی شاعر جس کا کلام جذبات کے ہیجان و تلاطم ۔ Holderlin
کا نمونہ ہے ۔ بہت کم عمر میں دیوانگی کی حالت میں مرگیا ۔
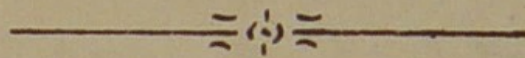
غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۱۹	گُل	کُل
۶	۳	دیکھا	دیکھ
۹	۱۰	جبلی	جبلّی
۱۱	۷	اسقدر	اُس قدر
۱۴	۱۸	پراسرارا	پراسرار
۱۸	۳	یہ لفظ جو مٹ گیا ہے "تعامل" ہے۔	
"	۷	دون	دونوں
۱۹	۳	اُتلافات	اُتلاف
۲۲	۲	شبہ	شبہہ
۳۱	۸	بسپر	جس پر
۳۲	۱۶	شیار	اشیار
۳۳	۹	تیاری	طیار
۳۷	۱۴	فطرتی	فطری
۴۹	۱۱	فطرتی	فطری
۵۳	۱۲	سے مطلق بھی ہیں	کے متعلق بھی ہیں یہ
۵۴	حاشیہ	کاکارفرما	کارفرما
۵۹	۳	بازگشث	بازگشت
۶۰	۱۷	ڈالتے	ڈالتی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۱	۹	پہلا لفظ "ہومر" ہے (مشہور یونانی شاعر کا نام)	
"	۱۹	ارادہ جذبات	ارادے اور جذبات
۶۲	۱۵	سے	اُسے
۶۳	۴	ایک ساز	ایک سانہ
۷۷	۱۵	نوجوانوں	نوجوان
۷۸	۱	پیدا ہوئی تھی	پیدا ہوا تھا
۸۳	۱۵	مافوق الطبیعات	مافوق الطبعیات
۹۳	۱۷	مس مار ہوکر	سمسا کر
۹۶	۴	ایسی بیاڈیس	السی بیاڈیس
۱۰۰	۴	حیائی	جبلّی
"	۸	کئے ہوئے	لئے ہوئے
۱۰۲	۷	گوئٹے کے حصہ اوّل	گوئٹے کے "فاؤسٹ" کے حصہ اول
۱۱۹	۷	فروھل	فروبل
۱۲۱	۸	مافوق الطبیعات	مافوق الطبعیات
"	۲۱	فطری حا	فطری حیا
۱۲۲	۲	ایک کا	ایک
"	۱۷	پیدا کرنے سے قبل	پیدا کرنے سے
۱۲۵	۱۳	قوت حسیّات	قوت حیات
۱۲۹	۹	فرونڈ	فرائڈ
۱۳۱	۵	دبائے جانے سے	دبائے نہ جانے سے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳۶	۱۲	خیالی میں	خیالی
۱۳۸	۲	کردیتی ہے	کردیتا ہے
۱۴۷	۳	حساس	احساس
″	۴	ابھی	بھی
″	۱۱	سماج	سماج
۱۸۷	۴	احساس اخلاقی اخلاق	احساس اخلاقی
۱۹۴	۲	نزل	تنزل
۲۲۰	۷	بناشوں	بندشوں
۲۲۱	۳	ہوئے	نہ ہوئے
۲۳۳	۲۱	خفیف	واقعات کی
۲۳۴	۱	میں پرستی	عین پرستی
۲۳۷	۱	اضی	ماضی
″	۵	جس کا	جس کے بیان کا
″	۷	لطافت	لطافت
۲۳۸	۱۹	ہوانسان کو	جوانسان کو
۲۴۸	۲	خصوصاً جرمن	خصوصاً جرمن تمدن
۲۵۱	۱۷	کی اصول	کے اصول
۲۵۸	۱۴	عمل نفسیات	عملی نفسیات
۲۹۴	۸	ہربارٹ کا	ہربارٹ کے
۲۹۶	۱۷	توجوان	تو نوجوان

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۹۸	۱	زندگی	جو زندگی
۲۹۹	۱۰	بیکار ہو	بے کار ہے
۳۰۷	۸	یا تو	×
۳۰۸	۱۰	کہ نفسیات	کہ نفسیات کو
۳۱۱	۱	بعض	بعض چیزیں
۳۱۲	۳	ایک خلقی	ایک خلقی رجحان
۳۱۴	۲	ہوتے ہیں	ہوتی ہے
〃	〃	ان کے	اس کے
۳۲۲	۱۰	موقوف	موقوف ہے
۳۲۵	۲	وہ	خدا
۳۲۶	۹	شہادتوں کو	شہادتوں پر
۲۴۳	۱۱	میتھوڈیٹ	میتھوڈسٹ
۳۴۴	۱۹	لذری	گذری
۳۴۶	۱۳	اصول صحت	اصول کی صحت
۳۵۰	۹	جائے ہے	جاتا ہے
۳۵۴	۸	جمہ	ترجمہ
۳۵۷	۱۳	محدوہ معنی	محدود معنی
۳۷۰	۶	ئی تناوری	کی شناوری
۳۸۳	۱	عل	عمل سے حل
۳۸۵	۲۰	درمندوں	دردمندوں

تصانیف و تراجم

جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب - ایم - اے - پی ایچ - ڈی

مسلمانون کی تعلیم اور جامعہ ملیہ

اس رسالہ مین ڈاکٹر صاحب نی تعلیم کی غایت اور مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی ضروریات پر نہایت دلچسپ اور مفید بحث کی ھی نیز بتایا ھی کہ جامعہ مسلمانوں کیلئی ان ضروریات کو کس طرح پورا کر سکتی ھی، تعلیمی مسائل سی دلچسپی رکھنی والی حضرات اسکا مطالعہ کرین قیمت ٤ آنہ

پردہ غفلت

مسلمان خاندانوں کی معاشرت کی سچی تصویر - تعلیم نسوان آزادی نسواں اور پردہ پر مفید و محققانہ بحث - فن ڈراما نویسی کا اعلی نمونہ - دلچسپ ظرافت آمیز نتیجہ خیز قصہ - جرمنی کی مشہور و معروف مطبع کاویانی مین نہایت اعلی پیمانہ پر چھپا ھی قیمت ایکرپیہ -

---

تلاش حق جلد اول و دوم

مہاتما گاندھی کی آپ بیتی یعنی My Experiments with Truth کا با محاورہ اردو ترجمہ - کتاب پر اردو کی تقریبا تمام رسائل واخبارات نی نہایت اچھی ریویو کیئی ھین گاندھی جی کی صحیح زندگی سی واقفیت کیلئی ضروری ھی کہ ان کی تجربات زندگی کا مطالعہ کیا جائی - دونوں جلدوں کی ضخامت ٧٠٠ صفحی سی زیادہ ھی - قیمت صرف ایک روپیہ فی جلد -

---

تاریخ فلسفہ اسلام

ھالنڈ کی مشہور فلسفی اور مستشرق ٹ - ج - دی بوئر کی مشہور جرمن تصنیف Geschichte der Philosophie in Islam کا براہ راست جرمن زبان سی اردو ترجمہ - تاریخ فلسفہ

نغمیات عنفوان شباب

سلسلہ اردو اکادمی نمبر ۱۸

نفسیات عنفوان شباب

EDUARD SPRANGER'S
PSYCHOLOGIE DES JUGENDALTERS.

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی
استاد فلسفہ وتعلیمات جامعہ ملیہ اسلامیہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
قرول باغ دہلی

سلسلہ اردو اکادمی نمبر ۱۸

نفسیاتِ عنفوانِ شباب

از

پروفیسر ایڈوارڈ اشپرانگر
اُستاد فلسفہ تعلیم و فلسفہ تمدن جامعہ برلن

مترجمہ ڈاکٹر سیّد عابد حسین ایم۔اے؛ پی ایچ۔ڈی۔

شائع کردہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرولباغ۔ دہلی

مطبوعہ جامعہ پریس صدر بازار دہلی

تہدیہ

میں اس ترجمے کو حبیب عزیز خواجہ غلام السیّدین صاحب سلمہٗ پرنسپل مدرسۃ المعلّمین مسلم یونیورسٹی کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ اس کے بے جان الفاظ میں اُن کی معجز بیانی سے جان پڑ جائے گی اور وہ اُن کے شاگردوں یعنی ہمارے معلموں کیلئے بصیرت و ہدایت کا باعث ہوں گے۔

نطقِ او کارِ دمِ عیسےٰ کند
حرفہائے گنگ را گویا کند
پیکرِ الفاظ را جانے دہد
جان و دل را علم و عرفانے دہد

عابد

فہرست مضامین

دیباچہ

(از مصنف)

عابد حسین صاحب نے، جو برلن یونیورسٹی میں میرے عزیز شاگرد تھے اور اپنے وطن میں ہمیشہ میرے سچے دوست رہیں گے، اس کتاب کا ترجمہ اُردو میں کرکے میری عزت افزائی کی ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ میں نے جو تصویر جرمن نوجوانوں کی پیش کی ہے وہ ہر ملک اور عہد کے نوجوانوں پر پوری نہیں اترتی۔ غالباً ہندوستان میں جو حضرات ہمدردی کی نظر سے اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں گے انھیں دونوں ملک کے نوجوانوں کی عام خصوصیات میں مشابہت معلوم کرنے سے اتنا فائدہ نہ ہوگا جتنا ان کے باہمی فرق پر غور کرنے سے۔ لیکن بعض قوموں میں باوجود جزدی اختلافات کے ایک معنوی رابطہ پایا جاتا ہے جس کی بنا اس پر ہوتی ہے کہ دونوں میں گہری روحانیت مشترک ہے اور دونوں کی قسمت قریب قریب یکساں ہے۔ جرمن اور ہندوستانی اہلِ دل جب کبھی ملتے ہیں تو انھیں اس ہمرنگی اور ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی اور ٹیگور کا نام ہمارے ملک میں محبت اور احترام سے لیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجھے پہلے ہی دن سے اپنے دوست عابد حسین سے روحانی اتحاد اور اُخوت کا احساس پیدا ہوگیا تھا۔ یہ اُس "سمجھنے" کی نہایت خوشنما مثال ہے جس پر میں اپنی نفسیات کی بنیاد رکھنا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں میں جو رابطہ ہے وہی میرے خیال میں باوجود اس قدر بُعدِ مکانی کے، جرمنی اور ہندوستان میں ہے۔ دونوں ملک روحانیت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور دونوں روحانیت کی گہری زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اس روحانی یگانگی کی ایک ادنےٰ سی مثال یہ ترجمہ ہے جو آپ کے سامنے پیش کیا جارہا ہے اور یہی مصنف کی طرف سے تحفۂ سلام ہے ان حضرات کی خدمت میں جو زندۂ جاوید

حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی آرزو اور ان کے منشا کے مطابق جامعہ ملیہ دہلی کی تشکیل کرنا چاہتے۔

ہم جرمنوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر قوم کو خود اپنے روحانی سرمائے پر زندگی بسر کرنا چاہئے۔ جرمن قوم مختلف قبائل میں تقسیم ہے اور ہم ان سب کی خصوصیات کو محبت کے ساتھ "سمجھتے" ہیں اس لئے ہمیں ان دوسری قوموں کی مخصوص سیرت اور مخصوص طرز زندگی کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے میں بھی ملکہ حاصل ہے جو اپنے وطن کی زمین میں قدم جمائے ہیں اور اپنی گہری روحانیت کا دامن مضبوطی سے تھامے ہیں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مغربی تمدن سب قوموں کے لئے باعثِ نجات نہیں ہو سکتا۔ ہم عرصے سے ہندوستانیوں کے گہرے عقائد اور روحانی سکونِ قلب سے متاثر بلکہ مسحور ہیں۔ ہماری قوم کے بڑے بڑے اربابِ فکر فریڈرش شلیگل، ولہیلم فان ہمبولٹ اور شوپن ہاوئر نے محبت کی نظروں سے ہند قدیم کے تمدن کا مطالعہ کیا ہے۔ ان لوگوں کے ذریعے سے جو پیام محبت ہندوستان سے آیا تھا اس کے جواب میں جرمنی یہ کتاب پیش کرتا ہے ـــــ وہ جرمنی جو اپنی مصیبت اور بدبختی کے باوجود ہندوستان کی طرح تین چیزوں پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہتا ہے: باطنیت، قومیت اور مذہبی و مافوق الطبیعی گہرائی۔ یہ عقیدہ کسی ملک کا پابند نہیں بلکہ ہر جگہ، جہاں لوگوں کی زندگی سچے سرچشمۂ حیات سے سیراب ہوتی ہے، لوگ اس سے آشنا ہیں لیکن جب ہم لوگ جرمنی میں یہ سوال کرتے ہیں کہ سب سے پہلے معرفتِ نفس اور زندگی کی تفسیر پر کب اور کہاں توجہ کی گئی تھی تو جواب ملتا ہے کہ اب سے ہزارہا سال پہلے ہندوستان میں جو اصلی متمدن قوموں کا گھر ہے۔

غرض یہ ناچیز کتاب محض نفسیات شباب پر ایک مقالہ نہیں ہے بلکہ مصنف کی آرزو ہے کہ یہ دل سے نکلا ہوا اور اثر میں ڈوبا ہوا تحفہ سمجھا جائے جرمنی کی طرف سے ہندوستان اور اس کی روح کی خدمت میں۔

ایڈوارڈ اشپرانگر

برلن۔ ۹ مارچ ۱۹۲۸ء

مقدمہ

(از مترجم)

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

(اقبال)

انگلستان کا مشہور شاعر پوپ کہتا ہے "انسان کے لیے مطالعے کا بہترین موضوع انسان ہے"۔ جو لوگ فلسفیانہ طبیعت رکھتے ہیں، دنیا کو گہری نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں انھیں چاروناچار اس مقولے کی تصدیق کرنا پڑتی ہے کیونکہ کائنات کے گورکھ دھندے کا سرا انسان ہی کی ذات ہے۔ اس بھول بھلیاں میں وہ کہیں سے چلنا شروع کریں گھوم پھر کر انسان تک آپہنچتے ہیں اور یہیں سے اس پیچ در پیچ رستے کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ اب رہے وہ لوگ جو فلسفیانہ تحقیق کی خلش سے محروم یا محفوظ ہیں اور عملی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں انھیں پوپ کے مقولے کے تسلیم کرنے میں کیا تامل ہوسکتا ہے؟ انھیں تو ہر قدم پر اسکی ضرورت پڑتی ہے کہ اپنے بنی نوع کی سیرت کو جانیں، ان کے مزاج کو پہچانیں، ان کے قول کو سمجھیں، اُن کے فعل کو پرکھیں۔

انسان کی عمر کا وہ حصہ جس کا مطالعہ سب سے زیادہ مشکل اور ایک لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہے نوجوانی کا زمانہ ہے۔ خالص نظری ذوق رکھنے والے طلسم شباب کی نیرنگیوں سے گھبراتے ہیں۔ شائد وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو دیکھنا ہی ہے تو اس صورت میں دیکھنا چاہیئے جب اُس کی سیرت کے نقوش ذرا اُبھر آئیں اور کسی قدر پختہ ہو جائیں۔ عنفوان شباب کی ہیولانی تصویر کو جو کبھی ایک رنگ پر نہیں رہتی،

نت نئے روپ بدلتی ہے دیکھنے سے کیا فائدہ اور فائدہ بھی ہو تو اس جھگڑے میں کون پڑے۔ مگر ارباب عمل یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے۔ انھیں تو اور لوگوں کی طرح نوجوانوں کی بھی حتےالامکان خدمت کرنا ہے اور ان سے حسب حیثیت کام لینا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ ان کے جذبات وخیالات، ان کی قابلیت وصلاحیت اور ان کی ضرورتوں کا صحیح اندازہ کر چکے ہوں۔

سب سے پہلے تو والدین کو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اپنے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی افتادمزاج کو سمجھیں تاکہ زندگی کی کٹھن منزل میں ان کی رہنمائی کر سکیں۔ ان کے بعد مگر ان سے زیادہ معلموں کو نوجوانوں کی سیرت کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہی اُن کی تعلیم وتربیت کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ والدین کو یہ آسانی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بچپن سے دیکھتے بھالتے ہیں اور اُس کی ارثی خصوصیتوں کو پہلے سے جانتے ہیں۔ مگر معلموں کو موجودہ طریقۂ تعلیم کے مطابق اپنے شاگردوں سے واقف ہونے کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے۔ نوجوانوں کے معلم ہائی اسکول کے اعلیٰ مدرس یا کالج کے پروفیسر ہوتے ہیں اور وہ عموماً انکی بچپن کی زندگی سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ والدین کو جو باتیں چودہ پندرہ برس کے سابقے میں خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں وہ معلموں کو دو چار برس کے عرصے میں مشاہدے اور تجربے سے دریافت کرنا پڑتی ہیں۔

والدین اور معلموں کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے لئے بھی نوجوانوں کی افتادمزاج سے واقف ہونا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ روحانی پیشوا جو انھیں عقیدت اور معرفت کے رستے پر چلانا چاہتے ہیں، سیاسی لیڈر یا سماجی مصلح جو ان سے ملک وملت کی خدمت لینا چاہتے ہیں اگر ان کی مخصوص ترکیب نفسی سے واقف نہ ہوں تو اپنی کوششوں میں ناکامیاب رہتے ہیں اور ان بیچاروں کی زندگی برباد کرتے ہیں۔ عدالت کے حاکم نوعمر مجرموں سے تبھی انصاف برت سکتے ہیں، کارخانوں کے مالک اور محکموں کے افسر نوجوان ماتحتوں سے تبھی کام لے سکتے ہیں جب وہ عنفوان شباب کی نفسی خصوصیات کے محرم ہوں۔

اب رہے خود نوجوان ان کی تو سب سے بڑی آرزو اور سب سے شدید ضرورت یہی ہے کہ اس طوفان وتلاطم کی حقیقت کو سمجھیں جو اُن کے نفس میں برپا ہے۔ جب تک وہ اس دریا کے مدوجزر سے آشنا نہ ہوں صحیح سلامت ساحل تک نہیں پہنچ سکتے۔

مگر مشکل یہ ہے کہ ناکردہ کار نوجوانوں میں اتنی بصیرت نہیں ہوتی کہ اپنی نفسی کیفیات کو تحقیق اور تنقید کی نظر سے دیکھ سکیں اور ان پر کیا موقوف ہے خود اپنی یا اپنے جیسوں کی سیرت کا نفسیاتی مشاہدہ جیسا چاہیئے کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ کسی شخص کی ترکیب نفسی کی تحلیل کرنا اسی کا کام ہے جسے اس شخص سے تعلق ہو مگر بہت قریب کا نہ ہو۔ نوجوانوں کی طبیعت کو اگر پوری طرح سمجھ سکتے ہیں تو وہی لوگ جو نوجوانی کی منزل سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ مگر یہ عجیب بات کہ نوجوانی کا دور گذرنے کے بعد لوگ اسے یاد تو بہت کرتے ہیں مگر اُس کی واردات اُن کے ذہن میں بہت کم محفوظ رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک خواب سا دیکھا تھا۔ جس طرح صبح اُٹھ کر رات کے خواب کے محض چند متفرق نقوش لوح دل پر رہ جاتے ہیں اُسی طرح جوانی کی نیند سے بیدار ہونے کے بعد شباب بیتی کے کچھ بیرنگ اور بے ربط واقعات یاد رہتے ہیں مگر وہ نفسی کیفیتیں یاد نہیں رہتیں جو اس ماجرے کی جان تھیں۔ اس نا تمام مرقعے سے زندگی کے مبصر کا کام نہیں چلتا۔ اس کے لئے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ ان لوگوں سے مدد لے جو ابھی تک عنفوان شباب کی منزل میں ہیں۔ مگر نوجوانوں کی رمیدگی اور پردہ داری کی بدولت یہ تدبیر بھی نہیں چلتی۔ انھیں درد پنہاں کی کسک سے تڑپنا گوارا ہے مگر اپنے دل کا حال کسی سے کہنا گوارا نہیں۔

آپ کہیں گے کہ اچھا اگر نوجوان اپنے بھید کو چھپاتے ہیں تو کیا ہم خود اُن کی حالت نہیں دیکھ سکتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ہم چشم بینا اور ذہن رسا رکھتے ہوں اور تحقیق و تنقید کی زحمت گوارا کریں تو بیشک دیکھ سکتے ہیں لیکن اگر ہر شخص چاہے کہ یوں ہی سرسری نظر ڈال کر نوجوانوں کی پیچ در پیچ ترکیب نفسی کو سمجھ لے تو تقریباً ناممکن ہے۔ عام تجربہ بعض راہوں میں صحیح راہنمائی کرتا ہے مگر اس منزل میں قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔

عام تجربے کی بنا پر نوجوانوں کی سیرت کی جو تصویر ہمارے ذہن میں قائم ہوتی ہے وہ عجیب اَن مِل بے جوڑ نقوش کا مجموعہ ہے۔ کبھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نوجوان بے فکری اور لاأبالی پن کی زندگی میں مگن ہے، نہ اسے طمع سود ہے نہ اندیشۂ زیاں نہ غم دوش ہے نہ فکر فردا اور کبھی یہ کہ وہ ہر وقت کسی خیال میں محو ہے کسی تشویش میں گھل رہا ہے گویا ساری دنیا کی ذمہ داریاں اُسی کے سر ہوں۔ کبھی ہم

اُسے اس قدر احدی اور آرام طلب پاتے ہیں کہ دن پر پڑا چارپائی توڑتا ہے اور اپنے ہاتھ سے اُٹھکر پانی پینا بھی گوارا نہیں کرتا اور کبھی اتنا محنتی اور جفاکش کہ بھوت بن کر کام کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور اس دھن میں نہ اسے کھانے کا ہوش رہتا ہے اور نہ سونے کی فکر۔ کبھی وہ ہمیں یار دوستوں کی صحبت کا شیدائی نظر آتا ہے، جب دیکھو احباب کے مجمعے میں ہنسی، دل لگی، قہقہوں، چہچہوں کا لطف اُٹھا رہا ہے اور کبھی اس درجہ تنہائی پسند کہ صحبت کے نام سے بیزار رہے انسان کے سائے سے بھاگتا ہے۔ کبھی اُسکی شکایت کی جاتی ہے کہ بے حد خودسر اور خود رائے ہے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا کسی کا کہنا نہیں مانتا اور کبھی تعریف ہوتی ہے کہ بڑوں کے سامنے آنکھیں بچھاتا ہے اور ان کی دل سے اطاعت کرتا ہے۔ کبھی اس کی حالت پر افسوس کیا جاتا ہے کہ مذہب سے غافل ہے، سست اعتقاد ہے، نماز روزے کے پاس نہیں پھٹکتا اور کبھی اس کی دینداری، عبادت گذاری، پرہیزگاری کی قسم کھائی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ عام یہ خیال ہے کہ عنفوان شباب محض حسن وعشق کا دلکش اور دلنواز طلسم ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس نوبہار عمر میں حسن کا رس گلبن زندگی کو تازگی اور شادابی بخشتا ہے محبت کی نسیم غنچۂ دل کو شگفتہ رکھتی ہے اور نوجوان کو ناز و نیاز کا لطف اُٹھانے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن ذرا غور کیجئے تو معلوم ہو جائے کہ عشق بھی اُن کانٹوں میں سے ایک کانٹا ہے جو نوجوان کے پہلو میں کھٹکتے ہیں یہ ہماری کم نگاہی ہے کہ غم زندگی اور الم روزگار کی گوناگوں خلش میں جو نوجوان کے دل کو تڑپاتی رہتی ہے ہمیں صرف عشق کی چھیڑ دکھائی دیتی ہے اور اسے بھی ہم لطف ومسرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لالۂ نودمیدہ کے خون جگر کو ہم رنگ شباب کی سرخی اس کے درد بھرے دل کی فریاد کو الفت کا ترانہ سمجھتے ہیں!

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا

اے وائے نالۂ لب خونیں نوائے گُل!

غرض عام تجربے سے نوجوان کی ترکیب نفسی کے سمجھنے میں کام نہیں چلتا۔ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو یہاں محض ایک دھوپ چھاؤں کا کھیل ایک تلوّن کا طلسم دکھائی دیتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس رنگ کو اصلی رنگ سمجھے۔

زندگی کی تفسیر میں عام تجربے سے آگے بڑھے تو ادب کی منزل آتی ہے۔ حیاتِ انسانی کی جو باریکیاں عام نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں انھیں شاعر اور ادیب کی نکتہ رس نظر دیکھ لیتی ہے مگر افسوس ہے کہ ہماری زبان کا ادب ہمیں نوجوانوں کے دل کا بھید سمجھنے میں بہت کم مدد دیتا ہے۔ ہمارے ادب کا جزوِ اعظم شاعری ہے۔ اُردو کے شاعروں کا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہم عہدِ شباب کے مصور اور مفسّر ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی ساری بلند پروازی محدود ہے "چنانکہ افتد و دانی" کی تفسیر تک اور یہ بھی جیسی کچھ ہے ظاہر ہے۔ اب رہے ہمارے ناول نویس اور افسانہ نگار اُن کا زاویۂ نگاہ کسی قدر وسیع ہے مگر دقتِ نظر ان میں شاعروں سے بھی کم ہے۔ اُردو میں جتنے ناول لکھے گئے ہیں اُن میں زندگی کی سچی تصویر اگر ہے تو صرف نذیر احمد کے ناولوں میں ہے۔ توبۃ النصوح اور فسانۂ مبتلا میں نوجوانوں کی زندگی کے ایک پہلو پر نہایت خوبی سے نظر ڈالی گئی ہے مگر نفسی تحلیل کی یہاں بھی کمی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب ہمارا ادب ہی نوجوانوں کی نفسی زندگی کی ترجمانی سے قاصر ہے تو اس مسئلے میں علمی تحقیق کیسے کی جاسکتی ہے۔ انسان کے قلب کی گہرائیوں کا مشاہدہ اصل میں شاعر اور ادیب کا کام ہے۔ نفسیات کا ماہر ادب کے سہارے کے بغیر اس منزل میں نہیں چل سکتا۔ اس کے پیشِ نظر باکمال شاعروں اور ناول نویسوں کے مشاہدات ہوں تو وہ انھیں تنقید کی کسوٹی پر کسے اور عقلی اصول کے مطابق ترتیب دے لیکن جب یہ لوح بالکل سادہ ہو تو وہ کس برتے پر تحقیق کا حوصلہ کرے۔ اب اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اردو داں پبلک نوجوانوں کی ترکیبِ نفسی کے اہم مسئلے سے واقف ہو تو لے دے کے یہی ایک صورت رہ جاتی ہے کہ دوسری زبانوں میں جو کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہوں اُن کا اُردو میں ترجمہ کریں۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے میں جو کچھ توقع ہوسکتی ہے مغربی زبانوں سے ہوسکتی ہے۔ مگر جب ہم یورپ اور امریکہ کے نفسیاتی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اس خاص مسئلے میں بہت کم تحقیق کی گئی ہے۔ حکمائے مغرب نفسیات کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) نفسیات بہ حیثیت سائنس کے اور (۲) بہ حیثیت فلسفے کے۔ پہلی قسم میں اس تعلق سے بحث

کی جاتی ہے جو انسان کے نفس کو عالم مادی سے ہے اور دوسری میں خالص نفسی کیفیات اور اُن کے مرکز یعنی انسانی سیرت کا تمدنی زندگی کی روشنی میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔ پہلی قسم کی نفسیات میں بہت کچھ تحقیق ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے مگر دوسری قسم کی نفسیات ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ اس کے دو شعبے قرار دیے گئے ہیں نفسیات عمومی جس میں نوع انسانی کی عام حالت اور عام سیرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نفسیات خصوصی جس میں مختلف قوموں، مختلف طبقوں اور مختلف عمر کے لوگوں کی مخصوص نفسی کیفیت کی تفسیر مدنظر ہوتی ہے۔ ابھی تک فلسفیانہ نفسیات عمومی خود نامکمل ہے اس لئے نفسیات خصوصی پر قلم اُٹھانے کی ہمت کرنا بہت مشکل ہے۔

پھر بھی تھوڑی بہت کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں جن میں سے چند میں نوجوانوں کی مخصوص ترکیب نفسی پر بحث کی گئی ہے۔ ان میں فلسفیانہ دقتِ نظر کے اعتبار سے پروفیسر اشپرانگر کی Psychologie des Jugendalters کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اسی کتاب کا ترجمہ ہم ارباب نظر کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

پروفیسر ایڈوارڈ اشپرانگر جن کمالات کے جامع ہیں اُن کے لحاظ سے نفسیات شباب کی تحقیق کے لئے بہت کم لوگ اُن سے زیادہ موزوں ہوں گے۔ موصوف برلن یونیورسٹی میں فلسفۂ تمدن اور فلسفۂ تعلیم کے پروفیسر ہیں اور انھیں موجودہ عہد کے جرمن فلسفیوں کی صف اول میں جگہ دی جاتی ہے۔ فلسفے کے مختلف شعبوں کے علاوہ تاریخ اور ادب میں اُن کا تبحر تمام جرمنی میں مسلّم ہے۔ فلسفیانہ نفسیات میں موصوف نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی ہے جس نے علمی تحقیقات کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اس وسعت نظر کے ساتھ ساتھ ان کا علمی تجربہ اس قدر وسیع ہے کہ بہت کم علماء کو نصیب ہوتا ہے۔

اس کتاب کی تصنیف کے وقت (۱۹۲۴ء) موصوف پندرہ برس سے یونیورسٹی میں معلم تھے اور انھیں ہزارہا نوجوانوں سے سابقہ رہ چکا تھا۔ اس سابقے کی قدر و قیمت سمجھانے کے لئے موصوف کی سیرت کا تھوڑا سا ذکر ضروری ہے۔

جرمنی میں یونیورسٹی کے پروفیسروں کا تعلق اپنے شاگردوں سے ایسا ہوتا ہے جیسا گرو کا چیلوں سے۔ ان کا کام صرف درس و تدریس ہی نہیں بلکہ زندگی کی ہر منزل میں طالب علموں کی رہنمائی کرنا سمجھا جاتا ہے۔ پروفیسر اشپرانگر کی شفقت کا یہ حال ہے کہ ہر شاگرد کو اپنا عزیز سمجھتے ہیں اور سادگی ان کے مزاج میں اس قدر ہے کہ نوجوانوں میں ہمعمروں کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔ کوئی انھیں حلقۂ درس میں دیکھے تو یہ سمجھے کہ دو ایک برس بڑا بھائی جو چھوٹے بھائیوں سے دو چار سبق آگے ہے ان کے ساتھ بیٹھا پڑھ رہا ہے، کہیں اگلے سبق میں انھیں کچھ سمجھاتا ہے اور کہیں پچھلے سبق میں اُن سے کچھ سمجھتا ہے۔ ظرافت جو اور جرمن پروفیسروں میں عنقا ہے پروفیسر اشپرانگر کا خاص جوہر ہے۔ لکچروں میں ان کے پاکیزہ لطائف سے نوجوانوں کا غنچۂ دل کھل جاتا ہے اور انھیں فلسفے کے ادق مسائل سے بجائے وحشت کے اُنس پیدا ہو جاتا ہے۔ موصوف کی محبت اور ہمدردی کا یہ عالم ہے کہ جب اپنے شاگردوں سے گھر پر ملتے ہیں تو ان کی علمی مشکلات حل کرنے کے علاوہ ان کی صحت، ان کے عام مشاغل اور ان کی زندگی کے مقاصد کے متعلق نہایت دلسوزی سے سوالات کرتے ہیں اور انھیں مشورے کی ضرورت ہو تو مشورہ اور مدد کی ضرورت ہو تو مدد دیتے ہیں۔ اس سادگی، خوش مزاجی اور حسن خلق کی بدولت نوجوانوں کے دل سے موصوف کے علم و فضل کا رعب بڑی حد تک کم ہو جاتا ہے اور وہ کھلے دل سے اپنا سارا حال کہہ سناتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ موصوف کے زہد و اتقا اور ان کی اخلاقی سخت گیری کی وجہ سے ان لوگوں کو اپنی بعض لغزشوں کے ذکر کی جرأت نہیں ہوتی لیکن کہیں اُس کہنہ مشق ماہر نفسیات اُس عارف زندگی کی نظر سے یہ باتیں ان خامکاروں کے چھپائے چھپ سکتی ہیں؟

اب ناظرین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ پروفیسر اشپرانگر کا ہزارہا نوجوانوں سے پندرہ برس کا سابقہ کیا معنی رکھتا ہے۔ لیکن ان کا تجربہ یہیں تک محدود نہیں۔ جرمنی کی "تحریک شباب" ہے جس میں یونیورسٹی کے طالب علموں کے علاوہ اسکولوں کے لاکھوں لڑکے شامل ہیں موصوف کو بہت گہرا تعلق ہے۔ وہ اکثر ان جماعتوں کے ارکان سے ملتے جلتے رہتے ہیں، ان کے جلسوں میں تقریریں کرتے ہیں اور انھیں مفید مشورے دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی خامیوں پر سختی سے نکتہ چینی بھی کرتے

ہیں۔ یہ آزاد منش نوجوان اعتراض سننے کے عادی نہیں لیکن پروفیسر اشپرانگر سے وہ اس قدر محبت رکھتے ہیں اور اُن کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ ان کی شیریں کلامی کے ساتھ ان کی تلخ گوئی کو بھی محض صبر سے نہیں بلکہ شوق سے سنتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکولوں کے معلموں کے توسط سے بھی موصوف کو نوجوان طالب علموں کے متعلق بہت وسیع معلومات حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ موصوف جرمنی کے مُدرِسوں کے پیر سمجھے جاتے ہیں۔ برلن میں ان کا ایک خاص حلقہ ہے جس میں بہت سے مدرس ان سے تعلیم کے نظری اور عملی مسائل حل کرتے ہیں۔ جرمنی کے اور مدرس بھی تحریر اور ملاقات کے ذریعے سے استفادہ کیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ نوجوانوں کی سیرت اور زندگی کے متعلق اپنے اپنے تجربے بیان کرتے ہیں جن میں سے موصوف اہم باتیں انتخاب کرکے قلمبند کرلیتے ہیں۔

اس وسیع اور گہرے تجربے کی بنا پر پروفیسر اشپرانگر جیسے عالم متبحر نے "نفسیاتِ عنفوانِ شباب" لکھی ہے۔ جرمنی میں اس کتاب کی اتنی قدر ہوئی کہ پہلا ایڈیشن چند مہینے میں ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب تک متعدد ایڈیشن چھپ کر فروخت ہو چکے ہیں۔ علمی کتابوں کو یہ بات یورپ میں بھی بہت کم نصیب ہوتی ہے۔

جامعہ ملیہ کی اردو اکادمی کو یہ فخر حاصل ہے کہ یورپ کی دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ ہونے سے پہلے وہ اس کا اُردو ترجمہ شائع کر رہی ہے۔ ہم جناب مصنف کے بے حد ممنون ہیں کہ انہوں نے نہ صرف ترجمہ کی اجازت دی بلکہ ہماری درخواست پر اُردو ترجمے کے لئے ایک خاص دیباچہ لکھ کر بھیجا۔ اس میں انہوں نے مترجم کے متعلق جو اُن کا ناچیز شاگرد ہے ایسے کلمے لکھے ہیں جن سے ناظرین کو اُن کی وسعت اخلاق اور بزرگانہ شفقت کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہو جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ انھیں غریب ہندوستان سے کس قدر عقیدت اور محبت ہے۔

اس کتاب میں جس نفسی زندگی کا خاکہ ہے وہ جرمنی کے نوجوانوں کی مخصوص زندگی ہے۔ اس سے ہماری یہ ضرورت کہ ہندوستان کے نوجوانوں کی ترکیب نفسی کو سمجھیں پوری نہیں ہوتی پھر بھی جو تصویر ہمارے سامنے ہے وہ بجائے خود دلکش ہے اور اس میں جا بجا وہ خط و خال بھی نظر آجاتے

ہیں جو تمام دنیا کے نوجوانوں میں مشترک ہیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ جناب مصنف نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے میں ان لوگوں کی زندگی کے مطالعے سے زیادہ مدد نہیں ملتی جو ہو بہو ہماری طرح ہیں بلکہ ایسی طبیعتوں کا مشاہدہ زیادہ مفید ہوتا ہے جو بعض باتوں میں ہم سے مشابہ ہیں اور بعض باتوں میں ہم سے مختلف۔ اس لحاظ سے یہ اُمید ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ ہمارے لئے بے کار نہ ثابت ہوگا۔

ناظرین سے اتنا اور عرض کرنا ہے کہ یہ فلسفے کی کتاب ہے اور اس میں بھی ایک خاص زاویۂ نظر کی حامل ہے اس لئے اگر اس کے مطالب کے سمجھنے میں کچھ دقت ہو تو بددل نہ ہوں۔ غور اور توجہ سے مطالعہ کیا جائے گا تو یہ دقت دور ہو جائے گی۔ کیونکہ جو کچھ پیچیدگی ہے وہ خود موضوع میں ہے ورنہ مصنف کی عبارت سہل ہے اور طرزِ بیان سلجھا ہوا ہے۔ ناظرین کو جو کچھ دشواری پیش آئیگی وہ صرف پہلے باب میں اور چند اور بابوں کی تمہید میں پیش آئیگی۔ جو حضرات فلسفے سے واقف نہیں، اور یوں بھی پیچیدہ مسائل سے گھبراتے ہیں وہ ان مقامات کو پہلے مطالعے میں چھوڑ جائیں۔ پوری کتاب کو ایک بار پڑھ جانے کے بعد غالباً یہ حصے بھی سمجھ میں آجائیں گے۔ طالب علموں کی آسانی کے لئے ہم نے مشکل الفاظ خصوصاً فلسفیانہ مصطلحات کی ایک فرہنگ آخر میں دیدی ہے۔

ہم یہ مقدمہ اس اعتراف کے ساتھ ختم کرتے ہیں کہ ہم سے ترجمہ کا حق پوری طرح ادا نہیں ہوا ہے۔ ہم نے حتے الامکان اصل کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور مطلب کو صحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے مگر اپنی عبارت میں وہ ادبی خوبیاں نہیں پیدا کر سکے جو اصل کتاب میں ہیں۔ ہم دو ایک جگہ مشکل مقامات کو جن کے بغیر تسلسل میں فرق نہیں آتا اور موضوع بحث کے سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی چھوڑ بھی گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے یہ کتاب ہماری دوسری کتابوں سے پست ہے اور غلطیاں اتنی رہ گئی ہیں کہ ایک مفصل غلط نامہ دینا پڑا ہے۔ اس کے وجوہ بیان کر کے ہم ناظرین کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے اور ان سے التجا کرتے ہیں کہ اگر کتاب کا مضمون انھیں پسند آئے

تو ترجمے اور طباعت کی خامیوں سے چشم پوشی کریں۔

سید عابد حسین

اورنگ آباد۔ ۳۱ اگست ۱۹۳۰ء

باب اوّل

مقصد اور منہاج

انسان کو جقدر سخت ضرورت سمجھے جانے کی عنفوانِ شباب مین ہوتی ہی عمر کے کسی حصّہ مین نہین ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ نوخیز جوانونکی مدد لوگ بمشکل اسی طرح کر سکتے ہین کہ اُنکی زندگی کو اچھی طرح سمجھین[1]۔ لیکن بہت سے واقعات مل کر اس سمجھنے کو مشکل بلکہ ناممکن بنا دیتے ہین۔ پہلے تو خود یہ نوجوان اپنی پیچ در پیچ اندرونی زندگی کو خود کے سبب سے اپنے آس پاس کے لوگون سے چھپائے ہین اُس نفسی بیداری کی جسے نوجوانی کہتے ہین۔ سب سے نمایان علامت پھول کی طرح کھلا ہونا نہین ہے بلکہ کلی کی طرح بند ہونا ہی۔ اس عمر مین طفلانہ صاف گوئی اور زود اعتباری باقی نہین رہتی بلکہ قریبی عزیزون اور قلبی دوستون کے ساتھ بھی خاموش کشیدگی حجاب آگین رمیدگی اور نفسی چھوٹ پڑتی جاتی ہی درانحالیکہ بچہ کی زندگی بڑون کے سہارے پر منحصر ہے اور اسطرح اپنی تکمیل کے لئے دوسرونکی محتاج ہی۔ نوجوان کی خصوصیت ہی یہ ہو کہ اُسمین سرکشی اور خودمختاری ہوتی ہی جو اُسے اپنی بسلیٔ ہوئی اندرونی دُنیا مین رہنے اور انسانون سے ملنے مین ذاتی انتخاب سے کام لینے پر آمادہ کرتی ہی اس عمر مین بخلاف سن بلوغ[2] کے جنس ذکور کا نفس بہ مقابلہ جنس اناث کے نفس کے زیادہ گہرا راز سربستہ ہوتا ہی۔ نوجوان مرد گویا دوہری زرہ سے اپنی حفاظت کرتا ہی۔ اس مین شبہ نہین کہ نوجوان

---

[1] یہان سمجھنے سے مراد ہی شخصی زندگی کے نفسی نظام کو اور نظام تمدن سے اُسکے تعلق کو سمجھنا۔

[2] شباب یا نوجوانی سے ہم بلوغ کامل سے پہلے کا زمانہ مراد لیتے ہین۔

[3] اس کتاب مین jugendalter عہد عنفوان شباب سے مراد ہی۔ یورپ کے لڑکون کے لئے تقریباً چودہ سے بائیس برس اور لڑکیون کے لئے تیرہ سے اُنیس برس تک کی عمر ہی۔ اور ہندوستان کے لڑکون کے لئے بارہ سے بیس تک اور لڑکیون کے لیے دس سے اٹھارہ تک کی عمر عنفوانِ شباب کا زمانہ لڑکے یا لڑکی کے بالغ ہونیکے بعد ختم ہو جاتا ہی۔ ہم نے عنفوان شباب اور نوجوانی ایک معنی مین استعمال کیا ہی۔

لڑکی بھی اپنی اندرونی زندگی کو چھپانیکی انتہائی کوشش کرتی ہی لیکن باوجودان تدبیرونکے وہ نوجوان مرد کے مقابلہ مین شیشہ کی طرح شفاف ہوتی ہی اور اپنی ذات کی تکمیل کے لئے دوسرونکی احتیاج جسے شار لوٹے بوہلر نے عام طور سے عنفوان شباب کی بنیادی خصوصیت قرار دیا ہے لڑکیون کے یہان باوجود اندرونی زندگی کی عزلت کے کہین زیادہ اہمیت رکھتی ہی۔

اسکے یہ معنی نہین ہین کہ نوجوان مردون کو مدد کی ضرورت نہین ہوتی لیکن مدد کرنیکے لیے سمجھنا لابدی ہی اور یہ دشوار ہی۔ بالغ فرد جو نوجوانون کو سمجھنا چاہے خود اپنی طرف سے ایک عجیب رکاوٹ محسوس کرتا ہی۔ ہم اپنی زندگی کے کسی حصہ کو اتنا نہین بھولتے جتنا زمانہ قبل بلوغ کو اس عمر کی طوفان خیزیان اور حشر انگیزیان ہمین جبتک ہم نوجوان ہین کتنی ہی اہم کیون نہ معلوم ہون لیکن آگے چلکر ہمارے حافظہ مین عنفوان شباب کے واردات قلبی کا زیر و بم مقابلہ عمر کے دوسرے حصونکی اندرونی کیفیات کے کم محفوظ رہتا ہی شاید اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہی کہ اس زمانیکے اکثر نفسی زلزلون کا سارا اثر صاحب نفس کی سیرت کو کسی معینہ سانچے مین ڈھالنے مین کھپ جاتا ہے اسلئے لوح حافظہ پر کوئی نقش نہین چھوڑ سکتا۔ شاید اس بھولنے مین لاشعوری ارادہ کو بھی کچھ دخل ہو۔ بہرحال عموماً ہماری یاد مین خود اپنے بلوغ کے عہد کی ایسی غلط تصویر ہوتی ہی کہ بڑے بڑے عارفان زندگی بھی نوجوانون کی نشو و نما کے زمانہ کو معمہ سمجھتے ہین۔

تیسری بات جس سے نوجوانون کے سمجھنے مین دشواری پیدا ہوتی ہی آگے چل کر مفصل بیان کی جائیگی۔ پوری طرح سے انسان صرف اسی انسان کو سمجھ سکتا ہی جسکی سیرت کی کم سے کم داغ بیل مضبوطی سے پڑ چکی ہو۔ لیکن عہد شباب کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ نوجوان کو خود اپنے نفس کا پورا شعور نہین ہوتا۔ یہ ان کے انوکھے حزن و ملال اور سمجھے جانیکی آرزو کا سب سے بڑا سبب ہے کہ وہ خود اپنے نفس کے سمجھنے سے اپنے آپ کو قطعاً معذور پاتے ہین۔

اس کتاب کا کام یہ ہے کہ عہد شباب کے نظام نفسی کی مکمل تصویر پیش کر کے نوجوانونکو اچھی طرح سمجھنے مین آسانی پیدا کرے۔ نفسیات کے جو اور دوسرے اہم مقاصد ہو سکتے ہین

اُن کو ترک کرکے یہاں شباب کی نفسیات افہامی سے بحث ہوگی۔ زندگی میں اکثر مجسم حقیقی اشخاص کے سمجھنے کی کوشش کیجاتی ہے مثلاً شاعر یا تذکرہ نویس ہمیں کسی انسان کی زندگی کے اندرونی حالات کا محرم بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا۔ ہم صرف اپنے عہد تمدن کے نوجوان کی ایک مثالی تصویر پیش کرسکتے ہیں۔ کسی خاص شخص کو یہ جامہ پہنانے کے لئے ضرورت ہے کہ اسمیں انفرادی خصوصیات کے لحاظ سے قطع و برید کی جائے یہاں تک کہ یہ آہستہ آہستہ اُسکے جسم پر چُست ہوتا جائے۔ پھر بھی یہ توقع کہ یہ بالکل ٹھیک آجائیگا فضول ہے۔ علم صحیح اسپر مجبور ہے کہ وہ عام معیار قائم کرنے اور عام تعمیری قوانین مرتب کرنے پر زور دے شاعر اور عملی مردم شناس جبلی طور پر ان معانی کو استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگوں میں ایک فطرتی قوت مشاہدہ ایک خاص قسم کی حس کائنات اور زندگی کو بہیئت کلّی سمجھنے کی ہوتی ہے جسکی بنیاد صورت اور تبدیل صورت کے سارے قوانین کے مخفی (لاشعوری) قیاس پر ہوتی ہے۔ مگر ہمیں سوائے اسکے کوئی چارہ نہیں کہ خود وہ معانی تعمیر کریں جنسے نفسی زندگی کے اصولی تعلقات اور روابط کا احصار کیا جاسکے اسلئے ضرورت ہے کہ ہم طریق کار دیباچہ کے طور پر مختصر الفاظ میں بیان کردیں۔

افہامی نفسیات سے بحث کرتے وقت سب سے پہلے فہم یا "سمجھنے" کے معنی کی توضیح ضروری ہے "سمجھنا" علوم ذہنی کے مخصوص طریقۂ ادراک یا علم کا نام ہے۔ اس سے یہ مراد لینا کہ کسی نفسی مظہر کا مدرک اپنے نفس میں اعادہ کرتا ہے صحیح نہیں۔ "سمجھنے" کے وسیع ترین معنی ہیں "ذہنی مظاہر کا ادراک مستند حقیقی علم کی شکل میں اسطرح کرنا کہ اُن مظاہر کے منشا سے آگاہی ہو" ہم صرف اُن چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں جو کوئی منشا[۲] رکھتی ہیں۔ سمجھنے میں اور ادراک یا توجیہ میں یہی فرق ہے کہ سمجھنے میں

[۱] نفسیات کی تقسیم نفسیات بیانی اور نفسیات افہامی میں مقصد کے لحاظ سے کیجاتی ہے نفسیات بیانی کا کام صرف یہ ہے کہ نفسی زندگی کے حالات صحت اور ترتیب کیساتھ بیان کردے لیکن نفسیات افہامی جیسا آگے چلکر تفصیل سے معلوم ہوگا نفسی مظاہر کے باہمی تعلق انکی علت غائی اور انکی تمدنی قدر سے بھی بحث کرتی ہے

[۲] منشا جرمن لفظ Sinn کا ترجمہ ہے جسکے معنی کی مصنف نے خود توضیح کردی ہے۔

منشا کا تعین ہوتا ہی اور ان چیزون مین نہین ہوتا مثلاً علت و معلول کے علاقہ کے ماتحت کسی واقعہ کی توجیہ جسمین محض ظاہری توالی کے قانون سے مدد لی جاتی ہی۔ سمجھنے کا عمل گہرائی مین ہوتا ہی۔ اور اندرونی علاقون کو معلوم کرتا ہی۔ یہ عمل ذہنی مظاہر کا منشا اس طرح معلوم کرتا ہی کہ وہ گویا اُنہین جان ڈال دیتا ہی اور اُن کا ادراک اُس کل کی نسبت سے کرتا ہی جسکے وہ اجزا ہین۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ "منشا" اور "بامنشا" کے کیا معنی ہین اسکا جواب بھی ہم بہت عام الفاظ مین دیتے ہین۔ "منشا" وہ چیز رکھتی ہی جو کسی نظام قدور[1] مین بحیثیت ایک تعمیری عنصر کے جگہ پاتی ہو اسلئے بامنشا وہ نظام یا اجزا کی وہ ترکیب کہلائیگی جو کسی نظام قدور کی تعمیر کرتی ہو اُس سے علاقہ رکھتی ہو یا اُسکے چلنے مین مدد کرتی ہو۔ کسی کل کے اجزا صرف اُسوقت "منشا" رکھتے ہین جبکہ خود وہ کل کسی قدری نقطۂ نظر کے ماتحت آسکے (۲) اُس کل کے اجزا کا تعلق اُسکے ساتھ اسی قدری نقطۂ نظر سے معین کیا گیا ہو یعنی جبکہ جب یہ اجزا کل کے ساتھ قدر کی تعمیر مین شریک ہون اور اپنی ایک خاص اہمیت اور خاص ترتیب رکھتے ہون کہ اُنہین حسب دلخواہ تغیر تبدل نہو سکے۔

ہماری زبان کے ہر جملہ مین ہر لفظ کا ایک معین منشا ہوتا ہی۔ پھر خود یہ جملہ کسی مطلب یا خبر کے بیان کرنیمین اپنا منشا رکھتا ہی یعنی علمی قدر کے ماتحت آجاتا ہی۔ ہر مشین کے پُرزے اپنا اپنا منشا رکھتے ہین بشرطیکہ اُس مشین کی مجموعی کارگذاری کا بھی کوئی منشا ہو۔ مشین کا جتنا مادی عنصر ہے اُسمین تغیر تبدل ہوسکتا ہی لیکن ہر جزو کا جو "وظیفہ" کل مین ہی اُسکا قائم رہنا ضروری ہی۔ کسی عمل کو ہم اُسوقت بامنشا کہینگے جب وہ حصول قدر کی غرض سے واقع ہو اور کسی نظام قدر کے ماتحت "سمجھا" جا سکے کسی قوم کی تہذیب کے مظاہر یا ساز و سامان کا بامنشا ہونا اسپر موقوف ہی کہ یہ چیزین اُس تہذیب کی مجموعی زندگی مین کہان تک مدد دیتی ہین۔ اگر اُن کو اس کل سے کوئی علاقہ نہ رہے تو وہ بے منشا

[1] قدر جرمن لفظ Wert اور انگریزی لفظ Value. کا ترجمہ ہی۔ یہ علم الاخلاق کی ایک اصطلاح ہے جسکے معنی ہین کسی چیز کی اہمیت کو اس اعتبار سے جانچنا کہ وہ انسان کے مقصد تخلیق کے پورا کرنےمین کس حد تک مدد دیتی ہی وہ چیز جو جانچی جائے ایسی صورت مین خود بھی قدر کہلاتی ہی۔